بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
ستمبر 2014

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں، غزلیں

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 6000 روپے

مستقل سلسلے

ستمبر 2014
جلد 29 شمارہ 1
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: B-20، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

پہلی شعاع

شعاع کا ستمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

پچھلا شمارہ سالگرہ نمبر تھا۔ قارئین نے اسے بے حد پسند کیا۔ ہمیں خط لکھ کر ہماری محنتوں کو سراہا۔ بہت سی بہنوں نے فون کر کے اپنی رائے سے نوازا۔ سالگرہ نمبر میں جو کمی یا خامی انہیں محسوس ہوئی' اس کا اظہار کیا۔ قارئین کی اس حوصلہ افزائی سے ہمیں نئی امنگ اور تقویت ملی ہے۔

شعاع کو خوب سے خوب تر بنانے کی امنگ، آپ کی پسندیدگی' ہمارے لیے کس قدر قیمتی ہے' الفاظ میں اس کا اظہار ممکن نہیں۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ہم وہ تمام خط شامل نہیں کر سکے جو ہمیں موصول ہوئے۔ ہم تہہ دل سے ان قارئین کے ممنون ہیں جنہوں نے اپنے قیمتی وقت کا کچھ حصہ ہماری نذر کیا۔ اور ان تمام قارئین کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو شعاع پڑھتی ہیں' اس پر تنقید و تبصرہ کرتی ہیں' ہماری دعا ہے کہ قارئین کی یہ محبتیں اسی طرح ہمارے ساتھ رہیں۔ آمین۔

عید سروے،

اکتوبر کا شمارہ عید نمبر ہوگا۔ اس میں عید کے حوالے سے دیگر سلسلوں کے علاوہ حسب روایت قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔ سروے کے سوال یہ ہیں۔

1۔ ذی الحج کا چاند نظر آتے ہی گلی کوچوں میں رونق نظر آنے لگتی ہے۔ جانوروں کی خریداری' ان کی آمد کا شور' ان کے پیچھے بھاگتے بچے' ان ہی ہنگاموں میں عیدالاضحی کا دن طلوع ہوتا ہے تو قصائی کی آمد کے انتظار سے لے کر گوشت بننے' اسے تقسیم کرنے اور اسے پکانے تک مصروفیت کا وہ عالم ہوتا ہے کہ سر اٹھانے کی مہلت نہیں ملتی۔ آپ ان مراحل سے کیسے نبرد آزما ہوتی ہیں۔ گھر میں قربانی کے جانوروں کی آمد سے لے کر قربانی ہونے تک کا احوال لکھیں۔

2۔ گوشت سے بنی آپ کی پسندیدہ ڈش کون سی ہے؟ آپ خود بناتی ہیں یا فرمائش کر کے بنواتی ہیں؟

3۔ ہر صوبے' ہر قوم' ہر خاندان کی ایک روایتی ڈش ہوتی ہے جو خاص موقعوں پر ضرور بنائی جاتی ہے۔ آپ کے گھر کی روایتی ڈش کون سی ہے؟

4۔ گوشت کی تقسیم کس طرح کرتی ہیں' گوشت تقسیم کرتے ہوئے آپ کون سی باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 15 ستمبر تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

- نمیرہ ناز کا مکمل ناول ۔ روپ نگر کی رام کہانی،
- سمیرا حمید کا مکمل ناول ۔ یارم،
- صدف ریحان گیلانی کا مکمل ناول ۔ وفا کے وعدے نبھا دیے سائیں،
- شاہدہ طلعت کا ناولٹ،
- رخسانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناول
- نگہت سیما، مصباح علی، سمیرا عثمان گل، صباحت یاسمین، قرۃ العین رائے اور قانتہ رابعہ کے افسانے،
- ٹی وی فنکارہ اریج فاطمہ سے ملاقات،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں ۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- خط آپ کے، آئینہ خانے میں، تاریخ کے جھروکوں سے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔ ہم منتظر ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

مہک میں سارے حروف دھو کر
قلم کو عنبر میں ڈبو کر
ثناءِ ربِ جلیل لکھوں
رحیم لکھوں، کریم لکھوں
اُسی کو اس کی دلیل لکھوں
کہاں نہیں تھا' کہاں نہیں ہے
مجھے بتاؤ وہ جہاں نہیں ہے
ازل سے ہے' تا ابد رہے گا
وہ آپ اپنی سند رہے گا
وہی تو ہے لاشریک و یکتا
وہ سب کا خالق وہ سب کا آقا
وہ سب کے اندر' وہ سب کے باہر
وہ سب سے اعلیٰ' وہ سب سے برتر
رحیم و رحمان صفات اس کی
بڑی مکرم ہے ذات اس کی

لاریب، ماہ زیب

روزِ ازل سے منبعِ انوار آپؐ ہیں
تاریکیوں میں نور کا مینار آپؐ ہیں

میری مجال، بیعتِ اغیار میں کروں
سردار آپؐ ہیں' مرے سردار آپؐ ہیں

کون و مکاں بنائے گئے آپؐ کے لیے
کون و مکاں کے وارث و حق دار آپؐ ہیں

ہے آپؐ کے جمال کا پھولوں میں رنگ و حسن
گلزارِ کائنات کی مہکار آپؐ ہیں

کونین میں نہیں کوئی آئینہ آپؐ سا
خلاقِ شش جہات کا شہکار آپؐ ہیں

ہیں اس جہاں میں جتنے بھی انسان بے نوا
ہر بے نوا کے مونس و غم خوار آپؐ ہیں

کس واسطے ظفر نہ لکھے نعت آپؐ کی
سرکار صرف اس کے تو حق دار آپؐ ہیں

سید ظفر علی شاہ بخاری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ ہم ایک دعوت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دستی کا گوشت بڑھایا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ گوشت پسند تھا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے نوچ نوچ کر کھانے لگے اور فرمایا۔

"میں قیامت والے دن تمام لوگوں کا سردار ہوں گا۔ کیا تم جانتے ہو' اس سرداری کی وجہ کیا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ایک ہی میدان میں (اگلے پچھلے تمام) لوگوں کو جمع فرمائے گا۔ ایک دیکھنے والا ان سب کو دیکھے گا اور ایک پکارنے والا ان سب کو اپنی آواز سنا سکے گا۔ سورج ان کے قریب ہوگا۔ لوگوں کو غم اور بے چینی اس حد تک پہنچے گی کہ ان کی طاقت اور برداشت سے باہر ہوگی' لوگ کہیں گے۔

"کیا تم دیکھتے نہیں کہ تم جس تکلیف سے دوچار ہو' وہ کس حد تک پہنچ چکی ہے۔ کیا تم ایسا شخص نہیں دیکھتے جو تمہارے لیے تمہارے رب سے سفارش کرے؟"

تو لوگ ایک دوسرے کو کہیں گے کہ تمہارے باپ آدم علیہ السلام ہیں۔

چنانچہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور کہیں گے۔

"اے آدم علیہ السلام! آپ تمام انسانوں کے باپ ہیں' اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے بنایا اور آپ کے اندر اپنی روح پھونکی اور اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا' تو انہوں نے آپ کو سجدہ کیا اور آپ کو جنت میں آباد کیا۔ کیا آپ اپنے رب سے ہماری سفارش نہیں کرتے؟ کیا آپ ہماری وہ تکلیف نہیں دیکھ رہے ہیں جس میں ہم مبتلا ہیں اور جس حالت کو ہم پہنچے ہوئے ہیں؟"

حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے۔ "میرا رب آج اتنا سخت غصے میں ہے کہ اس جیسا غضب ناک وہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا اور نہ آئندہ کبھی اس جیسا غضب ناک ہوگا اور اس نے مجھے (جنت میں) ایک درخت کے پاس جانے سے منع کیا تھا۔ لیکن مجھ سے نافرمانی کا صدور ہو گیا تھا۔ مجھے تو اپنی فکر ہے' اپنی فکر ہے' اپنی فکر ہے۔ تم میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ' تم نوح کے پاس جاؤ۔"

چنانچہ لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور ان سے عرض کریں گے۔

"اے نوح! آپ اہل زمین کی طرف سے سب سے پہلے رسول ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام شکر گزار بندہ رکھا ہے۔ کیا آپ وہ تکلیف نہیں دیکھ رہے ہیں جس میں ہم مبتلا ہیں؟ کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ ہماری بے چینی کس حد تک پہنچی ہوئی ہے؟ کیا آپ اپنے رب سے ہماری سفارش نہیں کرتے؟"

نوح علیہ السلام فرمائیں گے۔ "میرا رب آج اتنا سخت غصے میں ہے کہ اس جیسا غضب ناک وہ اس سے پہلے کبھی ہوا اور نہ کبھی آئندہ ہوگا اور مجھے ایک دعا کرنے کا حق حاصل تھا جو میں نے اپنی قوم کے خلاف کرلی تھی۔ مجھے تو اپنی فکر ہے' اپنی فکر ہے' اپنی فکر ہے۔ تم میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ' تم ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ۔

چنانچہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور عرض کریں گے۔

"اے ابراہیم! آپ اللہ کے نبی اور اہل زمین میں سے اس کے خلیل ہیں۔ آپ اپنے رب سے ہماری سفارش کر دیجئے۔ کیا آپ وہ تکلیف دیکھ نہیں رہے ہیں جس میں ہم مبتلا ہیں؟"

حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے فرمائیں گے۔ "میرا رب آج اتنا غضب ناک ہے کہ اتنا غضب ناک اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہوگا اور میں نے تو تین باتیں ایسی کی تھیں جو بظاہر واقعے کے خلاف تھیں۔ مجھے تو اپنی فکر ہے' اپنی فکر ہے' اپنی فکر ہے۔ تم میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ' تم موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔"

چنانچہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور ان سے عرض کریں گے۔

"اے موسیٰ! آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی رسالت اور ہم کلامی سے نواز کر تمام لوگوں پر فضیلت عطا کی۔ آپ اپنے رب سے ہماری سفارش کر دیجئے۔ کیا آپ وہ تکلیف دیکھ نہیں رہے ہیں جس میں ہم گھرے ہوئے ہیں؟"

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے۔ "میرا رب آج اتنا سخت غضب ناک ہے کہ اس جیسا غضب ناک وہ پہلے کبھی نہیں ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہوگا اور مجھ سے ایک جان کا قتل ہو گیا تھا جس کے قتل کرنے کا مجھے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ مجھے تو اپنی فکر ہے' اپنی فکر ہے' اپنی فکر ہے۔ تم میرے علاوہ اور کسی کے پاس جاؤ' تم عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔"

تو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور عرض کریں گے۔

"اے عیسیٰ! آپ اللہ کے رسول اور اس کا وہ کلمہ ہیں جو اس نے حضرت مریم کی طرف القا فرمایا اور اس کی روح ہیں اور آپ نے گہوارے میں لوگوں سے گفتگو فرمائی۔ آپ اپنے رب سے ہماری سفارش کر دیجئے۔ کیا آپ وہ تکلیف نہیں دیکھ رہے ہیں جس میں ہم مبتلا ہیں؟"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے۔ "میرا رب آج اتنا سخت غصے میں ہے کہ اس جیسا غضب ناک وہ پہلے کبھی ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔" حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے کسی قصور کا ذکر نہیں فرمائیں گے (اور فرمائیں گے) "مجھے تو اپنی فکر ہے' اپنی فکر ہے' اپنی فکر ہے۔ تم میرے سوا کسی اور کے پاس جاؤ' تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ۔"

ایک اور روایت میں ہے۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔) "لوگ میرے پاس آئیں گے اور کہیں گے۔"

"اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اللہ کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں۔ اللہ نے آپ کے اگلے پچھلے (تمام) گناہ بھی معاف فرما دیے ہیں۔ آپ اپنے رب سے ہماری سفارش فرما دیجئے۔ کیا آپ وہ تکلیف نہیں دیکھ رہے ہیں' جس میں ہم گھرے ہوئے ہیں؟"

چنانچہ میں چل کر عرش کے نیچے آؤں گا اور اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤں گا' پھر اللہ تعالیٰ اپنی حمد اور حسن ثنا پر مشتمل ایسے کلمات مجھ پر القا فرمائے گا کہ مجھ سے پہلے وہ کسی پر القا نہیں کیے گئے ہوں گے۔ پھر کہا جائے گا۔

"اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اپنا سر اٹھائیے' مانگیے' آپ کو دیا جائے گا۔ سفارش کیجئے' سفارش قبول کی جائے گی۔

چنانچہ میں اپنا سر (سجدے سے) اٹھاؤں گا اور کہوں گا۔

"اے میرے رب! میری امت' اے میرے رب! میری امت (اسے بخش دے۔)"

پس کہا جائے گا۔ "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اپنی امت کے ان لوگوں کو' جن پر حساب نہیں ہے' جنت کے دروازوں میں سے دائیں طرف کے دروازے سے

جنت میں لے جائیں اور وہ اس کے علاوہ دوسرے دروازوں میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ شریک ہیں۔(دوسرے دروازوں سے بھی وہ جاسکتے ہیں۔)"

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "قسم ہے اس ذات کی۔ جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جنت کے کواڑوں میں سے دو کواڑوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا مکہ اور ہجر کے درمیان یا مکہ اور بصریٰ کے درمیان ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ ہجر بحرین میں ایک شہر ہے اور بصریٰ دمشق کے جنوب میں واقع حوران کی ایک بستی ہے۔ یعنی جنت کا ایک دروازہ اتنا چوڑا ہو گا کہ دونوں کواڑوں کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہو گا۔

2۔ اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کا بیان ہے کہ قیامت والے دن' جبکہ جلیل القدر پیغمبروں کو بھی بارگاہ الٰہی میں سفارش کرنے کی ہمت نہیں ہو گی' نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حکم سے سفارش فرمائیں گے۔ ایک سفارش تو یہ فرمائیں گے کہ لوگوں کا حساب کتاب شروع کیا جائے' تاکہ میدان محشر کی ہولناکیوں سے لوگوں کو نجات ملے۔ روایت کا یہ حصہ اس حدیث میں نہیں ہے' دوسری روایات میں ہے۔

دوسری سفارش اپنی امت کے حق میں فرمائیں گے۔ یہ مختلف مرحلوں میں ہو گی۔ اس میں پہلے مرحلے کا ذکر ہے۔ جس میں آپؐ کی سفارش پر اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جنت میں لے جانے کی اجازت مرحمت فرمائے گا جن پر حساب نہیں ہو گا۔ دوسری مرتبہ آپؐ کی سفارش اس وقت ہو گی جب گناہ گار اہل ایمان جہنم میں اپنے گناہوں کی کافی سزا بھگت چکے ہوں گے تو پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے انہیں جہنم سے نکال کر جنت میں داخل فرمایا جائے گا۔

3۔ اس میں انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اپنی بعض لغزشوں کے حوالے سے سفارش کرنے سے معذرت کریں گے۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ انبیاء ایمان و تقویٰ کے جس بلند ترین درجے پر فائز ہوتے ہیں' وہاں معمولی سی لغزش بھی' جو گناہ کے دائرے میں نہیں آتی' انہیں بڑی غلطی محسوس ہوتی ہے' جیسے کہا جاتا ہے۔ "سفید اجلے کپڑے پر معمولی سا دھبہ بھی بڑا نمایاں محسوس ہوتا ہے۔" یہی حال انبیا صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور اسی اعتبار سے انہوں نے معمولی معمولی لغزشوں کی وجہ سے بارگاہ الٰہی میں پیش ہونے سے معذرت کی۔

4۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تین واقعے' جنہیں کذبات کہا گیا ہے' حالانکہ وہ جھوٹ نہیں ہیں' بلکہ معاریض ہیں' جو ظاہراً "جھوٹ معلوم ہوتے ہیں' لیکن حقیقتاً" جھوٹ نہیں ہوتے۔

ان میں سے ایک ان کا یہ کہنا کہ میں بیمار ہوں۔

دوسرا بتوں کی بابت کہنا کہ بڑے بت نے یہ کام کیا ہے' اس سے پوچھو۔

تیسرا بیوی کو اپنی بہن کہنا۔

پہلی بات کو کسی طرح جھوٹ نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ آپ نے اپنے آپ کو بیمار کہا تو یقیناً" آپ بیمار ہوں گے یا ان کی بستی کے لوگ جس جشن میں شرکت کی دعوت دے رہے تھے۔ اس کے لیے آپ بیمار تھے۔ بت توڑنے کے بعد کہنا کہ بڑے بت سے پوچھو' اس سے مقصود بتوں کے پجاریوں کے سامنے بتوں کی اصل حقیقت واضح کرنا اور ان کو توحید کی حقیقت سے آشنا کرنا تھا۔ اسی طرح بادشاہ کے سامنے حالت کی مجبوری کی وجہ سے بیوی کو بہن کہنا بھی جھوٹ نہیں ہے' کیونکہ ہر مسلمان مرد دوسرے مسلمان مرد کا بھائی اور مسلمان عورت ہر مسلمان کی بہن ہے۔ لیکن ظاہری شکل کے اعتبار سے کیونکہ یہ واقعات کے خلاف ہیں' اس لیے انہیں جھوٹ کہہ دیا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت کے لحاظ سے وہ جھوٹ

نہیں ہیں' توریے کی قسم سے ہیں جو بوقت ضرورت جائز ہے۔

حضرت ہاجرہ کا توکل

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ

"حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ اور ان کے بیٹے اسماعیل کو جبکہ وہ ان کو دودھ پلاتی تھیں' لائے حتیٰ کہ انہیں بیت اللہ کے نزدیک مسجد حرام کے بالائی حصے میں زمزم کے اوپر واقع ایک درخت کے پاس ٹھہرا دیا۔

اس زمانے میں مکے میں کوئی انسان آباد نہیں تھا۔ نہ وہاں پانی ہی تھا۔ ان ماں' بیٹے کو وہاں بٹھایا اور ان کے پاس ایک تھیلی رکھ دی۔ جس میں کچھ کھجوریں تھیں اور پانی کا ایک مشکیزہ تھا۔ پھر ابراہیم علیہ السلام پیٹھ پھیر کر جانے لگے تو حضرت اسماعیل کی والدہ ان کے پیچھے گئیں اور کہا۔

"اے ابراہیم! ہمیں اس وادی میں (تنہا) چھوڑ کر' جہاں کوئی غم خوار ساتھی ہے' نہ ضرورت کی کوئی چیز' کہاں جارہے ہیں؟"

انہوں نے یہ بات ان سے متعدد مرتبہ کہی' لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی طرف توجہ ہی نہ فرماتے۔ بالآخر حضرت ہاجرہ علیہ السلام نے کہا۔

"کیا اللہ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟"

حضرت ابراہیم نے کہا۔ "ہاں۔"

تو انہوں نے کہا۔ "تب وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔"

پھر وہ واپس چلی گئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی راہ پر چلے' یہاں تک کہ جب ثنیہ مقام پر پہنچے جہاں سے ان کے اہل و عیال انہیں نہیں دیکھ رہے تھے۔ اپنا رخ بیت اللہ کی طرف کیا' پھر ان کلمات کے ساتھ دعائیں کیں۔ اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور کہا۔

"اے میرے رب! میں نے اپنی اولاد کو ایک بے آب و گیاہ وادی میں آباد کیا ہے۔۔۔ تاکہ وہ شکر کریں۔"

(ادھر) اسماعیل کی والدہ' اسماعیل کو دودھ پلاتی اور اس مشکیزے کے پانی سے پانی پیتی رہیں' یہاں تک کہ جب مشکیزے کا پانی ختم ہو گیا تو خود پیاسی رہنے لگیں اور بیٹا بھی پیاس سے بلبلانے لگا اور وہ اسے زمین پر لوٹتے ہوئے دیکھنے لگیں۔

یہ منظر ان کے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔ چنانچہ وہ پانی کی تلاش میں چلیں تو صفا پہاڑ کو انہوں نے زمین میں سب سے قریب پایا۔ وہ اس پر کھڑی ہو گئیں اور وادی کی طرف منہ کر کے دیکھنے لگیں کہ کوئی انسان نظر آتا ہے۔ لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ صفا پہاڑ سے نیچے اتریں' یہاں تک کہ جب وادی (میدان) میں پہنچیں تو اپنی قمیص کا کنارہ اوپر اٹھایا' پھر اس طرح دوڑیں جیسے کوئی سخت مصیبت زدہ انسان دوڑتا ہے۔ حتیٰ کہ ساری وادی پار کر گئیں' پھر مروہ پہاڑی پر چڑھ کر کھڑی ہو گئیں اور نظر دوڑائی کہ کیا کوئی انسان دکھائی دیتا ہے؟ لیکن کوئی نظر نہ آیا۔

انہوں نے ایسا سات مرتبہ کیا۔ (سات چکر لگائے)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اسی وجہ سے (حضرت ہاجرہ کی متابعت میں) لوگ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔"

چنانچہ جب (آخر میں) مروہ پر چڑھیں تو ایک آواز سنی۔ تو اپنے آپ کو خطاب کر کے کہا۔ "خاموش رہ۔" (کیونکہ آواز ان کے لیے ناقابل یقین چیز تھی۔) پھر کان لگائے تو پھر آواز سنی۔ تو حضرت ہاجرہ نے کہا۔

"تیری آواز پہنچ گئی ہے۔ اگر تیرے پاس کچھ مدد کا سامان ہے تو۔" (فوراً "مدد کے لیے پہنچ")

پس ناگہاں دیکھا کہ زمزم کی جگہ کے پاس فرشتہ ہے۔

اس نے اپنی ایڑی یا اپنے پر کے ساتھ زمین کو کریدا' یہاں تک کہ پانی نکل آیا' تو حضرت ہاجرہ اس کے لیے حوض بنانے لگیں اور اپنے ہاتھ سے باڑھ بناتی تھیں اور چلو سے پانی لے کر مشکیزے میں

ڈالنے لگیں۔ وہ جتنا پانی چلو میں لیتیں، وہ پانی اتنا ہی ابلتا اور ایک روایت میں ہے کہ چلو کی مقدار کے برابر پانی ابلتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ حضرت اسماعیل کی والدہ پر رحم فرمائے۔ اگر وہ زمزم کو یوں ہی چھوڑ دیتیں۔" یا فرمایا۔ "چلو سے پانی اکٹھا نہ کرتیں تو زمزم روئے زمین کو سیراب کرنے والا بڑا چشمہ ہوتا۔"

راوی نے بیان کیا۔ "حضرت ہاجرہ نے خود بھی پانی پیا اور اپنے بچے کو بھی پلایا۔ پس فرشتے نے حضرت ہاجرہ سے کہا۔

"تم اپنی جان کا خوف مت کرو۔ (کہ وہ ضائع ہو جائے گی) اس لیے کہ اس مقام پر اللہ کا گھر ہے جسے یہ لڑکا اور اس کا باپ تعمیر کریں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے لوگوں کو ضائع نہیں کرتا۔"

اور (اس وقت) بیت اللہ (کی جگہ) ٹیلے کی طرح زمین سے بلند تھی۔ وہاں سیلاب آتے تو اس کے دائیں اور بائیں سے گزر جاتے۔ ایک عرصے تک یہی کیفیت رہی، یہاں تک کہ جرہم کا قافلہ یا جرہم قبیلے کا کوئی گھرانہ کداء کے راستے سے آتے ہوئے ان کے پاس سے گزرا۔ انہوں نے مکے کے زیریں حصے میں پڑاؤ کیا تو ایک منڈلاتا ہوا پرندہ دیکھا وہ کہنے لگے۔

"یہ پرندہ یقیناً" پانی پر گھوم رہا ہے۔ ہمیں تو اس وادی سے آتے جاتے ایک زمانہ ہو گیا ہے، اس میں تو پانی نہیں ہے۔"

چنانچہ (معلومات کے لیے) انہوں نے ایک یا دو قاصد بھیجے تو انہوں نے وہاں پانی پایا۔ انہوں نے آکر ان کو خبر دی تو وہ لوگ وہاں گئے۔ حضرت اسماعیل کی والدہ پانی کے پاس تھیں۔ انہوں نے کہا۔

"آپ ہمیں اجازت دیتی ہیں کہ ہم آپ کے پاس آکر پڑاؤ ڈال لیں؟"

انہوں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، لیکن پانی کی ملکیت میں تمہارا حق نہیں ہوگا۔"

انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "یہ بات حضرت اسماعیل کی والدہ کی خواہش کے مطابق ہوئی، وہ بھی انس و محبت کو پسند کرتی تھیں۔"

پس انہوں نے وہاں پڑاؤ ڈال لیا اور اپنے گھر والوں کو پیغام بھیجا۔ وہ بھی وہاں آکر مقیم ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہاں رہنے والے کئی گھر ہو گئے اور اسماعیل بھی جوان ہو گئے اور ان لوگوں سے انہوں نے عربی زبان بھی سیکھ لی اور جب وہ بڑے ہو گئے تو وہ ان میں سب سے زیادہ نفیس اور سب سے زیادہ دل پسند تھے۔ لہٰذا جب وہ بالغ ہو گئے تو انہوں نے اپنی ایک عورت سے ان کی شادی کر دی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ فوت ہو گئیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے، تاکہ اپنی چھوڑی ہوئی چیزوں (بیوی، بچے) کو ملاحظہ کریں۔ انہوں نے اسماعیل علیہ السلام کو نہ پایا تو ان کی بابت ان کی بیوی سے پوچھا۔ اس نے بتلایا کہ "وہ ہمارے لیے رزق کی تلاش میں، اور ایک روایت میں ہے۔ ہمارے لیے شکار کرنے باہر گئے ہیں۔"

پھر انہوں نے ان کی بیوی سے ان کی گزران اور عام حالت کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

"ہم بہت برے حال میں ہیں، بڑی تنگی اور سختی میں ہیں۔" اور ان کی طرف شکایت کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ "جب تمہارے خاوند آئیں تو انہیں میرا سلام کہنا اور ان سے کہنا۔ اپنے دروازے کی دہلیز بدل دیں۔"

چنانچہ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو گویا انہوں نے کسی چیز کو محسوس کیا۔ (کسی کی آمد کا احساس ہوا) اور پوچھا۔

"کیا تمہارے پاس کوئی آیا تھا؟"

بیوی نے کہا۔ "ہاں۔۔۔ ایسے ایسے حلیے کے ایک

بزرگ آئے تھے۔ انہوں نے آپ کی بابت پوچھا، تو میں نے ان کو بتلایا۔ پھر انہوں نے پوچھا۔ ہماری گزر اوقات کیسی ہے؟ تو میں نے ان کو بتلایا۔ ہم بڑی تکلیف اور سختی میں ہیں۔"

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پوچھا۔ "کیا انہوں نے تجھے کسی بات کی تلقین کی تھی؟"

اس نے کہا۔ "ہاں۔۔۔ مجھے انہوں نے حکم دیا تھا کہ میں آپ کو ان کا سلام کہوں اور آپ کے لیے یہ پیغام دے گئے تھے کہ اپنے دروازے کی دہلیز بدل دیں۔"

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا۔ "وہ میرے والد بزرگوار تھے اور انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھ سے علیحدگی اختیار کر لوں، پس تو اپنے گھر والوں (والدین) کے پاس چلی جا۔"

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس کو طلاق دے دی اور اس قبیلے کی کسی اور عورت سے شادی کر لی۔

پس حضرت ابراہیم علیہ السلام جب تک اللہ نے چاہا، کچھ عرصہ ٹھہرنے کے بعد دوبارہ ان کے پاس تشریف لائے تو پھر اسماعیل علیہ السلام کو گھر میں موجود نہ پایا۔ ان کی بیوی کے پاس آئے اور ان سے ان کی بابت پوچھا۔ تو اس نے بتلایا کہ وہ ہمارے لیے رزق کی تلاش میں باہر گئے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا۔ "تمہارا کیا حال ہے؟" اور اس سے ان کی گزران اور عام حالت کے بارے میں پوچھا۔ تو بیوی نے کہا۔

"ہم خیریت سے ہیں اور فراخی میں ہیں" اور اس نے اللہ کی حمد و ثنا کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا۔

"تمہاری خوراک کیا ہے۔"

اس نے کہا۔ "گوشت۔"

انہوں نے پوچھا۔

"پیتے کیا ہو؟"

اس نے کہا۔ "پانی!"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ "اے اللہ! ان کے لیے گوشت اور پانی میں برکت عطا فرما۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اس وقت ان کے لیے کوئی غلہ نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ ہوتا تو ابراہیم علیہ السلام اس کی بابت بھی ان کے لیے (برکت کی) دعا فرما دیتے۔"

حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ "مکہ کے سوا کسی اور جگہ کوئی شخص صرف ان دو چیزوں (گوشت اور پانی) پر گزارہ کرے تو اسے موافق نہیں آئیں گے۔"

ایک اور روایت میں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام (دوسری مرتبہ) آئے تو پوچھا۔

"اسماعیل کہاں ہیں؟"

تو ان کی بیوی نے کہا۔ "شکار کرنے گئے ہیں۔" پھر ان کی بیوی نے کہا۔

"کیا آپ تشریف نہیں رکھتے کہ (کچھ) کھائیں پئیں؟"

انہوں نے پوچھا۔ "تمہارا کھانا پینا کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "ہمیں کھانے کو گوشت اور پینے کو پانی میسر ہے۔" انہوں نے فرمایا۔ "اے اللہ! ان کے کھانے اور پینے میں برکت عطا فرما۔ راوی

حضرت ابن عباس نے بیان کیا کہ ابوالقاسم نے فرمایا۔ (مکے میں ان چیزوں کی فراوانی) حضرت ابراہیم کی دعا (کا نتیجہ) ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ "جب تمہارا خاوند آئے تو انہیں سلام کہنا اور یہ پیغام دینا کہ اپنے دروازے کی دہلیز کو برقرار رکھیں۔" جب حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو پوچھا۔

"کیا تمہارے پاس کوئی آیا تھا؟"

اس نے کہا۔ "ہاں۔۔۔ ایک خوب شکل بزرگ آئے تھے۔"

بیوی نے حضرت ابراہیم کی تعریف کی۔ "انہوں نے مجھ سے آپ کی بابت پوچھا تو میں نے انہیں بتلایا۔" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ "تمہاری گزر اوقات کیسی ہے؟" تو میں نے بتلایا۔ "ہم بہت

اچھی حالت میں ہیں۔"

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پوچھا۔ "انہوں نے کسی بات کی تلقین بھی کی؟"

بیوی نے کہا۔ "ہاں۔۔۔ وہ آپ کو سلام کہتے تھے اور آپ کو حکم دیتے تھے کہ اپنے دروازے کی دہلیز کو برقرار رکھیں۔"

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا۔ "وہ میرے والد تھے اور دہلیز سے مراد تو ہے' انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھے اپنے پاس ہی رکھوں۔ (اپنے سے علیحدہ نہ کروں)"

پھر جب تک اللہ نے چاہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کچھ عرصہ ٹھہرنے کے بعد پھر تشریف لائے۔ اسماعیل علیہ السلام زمزم کے قریب ایک درخت کے نیچے تیر درست کر رہے تھے۔

جب اسماعیل علیہ السلام نے ان کو دیکھا تو کھڑے ہو کر ان کی طرف بڑھے' پھر وہی احترام و محبت کا معاملہ کیا۔ جس طرح باپ' اولاد کے ساتھ اور اولاد' باپ کے ساتھ کرتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔

"اے اسماعیل علیہ السلام! اللہ نے مجھے ایک بات کا حکم دیا ہے۔"

اسماعیل علیہ السلام نے کہا۔ "آپ کے رب نے آپ کو جس بات کا حکم دیا ہے' وہ کریں۔"

انہوں نے پوچھا۔ "تو میری مدد کرے گا؟"

انہوں نے کہا۔ "میں آپ کی مدد کروں گا۔"

حضرات ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ "اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں یہاں ایک گھر تعمیر کروں۔"

اور ایک ٹیلے کی طرف اشارہ فرمایا جو اردگرد کے حصوں سے بلند تھا۔ چنانچہ اسی وقت اس خاص گھر کی دیواریں اٹھائیں۔ اسماعیل علیہ السلام پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے اور ابراہیم علیہ السلام اس سے تعمیر کرتے' یہاں تک کہ جب دیواریں اونچی ہو گئیں تو (مقام ابراہیم والا) پتھر لائے اور وہاں رکھا۔ پس ابراہیم علیہ السلام اس پر کھڑے ہو کر تعمیر کرتے اور اسماعیل علیہ السلام ان کو پتھر پکڑاتے جاتے اور دونوں کی زبانوں پر یہ دعا تھی۔"

"اے ہمارے رب! ہمارا یہ عمل قبول فرما' یقیناً" تو بہت سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

ایک اور روایت میں (واقعے کا ابتدائی حصہ اس طرح) ہے کہ حضرت ابراہیم' اسماعیل اور ان کی والدہ کو لے کر نکلے۔ ان کے ساتھ ایک مشکیزہ تھا۔ جس میں پانی تھا۔ پس اسماعیل کی والدہ مشکیزے سے پانی پیتیں تو بچے کے لیے ان کی چھاتی میں دودھ خوب اترتا' یہاں تک کہ وہ مکہ آگئے۔

یہاں حضرت ابراہیم نے ان کو ایک بڑے درخت کے نیچے بٹھایا۔ پھر ابراہیم اپنے گھر والوں کی طرف لوٹے تو اسماعیل علیہ السلام کی والدہ بھی ان کے پیچھے چلتی رہیں' یہاں تک کہ جب وہ کدا جگہ پر پہنچے تو حضرت ہاجرہ نے ان کو پیچھے سے آواز دی۔

"اے ابراہیم! ہمیں کس کے سپرد کر کے چھوڑ چلے ہو؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "اللہ کے۔"

والدہ اسماعیل علیہ السلام نے کہا۔ "میں اللہ کے سپرد کیے جانے پر راضی ہوں۔"

اور واپس چلی گئیں اور مشکیزے سے پانی پیتی رہیں اور بچے کے لیے ان کی چھاتی میں دودھ اترتا رہا۔ یہاں تک کہ جب پانی ختم ہو گیا تو (دل میں) کہا۔ "میں (ادھر ادھر) جاؤں اور دیکھوں تو شاید کوئی آدمی نظر آجائے۔"

راوی نے بیان کیا۔ چنانچہ وہ گئیں اور صفا پہاڑی پر چڑھ گئیں اور خوب نظر دوڑائی کہ کیا کوئی نظر آتا ہے۔ لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ (پھر نیچے اتریں) جب اتر گئیں تو دوڑیں اور مروہ پہاڑی پر چڑھ گئیں۔

اس طرح کئی چکر لگائے۔ (دونوں پہاڑوں کے درمیان) پھر (دل میں) کہا۔ میں جا کر بچے کو تو دیکھوں۔ اس نے کیا کیا۔ (اس کا کیا حال ہے؟) پس گئیں اور دیکھا تو وہ اسی حال میں تھا۔ گویا کہ وہ زندگی کی آخری سانس لے رہا ہے۔ چنانچہ ان کے نفس نے قرار نہیں پکڑا۔ (اور وہ زیادہ بے چین ہو گئیں) اور سوچا۔ میں (پھر) جاؤں اور دیکھوں۔ شاید کسی کو پالوں۔ وہ پھر گئیں اور صفا پہاڑی پر چڑھ گئیں اور خوب دیکھا۔ لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ سات چکر پورے کر لیے' پھر سوچا کہ جاؤں اور بچے کو دیکھوں کہ اس کا کیا حال ہے۔

وہاں آئیں تو اچانک ایک آواز کان میں پڑی۔ تو انہوں نے کہا۔ "اگر تیرے پاس کوئی بھلائی ہے تو مدد کر۔" وہاں جبریل علیہ السلام موجود تھے۔ انہوں نے اپنی ایڑی زمین پر ماری۔ چنانچہ زمین سے پانی پھوٹ پڑا۔ جسے دیکھ کر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ حیرت زدہ ہو گئیں اور اپنی ہتھیلیوں سے پانی سمیٹ کر مشکیزے میں ڈالنے لگیں اور راوی نے حدیث پوری تفصیل سے بیان کی۔

یہ ساری روایات امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے بیان کی ہیں۔

فوائد و مسائل

1۔ اس میں ایک تو صفا مروہ کے درمیان سعی کرنے کے تاریخی پس منظر کی وضاحت ہے کہ حج و عمرہ کا یہ رکن حضرت ہاجرہ کے اس واقعے کی یادگار کے طور پر اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔ جو اس حدیث میں بیان ہوا ہے۔ کیونکہ انہوں نے محض اللہ کی رضا کے لیے اللہ کے حکم پر اپنے شیر خوار بچے سمیت ایسی بے آب و گیاہ سرزمین پر رہنا قبول کر لیا تھا۔ جہاں کسی انسان کا نام و نشان تھا نہ کھانے پینے کا کوئی بندوبست۔ اللہ نے اس کا حسن صلہ یہ عطا فرمایا کہ ایک تو ان کے لیے زمزم کا چشمہ جاری فرما دیا جو وقتی طور پر ان کے لیے چشمہ آب حیات ثابت ہوا اور اس کا فیض عام اب تک جاری ہے۔ دوسرے' صفا اور مروہ کے درمیان ان کی بے تابانہ دوڑ کو حج اور عمرے کا رکن بنا دیا' تاکہ ہر حاجی اور عمرہ کرنے اس کو دہرائے اور قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے۔

2۔ خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہاتھوں سے ہوئی۔

3۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا پسندیدہ اور اس کے برعکس طرز عمل ناپسندیدہ ہے۔

4۔ رضائے الٰہی سے بے اعتنائی پر اگر باپ اپنے بیٹے کو بیوی کی بابت کہے کہ اسے طلاق دے دے تو بیٹے کو باپ کی اطاعت کرتے ہوئے ناشکری بیوی کو اپنے سے جدا کر دینا چاہیے۔

☆

باصلاحیت فنکارہ

اریج فاطمہ سے ملاقات

شاہین رشید

نازک کومل اور اچھے قد کاٹھ کی فنکارہ "اریج فاطمہ" کو اس فیلڈ میں آئے ہوئے تقریباً" ڈیڑھ دو سال ہی ہوئے ہیں مگر اس فنکارہ نے بہترین پرفارمنس سے اور اپنے اخلاق و کردار سے جگہ بنائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اریج فاطمہ آپ کو ہر وقت اسکرین پر نظر آتی ہے۔ کبھی کمرشلز میں تو کبھی ڈراموں میں۔

"ہر وقت اسکرین پہ رہنا کیسا لگتا ہے۔؟" ہم نے دعا و سلام کے بعد پہلا سوال کیا۔

"بہت اچھا لگتا ہے۔۔۔ اور سچ بتاؤں مجھے تو اپنے آپ کو زیادہ دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ لیکن جب میں کسی اہم جگہ پر جاتی ہوں اور وہاں پر کمرشلز چل رہے ہوتے ہیں تو جب میں اپنے آپ کو دیکھتی ہوں تو بہت اچھا لگتا ہے۔ ایک عجیب خوشی سی محسوس ہوتی ہے۔"

"اور لوگ آپ کو۔۔۔ مڑ مڑ کر دیکھتے ہوں گے۔ کیا کہتے ہیں جب ملتے ہیں تو؟"

"بہت عزت، بہت پیار سے ملتے ہیں اور بے ساختہ کہتے ہیں ارے آپ تو اسکرین پہ بڑی نظر آتی ہیں جبکہ آپ تو بہت چھوٹی ہیں۔ تو میں کہتی ہوں کہ میں اصل میں بھی چھوٹی ہی ہوں۔ اور یہ تو واقعی حقیقت ہے کہ اسکرین آپ کو اپنی عمر سے دو چار سال بڑا ہی دکھاتی ہے۔"

"آپ بتا رہی ہیں کہ آپ عمر میں بھی چھوٹی ہیں تو کچھ بتائیں اپنے بارے میں؟"

"جی میری پیدائش 2 نومبر 1989ء کی ہے تو آپ خود سوچ لیں۔ یہ بھی بتاؤں کہ مجھے سب پیار سے "اریج" اور "بیا" بولتے ہیں جبکہ میرا اصلی نام "اریبہ فاطمہ جعفری" ہے۔ اور یہ بھی بتادوں کہ میں "یو ایس اے" میں پیدا ہوئی۔ اور دو بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ اس لیے لاڈلی بھی ہوں۔"

"ہوں۔ گڈ۔ دونوں بھائی بڑے ہیں کیا۔؟ اور "یو ایس اے" میں پیدا ہونے والی لڑکی پاکستان میں کیوں رہ رہی ہے؟"

(خوبصورت ہنسی کے ساتھ) "پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایک بھائی مجھ سے بڑے ہیں ایک چھوٹا۔ اور میں اپنے دونوں بھائیوں اور والدین کی لاڈلی ہوں۔۔۔

دوسری بات یہ کہ میں پاکستان میں کیا کر رہی ہوں تو الحمد اللہ پاکستان میں میرے دادا دادی ہیں اور میرے کزن وغیرہ بھی ہیں تو مجھے بہت مزا آرہا ہے یہاں رہ کر اور یہاں کام کر کے۔"

"آپ نے بتایا تھا کہ آپ ایک "این جی او" چلانے کی نیت سے پاکستان آئی تھیں۔ تو کیا اب وہ کام پس پشت چلے گئے؟"

"ارے نہیں۔ ایسا کچھ نہیں۔ "این جی اوز" چلانا میرا مشن ہے اور میں اس پر کام کر رہی ہوں۔ مجھے ایک "یتیم خانہ" کھولنا ہے اور بچوں کے لیے کام کرنا ہے۔ کیونکہ میں نے چائلڈ سائیکلوجی میں بیچلر کیا ہے۔ اس کام میں دیر اس لیے ہو رہی ہے کہ میں پہلے اسٹیبلش ہونا چاہتی ہوں، مالی طور پر تھوڑی اسٹرانگ ہونا چاہتی ہوں، پھر ان شا اللہ بھرپور طریقے سے کام کروں گی۔ ایسا کچھ نہیں کہ میں پیچھے ہٹ گئی ہوں۔"

"والدین خوش ہیں آپ سے؟ اور والدین کیا کرتے ہیں؟"

"والدین بہت خوش ہیں میری شہرت سے۔ میری پرفارمنس سے، میرے کام سے اور سچ بات تو یہ ہے کہ اگر والدین اور بھائیوں کا تعاون نہ ہوتا تو بھلا میں کیا کر سکتی تھی ــــــ اور والدین کے بارے میں بتاؤں کہ میری امی کا تعلق "ایران" سے ہے اور والد کا تعلق پاکستان سے ہے۔ دونوں "یو ایس اے" میں رہتے ہیں والد جاب کرتے ہیں جبکہ امی گھر کی ذمہ داریاں سنبھالتی ہیں۔ دونوں بھائی بھی یو ایس اے میں ہی ہوتے ہیں۔ ہمارا آنا جانا لگا رہتا ہے۔"

"شادی کب کرنی ہے؟"

"وہ بھی ہو جائے گی۔ منگنی تو ہو چکی ہے۔ والدین کی پسند سے ان شا اللہ شادی بھی جلدی ہو جائے گی۔ میرے منگیتر میرے کزن بھی ہیں۔"

"شوبز میں انجوائے کر رہی ہو۔ اور آمد کیسے ہوئی؟"

"بالکل جی۔۔۔ بہت مزے آرہے ہیں بہت انجوائے کر رہی ہوں۔ جب کام اپنی مرضی کا ہو تو مزا کیوں نہیں آئے گا۔ اس فیلڈ میں اپنے چاچو کی وجہ سے آئی اور مجھے نہیں پتا تھا کہ اس فیلڈ میں کامیابیاں میری منتظر ہیں۔"

"واقعی۔ کس نے پہچان دی اور کس طرح آگے بڑھیں آپ؟"

"سب اوپر والے کی مہربانیاں۔ پہلا کمرشل کیا تھا اور یوں شوبز میں آنے کی ابتدا ہوئی تھی۔ ایک ٹیلی کام کمپنی کا کمرشل تھا اور صرف ایک لائن ہی بولنی تھی۔ اس کے بعد ڈرامہ سیریل "ہزار داستان" میں کام کرنے کی آفر آئی۔ تین بہنوں یا یوں کہہ لیں کہ تین بیٹیوں کی کہانی تھی اور زیبا بختیار نے ہماری ماں کا کردار کیا تھا۔ ایک سیریل "سبز قدم" میں چھوٹا سا رول ملا تھا جس میں میں نے نیگیٹو رول کیا تھا۔ اور پہچان مجھے ڈرامہ سیریل بلکہ سوپ "مر جائیں ہم تو کیا" نے دی۔ اور "ایک پاگل سی لڑکی" نے دی۔"

"امریکہ سے آئی ہوئی لڑکی کو اردو بولنی کیسے آئی۔ سیکھی یا گھر کا ماحول ایسا تھا کہ اردو بولی جاتی تھی؟"

"بس دیکھ لیں۔۔۔ اصل میں گھر میں تو ہم انگریزی

ہی بولتے تھے' اردو تو مجھے بس ٹوٹی پھوٹی ہی آتی تھی..... اور جب یہاں آئی تو مجھے بہت مشکل ہوئی' مگر پھر آہستہ آہستہ آہی گئی۔ شروع شروع میں ڈائیلاگ بولنے میں مشکل ہوتی تھی۔ بہت مشکل سے بولتی تھی۔ مگر زبان ہمیشہ سیکھنے سے نہیں بولنے سے پریکٹس کرنے سے آتی ہے۔ سو مجھے بھی آگئی۔ اور اب تو آپ دیکھ ہی رہی ہیں کہ میں کتنی اچھی اردو بول رہی ہوں۔"

"ابتدا میں ہی آپ نے ایک سیریل میں نگیٹو اور ایک سیریل میں "ینگ ٹو اولڈ" کیا۔ ڈر نہیں لگا کہ کہیں مخصوص نہ ہو جاؤں۔"

"نہیں بالکل بھی ڈر نہیں لگا۔ کیونکہ سب میرے بارے میں جانتے ہیں۔ ینگ ٹو اولڈ تو کردار کا ایک حصہ تھا۔ ہاں اگر میں ابتدا میں ہی اولڈ کردار کرتی تو شاید مشکل ہوتی۔ "میرے ہم نشیں" میں میں نے یہ رول کیا تھا اور فائزہ حسن نے بھی تو ینگ ٹو اولڈ کیا تھا۔ ہاں نگیٹو رول میں ڈر لگتا ہے کہ اگر لوگ پسند کرنے لگیں تو کہیں ایسے ہی رول نہ ملنے لگ جائیں۔ اس لیے ذرا احتیاط کرتی ہوں۔ سبز قدم میں نگیٹو رول ابتدا میں تھا بعد میں وہ پوزیٹیو ہو جاتا ہے۔"

"نگیٹو رول میں ___ مقبولیت کے زیادہ چانس ہوتا ہے___ اور یہ بتاؤ کہ اپنا بڑھاپا دیکھ کر کیسا لگا؟"

قہقہہ___ "اپنا بڑھاپا؟___ اچھا لگا۔ اچھی لگوں گی بڑھاپے میں۔ کافی بردبار اور گریس فل۔ اور جہاں تک نگیٹو رول کی بات ہے تو ایسا نہیں کہ میں نگیٹو رول بالکل نہیں کروں گی' ضرور کروں گی مگر ہمیشہ نہیں کبھی کبھی۔ اور ہاں آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ میری خواہش کہ مجھے "ساس" کا رول کرنے کو ملے۔"

"اچھا ___ ساس کا___ کیسی ساس لڑاکا یا مظلوم؟"

ہنستے ہوئے___ "کوئی سا بھی___ بس ساس کا رول ہو___"

"میں نے دیکھا ہے کہ آپ زیادہ تر شلوار قمیص یا کرتا اور چوڑی دار پاجامہ پہنتی ہیں' وجہ؟ یہ کردار کا حصہ ہوتا ہے کیا۔"

"سچ بتاؤں جو ڈریسز ہمیں پہننے کو ملتے ہیں' وہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں آتے' اس لیے زیادہ تر ڈریسز میں اپنے ہی پہنتی ہوں۔ اور مجھے چونکہ چوڑی دار پاجامہ زیادہ پسند ہے۔ اس لیے پھر میں وہ ہی زیادہ پہنتی ہوں۔"

"آج کل ریہرسل وغیرہ کا تو رواج رہا نہیں۔ تو پھر آپ کیا کرتی ہیں۔ سیٹ پر جاکر تھوڑی ریہرسل کرتی ہیں یا بس کرلیا جو ذہن میں آیا؟"

"نہیں ایسا نہیں ہے کہ جو ذہن میں آیا کرلیا۔ تو باقاعدہ ریہرسل کرتی ہوں۔ سیٹ پہ بھی اور اپنے گھر میں شیشے کے سامنے بھی۔ جب سے میں نے کام شروع کیا ہے' مجھے اس کام میں اتنا مزہ آرہا ہے کہ اداکاری میرا جنون بنتی جارہی ہے۔ اور جب تک میں خود مطمئن نہیں ہو جاتی پریکٹس نہیں چھوڑتی۔"

"اس فیلڈ میں آکر کیا محسوس کیا اچھی یا بری۔ لوگ کیسے ہیں؟"

"دیکھیں فیلڈ کوئی بھی ہو۔ اس میں اچھائی اور برائی تو ہوتی ہی ہے۔ اس لیے صرف شوبز کو الزام نہیں دے سکتے۔"

"گویا اداکاری مشکل کام ہے۔ تو ماڈلنگ؟"

"محنت دونوں میں ہے اور میں محنت سے نہیں گھبراتی۔ مگر پھر بھی ماڈلنگ میں میں شروع ہی سے اپنے آپ کو ایزی محسوس نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ دیکھا جائے تو ماڈلنگ میں پیسہ بہت ہے مگر پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ اپنی پسند اور ناپسند بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ لیکن خیر اب تو عادت ہو گئی ہے۔"

"پیسہ جمع کرتی ہیں یا اڑا دیتی ہیں؟"

"ہرگز نہیں اڑاتی___ پیسہ کمانا آسان نہیں ہے پیسہ اڑانا آسان ہے۔ مگر میں یہ آسان کام نہیں کرتی۔ میرے والدین کی تربیت ایسی ہے کہ ہمیں فضول خرچی کی عادت نہیں ہے۔ کیونکہ وقت اور حالات کا کچھ پتا نہیں ہوتا' اس لیے انسان کے پاس اپنی سیونگ ضرور ہونی چاہیے۔"

"لوگ تعریف کرتے ہیں یا ایمانداری کے ساتھ تھوڑی تنقید بھی کرتے ہیں؟"

"سچ بتاؤں۔ مجھے تو تعریف ہی سننے کو ملتی ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی ڈرامہ سیریل "میری بیٹی" ختم ہوا ہے' اس میں میرے کردار کو بہت پسند کیا گیا۔ اور یہ کردار تھا بھی بہت اچھا۔ مجھے کرنے میں مزا آیا۔ تنقید اب نہیں ہوتی' شروع شروع میں ہوتی تھی۔ اور مجھے لگتا تھا کہ واقعی یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ مجھے اداکاری کب آتی تھی۔ اب تو شکر ہے کہ اللہ نے اپنا کرم کردیا ہے۔"

"آپ نے بتایا کہ شروع شروع میں اردو نہیں آتی تھی تو ڈائریکٹرز اور سینئرز کا رویہ کیسا ہوتا تھا؟"

"سینئرز نے تو کچھ زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کی۔ کچھ تو صاف کہہ دیتے تھے کہ یہ ایک مشکل فیلڈ ہے آپ کو کچھ کرنا نہیں آتا یا آپ کو وقت لگے گا' مگر ڈائریکٹر مجھ سے خوش تھے اور ایک ڈائریکٹر نے تو کہا کہ آپ دیکھئے گا کہ ایک دو سال میں آپ ایک بہترین اداکارہ کہلائیں گی۔"

"اور ایسا ہی ہوا..... ہے نا۔"

"جی بالکل..... میں تو اپنی تعریف نہیں کروں گی۔ لیکن مجھے اچھا لگتا ہے جب لوگ میری تعریف کرتے ہیں۔"

"اس فیلڈ میں جگہ بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟"

صرف اور صرف محنت اور اپنے کام سے کام۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اس فیلڈ میں اپنے آپ کو منوانا پڑتا ہے۔ مگر بہت محنت کے ساتھ۔"

"آنے والے سیریلز میں کیا کیا ہے؟"

"آنے والے سیریلز میں "ایک پل زندگی ہے تو" اور مزید دو اور ڈرامے بھی ہیں مگر ابھی ان کے ناموں کا انتخاب نہیں ہوا۔"

"ملک سے باہر اپنی عمر کا زیادہ حصہ گزارنے والوں میں دو خصوصیات بہت نمایاں ہوتی ہیں۔ ایک ایمان داری دوسری وقت کی پابندی۔ ہمارے ملک میں دونوں کا فقدان ہے۔ مسئلہ ہوا؟"

"بالکل ہوا___ ایمان داری تو اتنی آڑے نہیں آتی البتہ وقت کی پابندی کے معاملے میں خاصی پریشانی ہوئی۔ کیونکہ میں تو اپنی روٹین کے مطابق وقت پر ہی جاتی تھی' مگر وہاں کوئی موجود ہی نہیں ہوتا تھا تو بڑی شرمندگی سی ہوتی تھی' پھر مجھے بتایا گیا کہ یہاں پر جو لوگ وقت کی پابندی کرتے ہیں وہ بے وقوف کہلاتے ہیں۔"

"تو پھر چھوڑ دی عادت؟"

"ہرگز نہیں۔ میں کیوں اپنی عادت خراب کروں۔ میں تو اپنے حساب سے ہی چلتی ہوں۔ تو اب یہ ہے کہ جب کام اسٹارٹ ہونے لگتا ہے اس سے کچھ دیر پہلے مجھے بلایا جاتا ہے۔"

"فیوچر پلاننگ کیا ہے؟ ڈائریکشن یا پروڈکشن؟"

"آپ کو پتا ہی ہے میری فیوچر پلاننگ کیا ہے۔ انشاء اللہ این جی او ہی چلانی ہے۔ نہ ڈائریکشن کی طرف خیال ہے اور نہ ہی پروڈکشن کی طرف۔"

"جب اداکاری سے زیادہ واقفیت نہیں تھی اس وقت کے ڈرامے اب دیکھتی ہو تو کیسا لگتا ہے؟"

"ہنسی آتی ہے۔ لگتا ہے کہ میں نے بہت برا کام کیا ہے۔ مگر پھر دل کو تسلی ہو جاتی ہے کہ اگر میں نئی تھی تو کیا ہوا۔ ڈائریکٹر تو مجھے ہوئے تھے انہوں نے جیسا کہا ویسا کیا۔ پھر اچھا کام کیا تو مزید آفرز آئیں۔ ورنہ نہ آتیں۔"

"تم سے کس نے کہا کہ تھوڑی سی موٹی ہو جاؤ۔"

"لوگ بھی کہتے ہیں اور مجھے خود بھی احساس ہے۔ اور اب تو پہلے سے کافی بہتر ہو گئی ہوں۔ ہر چیز کھاتی ہوں مگر ہڈی کچھ ایسی ہے کہ اس پہ گوشت چڑھتا ہی نہیں ہے۔"

"کہاں جانے کے لیے کبھی سستی نہیں دکھاتیں؟"

"بازار شاپنگ کے لیے۔ بہت انجوائے کرتی ہوں اور صرف ونڈو شاپنگ نہیں کرتی سچ مچ خریدتی ہوں۔"

"گھر آتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"

"کہ میک اپ اتاروں اور فریش ہو کر اپنے بستر پہ چلی جاؤں۔"

"گہری نیند سے اٹھنا کیسا لگتا ہے؟"

"بہت برا ـــــ جب کوئی گہری نیند سے اٹھادے تو بہت غصہ آتا ہے۔"

"غصے میں کیا رد عمل ہوتا ہے؟"

"کھانا پینا چھوڑ دیتی ہوں۔ رونا دھونا شروع کر دیتی ہوں۔"

"تہوار شوق سے مناتی ہیں؟"

"جی ـــ بہت شوق سے مناتی ہوں۔ امریکہ میں تھی تو تہوار منانے کا مزہ نہیں آتا تھا۔ لیکن جب سے پاکستان آئی ہوں' ہر تہوار مناتی ہوں۔ بلکہ جمعہ کا دن بھی خاص اہتمام سے مناتی ہوں اور اس دن خاص طور پر تیار ہو کر نماز پڑھنے کا بہت مزہ آتا ہے۔"

"اور کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"نہیں آپ نے سب کچھ تو پوچھ لیا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل	علینہ
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافر	موسیٰ رضا

دستک دستک دستک

شاہین رشید

غزالہ بٹ

"کیسی ہیں آپ ـــ؟"

"اللہ کا شکر ہے"

"کیا مصروفیات ہیں؟"

"بس آپ کو تو پتا ہی ہے ہم فنکاروں کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں بس وہ ہی مصروفیات میری بھی ہیں۔"

"لوگ آپ کو پسند کرتے ہیں۔ پھر کم کم کیوں آتی ہیں؟"

"میں ایک وقت میں ایک ہی پروجیکٹ کرتی ہوں اس لیے کم کم نظر آتی ہوں۔ اور ایک وقت میں ایک کام اس لیے کرتی ہوں' تاکہ بہت توجہ کے ساتھ کام کر سکوں۔ اور لوگ پسند کرتے ہیں یہ ان کی مہربانی ہے۔"

"جیو بند ہوا کئی پروجیکٹ بند ہو گئے۔"

"جی بالکل۔ بہت برا ہوا جیو کے ساتھ۔ ہمارا سوپ "ستارہ جہاں کی بیٹیاں" بھی اس کی نذر ہو گیا۔ دیکھیں کہ کب یہ آن ایئر ہوتا ہے۔"

"جب جیو کی سزا ختم ہو گی۔ اب کام کرنے کا انداز اور ماحول بہت بدل گیا ہے۔ آپ کو غصہ آتا ہے یا سب چلتا ہے؟"

"جی۔ واقعی ماحول اور انداز بہت بدل گیا ہے اور یہ بات میں ہی کیا' جتنے بھی سینئر لوگ ہیں سب محسوس کرتے ہیں۔ پہلے وقت میں لوگ محنت بہت کرتے تھے۔ اب ذرا محنت کا فقدان نظر آتا ہے۔ اب سب کو ہر کام کی جلدی ہوتی ہے۔"

"اس سے تو آپ کے نزدیک ڈرامے کے معیار پر بھی برا اثر پڑا ہو گا۔"

"اب سڑکیں سنسان کر دینے والے ڈرامے نہیں بن رہے ہیں۔ لیکن اتنے برے بھی نہیں بن رہے۔ لوگ اچھا کام کر رہے ہیں۔ ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ہمیشہ ایک جیسا ماحول نہیں رہتا۔ لیکن چونکہ ہم تھیٹر کے لوگ ہیں اور ذرا پرانے دور کے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے۔"

"آپ نے کہا کہ سڑکیں سنسان کر دینے والے ڈرامے نہیں بن رہے۔ مگر میں اس بات کو نہیں مانتی کیونکہ پہلے نہ صرف ایک ہی چینل تھا بلکہ لوگ بھی

فارغ ہوتے تھے۔"
"کیا مطلب لوگ فارغ ہوتے تھے۔۔۔ کیا ہمیں کوئی کام نہیں ہوتا تھا؟"
"ارے نہیں یہ مطلب نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ نہ موبائل فون' نہ انٹرنیٹ' نہ فیس بک اور نہ ہی Whats up۔ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ واحد تفریح ڈرامہ ہی ہوتا تھا۔"
"ہاں۔ یہ بات تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اس لحاظ سے تو واقعی ہم لوگ فارغ ہی ہوتے تھے۔ مگر پھر بھی ہر دور میں کوئی نہ کوئی مصروفیات نکل ہی آتی ہے۔"
"کتنے سال ہوگئے ہیں آپ کو اس دشت کی سیاحی میں؟"
"یہ اچھا جملہ استعمال کیا آپ نے جناب 1995ء سے اس فیلڈ میں ہوں اور نہ صرف اداکاری کی' بلکہ تھیٹر بھی کیا اور ریڈیو بھی کیا۔ ریڈیو کے ڈراموں میں صداکاری بھی کی۔"
"بے شمار کردار کیے۔ کوئی ایسا جس کو کرنے کی لگن ہو؟"
"جوانی سے اداکاری کا آغاز کیا اب بڑھاپے میں قدم رکھ لیا ہے تو ماشاء اللہ سے کردار تو میں نے سب ہی کرلیے ہیں۔ مگر وہ کہتے ہیں نا کہ فنکار کبھی اپنی اداکاری سے مطمئن نہیں ہوتا۔ تو یہی حال میرا ہے۔ مجھے ہمیشہ ہر کردار نیا ہی لگتا ہے۔ اور میں اسی طرح محنت کرتی ہوں جس طرح کوئی ایک نیا فنکار کرتا ہے۔"
"ہوں۔ گڈ۔ جوانی میں بھی اولڈ رول کیے۔ کیوں؟"
"کیوں کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ شاید مجھ میں جوانی سے ہی بوڑھی روح تھی۔ ایسا نہیں کہ مجھے جوانی والے رول ملتے نہیں تھے بلکہ مجھے خود ہی ینگ رول کرنا پسند نہیں تھا۔ مجھے اچھا لگتا تھا ماں کے اور نانی دادی والے کردار کرنا۔ کیونکہ ان کرداروں میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے کرنے کے لیے۔ جبکہ ینگ کردار تقریباً" ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اور مجھے کردار میں ورائٹی چاہیے ہوتی ہے۔"
"اب تو آپ سچ مچ نانی دادی ہوں گی۔ یہ کردار کیسا نبھا رہی ہیں۔"
"جی اب تو میں سچ مچ نانی دادی ہوں۔ اور یہ حقیقی رول کس طرح نبھا رہی ہوں تو یہ آپ کو ——— میرے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں ہی بتاسکتے ہیں۔ لیکن وہ ابھی چھوٹے ہیں۔ البتہ میرے بچے آپ کو بتاسکتے ہیں کہ میں کیسی نانی دادی ہوں۔"
"ماشاء اللہ سے کتنے بچے ہیں۔ اور کیا آپ سب مل کر رہتے ہیں۔"
"جی میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ اور تینوں کی شادی ہوگئی ہے بیٹے کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے اور جبکہ ایک بیٹی کے دو بیٹے ہیں اور دوسری بیٹی کی شادی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اور بیٹیاں تو ظاہر ہے کہ اپنے سسرال میں ہوتی ہیں اور ہم اپنے بیٹے کے ساتھ تو یوں سمجھ لیں کہ ہم مل جل کر جوائنٹ فیملی میں رہتے ہیں۔ اور میرے بچے اس فیلڈ میں نہیں ہیں۔"
"اچھا! بچے نہیں ہیں اس فیلڈ میں؟۔۔۔ جبکہ عموماً" اگر خاندان کا کوئی ایک فرد اس فیلڈ میں آجائے تو سب کے راستے کھل جاتے ہیں؟"
"ہاں جی ہوتا تو ایسا ہی ہے' مگر میرے بچوں کو اس فیلڈ میں آنے کا شوق کبھی ہوا ہی نہیں۔ بیٹیاں ویسے ہی بیاہی گئیں اور بیٹے کو دلچسپی ہی نہیں ہوئی۔ اور پتا نہیں کیوں میرا خود بھی دل نہیں چاہا کہ بچے اس فیلڈ میں آئیں۔ ورنہ میں فورس کرتی تو وہ کیوں نہ آتے۔"
"آپ کا دل کیوں نہیں تھا۔؟"
"ایک تو میں ان کا رجحان نہیں دیکھتی تھی' پھر اس فیلڈ میں محنت اور خواری بہت ہے۔ مجھے تو میرا جنون لے آیا اس فیلڈ میں۔ اگر بیٹے کا رجحان نہیں ہے تو میں کیوں زبردستی کرتی۔ ٹھیک ہے وہ اپنی چھوٹی سی فیملی اور دنیا میں بہت خوش ہے۔"
"سب سے پہلے آپ نے کس سیڑھی پہ قدم رکھا۔ ریڈیو' ٹی وی یا تھیٹر؟"
"میں نے پہلا قدم ریڈیو پہ رکھا اور اس سیڑھی کو کامیابی کے ساتھ عبور کرنے کے بعد میں نے ٹی وی کا رخ کیا بلکہ میں نے رخ نہیں کیا مجھے ٹی وی میں کام کرنے کی آفر دی گئی۔ اور اس کے بعد تھیٹر سے آفر آگئی۔ بس پھر ان کا سفر شروع ہوگیا۔ اور آج تک جاری ہے۔"
"آج کل صرف کام ہو رہا ہے یا گھریلو ذمہ داریاں بھی نبھائی جارہی ہیں؟"
"گھریلو ذمہ داریوں سے بھلا کیسے دور ہوسکتی ہوں۔ عورت کے لیے یہ ذمہ داریاں بڑی خوبصورت ہوتی ہیں۔ ہاں یہ ہے کہ پہلے میں ہی کھانا پکاتی تھی مگر اب بہو نے کافی حد تک یہ ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ میرے میاں صاحب کو میرے ہاتھ کا پکا بہت پسند ہے۔ اس لیے ان کے لیے اکثر کوکنگ میں ہی کرتی ہوں۔"

مدثر خٹک FM-104

"ہیلو کیسے ہیں آپ؟"
"جی اللہ کا شکر ہے۔ جو وقت اچھا گزر جائے۔"
"اب ابو ناراض تو نہیں ہوتے کہ کیوں ریڈیو پہ پروگرام کرتے ہو؟"
"نہیں۔۔۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب کچھ نہیں کہتے کیونکہ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرے ابو میرے سب سے بڑے فین تھے تو جب انہیں پتا چلا تو وہ بہت حیران ہوئے۔ اور کہنے لگے تم کب سے کر رہے پروگرام؟ میں نے بتایا تو کہنے لگے۔ مگر وہ تو کوئی "ارمان" لڑکا ہے۔ تو میں نے کہا کہ جی میں ہی ارمان ہوں۔ نام بدل کر اس لیے پروگرام کیا کہ کہیں آپ ناراض نہ ہوجائیں۔ خیر پھر سب کچھ ٹھیک ہوگیا۔"
"آپ کا پروگرام تو لائیو ہوتا ہے۔ اپنی آواز کیسے سنتے ہوں گے آپ؟"
"میں نے آج تک اپنی آواز نہیں سنی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنی آواز سن نہیں سکتا' بلکہ سچ بتاؤں مجھے اپنی آواز بہت بری لگتی ہے' اس لیے اپنے پروگرام نہیں سنتا۔"
"لوگوں کو آپ کی آواز پسند ہے۔؟"
"جی جی۔۔۔ بالکل۔ اس لیے تو آج تک پروگرام کر رہا ہوں۔ ورنہ کب کا چھوڑ چکا ہوتا۔ اور یہ میرا خود سے وعدہ ہے کہ جس دن میں نے اپنی آواز سن لی۔ میں پروگرام کرنا چھوڑ دوں گا۔"
"ارے۔۔۔! اتنی بری لگتی ہے اپنی آواز؟"
"جی اتنی ہی بری لگتی ہے مجھے اپنی آواز۔"
"اور اپنی کون کون سی عادت بری لگتی ہے؟"
"مجھ میں غصہ بہت تیز ہے اور یہ ایک بری بات ہے۔۔۔ ویسے عام طور پر غصہ آتا نہیں ہے۔ مگر آتا ہے تو خالص پٹھانوں والا آتا ہے۔ مگر یہ ایک اچھی عادت ہے کہ جب غصہ آتا ہے تو وہ جگہ چھوڑ دیتا ہوں۔ باقی ایسی کوئی بری عادت نہیں ہے۔"
"کھانے پینے میں نخرے دکھاتے ہیں؟"
"ارے بالکل بھی نہیں۔ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی کبھی ناشکری نہیں کرتا۔ سب کچھ مزے سے کھا لیتا ہوں۔"
"ریڈیو کے علاوہ فیوچر میں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"ہماری فیملی میں بزنس کا بہت رجحان ہے۔ تو اس لیے انشاء اللہ فیوچر میں میرا بھی ارادہ بزنس کرنے کا ہے۔ اور اس کے لیے میں انشاء اللہ ایم بی اے ان مارکیٹنگ کروں گا۔"

ڈاکٹر عائشہ گل

"کیسی ہیں ڈاکٹر صاحبہ!"

"جی الحمد للہ۔"

"ڈاکٹر کہلوانا اچھا لگتا ہے یا فنکارہ کہلوانا؟"

"دونوں۔ کیونکہ میں جنرل فزیشن ہوں یہ اور بات ہے کہ اس فیلڈ میں آکر میں اپنے پروفیشن سے دور ہو گئی ہوں۔ لیکن انشاء اللہ بہت جلد اس فیلڈ میں آکر پریکٹس کروں گی۔ اور فنکارہ کہلوانا تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے کیونکہ لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔"

"آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"

"بس وہی آپ کو پتا ہی ہے۔ بہت زیادہ کام نہیں کر رہی کچھ گھریلو مصروفیات کی وجہ سے۔ لیکن کچھ ہیں پروجیکٹ انڈر پروڈکشن جو انشاءاللہ جلد ہی آن ایر ہوں گے۔"

"ڈاکٹری پڑھتے پڑھتے شوبز میں آنے کا خیال کیسے آگیا؟"

"شاید اداکاری کے لیے ہی میرے رب نے مجھے پیدا کیا تھا اس لیے مجھے اتنی کامیابی ملی۔ اگر میں اس فیلڈ میں کامیاب نہ ہوتی تو یقیناً" واپس اپنی فیلڈ میں آجاتی۔ مگر ناظرین نے مجھے بہت محبت دی۔"

"صرف اداکاری تک محدود رہیں آپ یا کچھ اور بھی کیا؟"

"میں نے اداکاری کی فیلڈ میں سب کام کیے سوائے پروڈکشن اور ڈائریکشن کے۔ میں نے فلم میں بھی کام کیا۔ کمرشل ماڈلنگ اور میگزین ماڈلنگ بھی کی اور ریمپ پہ بھی اور کیٹ واک بھی کی۔ اور ڈراموں میں اداکاری چل ہی رہی ہے بلکہ سوائے کیٹ واک کے باقی تمام کام چل رہے ہیں۔۔۔ یہ فیلڈ میرا جنون ہے اور میں اس میں بہت آگے تک جانا چاہتی ہوں۔"

"ہوں۔۔۔ گڈ۔۔۔ کتنے سال ہو گئے اس فیلڈ میں۔۔۔ اور شہرت حاصل کرنا بھی جنون میں شامل ہو جاتا ہے۔۔۔ ایسا ہے؟"

"میں 2005ء میں اس فیلڈ میں آئی۔ تھوڑا عرصہ کام کیا اور پھر اسکرین سے غائب ہو گئی۔ کیوں کہ مجھے اپنی میڈیسن کی پڑھائی مکمل کرنی تھی۔ پڑھائی مکمل ہوئی تو پھر واپس اس فیلڈ میں آگئی۔ اور شہرت حاصل کرنا جنون نہیں تھا کیونکہ اگر اچھی پرفارمنس دوں گی تو شہرت تو خود بخود ہی مل جائے گی۔"

"ڈاکٹر بننا خواہشات میں شامل تھا۔ یا بس اچھے نمبر آگئے تو یہ لائن لے لی؟"

"دراصل میں میری والدہ ڈاکٹر تھیں اور میرے والد انجینئر۔ ان کی خواہش تھی کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک پروفیشن میں بھی اختیار کروں۔ چنانچہ میڈیسن میں میرے نمبر اچھے آگئے تو میں نے اس کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا اور ویسے بھی میڈیسن مجھے پسند تھی۔"

"اتنی مصروفیات میں گھریلو ذمہ داریاں بخوبی نبھا لیتی ہیں۔"

"الحمد اللہ۔ اللہ نے بہت باہمت بنایا ہے۔ گھر کی کوکنگ، سجاوٹ دیکھ بھال، اپنے میاں کا خیال رکھنا سب کچھ کرتی ہوں اور کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اور میں ہی کیا میرے میاں صاحب جو کہ ڈاکٹر ہیں، وہ بہت اچھے کک بھی ہیں، کبھی کبھی کچن کو ٹائم دیتے ہیں تو مزہ آجاتا ہے۔"

"پیسہ خرچ کرتی ہیں یا جمع۔"

"جمع؟۔۔۔ جمع کرنا تو میں نے سیکھا ہی نہیں ہے۔ بہت کھلے دل کی ہوں۔ بہت فراخ دلی سے خرچ کرتی ہوں۔ کیونکہ انسان کماتا کس لیے ہے۔"

"اور فرصت میں کیا کرتی ہیں؟"

قہقہہ۔۔۔ "فرصت ملتی ہی کب ہے۔"

☆

شعاع کے ساتھ

ادارہ

سنبل ملک۔۔۔ لاہور

1۔ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ان رسالوں کی دنیا میں قدم رکھے۔ اس کی وجہ ادب کی دنیا سے ناپسندیدگی ہرگز نہیں، بلکہ مہنگائی ہے، کیونکہ ہمارے ہاں کبھی کسی فرد کا مکمل سوٹ ایک مرتبہ میں نہیں آیا تو رسالے کہاں سے خریدے جاتے، 60 روپے گز کا کاٹن اور 60 کا رسالہ (60 کا رسالہ 10 روپے کمیشن لانے والے کے ستر اب تو دینے پڑیں گے) آتا ہے میں جاب کے سلسلے میں ایک آفس میں گئی تو وہاں ریک پر رکھے رسالے نظر آئے ان میں شعاع اور خواتین بھی تھے، رسالوں کا۔ ناولوں کا۔ اخبار پڑھنے کا نشہ تو شروع سے تھا مگر فری میں مل جائے تو کیا بات، انتظار کے دوران میں نے رسالہ بھی ختم کر لیا پھر تو جہاں بھی یہ ڈائجسٹ مجھے نظر آتے میں پڑھ لیتی۔ خیر اس میں ایسی بھی شرمندگی کی کوئی بات نہیں کیونکہ میں نے کتابیں بھی ادھار ہی لے کر پڑھا ہے۔ بی اے تک، چند کتابیں لے آتی پھر ان کے نوٹس بناتی پھر وہ دے کر اگلی لے آتی بس۔ وقت گزر گیا۔ ماما! پاپا مجھے آپ پر فخر ہے کہ آپ نے ہم چاروں بہن بھائیوں کو اتنی تنگی کے باوجود پڑھایا، لکھایا۔ اللہ پاک آپ کو عمر خضر عطا کرے، صحت وتندرستی اور سکون دے آمین۔

2۔ میں صبح سویرے اٹھ جاتی ہوں، فجر پڑھنے کے بعد قرآن مجید کی تلاوت پھر آٹا گوندھتی ہوں۔ اس کے بعد ماما کے ساتھ باہر کھیتوں میں واک کرنے جاتی ہوں۔ ایک گھنٹے کے بعد واپس آتے ہیں تو میں جاب پر جانے کی تیاری کرتی ہوں اور ماما پراٹھے بناتی ہیں۔ میں ناشتہ کرکے بھائی اور پاپا کے ساتھ ہی نکل جاتی ہوں جاب سے واپس آکر میں اور ماما دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں، کیونکہ میں اکلوتی بیٹی ہوں پھر نماز ظہر ادا کرکے ماما تھوڑا آرام کرتی ہیں تو میں رسالہ لے کر لیٹ جاتی ہوں اور دوپہر سے سہ پہر تک میں اور میرا رسالہ ہوتے ہیں (جناب جاب ملنے کے بعد میں اپنی پاکٹ سے رسالہ خریدتی ہوں) پھر رات کے کھانے کی تیاری، ساتھ ساتھ عصر، مغرب بھی ادا کی جاتی ہے آٹھ بجے تک ہم لوگ کھانا کھا لیتے ہیں، مجھے پکانے کا شوق ہے اور میں نئی نئی ڈشز بھی ٹرائی کرتی ہوں۔ جسے میرے پاپا بہت سراہتے ہیں۔ اس دوران ہی سارے گھر والے گپ شپ بھی کرتے ہیں۔

3۔ جی ہاں، بہت سی کہانیاں ایسی ہیں جن میں مجھے لگتا کہ یہ میرے کردار کی جھلک ہے جیسے متوسط طبقے کی ساری کہانیاں مجھے لگتی ہیں میرے متعلق ہیں۔ زیادہ تر میں خاموش رہتی ہوں مگر قریبی لوگوں کے ساتھ ہنسی مذاق بھی کرتی ہوں۔ رات کو چھت پر لیٹتی ہوں تو رب کائنات کے بارے میں سوچتی ہوں۔

تقریباً" ساری ہی تحریریں میری پسندیدہ ہیں۔ ہر تحریر میں کوئی نہ کوئی سبق ہوتا ہے پیغام ہوتا ہے، ہر تحریر سوچ کے نئے در وا کرتی ہے۔ پیر کامل۔ متاع جاں، جنت کے پتے۔ سدرۃ المنتہیٰ، آمنہ ریاض، سائرہ رضا، فرحت اشتیاق، نگہت سیما، بہت ہی زبردست ہیں البتہ مجھے رخسانہ نگار عدنان بہت بہت پسند ہیں کیا کبھی ان کا انٹرویو شامل ہو سکتا ہے؟

4۔ خامیاں بھی ہیں، خوبیاں بھی ہیں۔ خوبیاں زیادہ خامیاں کم ہیں۔ ابو کہتے ہیں تم کسی کی بات برداشت نہیں کرتیں۔ میرا چھوٹا بھائی کہتا ہے تم اگر ایک دفعہ کسی کو اچھا کہہ دو تو سب کچھ اس پر لٹا دیتی ہو چاہے وہ

تمہیں نقصان ہی پہنچائے۔ البتہ کبھی کبھی میں غلط نہ بھی ہوں تو خاموشی سے غلطی کو اپنے کھاتے میں ڈال لیتی ہوں۔ جلدی معاف کردیتی ہوں کیونکہ میں لڑائی جھگڑے بھول جاتی ہوں ہمیشہ منانے میں پہل کرتی ہوں۔ کام آنے والی ہوں بغیر کسی غرض کے' میری ماما میری بہترین دوست ہیں ہر چھوٹی بڑی بات ان سے کہہ کر مطمئن ہوجاتی ہوں۔

5 ۔بارش ہمیشہ سے ہی اچھی لگتی ہے اور بارش کو انجوائے بھی کرتی ہوں اگر جاب پر نہ ہوں تو پکوڑے یا سموسے ضروری بناتی ہوں۔ بارش میں بھیگنا ہوا کے ساتھ رقص کرنا اچھا لگتا ہے۔ جب ٹھنڈی ہوا گالوں کو چھو کر گزرتی ہے تو اک سکون سا محسوس ہوتا ہے۔

6 ۔بہت سارے شعر یاد ہیں یہ شعر میٹرک میں میری ٹیچر نے میری ڈائری پر لکھا تھا۔

رکھتے ہیں جو اوروں کے لیے پیار کا جذبہ
وہ لوگ کبھی ٹوٹ کر بکھرا نہیں کرتے

شبنم شمشاد۔یزمان

بہاولپور کے پیارے سے شہر یزمان سے تعلق ہے تو اس حوالے سے شہر یزمان بہت خوش قسمت ٹھہرا' (بھئی! میں جو ہوتی ہوں وہاں)

جہاں تک شعاع سے وابستگی کا تعلق ہے تو وہ تو شاید بچپن سے ہی ہوگئی تھی' تب جب لفظ پڑھنے تو آتے تھے لیکن ان میں چھپی تلخ حقیقتوں کا ادراک نہیں تھا۔ کچھ اپنی طبیعت کی وجہ سے میں باقاعدگی سے نہیں پڑھتی لیکن "کوئی لمحہ گلاب ہو" سے لے کر "مصحف" تک باخبر ضرور رہتی ہوں۔ سردیوں کی خنک راتوں میں اور گرمیوں کی گرم دوپہروں میں یہی تو ہے مشغلہ اپنا!

صبح کا آغاز تو ابو جی کی آواز سے ہوتا تھا لیکن 4 مئی کو ایک خوفناک حادثہ انہیں ہم سے بہت دور لے گیا۔ اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے (آمین)

اب یہ سیٹ امی نے سنبھال لی ہے وہ روایتی سی صبح' نماز اور اس کے بعد تلاوت! میں تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوں تو نماز وغیرہ سے فارغ ہوکے بس اپنے لیکچر دیکھ لیے اور میتھس کی اسائنمنٹس وغیرہ (مجھے کوئی عمر رسیدہ خاتون مت سمجھا جائے میں بیس سال کی ہوں) پورا دن ویسے ہی گزرتا ہے جیسے کوئی طالب علم یا ٹیچر گزار سکتا ہے' پڑھائی' لیکچرز اور بکس' شام میں ٹیوشنز' اپنی مصروفیات کی وجہ سے میں گھر کا کام نہیں کرپاتی۔

(بقول بہنوں کے مہمان جو ٹھہری) ہاں رات بس میری اپنی ہوتی ہے ایگزیمز سے پہلے تو پڑھائی کی ٹینشن ہوتی تھی اب راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ بس جاب اور دیگر مصروفیات اور دن' رات کی اسی کشمکش میں وقت بہت تیزی سے پر لگائے اڑ رہا ہے۔

رسالوں کے لیے ٹائم میں نکال لیتی ہوں' رات کو جب بہت دیر تک جاگوں یا پھر کالج میں بھی۔ بشرطیکہ پڑھنے کا موڈ ہو۔

3 ۔خامیوں اور خوبیوں کا مجموعہ ہے میری ذات' زینب کہتی ہے تم دل کی بہت اچھی ہو! ہاں بد لحاظ ہوجاتی ہو۔(اب جب سامنے بندہ ہی ایسا ہو تو؟؟)

ہاں میری اپنی نظر میں' میں جذباتی ہوں کچھ' ٹھہراؤ نہیں ہے میرے اندر' اور میں اپنی ذات کے بارے میں لاپروا بہت ہوں' خوبیاں یہ کہ محنتی ہوں اور بھی ہوں گی ڈھیر ساری!۔

تعریفی جملے بہت سارے ہیں جو میرے لیے سرمایہ ہیں اسپیشلی میتھس کے حوالے سے میری ٹیچنگ کے حوالے سے۔

ابو کہا کرتے تھے "شبنم بہت اچھی بیٹی ہے۔"

بارش مجھے نہیں پسند ہاں جب ضرورت ہو تب دل کرتا ہے بارش ہو ویسے نہیں۔ عجیب سیلن سی ہوجاتی ہے۔ ہاں یادگار واقعہ جب میں اور زینب برستی بارش میں اکیڈمی سے گھر آئے تھے وہ سارے لمحے بچپن کے جو تتلی بن کے اڑ گئے ہاں ان کے رنگ آج بھی ہتھیلیوں پر ہیں۔

بارش کی بنیاد میں جانے کس کے اتنے آنسو ہیں
صدیوں پہلے شاید کوئی' صدیوں بیٹھ کے رویا ہے

5 ۔پسندیدہ اقتباس کافی ہیں مگر یہ بہت پسند ہے۔

"دنیا کی مثال اندھیرے کی طرح ہے اور دین کی مثال روشنی جیسی ہے' اور ہمیں آگے اندھیرا اس لیے نظر آتا ہے' کیونکہ ہم دنیا کو آگے رکھنے کے عادی ہیں اور جب دنیا ہمیں رد کرتی ہے تب دین یاد آتا ہے' تو بات یہ ہوئی کہ ہم دنیا کے اندھیرے سے تھک کر اپنے اللہ کے پاس آتے ہیں اور پھر کچھ عرصے بعد دوبارہ دنیا میں کھو جاتے ہیں' استقامت نہیں ملتی ہمیں۔ کیونکہ ہمارے اعمال میں اخلاص نہیں ہے۔"

ایسا کچھ خاص تو اپنا کردار نہیں محسوس ہوا کبھی کسی میں' ہاں۔ ہر وہ لڑکی جو حساس ہو' محنتی ہو اور ہم لڑکیوں کے خمیر تو گندھتے ہی محبت سے ہیں۔ بس سارے کردار اپنے اپنے سے لگتے ہیں۔ پسندیدہ ناول بہت ہیں۔ مجھے مطالعے کا شوق ہے اس لیے کتابیں بہت پڑھی ہیں۔

دل کی دنیا بدلنے والا پیر کامل ہو یا پروین شاکر کی ہجر میں ڈوبی شاعری سب بہت پڑھا ہے۔ پسندیدہ شعر بھی بہت ہیں۔ بس ایک لکھ رہی ہوں میرا انتخاب کیسا لگا۔ ضرور بتایئے گا۔

سلجھا ہوا سا فرد سمجھتے ہیں مجھ کو لوگ
الجھا ہوا سا مجھ میں کوئی دوسرا بھی ہے

نور سحر.....چونیاں

(1) : شعاع سے وابستہ ہوئے قریباً" ایک دہائی کا عرصہ گزر چکا ہے اور یہ صرف وابستگی نہیں رہی دلبستگی بن چکی ہے اور اس حوالے سے دلچسپ واقعات تو بہت ہوا کرتے تھے جب زندگی دلچسپ ہوا کرتی تھی اب تو۔

اذیتوں کا دور ہے اور ہم ہیں دوستو

بابل کے آنگن میں جب ہوا کرتے تھے تو شعاع پڑھنے کی' منگوانے کی اتنی جلدی ہوتی تھی کہ کئی بار

ایسا ہوا کہ اگلی قسط جاننے کی بے چینی میں نیا مہینہ شروع ہونے کے پہلے ہی دن کسی کام والی یا کسی بچے کو نیا شعاع لینے بھیجنا تو نیا شمارہ نہ آیا ہونے کی صورت میں دکاندار نے پیسے بٹور کر پچھلے مہینے کا شمارہ ہی تھما دیا کرنا تو شعاع کے کئی شمارے ایک ہی مہینے کے ڈبل ڈبل آجایا کرتے تھے۔ اب تو تقریباً" یہ حال ہے کہ اپریل کا شمارہ جولائی میں اور جولائی کا ستمبر میں پڑھ رہے ہوتے ہیں بلکہ تازہ ترین واردات تو یہ ہے کہ شعاع پڑھنے پہ پابندی، کتاب پکڑنا جرم، شاعری لکھنا پڑھنا کسی پرانے عاشق کو یاد کرنے کی کوشش ٹھہرتی ہے سو یہ بھی دلچسپ واقعہ ہی ہوا ناں؟

(2) : صبح کا آغاز حق بندگی ادا کرنے کی کوشش سے ہوتا ہے۔ اس میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں یہ علم نہیں لیکن کوشش کرنا ہی ہمارے بس میں ہے اور اس کی ہمیں ترغیب دی گئی ہے جیسا کہ سورۃ بنی میں فرمان ربی ہے۔

"اور جو شخص آخرت کی بھلائی چاہتا ہو اور اسی کے لیے جیسے کوشش کرنا چاہیے ویسے کوشش کرے اور ایماندار ہو تو ایسے لوگوں کی کوشش خدا کی بارگاہ میں قبول ہوگی۔"

نماز تلاوت ذکر اذکار کے بعد کچھ دیر باہر کی ٹھنڈی فضا میں چہل قدمی کرتی ہوں۔ اس کے بعد حقیقی خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مجازی خدا کے احکامات کی تعمیل میں جو دوڑیں لگتی ہیں تو تب تک سہلا پہر گزر کر دوپہر ہونے کو ہوتی ہے۔ صاحب بہادر کی رخصتی عمل میں آنے کے بعد سے ان کی واپسی تک کے چند گھنٹے کسی حد تک میرے اپنے ہوتے ہیں آزادی کا ہلکا سا احساس رہتا ہے شام تک، کام بھی وہ سارے نمٹاتی ہوں جو شادی شدہ زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ شعاع کے لیے وقت تب نکلتا ہے جب اپنی گمشدہ جنت اپنے بابل کے دیس اپنی اماں کے آنگن میں قدم رکھتی ہوں تب میرا سارا وقت میرا اپنا ہوتا ہے۔ گزشتہ مہینوں کے شعاع و خواتین پڑھتی ہوں کتابوں کا مطالعہ کرتی ہوں ڈائری لکھتی ہوں بہنوں کے ساتھ باتیں، کہانیوں پہ تبصرے کرتی ہوں، بہت زیادہ اور اونچی آواز میں ہنستی ہوں اور ماں کی گود میں سر رکھ کر روتی ہوں۔

میرے مخلص اور سچے دوستوں میں میرا خدا میری ماں اور میرا شعاع، خدا تو ہے ہی صبور اور رہنما۔ ماں آنسو پونچھ کر پیار کرتی ہیں دعا دیتی ہیں تو شعاع جینے کی نئی راہیں دکھاتا ہے نئے حوصلے بخشتا ہے اپنے اوراق پہ بکھری مثالیں پیش کرتا ہے تو اس کے کردار اپنی زندگی کا حصہ محسوس ہوتے ہیں۔

(3) : نگہت سیما میری پسندیدہ مصنفہ ہیں ان کی تقریباً" ہر تحریر یاد رہتی ہے، محبت کی دھیمی دھیمی آنچ اچھی لگتی ہے ان کی تحریروں میں، خوب صورت آنکھوں گندمی رنگت اور لانبی انگلیوں والے آرٹسٹک ہاتھوں والی ہیروئن سب سے جدا ہے۔ نہ ہی نہایت حسینہ جمیلہ اور نہ ہی بہت بدصورت ہوتی ہے۔ خدیجہ، علیزہ اور اریب فاطمہ کی طرح اور سب سے بڑھ کر جذبہ حب الوطنی اپیل کرتا ہے اس حوالے سے ان کی تحریر "جس دیج سے کوئی مقتل میں گیا" بہت خوب اور یادگار تحریر تھی۔

سعدی حمید چودھری کی تحریروں میں آتش عشق میں سلگتی لڑکی سے بہت اپنا پن محسوس ہوتا ہے میں جتنا زیادہ سعدی کو پڑھنا چاہتی ہوں وہ اتنا ہی کم لکھتی ہیں "سب مایا ہے" ہمیشہ یاد رہے گی یہ کہانی۔

مجھے جلا کر بھسم کر دینے والا عشق اٹریکٹ کرتا ہے۔ سب مایا ہے اور عشق آتش (کنیز نبوی) میں بیان کیے گئے عشق کی طرح کا۔

کیوں کہ میرے خیال بھی اس شعر کے شاعر کے جیسے ہیں۔

اگر دل ہار ہی بیٹھے میرے ہم دم محبت میں
جزا کیسی، سزا کیسی، فنا کیسی، بقا کیسی

سعدیہ عزیز آفریدی بہت منفرد لکھتی ہیں ان کی زیادہ تر تحریریں حقیقی رشتوں کی محبت کی چاشنی میں

گندھی ہوئی ہیں جیسا کہ اماں کا شفو بہت زبردست تحریر تھی گو کہ اماں کا شفو۔ جیسے کردار حقیقی زندگی میں کم یاب ہیں مگر نایاب نہیں کہ یہ معاشرہ ان ہی جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی قائم ہے۔

سعدیہ عزیز اور سعدی حمید دونوں فلسفہ بہت زبردست لکھتی ہیں۔

مکمل طور پر اپنی جھلک کہیں بھی نہیں دکھی مگر کسی نہ کسی کردار میں کوئی نہ کوئی بات یا عادت اپنی ضرور دکھ جاتی ہے کیوں کہ یہ کہانیاں بھی ہم ہی لوگوں کی ہوتی ہیں کہ۔

افسانوں کی دنیا میں سب جھوٹ نہیں ہوتا۔

(4) : یہ سوال خاصا مشکل ہے جس کا آسان ترین جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ بلھا کی جاناں میں کون؟ (اپنی خوبیاں خامیاں خود بتانا آسان تو نہیں ناں!)

بہرحال کچھ نہ کچھ جواب دینے کی کوشش کرتی ہوں۔

لوگوں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بے وقوف بن جاتی ہوں اکثر، آنسو میری کمزوری ہیں۔ کسی سے لڑائی ہو جائے تو دل میں غصہ رکھ کر اسے بلا نہیں سکتی، دل میں زہر بھر جاتا ہے اس کے خلاف، پھر بولنا تو دور کی بات اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی کہ میرے لیے۔

منافقت کا نصاب پڑھ کر محبتوں کی کتاب لکھنا
بہت کٹھن ہے خزاں کے ماتھے پہ داستان بہار لکھنا!

پر اچھی چیز یہ ہے کہ نفرت میرے دل میں زیادہ ٹھہر نہیں پاتی۔ غصہ ختم ہو جائے تو صلح کرنے میں پہل کرتی ہوں اکثر معاف کر دیتی ہوں غلطی میری ہو تو احساس ہو جانے پر معافی مانگ بھی لیتی ہوں پھر انا کا مسئلہ نہیں بناتی! بچوں سے کتابوں پھولوں خوشبوؤں شاعری سے فطرت کی رنگینیوں سے پیار ہے۔

انسانوں سے نہیں انسانیت سے پیار ہے۔

(انسانوں میں اگر انسانیت نہ ہو تو ان سے پیار کیا بھی نہیں جا سکتا)

میرا المیہ یہ ہے کہ لوگ مجھ سے خوش نہیں رہتے یا یوں کہنا بہتر ہوگا کہ میں لوگوں کو خوش نہیں رکھ پاتی، میرے رشتہ دار اور دوست احباب (جو کہ نہ ہونے کے برابر ہیں) سبھی مجھ سے نالاں ہیں جس کی وجہ میرے خیال میں تو یہ ہے کہ میں کہہ دیتی ہوں (کہنے، نہ کہنے والی ہر بات) اور آج کے دور میں کہہ دینا ناقابل معافی جرم ہے کہ تو نے سچ بولنے کی جرأت کی، یہ بھی توہین ہے عدالت کی، قتل صرف جان سے مارنا ہی تو نہیں ہوتا۔ قتل لفظوں کے تیروں سے، لہجوں کی تلواروں سے، رویوں کی برچھیوں سے بھی تو ہوتا ہے سو روز جیتے ہیں روز مرتے ہیں۔

یہ پتھروں کا دور ہے رت ہے صلیب کی
جن کو ہو سر عزیز وہ ہٹ جائیں راہ سے

تعریفی جملہ؟

بہن کی نند کے میرے بارے میں یہ الفاظ (جو انہوں نے میری متوقع سسرال کے بارے میں سن کر میری بہنا سے کہے تھے)

"سچے موتی جیسی تمہاری بہن اور تمہارے ابو اسے کہاں پھنسا رہے ہیں وہ لوگ (موجودہ سسرال) تو اسے رول دیں گے۔"

یہ تعریف سن کر اچھا بھی لگا تھا اور دکھ بھی ہوا تھا، (کہ ان کا تجزیہ درست ثابت ہوا) پر مجھے کسی سے شکوہ نہیں کہ یہ فیصلے تو کہیں اور ہوتے ہیں۔

کوئی تو فیصلہ کرتا ہے پتھر کے مقدر کا
کسے ٹھوکر پہ رکھنا ہے کسے بھگوان ہونا ہے

(5) : ساون اور رم جھم برسات کا موسم مجھے بہت پسند ہے۔ پر برسات میں جب سیاہ گھٹاؤں کے ایک دم سے آکر نیلے آسمان کو ڈھک لینے کے نتیجے میں جو خوفناک سا اندھیرا چھا جاتا ہے ہر طرف، اس سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے وہ پراسرار تاریکی میرے دل میں خوف اور بے چینی بھر دیتی ہے میں تب تک بہت مضطرب رہتی ہوں جب تک بارش رک نہ جائے یا مطلع صاف نہ ہو جائے۔

تیز ہواؤں اور شوریدہ سر آندھیوں والی طوفانی بارش اچھی نہیں لگتی۔ دھیمی اور خاموش بارش اچھی

لگتی ہے جس میں بوندوں کے ٹپ ٹپ کے سوا کوئی آواز نہ ہو (گویا محبوب کے ہجر میں کوئی آنکھ برس رہی ہے) ساون رت کے حوالے سے چند سال پہلے کی ایک خوب صورت یاد دل پر نقش ہے۔ وہ میرا جنم دن تھا جب اس بات پر کہ "آج کسی کو میری سالگرہ یاد نہیں" باہر برسات اور اندر میری آنکھیں برس رہی تھیں دل اداسی سے بھر رہا تھا کہ چپکے سے میرے پیچھے آکر میری بہنوں نے ایک دم شور مچا دیا "ہیپی برتھ ڈے ڈیئر سسٹر" اور ساتھ ہی دونوں نے اپنا اپنا تحفہ مجھے پکڑایا۔ جب میں نے ان گفٹس کو کھولا تو دو خوب صورت ناول "بارِ وفا اور میرے دل میرے مسافر" ہاتھوں میں تھے۔ بہت سرپرائزنگ تھا یہ سب میرے لیے بہت اچھا لگا تھا بہنوں کا سالگرہ یاد رکھنا اور اتنی بہترین کتابیں تحفے میں دینا۔ جبکہ اس کے کچھ دیر بعد بارش میں نہانا اور اک دوجے کے پیچھے بھاگنا بھی یاد آرہا ہے۔ بے انت خوشی کے انمول لمحے تھے جو بیت گئے کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔ وقت گزر جاتا ہے وقت گزر رہا ہے پر ذہن و دل پر وہ نقش یادیں سنبھال رکھی ہیں کسی قیمتی سرمائے کی طرح۔ نہ وہ عمر لوٹ سکتی ہے نہ ہی گزرے ہوئے ساون کے وہ دن، پر تصویر کی صورت وہ یاد محفوظ ہے ذہن کے البم میں۔ جب جی چاہا نکال کر دیکھ لی۔

بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی، مگر مجھ کو لوٹا دو
بچپن کا ساون وہ کاغذ کی کشتی وہ بارش کا پانی

(6): پسند کے شعر تو بہت سارے ہیں لیکن سبھی لکھے تو نہیں جاسکتے، سو یہ چند ایک حاضر خدمت ہیں۔ جو پسندیدہ ترین کی لسٹ میں سے ہیں۔

ہمارا تذکرہ چھوڑو ہم ایسے لوگ ہیں جن کو
نفرتیں کچھ نہیں کہتیں، وفائیں مار دیتی ہیں

کیا ضرر کیا فائدہ کچھ رکھا نہیں حساب کبھی
عمر بھر اس دل کو لا حاصلی اچھی لگی

ہر اک گھر پہ مسلط ہے ویرانی دل کی
سارے شہر پہ سایہ میرے مکان کا ہے

اب یہ آخری شعر ان لوگوں کے نام، میں جن کی توقعات پر پورا نہیں اتر پاتی اور انہیں مجھ سے بہت شکوے ہیں۔

جو ہو سکے تو بھلا دینا رنجشیں دل کی
کہ محبتوں کا تقاضا ہے درگزر کرنا
تیرے طرزِ تغافل سے کیا گلہ ہم کو
ہمیں آتا ہی نہیں دلوں میں گھر کرنا

پسندیدہ کتابیں بہت سی ہیں مگر سب سے زیادہ قرآن مجید ہے جو کہ سب سے بڑھ کر بھی ہے۔ وہ نسخہ کیمیا جو نشانِ منزل ہی نہیں بلکہ مکمل ضابطہ حیات بھی ہے جس کو جتنا سمجھ کر اور گہرائی سے پڑھا جائے اس فانی دنیا سے دل اتنا ہی اچاٹ ہوتا جاتا ہے اور اس پر ہی عمل کر کے دنیا و آخرت میں سرخرو ہوا جا سکتا ہے۔ اقتباسات بھی اسی کتاب ہدایت میں سے۔

"مال اور بیٹے دنیاوی زندگی کی آرائش ہیں اور تیرے پروردگار کے نزدیک باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں ثواب میں اور بہتر ہیں آرزو رکھنے میں۔" (سورۃ کہف)

"اور اگر اللہ بندوں کو ان کی نافرمانیوں پر جھٹ پکڑ لیا کرے تو زمین پر ایک جاندار باقی نہ چھوڑے مگر وہ ان کو ایک مقررہ وعدے تک مہلت دیتا ہے جب ان کا وقت آن پہنچتا ہے تو ایک لمحہ آگے یا پیچھے نہیں ہو سکتے۔" (سورۃ نحل)

"اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اللہ کی رحمت سے ناامید وہی ہوتے ہیں جو منکر ہیں۔" (سورۃ یوسف)

"جو کوئی اللہ سے ڈرے اور صبر کرے تو اللہ نیک لوگوں کا حق برباد نہیں کرتا۔" (سورۃ یوسف)

☆

رخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً بیٹا بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو جاتے ہیں۔

عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی

رخصتی کی بات کرتی ہیں۔وہ سب پریشان ہوجاتے ہیں۔عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

حمیدہ خالہ' عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ دوران عدت انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے' سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور وہیں چھوڑ کر فرار ہوجاتا ہے۔

رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہوجاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہوکر سو اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔اس کا ابارشن ہوجاتا ہے۔عدیل شرمندہ ہوکر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہوکر پاکستان آجاتا ہے۔عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کرکے اس کے سارے راستے بند کردیے ہیں اور اب مفرور ہے۔بہت کوششوں کے بعد ہاشم' عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔

بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کردیتی ہے۔دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔عدیل سخت پریشان ہے۔عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروادیتا ہے اور کچھ دنوں بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔ بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔مثال بیمار پڑجاتی ہے۔بشریٰ بھی حواس کھودیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کرلے آتا ہے۔عدیل عمران پر اغوا کا پرچا کٹوادیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کرلیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔اچانک ہی فوزیہ کا کہیں رشتہ طے ہوجاتا ہے۔

انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بجھا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل' مثال کو لے جائے' تاکہ وہ بشریٰ کی کہیں اور شادی کرسکیں۔دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔فوزیہ کی شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔

انسپکٹر طارق' ذکیہ بیگم سے بشریٰ کا رشتہ مانگتے ہیں۔ذکیہ بیگم خوش ہوجاتی ہیں' مگر بشریٰ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔ایک پراسراری عورت عاصمہ کے گھر بطور کرائے دار رہنے لگتی ہے۔وہ اپنی حرکتوں اور انداز سے جادو ٹونے والی عورت لگتی ہے۔عاصمہ بہت مشکل سے اسے نکال پاتی ہے۔

بشریٰ کا سابقہ منگیتر احسن کمال ایک طویل عرصے بعد امریکا سے لوٹ آتا ہے۔وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشریٰ سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کرلیتا ہے' پھر شادی کے ناکام ہوجانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آجاتا ہے اور دوبارہ بشریٰ سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔بشریٰ تذبذب کا شکار ہوجاتی ہے۔

بشریٰ اور احسن کمال کی شادی کے بعد عدیل مستقل طور پر مثال کو اپنے ساتھ رکھنے کا دعوا کرتا ہے مگر بشریٰ قطعی نہیں مانتی' پھر احسن کمال کے مشورے پر دونوں بمشکل راضی ہوجاتے ہیں کہ مہینے کے ابتدائی پندرہ دنوں میں مثال' بشریٰ کے پاس رہے گی اور بقیہ پندرہ دن عدیل کے پاس۔گھر کے حالات اور نسیم بیگم کے اصرار پر بالآخر عدیل عفت سے شادی کرلیتا ہے۔والدین کی شادی کے بعد مثال دونوں گھروں کے درمیان گھن چکر بن جاتی ہے۔بشریٰ کے گھر میں سیفی اور احسن اس کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور عدیل کے گھر میں اس کی دوسری بیوی عفت۔مثال کے لیے مزید زمین تنگ' بشریٰ

اور عدیل کے نئے بچوں کی پیدائش کے بعد پڑجاتی ہے۔مثال اپنا اعتماد کھو بیٹھتی ہے۔احسن کمال اپنی فیملی کو لے کر ملائیشیا چلا جاتا ہے اور مثال کو تاریخ سے پہلے عدیل کے گھر بھجوادیتا ہے۔دوسری طرف عدیل اپنی بیوی بچوں کے مجبور کرنے پر مثال کے آنے سے قبل اسلام آباد چلا جاتا ہے۔مثال مشکل میں گھر جاتی ہے۔پریشانی کی حالت میں اسے ایک نشئی تنگ کرنے لگتا ہے تو عاصمہ آکر اسے بچاتی ہے۔پھر اپنے گھر لے جاتی ہے۔جہاں سے مثال اپنے ماموں کو فون کرکے بلواتی ہے اور اس کے گھر چلی جاتی ہے۔

عاصمہ کے حالات بہتر ہوجاتے ہیں۔وہ نسبتاً "پوش ایریا" میں گھر لے لیتی ہے۔اس کا کوچنگ سینٹر خوب ترقی کرجاتا ہے۔اسے مثال بہت اچھی لگتی ہے۔مثال' واثق کی نظروں میں آچکی ہے تاہم دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔

عاصمہ کا بھائی ہاشم ایک طویل عرصے بعد پاکستان لوٹ آتا ہے اور آتے ہی عاصمہ کی بیٹیوں اریشہ اور اریبہ کو اپنے بیٹوں وقار' وقاص کے لیے مانگ لیتا ہے۔عاصمہ اور واثق بہت خوش ہوتے ہیں۔

مثال کو نیند میں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اسے گھسیٹ رہا ہے۔

انیسویں قسط

وہ بہت خاموشی سے گھر کے کاٹھ کباڑ سے اٹے اسٹور بنے کمرے کی صفائی میں جتی ہوئی تھی۔اس نے سارا بھاری ہلکا کاٹھ کباڑ کمرے سے باہر نکال دیا تھا۔

اسے یاد تھا۔مرنے سے کچھ ماہ پہلے عفت نے نسیم کو اس چھوٹے سے ایک کھڑکی والے تنگ کمرے میں شفٹ کروادیا تھا۔

"امی! آپ کا کمرا ہمارے بیڈ روم سے کافی فاصلے پر ہے' جبکہ یہ کمرا ہمارے بیڈ روم کے پیچھے ہے لیکن قریب ہے۔رات میں آپ آوازیں دیتی رہتی ہیں اور مجھے پتا نہیں چلتا۔اس کمرے سے مجھے آپ کی آواز صاف سنائی دیا کرے گی۔میں نہ سہی عدیل تو سن ہی لیا کریں گے۔"عفت نے بہت چالاکی اور صفائی سے نسیم کا کشادہ کمرا پری کو دیتے ہوئے عمر رسیدہ ساس کو یوں طریقے سے بہلایا تھا۔

یہ الگ بات کہ نسیم کی آواز رات تو کیا دن میں بھی گھر کے افراد کم ہی سن پاتے تھے۔سن بھی لیتے تھے تو ان سنی کردیتے تھے۔

مثال جن دنوں یہاں ہوتی' وہ نسیم کی فل ٹائم اٹینڈنٹ ہوتی تھی۔ نسیم کی دیکھ بھال کی وجہ سے اکثر عفت اس سے بہت سے کام نہیں کہہ پاتی تھی۔ نسیم کو پرانی باتیں دہرانے اور دہراتے چلے جانے کی عادت تھی۔جن میں مثال کی ماں کی باغی طبیعت اور فسادی فطرت جیسے بھولے بسرے سارے فسانے ہوتے تھے جنہیں مثال کے لیے سننا مشکل ہوتا۔مگر وہ کان لپیٹے کوئی کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھی رہتی۔

اسے آج رات بھر سوچ سوچ کر اپنے باپ کے گھر میں رہنے کے قابل یہی کمرا لگا تھا۔

جب وہ پندرہ دنوں کے لیے آتی تھی تو عفت اسے کبھی برآمدے میں سلادیتی' کبھی اوپر والے اسٹور میں۔کبھی عدیل کے سامنے دکھاوا کرنا ہوتا تو پری کی منت کرکے اسے پری کے کمرے میں میٹرس لگا کر سونے کی اجازت مل جاتی۔

اور دانیال تو مثال سے عداوت کے معاملے میں بہن سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔وہ چودہ' پندرہ سال کی عمر میں سب گھر والوں سے الگ مزاج کا تھا۔

انتہائی غصیلا' خود غرض' ضدی اور جھگڑالو' بنس سے پنگا لینے کی ہمت عفت میں بھی نہیں ہوتی تھی۔
عدیل کے سامنے وہ کچھ دبا رہتا۔ کم گو اور لا تعلق۔
اس کے کمرے میں جانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ وہ پری اور ماں کو بھی اس جرات پر رگید کر رکھ دیتا تھا
چودہ' پندرہ سال کا لڑکا اس پورے گھر میں دہشت کی علامت تھا۔ صرف یہی ایک کمرا تھا جو نچلے پورشن کے بالکل اختتام پر تھا اور گھر میں فالتو تھا۔
"کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔ کیوں آتے ہی گھر میں اٹھا پٹخ لگا دی ہے تم نے۔ کیا ان کے گھر سے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر آئی ہو۔" اور تن دہی سے دیواریں جھاڑتے مثال کے ہاتھ وہیں ٹھٹک کر رک گئے۔
عفت نے کتنا درست اندازہ لگایا تھا۔
ڈراؤنا خواب ہی تو تھا وہ سب جسے وہ بھلا دینا چاہتی تھی۔ لیکن کیا ایسا ممکن تھا۔ شاید کبھی نہیں۔
"ٹھیک کہا آپ نے بہت ڈراؤنا خواب دیکھا ہے میں نے۔" وہ پھر سے اطمینان کے ساتھ دیواریں جھاڑنے لگی۔
"کیا مطلب؟" عفت اس کے لہجے پر ٹھٹکی۔
"دادو آئی تھیں میرے خواب میں۔" وہ اب دروازہ اور کمرے کی اکلوتی کھڑکی کو پوری طاقت کے ساتھ جھاڑ رہی تھی۔
ایک تو اس کے ساتھ بڑے بڑے تین سیاہ بیگ دیکھ کر ہی وہ خوف زدہ ہو گئی تھی' اوپر سے اس لڑکی کے انداز!
"کہہ رہی تھیں۔ تم لوگوں نے میرے کمرے کو کباڑ خانہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ میں اس کمرے میں تھوڑی بہت جتنی بھی ہو سکتی تھی' اللہ کی عبادت کیا کرتی تھی۔ اس کباڑ کی وجہ سے وہ بھی مجھ تک نہیں پہنچ پا رہی۔" مثال پوری سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔
عفت کی آنکھوں میں الجھن بڑھ گئی۔
"کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔" وہ جھلا کر اس کے دروازے کے پاس پڑے ہوئے خوب پھولے بیگوں کو پاؤں کی ٹھوکر سے چیک کرتے ہوئے کوفت سے بولی۔
"دادو کی عبادت اس کمرے میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ اسے باہر نکلنے کا رستہ نہیں مل رہا۔ دادو نے خواب میں آ کر میری منت کی ہے کہ جب تک یہ کمرا خوب صاف نہیں ہو جاتا' اس میں کوئی بسیرا۔۔۔ آئی مین۔۔۔ کوئی رہنے نہیں لگ جاتا۔ ان کی عبادت یہیں پھنسی رہے گی اور اس کا ثواب بھی انہیں نہیں مل سکے گا اور وہ ہماری اس سستی کی وجہ سے ہو سکتا ہے عذاب میں ہوں۔"
عفت کا جی چاہا' اسے دونوں ہاتھوں سے پیٹ ڈالے۔
"کمینی نے کیسی کہانی گھڑی ہے' عدیل تو اس بکواس پر فوراً ہی ایمان لے آئے گا۔"
ابھی تک وہ ماں کو یوں یاد کرتا تھا' جیسے وہ ابھی بھی موجود ہوں۔
"یہ تھیلے بھر بھر کر سامان کیوں لے کر آئی ہو؟ کیا ماں نے دھکے دے کر نکال دیا ہے ہمیشہ کے لیے۔" عفت بہت دیر تک اپنے تجسس کو چھپا نہ سکی۔
"ایسا ہی ہوا ہے اس بار۔" مثال نے گہرا سانس لے کر تنقیدی نظروں سے صاف دیواروں' دروازے اور کھڑکی کو دیکھا۔ فرش پر اب صرف دھلائی کا کام رہ گیا تھا۔ پھر یہ کمرا مکمل طور پر اس کو اپنانے کے لیے تیار تھا۔
"آپ اتنی اچھی ہیں' اتنی مہربان اور خیال رکھنے والی۔۔۔ میں جہاں بھی جاتی ہوں۔۔۔ آپ کی نیک طبیعت کا

چرچا کرنے سے خود کو روک نہیں پاتی۔" اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔
عفت کو اس پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ مگر ابھی وہ برداشت کرنا چاہتی تھی۔
"تم یہ سب کیوں لے کر آئی ہو؟" وہ دانت پیس کر بولی۔
"مما نے مجھے اپنے شوہر کے گھر سے نکال دیا ہے۔" وہ چہرے پر زمانے بھر کی مظلومیت سجا کر بولی۔
"کیونکہ میں نے ان کے منہ پر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ آپ سے اچھی تو میری عفت مما ہیں' جو میرا بہت خیال رکھتی ہیں اور وہ مجھے اپنی پری سے بڑھ کر چاہتی ہیں اور اہمیت دیتی ہیں تو میری سگی ماں کو جیسے آگ لگ گئی۔ میرا سامان اٹھا کر گھر سے باہر پھینکا اور صاف کہہ دیا کہ جاؤ اپنی عفت مما کے ساتھ ہی رہو ہمیشہ کے لیے۔ سو میں آ گئی فی الحال تو یہ سب لے کر۔۔۔" وہ دونوں بازو جھٹکتے ہوئے خود کو مطمئن ظاہر کرتے ہوئے بولی۔
عفت تو یوں ششدر سی کھڑی رہ گئی' جیسے اس نے کسی بہت قریبی عزیز کے مرنے کی خبر سن لی ہو۔
"تو۔۔۔ تم۔۔۔ اب واپس۔۔۔ پندرہ دن بعد بھی۔۔۔ واپس نہیں جاؤ گی۔" وہ اڑی رنگت کے ساتھ بمشکل بولی۔
مثال نفی میں سر ہلا کر ٹب میں موجود پانی اور سرف فرش پر بہا کر بڑی تندہی سے جھاڑو لگانے لگی۔
وہ عفت کے سر پر بم پھوڑ چکی تھی۔ عفت کی حالت اب کیا ہو گی۔ اسے اس میں دلچسپی نہیں تھی۔
اسے صرف پاپا کا رد عمل جاننا تھا۔ وہ جانے اس بات کو کیسے لیں گے۔

☼ ☼ ☼

"تم۔۔۔ یہاں۔۔۔ آپ۔۔۔" عدیل اتنے برسوں بعد بشریٰ کو اپنے سامنے دیکھ کر لمحہ بھر کو تو کچھ بول ہی نہیں سکا تھا۔
اور پھر بولا تو یہ تین بے ربط سے الفاظ۔
بشریٰ کچھ کہے بغیر خاموشی سے اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔
اس کے چہرے پر اتنی گہری چپ اور ایسی وحشت تھی' جیسے وہ کچھ بولے گی تو شاید رو ہی پڑے گی۔
اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ بال یوں چہرے کے ارد گرد اڑ رہے تھے' جیسے انہیں کئی دنوں سے سلجھایا نہ گیا ہو۔ کہیں براؤن' کہیں سیاہ اور کہیں جھلکتی سفیدی۔۔۔ خشک۔۔۔ بے رونق بال بشریٰ کی بے توجہی کا اعلان کر رہے تھے۔
عدیل نے بشریٰ کو کبھی خود سے یوں لاپروا نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنا بہت خیال رکھا کرتی تھی۔
اس نے دونوں ہاتھ آپس میں جکڑ رکھے تھے۔ بڑھتی عمر کا اعلان کرتی ہاتھوں میں نیلی سبز رگیں ابھری ہوئی تھیں۔
اس کی گردن کی ہڈی بہت نمایاں تھی اور جبڑے رخساروں میں یوں نمایاں تھے' جیسے کئی دنوں سے اس نے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے۔ وہ عدیل کو بہت کمزور' مرجھائی ہوئی اپنی عمر سے کہیں بڑی نظر آنے والی عورت لگ رہی تھی۔
اس کے چہرے پر تھکن تھی۔ جیسے وہ اپنے گھر سے عدیل کے آفس تک پیدل چل کر آئی ہو۔
"تم۔۔۔ تم ٹھیک ہو نا۔" اس کی اتنی لمبی چپ نے عدیل کو ڈرا دیا۔
وہ کوشش کے باوجود خود کو اسے تم کہنے سے نہ روک سکا۔
"ایک گلاس پانی۔۔۔ مل جائے گا۔" وہ اسی طرح دونوں ہاتھ آپس میں جوڑے' چہرہ جھکائے کھردری آواز میں بولی۔

عدیل اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"یقیناً" کوئی بہت بڑی بات ہوئی ہے۔" وہ اسے دیکھ کر سوچنے لگا۔

"کہیں احسن کمال نے اسے چھوڑ تو نہیں دیا۔" برسوں پہلے کی دبی دبی سی خواہش کسی خدشے کی طرح سر اٹھا کر اس کے دل میں آئی۔

"نہیں... نہیں... اب نہیں... اس کے ساتھ کچھ ایسا برا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اس بار یہ ٹوٹی تو پھر شاید کبھی جڑ نہیں سکے گی۔" اس نے کانپتے دل کے ساتھ اس کے آگے پانی کا گلاس رکھ کر سوچا۔

بشریٰ ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گئی اور اس سارے درانیے میں اس نے پہلی بار عدیل کی آنکھوں میں دیکھا۔

جن میں اسے اپنے لیے وہی فکر اور پریشانی نظر آئی جو کبھی بشریٰ کو موسم بدلنے پر نزلہ زکام، بخار ہونے پر عدیل کی آنکھوں میں ہوتی تھی۔

دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھ کر نظر ہی چرا گئے۔ دونوں کی صدائیں تھیں یا بہت سی آوازیں جو دونوں کے ویران دلوں میں گونجی تھیں۔

"مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" بشریٰ بے بسی سے بڑبڑا کر رہ گئی۔

"سب ٹھیک تو ہے نا بشریٰ... تم... تمہارا شوہر... مثال!" عدیل اس کے پھر خاموشی میں ڈوب جانے پر کچھ بے چین ہو کر بولا۔

وہ ساکت سی بیٹھی تھی۔

"میں آج آپ سے ایک درخواست کرنے آئی ہوں عدیل!" بہت رک رک کر بہت سوچ کر جیسے پوری ہمت جمع کر کے وہ بولی۔

"کیسی درخواست... میرے پاس کیا ہے اب تمہیں دینے کے لیے۔" وہ پھیکے سے لہجے میں بولا۔ جس میں بہت کچھ کھو دینے کا پچھتاوا تھا۔ بشریٰ نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

عدیل نظروں چرا کر بلائنڈز سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کی شکایتی نظروں کی تلافی اب ممکن نہیں تھی۔

"میں احسن کمال... بچوں... اس کے دونوں بچوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے آسٹریلیا شفٹ ہو رہی ہوں۔"

ایک لمبی چپ کے بعد وہ پھر سے ہارے لہجے میں بولی اور عدیل کو یوں لگا جیسے اس کے آس پاس کوئی بم پھوٹا ہو۔

"اس کے دونوں بچوں..." وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"احسن کمال کے بیٹے سیفی اور آئینہ۔" بشریٰ نے اس کی استعجاب بھری سرگوشی سن کر شرمندہ سے لہجے میں وضاحت کی۔

"اور مثال..." وہ ایسا کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن جانے کیسے اس کے منہ سے پھسل گیا۔

بشریٰ کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔

مثال کے نام پر اسے لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے لیا ہو۔ وہ جتنی ہمت سے اتنا بڑا فیصلہ دل میں کر کے آئی تھی۔ اسے لگا وہ یہ فیصلہ جو عدیل کو سنائے گی تو اس کے بعد شاید وہ خود بھی زندہ نہیں رہ پائے گی۔

"وہ... میرے ساتھ... ہمارے ساتھ... نہیں جائے گی۔ وہ جانا نہیں چاہتی۔ اس نے ہمارے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا ہے۔" لمحہ بھر میں اس نے جملوں میں رد و بدل کیا اور دفاعی پوزیشن پر آ گئی۔

"میں نے اس سے بہت کہا، سمجھایا... کہ میں چاہتی ہوں وہ ہمارے ساتھ چلے۔ اسے چلنا چاہیے۔ وہاں اس

کے لیے ایک برائٹ سیکیور فیوچر ہوگا۔ بٹ... وہ تم سے... اپنے باپ سے اتنی دور نہیں جانا چاہتی۔

وہ بے ربطگی سے جلدی جلدی بولتی چلی گئی۔

حالانکہ وہ گھر سے یہی سوچ کر نکلی تھی کہ وہ عدیل کو سارا ماجرا سیفی کی ذلیل حرکت کا قصہ اور اپنی بیٹی کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور اپنی بے بسی... سب کچھ سچ سچ بتادے گی۔

لیکن جانے کیوں اتنے سالوں بعد اگرچہ دل مکمل طور پر عدیل پر بھروسا کرنا چاہ رہا تھا لیکن ایک دم سے اپنے بھرم کی خاطر اس نے خود کو یہ سب کہنے سے روک دیا۔

"اب تم کیا چاہتی ہو کہ میں مثال کو سمجھاؤں کہ وہ تمہارے ساتھ چلنے کے لیے راضی ہوجائے؟" عدیل نے سکون بھرے لہجے میں جواب دیتے ہوئے جیسے بشریٰ کی بساط ہی الٹ دی۔ وہ پریشان سی اسے دیکھنے لگی اور بے ساختہ اس نے نفی میں سرہلا دیا۔

عدیل نے اسے الجھ کر دیکھا۔

"تو... تم میرے پاس اور کون سی درخواست لے کر آئی ہو۔" اسے بشریٰ کے آنے کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔

"اتنے برس گزر گئے۔ یوں سمجھیں میں نے اپنی آدھی سے زیادہ عمر بتادی اور مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ عورت واقعی بہت کمزور، بہت بے بس ہے۔ وہ لاکھ خود مختار ہونے کا دعوا کرے۔" وہ گہرا سانس لے کر بے بسی سے اپنی بے چارگی کا اظہار کر گئی۔

"میں ابھی بھی نہیں سمجھا بشریٰ!" عدیل واقعی سمجھ نہیں پایا تھا، وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

بشریٰ پھر خاموش ہوگئی۔

جسے وہ بولنے کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب کر رہی ہو۔

"میں یہ جان چکی ہوں عدیل! کہ میں لاکھ مثال سے محبت اور ممتا کے دعوے کروں، میں اس کی حفاظت نہیں کرسکتی۔"

کچھ دیر پہلے جو اس نے کچھ نہ بتانے کا دل میں عہد کیا تھا۔ اس چھوٹے سے جملے میں کہہ گئی۔

عدیل کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔

"کیا مطلب؟" وہ بہت دیر بعد پوچھ سکا تھا۔ "کیا ہوا ہے مثال کو... بتاؤ مجھے۔ کسی نے اس کے ساتھ کچھ غلط کیا ہے؟" وہ ایک دم سے وحشت زدہ سا ہوگیا تھا۔

بشریٰ آنکھوں میں پانی لیے زور، زور سے نفی میں سرہلانے لگی۔

"اسے کچھ نہیں ہوا۔ لیکن میری خواہش... اور یہ ضروری ہے عدیل! کہ مثال اپنے باپ کی محفوظ چھت تلے رہے۔ میں جارہی ہوں۔ میں اس کا وہ خیال نہیں رکھ سکوں گی جو شاید ایک سگا باپ رکھ سکتا ہے۔ میں اس سے رابطے میں رہوں گی۔ اس کی ضرورت کا خیال رکھنے کی کوشش کروں گی۔ لیکن میری درخواست ہے پلیز! اسے اپنے پاس رکھ لیں اور اس کا بہت خیال رکھیں۔ وہ میرے بغیر تو رہ سکتی ہے، مگر وہ تمہاری جدائی نہیں سہ سکے گی۔ میں اسے اپنی خوشی اور رضا سے تمہارے حوالے کر رہی ہوں۔" کہتے کہتے وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

عدیل شاکڈ سا ساکت بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

"میں اس کی جدائی سہ لوں گی۔ جیسے بھی ہوگا اس کے بغیر جی لوں گی۔ مجھے یہ اطمینان ہوگا کہ وہ تمہارے پاس... اپنے باپ کے پاس بحفاظت ہے۔ تم اس کا خیال مجھ سے بہت بہتر رکھ سکتے ہو، رکھو گے۔"

کہہ کر خود کو کھینچتے ہوئے وہ مردہ قدموں سے عدیل کا جواب سنے بغیر دروازہ کھول کر جیسے آئی تھی اسی طرح چلی

گئی۔

عدیل ٹوگنگ تھا۔ نہ جانے بیچ میں کیا ہوا ہے۔ کیا احسن کمال... نے مثال کے ساتھ کچھ برا کیا؟

کسی سانپ کی طرح اس خدشے نے سر اٹھایا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر آفس کے باہر تک بشریٰ کے پیچھے گیا۔ مگر اس کی گاڑی دھول اڑاتی دور جارہی تھی۔

شاید وہ ٹھیک کہہ گئی ہے۔ جوان بیٹی کی جیسی حفاظت ایک باپ کرسکتا ہے کہ ایک لاچار ماں نہیں کرسکتی مگر مثال کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ ستون کے ساتھ ٹکا مضطرب سا ایک ہی بات سوچے جارہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سارا گھر ایک دم سے خالی ہوگیا تھا۔

اسے تو کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ بیٹیوں نے گھر کو کس طرح سے بھر رکھا ہے۔ گھر کی ساری آبادی جیسے ان کے دم سے تھی۔

سب طرف ایک گمبھیر خاموشی گہری چپ سی تھی۔

وردہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ بہت سارے دنوں کی تھکن جمع ہوگئی تھی۔ آرام کے لیے تو وہ بھی لیٹی تھی۔ ذرا سی دیر کو اس کی آنکھ لگی، مگر پھر وہ اٹھ کر باہر آگئی۔

واثق جاب کی تلاش میں نکلا تھا۔ پچھلے دنوں اسے جو عارضی نوکری چھ ماہ کے کنٹریکٹ پر ملی تھی، وہ پچھلے ہفتے ختم ہوچکی تھی۔

عاصمہ کی اکیڈمی میں بچے اب بہت کم رہ گئے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا تھا۔ کوئی ڈھنگ کی ٹیچر چند ہفتوں سے زیادہ ٹکتی ہی نہیں تھی۔ حالانکہ عاصمہ نے اپنی جیب سے ان کی تنخواہیں بھی بہت بڑھائی تھیں مگر انہیں کسی اور اکیڈمی سے اچھا پیکج مل جاتا تو وہ چپکے سے بغیر بتائے ہی چلی جاتیں۔

بار بار ٹیچرز بدلنے سے اسٹوڈنٹس اور ان کے والدین بہت ڈسٹرب ہوتے۔ یوں بھی اس کا اپنا دھیان بھی اکیڈمی کی طرف سے خاصا کم ہوگیا تھا۔ واثق کو جاب مل جاتی تو وہ اکیڈمی بند کرنے کا ہی سوچ رہی تھی مگر ابھی تو آمدنی کا یہی ایک ذریعہ تھا۔

"مما! آپ سوئی نہیں؟" وردہ جمائیاں لیتی اٹھ کر باہر آگئی۔

عاصمہ اسے دیکھ کر ذرا سا چونکتے ہوئے مسکرائی۔

اریبہ کی طرح وہ بھی قد کاٹھ میں دن بدن بڑھتی جارہی تھی یا شاید وردہ ان دونوں کی موجودگی میں عاصمہ کو نظر ہی نہیں آئی تھی اور اب ایک دم اسے لگا۔ وردہ فرسٹ ایئر پاس کرتے ہی ایک دم سے بہت بڑی ہوگئی ہے۔

عاصمہ نے کوئی جواب دیے بغیر اس کی طرف بانہیں پھیلائیں۔ وہ فوراً ماں کی بانہوں میں سماگئی۔

"مما! آپیوں کے جانے کے بعد کتنی خاموشی ہوگئی ہے گھر میں۔ وہ دونوں اتنا شور مچاتی تھیں کیا؟" وہ ماں کے سینے میں منہ چھپا کر شریر لہجے میں بولی۔

عاصمہ نے ہنستے ہوئے اس کے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی۔ دونوں پھر خاموش ہوگئیں۔

"مگر مما! ماموں تو کہہ رہے تھے، وہ پاکستان آجائیں گے کچھ مہینوں میں سب کو لے کر۔" وردہ کو کچھ دیر بعد خیال آیا تو سر اٹھا کر پوچھنے لگی۔

"مشکل ہے وردہ! تمہارے ماموں تو کئی سالوں سے یہی کہہ رہے ہیں۔ اب تو دونوں بیٹوں کی جاب بھی وہیں

ہے۔ گھر بھی نے چکے ہیں ادھر اور ہوئیں تو مل ہی گئیں۔" آخر میں وہ خود ہی مسکرانے لگی۔

"تو وہ اب بھی نہیں آئیں گے یہاں؟" وردہ کچھ پریشان ہو کر بولی۔

"اللہ نہ کرے۔ آنا تو ہے انہیں جلد یا بدیر' بلکہ ابھی تو میں سوچ رہی ہوں واثق کی جاب لگ جائے تو تمہارے فرض سے ایک دو سالوں میں سبکدوش ہو کر حج کے لیے جاؤں گی۔"

"خبردار مما! آپ نے ابھی میرے متعلق ایسی ویسی کوئی بات سوچی بھی تو۔ مجھے پڑھنا ہے ابھی اور بہت پڑھنا ہے' شادی۔۔۔ بالکل بھی نہیں۔۔۔ کم از کم پانچ چھ سال تو سوچیے بھی نہیں۔" وہ خطرناک تیوروں کے ساتھ ماں کو دھمکانے والے انداز میں بولی تو عاصمہ یوں ہی مسکرا کر سر ہلانے لگی۔

اسی وقت دروازہ کھول کر واثق آگیا۔

اس کے چہرے پر تھکن کے بجائے مسکراہٹ اور چمک سی تھی۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔" عاصمہ زیر لب کہتے ہوئے سر اٹھا کر بولی تو دونوں ماں کو دیکھنے لگے۔

واثق سلام کر کے ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

"مجھے لگتا ہے کوئی اچھی خبر ہے۔" عاصمہ یقین بھرے لہجے میں بولی۔

"اچھی سی چائے پلوائیں پہلے' پھر بتاتا ہوں۔" واثق جوتے اتارتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"اس کا مطلب ہے وہ خبر میرے سامنے نہیں سنائی جانے والی جو مجھے چائے بنانے کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔" وردہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

"بہت تیز ہو گئی ہے مما یہ۔" واثق ہنس کر بولا۔

"بھائی! بتائیں نا کیا بنا آپ کی جاب کا؟" وہ بے صبرے پن سے بولی۔

"بہنا جی! سمجھیں مل بھی گئی ہے اور نہیں بھی۔" وہ ٹانگیں سامنے پھیلا کر پرسکون انداز میں بولا۔

عاصمہ اور وردہ نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا۔۔۔ ملی ہے یا نہیں' ٹھیک بتائیں نا۔" وردہ کچھ منہ بنا کر بولی۔

"مما! میرا ایک کالج فیلو تھا۔ کالج کے دور میں تو اتنی دوستی نہیں تھی ہمارے درمیان' لیکن آج ملا تو بہت اچھا لگا۔ بہت نائس ہے وہ' میرے بارے میں پوچھنے لگا کہ کیا کر رہا ہوں آج کل' میرے بتانے پر کچھ دیر تو خاموش رہا' پھر اس نے مجھے جاب کی آفر کر دی۔"

"جاب کی آفر۔ آفس ہے اس کا یا کوئی کمپنی۔۔۔ امیر دوست ہے کیا آپ کا؟" وردہ اسی بے صبری سے پھر بولی۔

"ہاں ہے تو۔۔۔ فیکٹری ہے اس کی کافی بڑی۔۔۔ اسے فی الحال میری ضرورت ہے۔ کل جاؤں گا' دیکھوں گا کہ جاب کیا ہے' پھر فیصلہ کروں گا کہ کرنی ہے یا نہیں۔ اب چائے مل سکتی ہے یا نہیں۔"

وہ اٹھ کر جاتے ہوئے وردہ کے سر پر چپت لگا کر کہہ گیا۔

"یہ کیا پھسپھسی جاب ہوئی بھلا۔ ملنے پہ بھی ففٹی ففٹی۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

عاصمہ خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"کیا مطلب مما۔۔۔ یہ مثال آپی۔۔۔ اب کیا مستقل ہمارے سر پر پڑی رہیں گی۔ اب کبھی بھی اپنی ماں کے گھر نہیں جائیں گی۔ کیا مصیبت ہے یار!" پری بہت جھنجلائی ہوئی تھی۔ خوامخواہ کمرے کی چیزیں اٹھا پٹخ کر رہی تھی۔

اور یہ تو اب طے تھا کہ مثال اب ان لوگوں کے ساتھ ہی جائے گی۔ جس پر پاپا کی محبت کی اکیلی حصے دار پریشے پریشانی ہوئی تھی۔ عفت بالکل خاموش تھی۔

وہ پری کی شرٹ پر دھاگے سے بیل بنا رہی تھی۔

"آپ کچھ بول کیوں نہیں رہی ہیں۔ مجھے بہت غصہ آ رہا ہے۔ آپ پاپا کو فون کر کے بلائیں' انہیں کہیں فوراً" اس سے آکر بات کریں۔" عفت کی خاموشی اسے اور مشتعل کر گئی۔

"پری! تمہارے پاپا آنے والے ہیں۔ وہ راستے میں ہوں گے۔ تم اس طرح ری ایکٹ کرو گی تو شاید انہیں برا لگ جائے۔ بہر حال مثال بھی ان کی بیٹی ہے اور تم سے پہلے وہ اس کے بارے میں سوچیں گے' یہ ذہن میں رکھو۔"

عفت خلاف توقع بہت ٹھہر ٹھہر کر بظاہر سلجھے ہوئے صلح جو لہجے میں کہہ رہی تھی۔ پری ششدر سی رہ گئی۔

"آپ۔۔۔ آپ اسے ہمیشہ کے لیے قبول کر لیں گی اس گھر میں۔ وہ اب یہیں رہے گی۔ کبھی نہیں جائے گی کیا؟" وہ ماں کے سر پر آکر چلاتے ہوئے بولی۔ عفت اسے تاسف سے دیکھ کر رہ گئی۔

"ہر چیز کا نتیجہ فوراً" سامنے نہیں آتا۔ اپنے اندر تھوڑا ضبط پیدا کرو۔" نہ چاہتے ہوئے بھی عفت اسے نصیحت کر گئی' جبکہ جانتی بھی تھی کہ یہ موقع بہر حال نصیحت کا نہیں ہے۔

"میں اسے اور اس کے سامان کو اٹھا کر باہر بھی پھینک سکتی ہوں تو آپ اپنی یہ نیک نصیحتیں سنبھال کر رکھیں' اس وقت مجھے کچھ نہ کہیے گا۔" وہ عفت کی توقع سے زیادہ غصے میں آکر بولی۔

"پری۔۔۔ پری۔۔۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" عفت بوکھلا کر قمیص ایک طرف پھینک کر غصے میں جاتی پری کے پیچھے لپکی۔

"حد ہے۔ اس لڑکی کی ذرا جو صبر' برداشت ہو اس میں خوامخواہ ہی میں کوئی نیا تماشا کھڑا کرے گی۔ رکو۔۔۔ پری بات سنو میری بیٹا!" وہ اس کے پیچھے تک چلی گئی۔ مگر وہ ان سنی کرتی جا چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

مثال نے سخت تھکے ہوئے پیروں کو دونوں ہاتھوں سے سہلا کر انہیں کرسی پہ رکھا۔ جبکہ اس کے ہاتھوں میں بھی درد تھا۔

درد اپنی جگہ' مگر یہ چھوٹا سا کاٹھ کباڑ سے سجا کمرا اس قابل ہو چکا تھا کہ وہ اب باقی کے جتنے بھی دن خدا نے اس کے اس گھر میں رکھے تھے با آسانی گزار سکتی تھی۔ اگر اسے گزارنے دیے گئے تو۔۔۔

دادی کا پلنگ جھاڑ پونچھ کر جس قدر اسے صاف کر کے چمکایا جا سکتا تھا۔ مثال اسے چمکا کر کھڑکی کے ساتھ دیوار سے ذرا فاصلے پر لگا چکی تھی۔ پرانے پرنٹ کی گھسی ہوئی مگر صاف چادر تکیہ' پرانے میز پر اس کی کتابوں کا ڈھیر اور پلنگ کے نیچے اس کے تینوں سامان سے بھرے بیگ لگ چکے تھے۔

کمرے میں ایک ہی ٹوٹی پھوٹی الماری تھی۔ جس کے پٹ نہیں تھے۔

"پاپا کا موڈ اچھا ہو۔۔۔ کسی دن تو انہیں کہوں گی۔ اس الماری کے پٹ لگا دیں۔ میں اس میں اپنے کپڑے' جوتے وغیرہ رکھ لوں گی۔"

وہ اب دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں سہلا رہی تھی۔

وہ صبح سے کام میں لگی تھی اور اب نہ صرف بہت تھک چکی تھی۔ بلکہ اسے بھوک بھی لگی تھی۔

اور کسی نے اس سے جھوٹے منہ کھانا تو کیا چائے پانی کا بھی نہیں پوچھا تھا۔

اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اب جا کر اسے کچن میں بھی سارا کام کرنا پڑے گا تو ہی کھانے کو کچھ ملے گا۔ لیکن اب اس میں اٹھنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ وہ یوں ہی کسلمندی سے بیٹھی رہی۔

"تم یہاں مستقل آگئی ہو کیا مثال۔۔۔؟" پری اس کے پیچھے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑی تھی۔ کچھ دیر کھڑی کمرے کا جائزہ لیتی رہی۔ جس کا چند گھنٹوں میں نقشہ بدل چکا تھا۔ پھر بہت کڑوے کسیلے لہجے میں چبا کر بولی۔

مثال نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"کیوں تھک گئی تمہاری ماں تمہیں اپنے گھر میں رکھ کر یا اس کے دوسرے شوہر نے تمہیں دھکے دے کر نکال دیا۔ ایسا ہی ہوا نا مثال آپی تمہارے ساتھ وہاں؟" طنزاً "اس سے جب سخت ناگوار لہجے میں بات کرتی تھی تو آپی اور مثال کو بہت حقارت سے چبا چبا کر الگ سے ادا کرتی تھی۔

مثال خون میں اٹھتے ابال کو ضبط کرتی خاموش رہی۔

"سنا ہے تمہاری ماں کے دوسرے شوہر کا جوان بیٹا بھی ہے۔ کہیں اس کے ساتھ تو رنگ رلیاں مناتی رنگے ہاتھوں نہیں پکڑی گئیں تم۔" وہ کس قدر کمینی تھی۔ اس کا اندازہ مثال کو کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو ابھی اس جملے کے بولنے سے پہلے تک پری کو ایک معصوم چھوٹی بار بی ڈول جیسی بہن سمجھتی تھی۔ جس کو مثال نے گودوں کھلایا تھا اور عفت سے چھپ چھپ کر اسے بہت پیار کیا تھا۔ اپنی محدود سی پاکٹ منی سے اس کے لیے چاکلیٹس اور کینڈیز لایا کرتی تھی۔

وہ پری اس سے اتنی گندی گری ہوئی بات بھی کر سکتی ہے۔ مثال کبھی سوچ نہیں سکتی تھی۔

اگرچہ وہ بات تقریباً کچھ اسی طرح وقوع پذیر ہوئی تھی جیسے پری نے حقارت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ لیکن مثال کو یوں لگا جیسے کسی نے کیچڑ سے بھرا جوتا کھینچ کر اس کے منہ پر مار دیا ہو۔ اسے چاہنے کے باوجود غصہ بھی نہیں آیا۔ بس جیسے ڈھیر سارا نمک اس کے حلق میں گھل سا گیا۔

وہ پری کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ بلکہ وہ تو کسی کے بھی سامنے نہیں رونا چاہتی تھی۔ لیکن ہر بار اسے اس نہج پہ پہنچا دیا جاتا تھا کہ وہ سب کے سامنے رو ہی پڑے۔

"میں چائے بنانے جا رہی ہوں تم پیو گی۔" پیروں سے اٹھتی ٹیسوں کو دبا کر بدقت اٹھتے ہوئے بظاہر سپاٹ لہجے میں آنکھوں میں آئی نمی کو چھپا کر وہ رخ پھیرے جاتے ہوئے بولی۔ اس کی اس بے تکی آفر نے پری کو اور چڑا دیا۔ وہ تیزی سے پنجوں پر گھومی تھی۔

"کیا سمجھتی ہو تم خود کو۔۔۔ یوں بے پروا ظاہر کر کے ہم سب کو بے وقوف بنالو گی 'بتاؤ' وہاں ایسا کیا کر کے آئی ہو کہ انہوں نے تمہیں ہمیشہ کے لیے یہاں پھینک دیا ہے ہمارے سروں پر کسی مصیبت کی طرح۔" پری عفت نہیں تھی کہ بہت پلاننگ کے ساتھ اپنے بغض کو نرم لفظوں اور مبہم رویے کے پیچھے چھپا لیتی۔ وہ پری تھی جو ماں اور باپ کے لاڈ سے سر چڑھی تھی۔

"بتاؤ مجھے گونگی ہو کر آئی ہو کیا وہاں سے؟" وہ مثال کی ہنوز چپ پر اور بھی برافروختہ ہو کر چلائی۔

"پری! یہ گھر جتنا تمہارا ہے اتنا ہی میرا بھی ہے یہ مت بھولو تم اگر عدیل احمد کی چھوٹی بیٹی ہو تو میں ان کی بڑی بیٹی ہوں۔ ان کی محبت 'ان کے گھر 'ان کی ہر چیز کی پہلی حصے دار 'پہلی حق دار۔۔۔ اوکے۔"

پتا نہیں کس طرح اس نے اپنے دل کو سنبھالا تھا جو زور 'زور سے رونے پر آمادہ تھا اور وہ اسے سنبھال کر اتنے

روکھے لہجے میں بولی تھی کہ لمحہ بھر کو پری بھی اس کے ڈھنگ لہجے پر کچھ خائف سی ہو گئی۔

"بلیک میل کر رہی ہو مجھے 'میری ماں کو۔" پری اس کے جواب میں صرف یہی کہہ سکی۔

"نہیں 'صرف بتا رہی ہوں کہ میں جب جیسے میری مرضی 'میری خواہش ہو گی' میں اپنی ماں کے گھر رہوں گی یا اپنے باپ کے گھر۔۔۔ تم اس پر اعتراض نہیں کر سکتیں اور جب ہمیں ایک ہی گھر میں رہنا ہے تو بہتر ہے نہ تم مجھ سے بے وجہ الجھو اور نہ میں تم سے الجھوں۔ امن سے رہو 'امن سے رہنے دو' مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے۔ اور یہ مت سمجھنا کہ مجھے ماں کے گھر سے کسی نے نکالا ہے یا مجھے وہاں کوئی مسئلہ تھا۔ اصل میں مجھے پاپا نے زبردستی بلایا ہے۔ وہ اب یہ چاہتے ہیں کہ میں ہمیشہ کے لیے ان کے ساتھ آکر رہوں۔ اور کبھی کبھار اپنی ماما سے ملنے چلی جایا کروں اور اب اس طرح کے جو بھی قصے 'کہانیاں تمہارے دماغ میں آرہی ہیں' وہ تم پاپا کے آنے پر ان سے شیئر کر لینا کہ مجھے وہاں سے کیوں ادھر بھیجا گیا۔ وہ یقیناً" تمہیں کوئی تسلی بخش جواب دے سکیں گے' اوکے۔"

وہ بہت ٹھنڈے ٹھار لہجے میں سکون سے کہتے ہوئے اسے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔

اور پری جتنی بھی نادان ناسمجھ سہی اتنا تو وہ سمجھتی تھی کہ اس طرح کی بات پاپا سے کرنے کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اور وہ اتنی بھی بے وقوف نہیں تھی کہ ایسے گھٹیا سوال کر کے خود کو پاپا کی نظروں سے گراتی۔

"چلو 'میں بھی دیکھتی ہوں' کتنے دنوں تک تم پاپا کی گڈبک میں رہتی ہو۔ آپی مثال!" وہ پیچھے سے چیلنج کرنے والے انداز میں بولی تو مثال ان ہی قدموں پر ٹھٹک گئی۔

اس نے گردن موڑ کر پری کی نفرت بھری نظروں کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"نہیں۔۔۔ پاپا۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ نہ کوئی جھگڑا 'نہ کوئی ایسی بات۔"

وہ رات کے اندھیرے میں باپ کے سامنے سر جھکائے اپنی انگلیاں مسلتی مضطرب سی بیٹھی تھی۔

عدیل کی نظریں مثال کے چہرے پر جمی تھیں۔

اسے مثال کی بات سے اتفاق تھا نہ اس کی تسلی ہوئی تھی۔ مگر اس کے چہرے سے چھلکتا اضطراب اور آنکھوں میں جھانکتا خوف اس ان کہی کہانی کی تائید کر رہا تھا جو وہ شام میں بشریٰ کے لہجے سے اخذ کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

عدیل اس کی بات کے جواب میں بہت دیر سے چپ تھا۔

مثال نے آہستگی سے پلکیں اٹھا کر باپ کی طرف دیکھا۔ وہ کسی اور ہی سمت میں دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

"پاپا۔۔۔ اگر آپ کو اچھا نہیں لگ رہا میرا یہاں آنا تو۔۔۔ میں۔۔۔" وہ کچھ دیر بعد نم لہجے میں ادھورا سا جملہ بول کر خود کو کمپوز کرنے لگی۔

"تو کیا کرو گی 'کوئی تیسرا ٹھکانہ بھی ہے تمہارا؟" عدیل کے تلخ لہجے نے مثال کو گنگ سا کر دیا۔ اسے عدیل سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی۔

مگر عدیل بھی کیا کرتا۔ شام سے آفس سے آنے کے بعد اب رات کے کھانے تک اس نے جتنی بکواس عفت اور پری کی نہ ماننے والی ناراضی کو برداشت کیا تھا۔ اسے بخوبی آنے والے دنوں کی سختی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ عفت کبھی بھی مثال کو ہمیشہ کے لیے اس گھر میں برداشت نہیں کرے گی۔

اور پری، عفت ہی کی بیٹی ہے جسے اپنے اکلوتے ہونے کا اور ماں، باپ کے لاڈلے ہونے کا بہت زعم ہے۔
بھری محفل میں وہ اور عفت علی الاعلان کہتی تھیں کہ پریشے ان کی ایک ہی بیٹی ہے۔ ایک بیٹا دانیال اور ایک بیٹی پریشے۔
اب یہ مثال کہاں سے ٹپک پڑی ان کے گھر میں بٹوارہ ڈالنے کے لیے۔
"اس کی ماں اور باپ کو کچھ عرصے کے لیے مجبوراً" ملک سے باہر جانا پڑ گیا ہے۔ کوشش کے باوجود مثال کا ویزا نہیں لگ سکا۔ چھ، آٹھ ماہ میں وہ واپس آجائیں گے تو یہ اپنی ماں کے پاس چلی جائے گی۔ ہمیشہ کے لیے نہیں آئی۔" بہت سوچنے کے بعد عدیل کو یہی ایک مضبوط بہانہ سوجھا تھا عفت کے غصے کو کم کرنے کا۔ اس نے عدیل کی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔
مگر فی الوقت یقین کرنے کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔
"میں چھ، آٹھ ماہ میں مثال کا کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر اس کی شادی کردوں گا تو یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہوجائے گا۔"
عدیل اس بات کو سوچ کر دل میں بہت مطمئن تھا اور آج ہی سے اس نے اپنے ارد گرد دور و نزدیک خاندان میں اور باہر کوئی ایسا موزوں رشتہ مثال کے لیے سوچنا شروع کردیا تھا جلد از جلد اس کی بیٹی کو بخوشی بیاہ کر لے جاسکے۔
"اگرچہ وہ ابھی کم عمر ہے۔ مگر اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔" وہ خود کو سمجھا چکا تھا۔
"اور تم پریشان نہیں ہو، تیسرا ایسا کوئی بھی آپشن میں سوچ چکا ہوں۔ تم عفت اور پری سے یہی کہنا کہ بشریٰ تمہیں یہاں صرف چند ماہ کے لیے چھوڑ کر گئی ہے، اوکے۔" چند لمحوں بعد معلوم نہیں اسے اپنے جملے کی سختی کا احساس ہوا تھا یا مثال کی تشفی کے لیے اس نے یہ بات کہی تھی۔ مگر مثال اسی طرح سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔
پاپا پر تو اسے دنیا سے زیادہ بھروسا اور مان تھا۔ وہ اسے کبھی بھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے۔ اسے اندھا یقین تھا۔
اس کی آنکھوں سے ٹوٹ کر دو آنسو اس کی ہتھیلیوں پر گرے۔
"اور کوشش کرنا کہ عفت اور پری کے ساتھ تو تم کسی قسم کا کوئی ایشو کھڑا نہ کرو۔ وہ دونوں جو بات کہیں سخت یا نرم، اسے خاموشی سے سن لیا کرنا۔ چند ماہ کی بات ہے، پھر ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔"
مثال نے چونک کر باپ کو دیکھا۔

"چند ماہ بعد..... کیا ہونے والا ہے، کیا بشریٰ اسے واپس لے جائے گی۔ پاپا کا یہ خیال ہے تو ان کی بھول ہے، احسن کمال اب کبھی بھی مجھے اپنے گھر میں قبول نہیں کرے گا۔" اسے اور بھی رونا آنے لگا۔
اسے لگا وہ اپنے باپ پر کوئی بہت بڑی مصیبت بن کر نازل ہوئی ہے اور اس کی وجہ سے اس کے باپ کے کندھے چند گھنٹوں میں جھک سے گئے ہیں۔
"کاش میں یہاں نہ آتی۔" وہ چپکے سے عدیل کے گہری سوچ میں ڈوبے چہرے کو دیکھ کر خود سے بولی۔
"تو پھر میں اور کہاں جاتی؟" وہ سخت رنجیدہ تھی۔
"اب جاکر سوجاؤ تم اور سنو مثال! تمہارا یہ فائنل سیمسٹر ہے نا کالج میں؟" وہ بہت دیر کچھ یاد کر کے بولا تھا۔
"جی پاپا!" وہ گھٹی ہوئی آواز میں آہستگی سے بولی۔
"اچھی بات ہے۔ تم اپنا فوکس صرف اپنی اسٹڈیز پر کرنا۔ عفت کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہیلپ کرادیا کرنا

اور اپنے کام سے کام رکھنا اور کوشش کرنا پری سے بالکل نہیں الجھو، تم جتنا میری باتوں کو یاد رکھو گی اور ان پر عمل کرو گی میرے لیے زندگی کچھ باسہولت ہو جائے گی۔ تم سمجھ رہی ہو نا میں تم سے کیا چاہ رہا ہوں۔"

اسے ایک بار پھر اپنے باپ کی بے بسی پر شدت سے رونا آرہا تھا۔ وہ چہرہ جھکائے یوں ہی زور سے گردن اثبات میں ہلائے گئی۔

"بیٹا! میں نہیں چاہتا کہ گھر کا ماحول خراب ہو، خوامخواہ کوئی بدمزگی، کوئی رنجش ہو۔ عفت دل کی بری نہیں ہے اگر تم تحمل سے اسے اپنی ماں کی جگہ رکھ کر اس کے ساتھ رہو گی تو تمہیں اس کا برتاؤ بہت ناگوار نہیں گزرے گا۔" وہ رک رک کر اسے آنے والے دنوں کے لیے تیار کر رہا تھا۔ "پھر پری اور وانی تو تمہاری چھوٹے بہن اور بھائی ہیں بہن سے تمہیں بھی بہت محبت ہے نا۔"

مثال اسی طرح سر جھکائے اثبات میں گردن ہلا گئی۔

"آپ بڑی بہن ہو ان کی۔ ان کا خیال کرو گی تو وہ بھی آپ کا خیال کریں گے۔ آپ سے محبت کریں گے۔ اسی طرح گھر کی فضا اچھی رہے گی اور میں سکون سے آنے والے دنوں میں تمہارے لیے کوئی بہتر فیصلہ کر سکوں گا۔"

عدیل کی آخری بات پر مثال نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیسا فیصلہ پاپا؟" وہ پوچھے بغیر رہ نہ سکی۔

"میں چاہتا ہوں میری مثال بہت خوش رہے، اس کے اخلاق، اس کا رویہ دوسروں سے سلوک سب اتنا اچھا ہو، مہربان محبت کرنے والا کہ میری بیٹی ایک مثال بن سکے۔ تم سمجھ رہی ہو نا۔"

وہ اس کے سوال کو ٹال کر اس کے اوپر رکھی ذمہ داری اور بردباری کی گٹھڑی میں کچھ اور بوجھ بڑھاتا چلا گیا۔ کہ اس گھر کے ماحول کو ٹھیک رکھنے کی تمام تر ذمہ داری مثال کی تھی۔ اس کا رویہ اس کا سلوک سب اتنا مثالی ہونا چاہیے کہ عفت کو اور اس کے بچوں کو اس سے کبھی کوئی شکایت نہ ہو۔ کم از کم عدیل تک ایسی کوئی شکایت نہیں پہنچے۔

"پاپا! میں اگر فرشتہ بھی بن کر رہوں گی اس گھر میں تو بھی آپ کی سیکنڈ وائف اور آپ کے بچوں کو خوش نہیں کر سکوں گی۔" وہ باپ کو دیکھتے ہوئے افسردگی سے دل میں سوچنے لگی۔

"اب تم جاؤ۔ کافی رات ہو گئی ہے کوئی بھی مسئلہ ہو، کوئی بھی ضرورت ہو۔ تم صرف مجھ سے بات کرو گی۔ او کے۔"

وہ اسے برسوں پہلے والی نصیحت یاد دلاتے ہوئے بولا۔ جس پر عمل کرنے کی نوبت آج تک نہیں آسکی تھی۔ اتنے سالوں میں جب بھی مثال اپنے مسئلے اور ضرورتیں لے کر عدیل کے پاس آئی تھی اس کے پاس ان کو سننے کے لیے ان کو حل کرنے کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا۔ سن بھی لیے جاتے وہ مسئلے تو ان کو حل کبھی نہیں کیا گیا تھا اور اب پھر وہی ایک باپ کے فرض سے سبکدوش ہونے والی کوشش!

مثال کچھ کہے بغیر اٹھ کر باہر نکل گئی۔

عدیل اسے جاتا دیکھتے ہوئے ابھی بھی بہت کچھ سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

جاب واثق کی توقع سے بہت بڑھ کر تھی۔

کیمیکل بنانے کی اس فیکٹری میں شہزاد نے اسے بہت اچھی سیٹ آفر کی تھی۔ بلکہ سیلری پیکج بھی بہت اچھا تھا۔

پھر کام کا اسکوپ بہت تھا اور واثق جو یہ سوچ کر گیا تھا کہ اگر جاب اس کے جی کو نہیں لگی تو وہ مروت اور لحاظ میں آئے بغیر شہزاد کو صاف انکار کر آئے گا۔

"یہ سیلری پیکج اس ماہ کے لیے ہے کہ اس پیریڈ میں ہمیں بہت سے آرڈر پورے کرنے ہیں اگر ہم اس گول کو کامیابی سے اچیو کرلیں گے تو تمہارا پیکج اس سے تقریباً" ڈبل کر دیا جائے گا۔" شہزاد کی بات پر وہ ہنس پڑا۔

"نہیں یار! مجھے لالچ نہیں بتاؤ میں اپنے کام کو پوری دیانت داری سے کرنا چاہتا ہوں کہ میری ماں نے مجھے ہمیشہ رزق کو حلال کر کے کھانے کا سبق پڑھایا ہے، ابھی مجھے صرف اپنے کام میں دلچسپی ہے آگے ملنے والے پیکج میں نہیں۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"ویل اینڈ گڈ اور یار ہماری فیکٹری سے کیا بلکہ ہر جگہ موجود کام کرنے والا ایسی سوچ رکھ کر اپنا کام خوب لگن سے کرے تو میرے خیال میں کہیں بھی کوئی کمی نہ رہے اور کرپشن تو جڑوں سے ہل جائے۔" شہزاد بھی اس کی سوچ سے متاثر ہوا تھا۔

"بالکل... کیا ہم آج ہی اپنے پروجیکٹس ڈسکس کرلیں جو ہمیں اگلے تین ماہ کے دوران مکمل کرنے ہیں۔" واثق کام کرنے کے لیے بے چین تھا۔ فوراً" ہی بولا۔

"کیوں نہیں۔ لیکن پہلے کافی یا چائے۔ بتاؤ کیا چلے گا؟"

"کافی ہی منگوالو۔" وہ سر ہلا کر بولا۔

"ایک سال پہلے تک پاپا ہی سب کچھ دیکھا کرتے تھے۔ میں تو کبھی کبھار جب دل چاہا آفس آجایا کرتا تھا۔ کچھ ایسی پابندی نہیں تھی مجھ پر۔ لیکن چھ سات ماہ پہلے پاپا کی طبیعت خراب ہوئی تو پھر وہ ٹھیک ہی نہیں ہو سکے تو مجبوراً" سب کچھ مجھے سنبھالنا پڑا۔ یقین کرو شروع میں تو جب سارا کچھ میرے سر پر پڑا تو یک بیک میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ کافی وقت لگا مجھے سب کچھ سمجھنے میں۔" شہزاد اس کے سامنے لیپ ٹاپ کھول کر پروجیکٹس کی فائل نکالتے ہوئے بتانے لگا۔

"اوہ کیا ہوا ہے تمہارے فادر کو؟"

"پیرالائزڈ ہیں پچھلے تین ماہ سے۔"

"اوہ ویری سیڈ۔ اللہ انہیں صحت دے۔ میں کسی وقت جاؤں گا تمہارے ساتھ انہیں دیکھنے۔"

"ہاں ضرور۔ اچھا یہ دیکھو، یہ پہلا پروجیکٹ جو ہمیں صرف چالیس دن میں مکمل کرنا ہے۔"

اس نے لیپ ٹاپ واثق کے آگے کھسکایا اور دونوں ڈسکشن کرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

"نہیں پاپا! مجھے نہیں جانا۔" پری نے قطعیت سے کہا۔

عفت کے ساتھ عدیل نے بھی کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"لیکن مجھے تو جانا ہے۔ یہ بات صرف تمہاری طرف سے نہیں ہو سکتی۔ پاپا! مجھے چلنا ہے سیر کے لیے۔" وانی بھی حتمی لہجے میں بولا۔

مثال سب کے لیے گرم چائے لے کر آرہی تھی۔
وہ چائے میز پر رکھ کر خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔
عدیل نے ایک نظر اسے جاتے دیکھا۔
"تم ناشتا نہیں کر رہیں ہمارے ساتھ؟" وہ پیچھے سے مثال کو پکارنا چاہتا تھا مگر عفت کی تیز نظروں سے خائف ہو کر اس نے اپنی پکار کو وہیں خاموش کرا دیا۔
"تو ٹھیک ہے تم جاؤ مگر میں نہیں جارہی۔" پری اسی تمکنت بھرے لہجے میں بولی۔
"لیکن کیوں پری... جان! پاپا نے یہ پروگرام صرف تمہاری وجہ سے تو بنایا تھا۔" عفت اسے چھوٹے بچوں کی طرح چمکار کر بولی۔
"تو کیا اس گھر میں سارے پلان صرف پری بیگم کو خوش کرنے کے لیے بنتے ہیں.... میری مرضی' میری خوشی کچھ بھی نہیں۔"
دانی پری کے انداز پر بھڑک اٹھا اور زور سے ہاتھ میں پکڑا جوس کا گلاس میز پر پٹخ کر بولا۔
عدیل اور عفت اس کے انداز پر لحہ بھر کو گنگ سے رہ گئے۔
"دانی۔۔۔ یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا؟" عفت نے اسے گھرکا۔
"ایک بات آج آپ مجھے کلیر کردیں۔ میری اس گھر میں کیا پوزیشن ہے۔ سیکنڈ سٹیزن ہوں میں کیا اس گھر کا؟"
وہ جیسے غصے میں بھرا ہوا تھا۔
"دانیال!" عدیل کچھ شاکڈ سا رہ گیا۔
"ہر بات میں صرف پری کی رائے پوچھی جاتی ہے۔ اس کا مشورہ جانا جاتا ہے۔ اس کی پسند ناپسند کو فوقیت دی جاتی ہے۔ تو پھر میری کیا حیثیت ہے یہاں۔ پہلے پری کی وجہ سے سیر کا پروگرام بنایا گیا۔ مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا کہ میں جانا بھی چاہتا ہوں یا نہیں' جب میں مینٹلی تیار ہو گیا تو اب آپ کی لاڈلی کے کہنے پر اس پروگرام کو کینسل کردیا جائے گا۔ آئی نو ایسا ہی ہو گا شٹ۔ میں کون ہوں پھر۔" وہ ساڑھے پندرہ سال کا ساڑھے پانچ فٹ نکلتا قد' بھرے جسم اور میچور چہرے کے ساتھ ماں باپ کے سامنے کھڑا انہیں آنے والے سخت ترین دنوں کی جھلک دکھا رہا تھا۔
"مائی فٹ تو میں بھی اب کبھی کہیں بھی۔ کہیں بھی نہیں جاؤں گا اوکے۔" اس نے زور سے میز پر مکا مارا ناشتے کے لوازمات اور برتن بری طرح سے کھنکھنا کر رہ گئے۔
کرسی کو ٹھوکر مار کر لڑھکاتا ہوا دروازے کو لات رسید کرتا وہ کمرے سے ہی نہیں گھر سے بھی باہر جاچکا تھا۔ اور وہ چاروں بالکل گنگ تھے۔
جیسے کسی بڑے طوفان کے گزر جانے کے بعد ہر طرف خاموشی چھا جاتی ہے۔

"دیکھا تم نے اس کی حرکت کو۔ اسے یہ تمیز ہے بڑوں سے بات کرنے کی۔ کیا پڑھنے جاتا ہے یہ اتنے مہنگے اسکول میں۔۔۔ یہ لڑکا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا عفت! تم اس کی ایسی تربیت کررہی ہو۔۔۔ یہ تو بالکل ہاتھوں سے نکل چکا ہے اور تم ایسی بے خبر ہیں اس سے۔" عدیل بری طرح سے صدمے میں تھا اور عفت سے تو جواب میں کچھ بولا نہیں گیا۔ پریشے کے لیے بھی یہ سب خلاف امید تھا وہ بھی جیسے ڈر کر بالکل خاموش ہو گئی تھی۔
عدیل کچھ بھی کھائے بغیر نڈھال سا ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر چلا گیا اور عفت چاہنے کے باوجود اسے روک

نہیں سکی۔
دانی کے ری ایکشن نے اسے بھی سخت خوف زدہ کردیا تھا۔ ایسا تو وہ کبھی بھی نہیں تھا۔ پھر اسے ہوا کیا۔
وہ بس یہی سوچ رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

وہ پبلک لائبریری کے باہر سیڑھیوں پر دونوں گھٹنوں کے گرد بازو کا گھیرا کیے بیٹھی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔
وہ اندر کی طرف آتے ہوئے اسے دیکھ کر بے اختیار ٹھٹکا تھا۔
اس کے ارد گرد لوگ آجا رہے تھے۔ مگر وہ دنیا ومافیہا سے بے خبر تھی' شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ پرندے شور مچاتے اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے وہ ان کے شور کو بھی سن نہیں رہی تھی۔
واثق آہستگی سے اس کے دوسری طرف جا کر بیٹھ گیا۔
وہ اسی طرح کسی اسٹیچو کی مانند ساکت تھی۔
"تو جاب ملی پھر تمہیں؟" بہت دیر بعد واثق نے اس گہرے سکوت کو آہستگی سے توڑا۔
"نہیں۔" اس نے حرکت کیے بغیر آہستگی سے جواب دیا۔
تو وہ اتنی بھی غافل نہیں بیٹھی تھی جتنا اسے واثق سمجھا تھا۔
"تو کوشش ترک کردی؟" وہ اسے بولنے پہ اکسانے کے لیے بولا۔
"نہیں۔" جواب پھر مختصر تھا۔
"اگر میں کچھ ہیلپ کرسکوں تو؟" وہ لہجے میں کچھ اور بھی نرمی اور اپنائیت سمو کر بولا۔
"نہیں۔" وہ اسی طرح کسی نادیدہ نقطے پر نگاہیں جمائے اسی لہجے میں بولی۔
"نہیں کے سوا اور کوئی جواب نہیں ہے تمہارے پاس۔" وہ اس کی نہیں کی تکرار پر جھنجلا کر بولا۔
"نہیں۔" وہ پھر اس ٹون میں اسے چڑانے کو بولی۔
اور اگلے لمحے اس کی طرف مڑ کر دیکھے بغیر اٹھ کر جانے لگی اور واثق کو پتا بھی نہیں چلا بالکل غیر ارادی طور پر اس نے مثال کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں جکڑ لیا۔
مثال کو جیسے ہزار والٹ کا کرنٹ لگا۔
وہ تڑپ کر مڑی۔
وہ مسکراتے چہرے کے ساتھ اپنائیت بھری مسکراہٹ سے اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ روز اسی طرح ملا کرتے ہیں۔
"مسٹر۔۔۔" وہ پورا زور لگا کر ہاتھ کھینچ رہی تھی۔
"واثق۔۔۔ واثق احمد نام ہے میرا اور آپ کا مثال۔۔۔ ہے نا۔" وہ اسی طرح اس کا ہاتھ اپنی مضبوط گرفت میں لیے اس کے سرخ ہوتے چہرے پر نظریں جمائے بولا۔

مثال کی آنکھیں کچھ حیرت سے پھیل سی گئیں۔
"بھئی اب اتنے مہینوں بلکہ شاید سالوں سے تو ہم مل رہے ہیں' میرا مطلب ہے آتے جاتے رستوں پر ٹکرا رہے ہیں تو اتنا حق تو ہے ایک دوسرے کے نام جان سکیں اور ایک دوسرے کے مسائل شیئر کرسکیں۔ ایم آئی رائٹ؟" وہ اس کے برابر کھڑا ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"پلیز میرا ہاتھ چھوڑیں فوراً"۔ "وہ غصے میں غرا کر بولی۔
"ورنہ آپ تھپڑ کھینچ ماریں گی۔ ہے نا۔"
"میں یہ کر سکتی ہوں جانتے ہیں آپ۔ چھوڑیں مجھے۔" وہ اسے پرے دھکیل کر زور سے بولی تو اس نے ایک دم سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔
"آپ کہیں بھی چلی جائیں۔ آپ کا ہر راستہ مجھ تک آئے گا۔ اور یہ ہر بار "اتفاقاً" نہیں ہوتا۔ بہتر ہے ہم کہیں بیٹھ کر بات کرلیں میں صرف یہ چاہتا ہوں۔"
وہ بولتا ہوا اب اس کے برابر چل رہا تھا۔
"مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی؟" وہ اس سے آگے نکلنے کی کوشش میں اب تقریباً "دوڑ رہی تھی۔
"پلیز آہستہ چلیں لوگ سمجھیں گے شاید ہم دونوں کسی میراتھن میں حصہ لینے جارہے ہیں۔ سب ہماری طرف ہی دیکھ رہے ہیں۔" اس نے ڈرایا اور وہ ڈر گئی۔
بے اختیار دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ لوگ گزر تو رہے تھے مگر ان کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔
"مثال! میں آپ کو جاب دلا سکتا ہوں بہت اچھی نہیں لیکن ایک مناسب جاب... ایک اچھی اکیڈمی کو جونیئر ٹیچرز کی ضرورت ہے اگر آپ کا موڈ ہو تو اس ایڈریس پر چلی جایئے گا۔ آئی ہوپ آپ کا کام بن جائے گا۔ ظاہر ہے اسٹڈیز کے دوران آپ نائن ٹو فائیو والی جاب تو نہیں کر سکیں گی۔ فی الحال یہ اکیڈمی کی جاب آپ کو سوٹ کرے گی۔" کہہ کر وہ وزیٹنگ کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما کر آگے بڑھ گیا مثال وہیں ۔ کھڑی اس کو جاتے دیکھتی رہی۔
دوسری نظر اس نے وزیٹنگ کارڈ پہ ڈالی۔
"اس کو میرے بارے میں سب کچھ کیسے معلوم ہے۔ میرا نام، چلو جاب ڈھونڈنے کا پتا تو اسے میرے بک ایشو کروانے پر ہو گیا۔ میں پڑھ رہی ہوں اسے یہ بھی معلوم ہے اور پتا نہیں کیوں میں اس سے بہت سختی سے پیش نہیں آپاتی۔
اور یہ ٹھیک کہتا ہے کہ ہم دونوں اتنی بار ٹکرا چکے ہیں کہ اب تو واقعی مجھے بھی اس کی عادت سی ہونے لگی ہے۔ پاپا کے گھر جب بھی آتی تھی میں انجانے پن میں اس کے کہیں نہ کہیں ملنے کی کیوں منتظر رہتی تھی۔"
وہ اب سست روی سے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔
یہ پبلک لائبریری عدیل کے گھر سے پیدل کے راستے پر تھی اور کوئی نہ کوئی کتاب ایشو کروانے کے لیے وہ اکثر شام کو ادھر آجایا کرتی تھی اور آج تو سارا دن سارے گھر میں موت کا سا سناٹا رہا تھا۔ اس نے عفت کو لائبریری آنے کا بتایا تو اس نے کوئی جواب بھی نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گئی تھی۔
کل شام میں میں اس اکیڈمی جاؤں گی ۔ مجھے اس کا نام بھی کچھ دیکھا دیکھا لگ رہا ہے۔"
وہ کارڈ کو سرسری نظر سے دیکھ کر مٹھی میں دبا تی شام گہری ہونے کے احساس پر تیز قدموں کے ساتھ گھر کی طرف چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

سارا گھر پیک ہو چکا تھا۔

بھاری فرنیچر اور دوسرے سامان کو دو تین کمروں میں اکٹھا کر کے بحفاظت رکھ دیا گیا تھا۔
بہت سا سامان احسن کمال کے کہنے پر ضرورت مندوں میں یونہی دے دیا گیا تھا۔

اپنی آئینہ کی اور احسن کی پیکنگ وہ مکمل کر چکی تھی۔
اور وہ یہ سارے کام کسی روبوٹ کی طرح نمٹاتی رہی تھی۔ اس کی دلچسپی اب کسی بھی کام میں نہیں رہی تھی اسے یوں لگ رہا تھا۔ اب وہ جس سفر پر جانے والی ہے اس سے کبھی واپسی نہیں ہو گی۔
اس نے تھکی ہوئی نظر سارے گھر پر ڈالی کچھ بھی سمیٹنے کو نہیں رہ گیا تھا۔
رات گیارہ بجے کی فلائٹ تھی ان کی سڈنی کے لیے سیفی دو دن پہلے جا چکا تھا۔ وہ چھ سات ماہ بعد ہمیشہ کے لیے ان کے پاس آسٹریلیا آجاتا۔
آئینہ اور احسن کمال کچھ ضروری چیزوں کی شاپنگ کے لیے مارکیٹ گئے تھے۔ جہاں انہیں تین چار گھنٹے لگ سکتے تھے۔
ابھی ساڑھے چار ہوئے تھے اس کے پاس ٹائم تھا۔
وہ اس خیال کے آتے ہی بے چین سی اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ کل کی ایشو کروائی ہوئی کتابیں لے کر چھت پر آگئی۔
بہت سوچنے کے باوجود بھی وہ اکیڈمی نہیں جا سکی تھی۔
پہلے پاپا سے بات کروں لیکن آج کل ان کا موڈ بہت آف ہے۔ اگر انہیں بعد میں پتا چلا تو ناراض ہو جائیں گے۔ وہ یہی سوچ کر نہیں گئی۔
اور گھر کا ماحول تو ابھی بھی بہت خراب تھا۔
دانی نے عفت کے لاکھ سمجھانے بجھانے کے باوجود عدیل سے معذرت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔
عفت کو پہلی بار عدیل سے بہت شرمندگی ہوئی تھی ۔ وہ رات بہت دیر سے گھر آیا اور کچھ بھی کھائے بغیر خاموشی سے سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ اور صبح بھی خاموشی سے خالی چائے پی کر آفس چلا گیا تھا۔ پری بھی بالکل خاموش تھی۔
اور مثال سے تو کسی کو کوئی غرض نہیں تھی۔ ان دو دنوں میں اس نے کچن کا گھر کا سارا کام سنبھال لیا تھا کہ کہیں کوتاہی ہو جانے پر بیٹے کا غصہ عفت اس پر نہ نکال دے۔
مگر عفت بالکل بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔
"ماما نے اتنے دنوں سے مجھے ایک بار بھی فون نہیں کیا۔ مجھ سے بات نہیں کی جیسے انہیں ایسے کسی بہانے کی تلاش تھی کہ وہ مجھ سے پیچھا چھڑا لیتیں۔ وہ انہیں سیفی نے دے دیا تھا۔"
ایک دم سے اسے بشریٰ کی بے اعتنائی کا خیال آیا آنکھیں بھر آئیں۔ نیچے سڑک پر گاڑی کے رکنے اور گاڑی کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر وہ یونہی بے دھیان سی بیٹھی رہی۔
"وہ کہیں مما مجھے لینے تو نہیں آگئیں؟" بہت دیر بعد اسے اچانک جیسے خیال آیا تو وہ تیزی سے نیچے بھاگ گئی۔

☼ ☼ ☼

عفت سامنے کھڑی اس خوب صورت، پُر وقار اداس حسن والی ادھیڑ عمر عورت دیکھ کر کچھ چونکی تھی۔
"میں بشریٰ... مثال ہے گھر پر؟" وہ بہت رک رک کر بولی تھی، عفت شاکڈ سی کھڑی رہ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نگہت سیما

میں ان دونوں سے محبت کرتا تھا اور وہ دونوں مجھ سے۔ زویا اور ماریہ۔ ایک میری پھوپھی زاد تھی اور ایک چچازاد۔

ہم تینوں کا بچپن اکٹھے کھیلتے کودتے گزرا تھا۔ اس لیے کہ ہم تینوں ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ پھوپھی شادی کے دو سال بعد ایک سالہ زویا کو گود میں اٹھائے بیوگی کی سفید چادر اوڑھے میکے لوٹ آئی تھیں۔ دادا، دادی چاہتے تھے کہ پھوپھی کی شادی کردیں۔ مگر پھوپھی نے کہا۔

"آج کے بعد دوبارہ یہ بات مت کیجئے گا۔ میرے پاس میری زویا ہے۔ میں اپنی ساری عمر اس کے سہارے گزار سکتی ہوں۔"

اس وقت سب خاموش ہوگئے تھے کہ ابھی نیا نیا زخم ہے بھرنے میں وقت لگے گا لیکن کچھ زخم کبھی نہیں بھرتے۔ پھپھو نے بھی نصر پھوپھا کے ساتھ جو عہد کیا تھا، اسے تاعمر نبھایا۔ سو میں نے ہوش سنبھالنے پر پھپھو کو اپنے گھر میں ہی دیکھا تھا۔ اس وقت میری عمر چار سال تھی۔ میں اپنے دو بھائیوں سے چھوٹا تھا اور میری کوئی بہن نہیں تھی۔ دونوں بڑے بھائی طاہر اور منیب ایک دوسرے کے ساتھ مگن رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی مجھے اپنے کھیل یا سرگرمیوں میں شامل نہیں کیا تھا لیکن وہ دونوں مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ دونوں ہی مجھے اپنی چیزوں میں سے حصہ ضرور دیتے تھے۔

چچا کے دو ہی بچے تھے۔ دو سالہ ماریہ اور مجھ سے دو سال بڑا خرم۔ تو جب پھپھو اس گھر میں آئیں تو ہم تینوں کے درمیان دوستی کا ایک بڑا مضبوط رشتہ بن گیا تھا۔

میں اس وقت تک ناشتا یا کھانا نہیں کھاتا تھا جب تک زویا اور ماریہ نہیں آجاتی تھیں۔ ایک بار زویا کو خسرہ نکل آئی تو پھپھو اسے ناشتے پر نہیں لائیں۔ اس کے باوجود جب تک وہ اسے گود میں لے کر نہیں بیٹھیں میں نے کھانا نہیں کھایا۔ اس طرح ایک بار میں سیڑھیوں سے گر کر زخمی ہوگیا تھا۔ میرے سر پہ ٹانکے لگے تھے۔ اور میں اسپتال سے جب تک آ نہیں گیا تھا، ماریہ نے کچھ بھی کھانے سے انکار کردیا تھا۔

میری اماں، چچی اور پھپھو کے درمیان کوئی روایتی چپقلش نہ تھی۔ تینوں کے درمیان بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔

ہم تینوں بچپن سے نکل کر لڑکپن میں داخل ہوئے پھر لڑکپن سے جوانی میں، لیکن ہماری یہ مثلث اسی طرح قائم تھی۔ حالانکہ خرم نے کئی بار کوشش کی تھی اسے مربع بنانے کی، لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔

ہم تینوں میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ ہم تینوں ہی ایک دوسرے کا بے تحاشا خیال رکھتے تھے۔ میں اگر زویا کے لیے کچھ خریدتا تو ماریہ کے لیے بھی ضرور لے کر آتا۔ وہ دونوں بھی میری سالگرہ اور میری چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کو بے حد اہتمام سے مناتیں اور میں بھی ہر چھوٹے بڑے موقع پر انہیں چھوٹے چھوٹے تحائف دیتا۔

ہم سمجھتے تھے شاید زندگی ایسے ہی گزر جائے گی۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے زندگی بتادیں گے لیکن پہلی بار ہماری اس مثلث کے

خط اس وقت کمزور پڑے جب گھر میں میری شادی کی بات چلی۔

٭ ٭ ٭

میں نے اسی سال ایم بی اے کیا تھا۔ ماریہ سائیکالوجی میں ماسٹر کر رہی تھی۔ زویا اس سے ایک سال پیچھے....

مجھے ایم بی اے کرتے ہی فوراً" جاب مل گئی تھی۔ اماں ابا حج پر جانے سے پہلے میری شادی کرنا چاہتے تھے۔

"لیکن اماں! شادی کس سے کریں گی۔ وہ تو دونوں کا دیوانہ ہے اور دونوں اس کی۔" میری بڑی بھابھی بہت شوخ اور چلبلی تھیں۔

"کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اس سے ضرور پوچھ لیجئے گا۔"

اور اماں نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔

"زین! ہم تمہاری شادی کے لیے سوچ رہے ہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا۔"

"ضرور سوچیے اماں! میں نے کب منع کیا ہے۔" میں آئینے کے سامنے کھڑا اپنی ٹائی درست کر رہا تھا۔ یہ ٹائی اور ایک پرفیوم مجھے ماریہ نے جاب ملنے پر گفٹ کیا تھا۔

"تمہاری نظر میں کوئی لڑکی ہے زین!"

"میں لڑکیوں پر نظر رکھتا ہوں' آپ ایسا سمجھتی ہیں مجھے۔" میں نے آئینے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے مصنوعی خفگی سے انہیں دیکھا۔

"میرا مطلب ہے یونیورسٹی کالج میں کبھی کوئی لڑکی پسند آئی۔"

"نہیں...." میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے کبھی لڑکیوں سے دوستی نہیں رکھی۔"

"تو پھر کیا ہم اپنی مرضی سے تمہارا رشتہ طے کر دیں' تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا نا؟"

"نہیں پیاری اماں! بالکل بھی نہیں۔"

میں نے ہنستے ہوئے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کی پیشانی چومی اور آفس جانے کے لیے گھر سے باہر نکل آیا۔

اس روز آفس میں کام کرتے ہوئے میرے دل میں گدگدی ہوتی رہی کہ صبح میں جلدی نکل آیا تھا اور میں نے زویا اور مایا سے یہ بات ڈسکس نہیں کی۔ خیر شام کو ضرور بتاؤں گا کہ اماں کیا سوچ رہی ہیں اور یہ کہ وہ مطمئن رہیں' میری بیوی کے آجانے سے ہماری دوستی ہرگز ہرگز متاثر نہیں ہوگی اور ہماری ٹرائی اینگل کے خط ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوں گے۔

اماں نے میری پسند پوچھی تھی۔ اس لیے اس روز میں نے اپنے آفس میں کام کرنے والی لڑکیوں کو بھی قدرے دھیان سے دیکھا تھا۔ دو تو میرڈ تھیں' جب کہ ایک کا چیختا چلاتا میک اپ میری طبیعت پر انتہائی گراں گزرتا تھا اور ایک اگرچہ غیر شادی شدہ تھی لیکن ادھیڑ عمر تھی۔

مجھے بڑی ہنسی آئی کہ اب زین العابدین صاحب لڑکیوں کو پسند کریں گے۔

"نہیں بھئی یہ اماں کا شعبہ ہے۔ انہی کے پاس رہنے دیا جائے۔"

اس روز گھر آکر شام کے وقت لاؤنج میں بیٹھے بیٹھے میں نے ان دونوں کو اماں کا خیال بتایا تو وہ دونوں ہی جیسے یکدم پرجوش ہو گئیں۔

اس روز وہ دونوں کتنی ہی دیر تک بیٹھی مختلف لڑکیوں کو ڈسکس کرتی اور ریجیکٹ کرتی رہیں۔

دوسری طرف اماں بڑی بھابھی چھوٹی بھابھی اور دونوں بھائیوں کے ساتھ کانفرنس کر رہی تھیں۔

"مجھے تو خیر دونوں ہی پیاری ہیں' لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کے لیے جھولی پھیلاؤں۔"

"اماں! یہ بات آپ زین سے کیوں نہیں پوچھ لیتیں۔ ویسے میرے خیال میں مایا بڑی ہے' سو پہلا حق تو اسی کا بنتا ہے۔" چھوٹی بھابھی نے کہا تھا۔

"یوں بھی یہ اچھا فیصلہ ہوگا۔" بڑے بھائی بولے

تھے۔

"زویا کا خرم کے ساتھ اور ماریا کا زین کے ساتھ رشتہ ہو جائے تو دونوں لڑکیاں گھر میں رہ جائیں گی۔"

"یہ بات تو تم نے بہت اچھی کی ہے طاہر۔" اماں خوش ہو گئی تھیں۔

"لیکن زین سے ضرور پوچھ لیجئے گا اماں!" چھوٹے بھائی نے اب بھی اماں کو تاکید کی تھی اور اماں نے مجھ سے پوچھ لیا۔ کچھ دیر تک تو میں ہکا بکا سا اماں کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں.... گھر کی بچیاں ہیں دیکھی بھالی۔ انہیں رچنے بسنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور ہمیں انہیں قبولنے میں اور پھر بچپن سے تمہارا ساتھ ہے۔ ان کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو۔ وہ تمہیں سمجھتی ہیں.... ہم سب کا خیال تو مایا کے لیے ہے لیکن اگر تمہارا رجحان زویا کی طرف زیادہ ہو تو...."

"میرا رجحان؟" میں نے خود کو ٹٹولا۔ میرے لیے تو دونوں ہی برابر تھیں۔

"مایا یا زویا۔"

میرے لیے زویا اور مایا دونوں ایک جیسی تھیں۔ میں دونوں کو یکساں عزیز رکھتا تھا اور آج سے پہلے میں نے دونوں کے متعلق اس طرح کی کوئی بات نہیں سوچی تھی۔ اور شاید انہوں نے بھی اس طرح کبھی نہ سوچا ہو میری خاموشی پر اماں نے بڑے بھائی والی بات کہہ سنائی کہ اگر میں مایا کے حق میں فیصلہ دوں تو زویا کو چچی خرم کے لیے لے لیں گی۔ اس طرح دونوں لڑکیاں گھر میں ہی رہ جائیں گی۔ مجھے اپنی مثلث کا خیال آیا۔ پھر میں نے واقعی مایا کے حق میں ہاں کردی۔ دوسری صورت میں مایا کو اس گھر سے رخصت ہونا پڑتا۔

اماں خوش ہو گئیں اور فوراً" ہی پورے گھر میں بات پھیل گئی۔

"مجھے پہلے ہی پتا تھا زین مایا کو پسند کرے گا۔" چھوٹی بھابھی بڑی بھابھی سے کہہ رہی تھیں۔

وہ دونوں اس وقت کچن میں تھیں اور میں فریج سے پانی کی بوتل لینے آیا تھا۔

"کیوں تمہیں الہام ہوا تھا۔" بڑی بھابھی نے ذرا تیکھے انداز میں پوچھا تھا۔

"مایا دراصل گوری چٹی ہے اور زویا سانولی سی۔" چھوٹی بھابھی نے اپنے تئیں بڑی ٹھوس دلیل دی۔ دراصل انہیں گورے رنگ کا کمپلیکس تھا' لیکن مجھے نہیں' میں نے تو کبھی اس بات پر دھیان بھی نہیں دیا تھا کہ زویا سانولی ہے اور مایا گوری۔ دونوں ہی پرکشش تھیں۔

"اور میں زین کی جگہ ہوتی نا تو دونوں سے ہی شادی کرلیتی۔" بڑی بھابھی نے شوخی سے میری طرف دیکھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ چکی تھیں۔

"تمہیں فیصلہ کرنا تو بہت ہی مشکل ہوا ہوگا زین!" بڑی بھابھی بغور مجھے دیکھ رہی تھیں۔

"نہیں تو۔" میں فریج سے بوتل نکال کر مڑا۔ "مجھے اماں اور بھائی صاحب کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ وہ بڑے ہیں بہتر سمجھتے ہیں۔"

"کیا تمہیں زویا کا خیال نہیں آیا زین؟" مجھے بھابھی کا لہجہ عجیب سے لگا۔

"کیسا خیال؟"

"یہی کہ تم نے مایا کو منتخب کیا تو وہ ہرٹ ہوگی؟"

"کمال کرتی ہیں بھابھی آپ۔ وہ دونوں تو خود کئی دنوں سے زوروشور سے میرے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہی ہیں۔"

"عجیب ہو تم تینوں بھی۔"

بھابھی سر جھٹک کر پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئیں اور میں پانی کی بوتل لے کر اپنے کمرے میں آگیا۔

اس رات باہر لان میں ٹہلتے ہوئے مجھے مایا کچھ اداس اور خاموش سی لگی تھی اور زویا نارمل.....

میں نے دو تین بار مایا سے پوچھا۔ اور اس نے چونک کر کہا تھا۔ "ہاں ٹھیک ہوں۔"

"زوئی! یہ چیٹنگ ہے نا۔ سراسر چیٹنگ" کہ مایا کے دل میں کوئی بات ہے اور یہ ہم سے شیئر نہیں کر رہی۔"

"تو کیا تم نے چیٹنگ نہیں کی کہ ہمیں بتایا تک نہیں اور ہم خوامخواہ تمہارے لیے لڑکیاں تلاش کرتے رہے بلکہ میں نے تو ایک لڑکی فائنل بھی کردی تھی۔ وہ تو زویا کو اچھی نہیں لگی تھی ورنہ....."

وہ قدرے اندھیرے میں تھی جبکہ برآمدے میں لگے بلب کی مدھم روشنی زویا کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

"مجھے تو خود آج ہی چار گھنٹے دس منٹ پہلے پتا چلا تھا جب میں اپنے کمرے میں تھا اور اماں نے آکر بتایا تھا کہ ان لوگوں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔"

"تو تمہیں اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا؟" مجھے مایا کی آواز بھیگی بھیگی سی لگی۔

"اف یہ لڑکیاں... ویسے شادی کے لیے مری جاتی ہیں اور جب شادی ہونے لگتی ہے تو رونا دھونا شروع کردیتی ہیں۔"

ایک بار نہ جانے کس بات پر چھوٹے بھائی نے کہا تو اماں نے کہا تھا۔

"بابل کا گھر چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔"

لیکن مایا سے تو بابل کا آنگن نہیں چھینا جا رہا تھا۔ وہ تو اسی آنگن میں رہتی۔ بس کمرہ بدل جاتا تھا۔ اپنے کمرے سے اٹھ کر میرے کمرے میں آجاتی۔ پھر کیوں اس کی آواز بھیگی بھیگی سی تھی۔

"نہیں! بھلا مجھے کیوں اعتراض ہوتا۔ اماں، ابا بھائی جو بھی فیصلہ کرتے۔ چاہے وہ تم ہوتیں زویا یا کوئی اور۔"

اس نے ایک گہری سانس لی۔

"کیا تمہیں اعتراض ہے؟"

"نہیں! دراصل..... میں نے اس سے پہلے اس طرح کبھی نہیں سوچا تھا۔"

"سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا، لیکن کیا یہ زیادہ اچھا نہیں ہے کہ کسی اجنبی سے ہونے کے بجائے کسی ایسے سے شادی ہو جو آپ کو اچھی طرح جانتا ہو۔ آپ کی پسند ناپسند ہر چیز کا پتا ہو اسے۔"

"کیا تمہیں میری پسند ناپسند کا پتا ہے زین!"

"مجھے نہیں تو کس کو پتا ہوگا۔" میں ہنس پڑا۔

"اصولاً" تو تمہیں مجھ سے شرمانا چاہیے تھا، لیکن تم ہو کہ پٹر پٹر باتیں کیے جا رہی ہو۔ کیوں زویا؟"

"ہاں۔" زویا مسکرائی "بلکہ اسے تو اب تم سے پردہ کرنا چاہیے۔"

مدھم روشنی میں، میں نے اس کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کی مسکراہٹ پھیکی پھیکی سی لگی۔ یہ اس مسکراہٹ سے مختلف تھی جو پہلے اس کی بے حد دلکش آنکھوں میں دمکتی تھی پھر ہونٹوں پر کھلتی تھی۔

مایا چلی گئی تھی۔

"ارے... شرما رہی ہو؟"

میں نے اسے آواز دی تھی لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ پھر بہت دیر تک میں اور زویا ٹہلتے رہے اور باتیں کرتے رہے تھے۔ میں نے زویا کو بتایا کہ اماں کہہ رہی ہیں کہ وہ اور خرم۔

خرم جو کبھی ہماری مثلث توڑ کر مربع نہیں بنا سکا تھا اب بنانے والا تھا۔

زویا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ شاید اسے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ خرم انجینئر تھا اور ایک بہت اچھی کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

گھر کا ہر فرد خوش تھا۔ گھر میں میری شادی اور زویا کی منگنی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ زویا کی پڑھائی ختم ہونے میں ابھی پورا سال تھا اور خرم کو اس کی کمپنی دو سال کے لیے سعودیہ بھیج رہی تھی۔ فی الحال زویا کی منگنی ہو رہی تھی۔

بھابھیوں کے بازار کے چکر لگ رہے تھے۔ زویا مایا بھی ان کے ساتھ ہی جاتی تھیں اور اب کم ہی نظر آتی تھیں اور ابھی شادی کی تاریخ طے ہی کی گئی تھی کہ میرا ٹرانسفر کراچی ہوگیا۔ جس روز میں جا رہا تھا اس روز بھی مجھے وہ دونوں ہی نظر نہیں آئی تھیں۔

"بھئی شادی میں ایک ماہ ہے اس لیے مایا کا تو تم سے پردہ ہے اور رہی زویا کی بات تو وہ غالباً" مایا کے کمرے میں ہے۔ اس کے دوپٹوں پر گوٹا ٹانک رہی ہے۔ اس لیے تم ادھر نہیں جاسکتے۔"

"اچھا۔ زویا کو تو بلادیں پھر ناراض ہوگی کہ مجھ سے مل کر نہیں گیا؟"

اور بھابھی کے بلانے پر وہ افراتفری میں آئی اور پھر خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

میں نے حساب لگایا۔ آج سے ٹھیک آٹھ دن پہلے لان میں ان کے ساتھ ٹہل رہا تھا اور یہ وہی دن تھا، جب اماں نے مجھے مایا کے متعلق اپنا فیصلہ بتایا اور میں نے اوکے کردیا تھا۔

"ان آٹھ دنوں میں، میں بہت بزی ہوگیا تھا۔ اکثر گھر پر بھی لیپ ٹاپ پر کام میں مصروف رہتا تھا، لیکن ایسا تو پہلے بھی ہوتا تھا اور تب وہ دونوں ہی میرے کمرے میں آجاتی تھیں، لیکن اب ان آٹھ دنوں میں شاید دو یا تین بار ہی میں نے مایا اور زویا کو دیکھا تھا۔

خیر میں کراچی چلا گیا اور اپنی شادی سے صرف دو دن پہلے آیا۔ میں زویا کو ڈھونڈ رہا تھا۔ جب وہ کہیں نظر نہ آئی تو میں نے بھابھی سے پوچھ ہی لیا۔

"ارے وہ تو مایا کے ساتھ پارلر گئی ہے۔"

"ہیں... لیکن میری شادی تو پرسوں ہے۔"

"تو پرسوں ہی ہوگی نا۔" بڑی بھابھی ہنسیں۔

اور میری ملاقات زویا سے پھر اگلی صبح ہی ہوسکی تھی کیونکہ میں بے حد تھکا ہوا تھا اور سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

صبح میری آنکھ جلدی کھل گئی۔ میں کمرے سے نکل کر کچن میں آیا کہ اگر وہاں کوئی ہو تو اسے چائے کے لیے کہوں۔ زویا کھڑی چائے بنا رہی تھی۔

"کہاں غائب ہو بھئی۔ میں کل سے آیا ہوں اور تم نظر نہیں آرہیں۔"

"ہم جب آئے تو تم سوچکے تھے۔"

اس نے بس ایک نظر ہی مڑ کر مجھے دیکھا تھا اور پھر پیالیوں میں قہوہ ڈالنے لگی۔

"میرے لیے بھی ایک کپ بنادو۔"

"تمہارے لیے ہی بنا رہی ہوں۔" اس نے مڑ کر مجھے نہیں دیکھا۔

"دوسری محترمہ کا کیا حال ہے۔ کیا اب ان کا دیدار شادی کے بعد ہی ہوگا؟"

"یقیناً"۔"

اس نے چائے بنا کر کپ مجھے پکڑایا اور دوسرا کپ اٹھا کر یہ کہتے ہوئے نکل گئی۔

میں چائے کا کپ لیے اپنے کمرے میں آیا تو وہاں چھوٹے بھائی بیٹھے تھے۔

"میں نے تمہاری بھابھی سے کہا ہے ہم دونوں کا ناشتا ادھر ہی لے آئیں پھر کہیں جانا ہے۔"

"کہاں؟"

"پارلر درزی سے تمہارے کپڑے اٹھانے ہیں۔"

"اچھا ناشتا کرکے شیو بنالوں... پھر چلتے ہیں۔ میں جوتے نہیں لے سکا۔ ٹائم نہیں ملا تھا۔"

"ایک کام کہا تھا — وہ بھی نہیں ہوسکا۔ خیر جا رہے ہیں تو لے لیں گے... لیکن شیو وغیرہ مت کرو

اب کل ہی کرنا دولہا بننے سے پہلے۔" وہ مسکرائے۔
"تم خوش تو ہو نا؟"
میں چائے پی رہا تھا جب انہوں نے اچانک پوچھا تو میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔
"میں نے اماں سے کہا تھا' تم سے ضرور پوچھ لیں۔"
"ہاں پوچھا تو تھا انہوں نے۔"
"اچھا... میرا خیال تھا شاید تم زویا سے؟ میرا مطلب ہے تم زویا کو پسند کرتے ہو؟"

☼ ☼ ☼

اس وقت تو مجھے چھوٹے بھائی کی بات صحیح نہیں لگی تھی لیکن ٹھیک ایک سال' ایک ماہ' دس دن بعد میں سوچ رہا تھا چھوٹے بھائی نے کتنا صحیح کہا تھا۔
یعنی میں نے اتنا عرصہ اس غلط فہمی میں گزار دیا کہ میں مایا کے ساتھ بہت خوش گوار ازدواجی زندگی گزار رہا ہوں۔ ویسے تو اس میں کچھ اتنا جھوٹ بھی نہیں تھا۔ میری زندگی بہت خوش گوار تھی۔
مایا دلہن بن کے بے حد حسین لگ رہی تھی' جب اسے اسٹیج پر لایا گیا تھا تو میں ایک دم کھڑا ہو گیا تھا۔ مگر وہ مجھے اداس سی لگی تھی حالانکہ اسے بہت دور نہیں جانا تھا۔ مگر شاید لڑکیاں اتنی نازک دل ہوتی ہیں کہ اس موقع پر دل بھر ہی آتا ہے۔
کچھ دیر بعد زویا کو بھی اسٹیج پر لایا گیا تھا وہ بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ اس کی بے حد خوب صورت آنکھیں بیوٹیشن نے اور بھی قاتل بنا دی تھیں۔
اسے مصنوعی پلکوں کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی اپنی پلکیں ہی اتنی خوب صورت تھیں۔ لمبی' گھنی مڑی ہوئی' جیسے خوب صورت جھیلوں کے گرد سیاہ جنگل۔
وہ دونوں میرے دائیں بائیں بیٹھی تھیں۔ میرا نکاح ہو چکا تھا اور اب زویا کو انگوٹھی پہنائی جانی تھی ۔ انگوٹھی چچی نے پہنائی۔ کیونکہ خرم سعودیہ میں تھا۔ زویا زیادہ دیر نہیں بیٹھی تھی' منگنی کی تقریب کے فوراً" بعد اٹھ گئی تھی۔ مایا میرے پہلو میں بیٹھی تھی۔ دمکتی گلابی رنگت والی سب ہی دلہن کی تعریف کر رہے تھے۔
اور پھر ولیمہ والے دن بھی وہ مجھے سب سے الگ اور منفرد لگی۔ اس کی سانولی رنگت میں بلا کی ملاحت تھی جو میک اپ سے دمک اٹھتی تھی۔

☼ ☼ ☼

ناران میں دریائے کنہار کے کنارے بیٹھ کر اس میں پتھر پھینکتے ہوئے' جھیل سیف الملک کی طرف جاتے ہوئے' میرا ہاتھ پکڑ کر گلیشیر پر چلتے اور تنگ پگڈنڈی پر آگے پیچھے چلتے ہوئے لالہ زار کی بلندیوں پر بیٹھے ہوئے مجھے ایک بار بھی وہ اتنی خوش نہیں لگی تھی جتنا کہ اسے لگنا چاہیے تھا۔
"مایا! کیا تم یہاں آکر خوش نہیں ہو۔ کیا تم کہیں اور جانا چاہتی تھیں؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔
"مجھے یاد تھا جب پہلے ہم یہاں آئے تھے۔ تو تم نے کہا تھا۔ کاش میں پھر بھی یہاں آسکوں۔ میں نے تب ہی یہاں کا پروگرام بنایا تھا' حالانکہ چھوٹے بھائی کہہ رہے تھے بھوربن چلے جاؤ لیکن اب مجھے لگ رہا ہے جیسے تم خوش نہیں ہو میں یہاں آکر۔ ہیں نا۔"
"میں خوش ہوں لیکن پہلی بار جو ایکسائٹمنٹ ہوتی ہے وہ دوسری بار تو نہیں ہو سکتی نا۔"
"ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" مجھے اس کی بات صحیح لگی۔
سو میں نے مزید کسی بات پر غور نہیں کیا۔
مایا کے متعلق کوئی بھی شخص پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ بہت اچھی بیوی ہے۔ وہ میری بیوی تھی' میری دوست اور غمگسار تھی۔ ہماری زندگی بہت پرسکون تھی۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ مجھے ہر چیز تیار ملتی' میرے کپڑے' جوتے' میرے آفس کے کاغذات فائلیں سب۔
وہ کھانا بہت عمدہ پکاتی تھی۔
مجھے ذرا سا زکام بھی ہوتا تو وہ ساری رات جاگتی

تھی۔ اور جب اسے کوئی تکلیف ہوتی تو میں بھی سو نہ پاتا۔ مثالی زندگی تھی ہماری لیکن پھر بھی کبھی کبھی بہت خالی پن لگتا تھا۔ ایک بار میں نے مایا سے کہا۔
"یار! تم کیسی بیوی ہو کبھی لڑتی شڑتی نہیں ہو۔ نہ کوئی فرمائش' نہ کوئی ضد۔"
"ہم بچپن سے اکٹھے رہتے آرہے ہیں۔ کیا پہلے کبھی ان سالوں میں ہماری لڑائی ہوئی؟"
"لیکن اب تو تم بیوی ہو۔ بیویوں کا تو حق بنتا ہے لڑنا۔"
میں شاید اس خاموشی' اس سکون کو توڑنا چاہتا تھا جو کبھی کبھی مجھے بے طرح محسوس ہوتی تھی۔
"لیکن میں تم سے لڑ نہیں سکتی۔ کبھی بھی نہیں۔" مایا اس لمحے مجھے بڑی اداس لگی۔
"اچھا... میں اگر دوسری شادی کرلوں تب بھی نہیں؟" میں نے سر کے نیچے ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔
"تب بھی نہیں۔ کیونکہ مجھے پتا ہے تم دوسری شادی کبھی نہیں کرو گے۔"
"اور اگر مجھے کسی سے محبت ہو جائے تو؟"
وہ ہنس پڑی۔
"تمہیں کسی سے محبت نہیں ہو سکتی۔" اس کے یقین پر میں مسکرا دیا۔
"تم صحیح کہتی ہو' مجھے اپنے ماں باپ اور بھائیوں کے علاوہ اگر کسی سے محبت ہوئی تو وہ صرف تم اور زویا ہو... لیکن جب تک تم سے شادی نہیں ہوئی تھی اس محبت کی نوعیت مختلف تھی' لیکن اب تم میری زندگی میں شامل ہو گئی ہو' زویا ہمارے درمیان سے نکل کر اپنا الگ زاویہ بنا لے گی خرم کے ساتھ' لیکن ہمارے درمیان وہ ابتدائی محبت کبھی ختم نہیں ہوگی جس کی جڑیں ہمارے اندر ہیں۔"
"بچپن کی محبتوں کی ڈیمانڈ اور ہوتی ہے اور جوانی کی محبتوں کی اور۔" پتا نہیں اس نے کیوں کہا تھا۔
میں اس کی بات نہیں سمجھا تھا' لیکن میں نے اس کی تائید ضرور کی تھی۔

آج ہمارے درمیان روزمرہ کے معمولات سے ہٹ کر باتیں ہو رہی تھیں۔ شادی سے پہلے مایا اتنی کم گو نہیں تھی' جتنی اب ہو گئی تھی۔ میں بھی کچھ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ میں بھی پہلے بہت بولتا تھا۔ ہماری باتیں ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔ جب تک ہم تینوں ایک دوسرے کو دن بھر کی روداد سنا نہ لیتے' ہمیں چین نہ آتا تھا۔ لیکن اب میں گھر آتا تو کھانا کھاتے ٹی وی دیکھتے کبھی مجھے اسے دفتر میں گزرے دن کا احوال سنانے کا خیال نہ آتا تھا اور نہ ہی مایا نے مجھے کبھی بتایا تھا کہ دن بھر اس نے کیا کیا۔ فارغ وقت میں کیا کرتی ہے۔

☼ ☼ ☼

کراچی میں تقریباً" ایک سال رہنے کے بعد مجھے واپس لاہور بلوا لیا گیا۔ لاہور واپس جانے کا سن کر مایا بے حد خوش ہوئی تھی۔ ہم جب گھر پہنچے تو زویا یونیورسٹی میں تھی۔ ایک ماہ بعد اس کے فائنل پیپرز ہونے والے تھے۔
ہم سب لاؤنج میں بہت دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ چچی کھانے کا انتظام کرنے کے لیے کچن جانے لگیں تو مایا بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ دونوں بھابھیاں پہلے ہی کچن میں تھیں۔ میں کچھ دیر اماں ابا اور چچا سے باتیں کرتا رہا اس دوران بڑی بھابھی اور چھوٹی بھابھی نے دو بار چائے بھجوائی تھی۔
"ارے بہو! لنچ بھی کرنا ہے اس نے۔" چھوٹے چچا نے بڑی بھابھی سے کہا جب وہ دوسری بار چائے لائیں تو۔
"چچا جان! یہ چائے ان کی نصف بہتر بھجوا رہی ہیں۔"
اس لمحے مجھے مایا پر بہت پیار آیا۔ وہ جانتی تھی کہ میں کراچی آنے کے بعد چائے زیادہ پینے لگا تھا۔ اپنی اماں سے باتیں کرتے ہوئے بھی اسے میرا خیال تھا۔
"بیٹا تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔ پھر کھانے پر ملاقات ہوتی ہے۔" چچا اٹھے تو میں بھی ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا لاؤنج سے باہر آیا تو تھکی تھکی سی زویا اندر آرہی تھی۔

کشادہ پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔

"زوئی۔"

میں بے اختیار اس کی طرف بڑھا تھا۔

"زین۔۔۔ کیسے ہو۔"

اس نے اپنی لمبی گھنی پلکیں اٹھائیں' وہ گھنی لانبی پلکیں جنہیں دیکھ کر مجھے سیاہ گھنیرے جنگلوں کا خیال آتا تھا۔

مجھے اس کی آنکھیں سیاہ بادلوں کی طرح لگیں' جو پانیوں سے بھرے ہوتے ہیں یا پھر منجمد جھیلیں جن کے نیچے بہت سارا پانی ہوتا ہے۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور میں اس کی طرف۔۔۔ اور پھر جیسے کائنات کی گردش تھم گئی تھی کائنات میں صرف ہم دونوں تھے آس پاس کے سب مناظر۔۔۔ دھند میں گم ہو گئے تھے۔ میرا دل کسی انوکھی تال پر رقص کر رہا تھا۔

میں سحر زدہ سا اسے دیکھ رہا تھا اور وہ میری آنکھوں کے سحر میں گرفتار ہو گئی تھی۔۔۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اسے گلے لگا لوں۔ اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لوں اور اس طرح ملوں جیسے برسوں سے بچھڑے ملتے ہیں۔۔۔ لیکن میں ساکت کھڑا اسے دیکھتا رہا اور وہ مجھے دیکھتی رہی پھر شاید کسی کی ہنسی کی آواز آئی تھی۔ شاید بڑی بھابھی کی۔ انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بہت ہنسی آتی تھی۔ اس نے چونک کر نظریں جھکا لیں اور طلسم ٹوٹ گیا۔

"تم کیسی ہو زویا!"

مجھے اپنی آواز خود اجنبی سی لگی تھی جیسے اس میں ہزاروں آنسو ہوں۔۔۔ کسی بہت اپنے کے بچھڑ جانے' کھو جانے کے غم میں بہنے والے آنسو۔

"ٹھیک ہوں۔"

"کمزور لگ رہی ہو۔"

"ہاں نہیں تو۔۔۔ ٹھیک ہوں۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور میں نڈھال سا اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر گر گیا۔

کیا ہمارے پاس کرنے کے لیے کوئی بات نہیں تھی۔۔۔ ایک سال بعد ملنے کے باوجود ہمارے پاس کرنے کے لیے کوئی بات نہیں تھی؟

وہ رکی کیوں نہیں؟

اس نے مایا کا بھی نہیں پوچھا۔

"مجھے میرا خیال تھا شاید۔۔۔ تم زویا کو پسند کرتے ہو۔"

چھوٹے بھائی جان کی آواز میرے کانوں میں گونجی

اپنی شادی کے ٹھیک ایک سال نو دن بعد مجھے احساس ہوا کہ در اصل میں زویا کی محبت میں مبتلا ہو گیا اور۔۔۔ محبت بھی ایسی جو عشق جیسی ہو۔

جسم و جاں کو جلاتی تڑپاتی۔

میرے اندر خاموشیاں اتر آئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

میرے اور مایا کے درمیان جو تھوڑی بات چیت ہوتی تھی وہ بھی برائے نام رہ گئی تھی۔۔۔ اور یہاں اس گھر میں بطور خاص مجھے اسے مخاطب کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ ناشتا کھانا سب کے ساتھ ٹیبل پر بیٹھ کر کھا لیا جاتا۔

رات کو جب تک وہ فارغ ہو کر کمرے میں آتی تو میں سو چکا ہوتا۔ یا کسی کام میں مصروف ہوتا اور زویا۔۔۔ اس سے بھی بہت کم نہ ہونے کے برابر بات ہوتی تھی ۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہ کر پڑھتی رہتی تھی۔

کبھی کھانے کی ٹیبل پر وہ نظر آتی تو میری نظریں اسے اپنے حصار میں لے لیتی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا بس اسے دیکھتا رہوں۔ مایا کہیں پس منظر میں چلی گئی تھی۔

میں تو سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے صرف زویا کو ہی دیکھتا تھا۔۔۔ وہ میرے سامنے نہیں ہوتی تو بھی میرے تصور میں رہتی تھی۔ ہر آن ہر لحہ۔

میں ہر روز خود سے عہد کرتا کہ کل سے مایا پر زیادہ توجہ دوں گا اور زویا کو سوچوں گا بھی نہیں' لیکن زویا کو نہ سوچنا میرے اختیار میں نہیں تھا اور مایا۔۔۔ میں زبردستی دو بار اس کے ساتھ باہر بھی گیا کھانا کھانے' لیکن ہمارے درمیان خاموشی نہ ٹوٹی۔

"کیا بات ہے مایا! یہاں آ کر تم کچھ زیادہ ہی خاموش نہیں ہو گئی ہو۔ میں تو ترس گیا ہوں تمہاری آواز سننے کو۔"

میں نے کوشش کی تھی کہ ہمارے درمیان جو فاصلے پیدا ہوتے جا رہے ہیں' ختم ہو جائیں۔ اس نے بس ایک نظر مجھے دیکھا۔

"تم خود ہی بہت مصروف رہتے ہو زین!"

میں اندر ہی اندر شرمندہ ہو گیا لیکن اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے ہنسا تھا۔

"نہیں یار! تم بھی تو بہت مصروف رہنے لگی ہو۔"

میں اس کا خیال ذہن سے جھٹکنے کے لیے مایا کے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرتا تو وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھتی۔

میں نے شاید کبھی بھی صحیح فیصلہ نہیں کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں بازار سے کوئی چیز پسند کر کے لے آتا مگر گھر آ کر مجھے وہ ناپسند ہو جاتی تھی اور پھر شور ڈالتا کہ یہ واپس کریں مجھے کچھ اور لینا تھا۔۔۔ لیکن مایا اور زویا کوئی چیز نہیں تھیں کہ میں کہتا مجھے مایا نہیں چاہیے۔ زویا دے دو۔

یہ کیا ہو گیا تھا کہ میں خود سے ہی نظریں چرائے پھرتا۔ آفس سے اٹھتا تو سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا پھرتا۔

"کہاں ہوتے ہو یار۔" ایک روز چھوٹے بھائی نے مجھے پکڑ لیا۔ "تمہارا آفس کیا رات کو بھی کھلا رہتا ہے۔"

اس روز میں رات دیر سے گھر میں داخل ہوا تھا۔

"نہیں' بس یونہی ایک دوست کے پاس چلا گیا تھا۔!"

حالانکہ میرے کوئی دوست نہیں تھے۔ جیسے زویا اور مایا کی کوئی خاص سہیلیاں نہیں تھیں۔ ہم نے کبھی کسی اور کو دوست بنانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

"کیا کوئی بات تمہیں پریشان کر رہی ہے برادر۔"

چھوٹے بھائی کی نظریں بہت تیز تھیں۔

"نہیں تو۔۔۔" میں نے نظریں چرائیں۔

"تم دونوں۔۔۔ میرا مطلب ہے تم اور مایا خوش تو ہو نا ایک دوسرے کے ساتھ۔۔۔"

"ناخوش ہونے کی تو کوئی بات نہیں ہے بھائی!"

تب ہی میں نے زویا کو اپنے کمرے سے نکل کر کچن کی طرف جاتے دیکھا اور میری نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا۔

چھوٹے بھائی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کوئی ایسی غلطی مت کرنا زین! جس سے پورے خاندان کی بنیادیں ہل جائیں۔"

اپنی بات کہہ کر وہ رکے نہیں تھے اور میں سُن ہو گیا تھا۔ یہ چھوٹے بھائی نے کیا کہا تھا۔۔۔

چھوٹے بھائی کی نظر بہت گہری تھیں۔ وہ اس وقت بھی جانتے تھے جب میں نہیں جانتا تھا۔ اور اب بھی وہ جانتے تھے' جو میرے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔

چھوٹے بھائی کی تنبیہہ کے بعد میں نے زویا کی طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔ کھانے کی بڑی سی ٹیبل پر بھی میں اس طرح بیٹھتا کہ زویا پر براہ راست میری نظر نہ پڑے' لیکن کیا دریاؤں پر بند باندھے جا سکتے ہیں؟

لیکن میں بند باندھ رہا تھا اور ہر بار پانی کا کوئی زور آور ریلا آ کر اس بند کو توڑ دیتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس روز زویا تیار ہو کر پورچ میں کھڑی تھی۔ اسے یونیورسٹی جانا تھا۔ اس کے پیپرز شروع ہو چکے تھے۔ میں آفس جانے کے لیے نکل رہا تھا۔

"کھڑی کیوں ہو زویا؟"

"بڑے بھائی کا انتظار کر رہی تھی۔"

"بڑے بھائی تو ابھی اٹھے ہیں' ناشتا کر رہے ہیں تمہیں دیر ہو جائے گی۔ میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

وہ تھوڑا سا جھجکی لیکن پھر خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں ہمارے درمیان عجیب سی جھجک آ گئی

تھی۔۔۔ ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی ہمارے درمیان اس طرح کی اجنبیت در آئے گی۔

"تمہاری تیاری کیسی ہے زوئی!"

"ٹھیک ہے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"واپسی پر بھی میں تمہیں پک کرلوں گا۔ کتنے بجے پیپر ختم ہوگا۔"

"بارہ بجے۔۔۔ لیکن میں چلی جاؤں گی۔"

"نہیں میں لنچ کے لیے اٹھوں گا تو تمہیں گھر چھوڑ دوں گا اور صبح بھی تمہیں ڈراپ کردیا کروں گا ۔خوامخواہ پوائنٹ کے لیے خوار ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور مجھے جواب کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں ہر روز صبح اسے لے جانے لگا تھا۔ ہمارے درمیان دو تین مختصر جملوں کے اور کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔

اس روز اس کا آخری پیپر تھا۔

"تھینک گاڈ۔۔۔ آج جاکر خوب سوؤں گی۔"

اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔

"یعنی آج فارغ ہوگئی ہو۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔"

"تو چلو آئس کریم کھلاتا ہوں تمہیں۔"

اس سے پہلے بھی بہت دفعہ ہم آئس کریم کھانے گئے تھے، لیکن آج اس نے فوراً" نفی میں سر ہلایا تھا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں زین گھر ہی چلو۔"

لیکن میں نے گاڑی کا رخ اپنے پسندیدہ آئس کریم پارلر کی طرف کردیا تھا۔ ہم زیادہ تر شام یا رات کو آتے تھے۔ اس وقت دن کے ساڑھے بارہ بجے وہاں بالکل بھی رش نہیں تھا۔

میں نے بیٹھتے ہی اس کے اور اپنے پسندیدہ فلیور کا آرڈر دیا۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

اس کی لانبی پلکوں کا سایہ اس کے رخساروں پر پڑ رہا تھا۔ میں مبہوت سا اسے دیکھے جارہا تھا۔ گردو پیش سے بے خبر۔

یہ میرے ساتھ کیا ہوگیا تھا۔ میں نے کیا کھویا تھا۔ میرا دل بالکل خالی تھا اوندھے پیالے کی طرح۔ کھوئی ہوئی چیزیں کبھی کبھی مل بھی تو جاتی ہیں۔ میرے سامنے پڑی آئس کریم پگھل رہی تھی اور میں اسے دیکھے جارہا تھا۔

کیا مجھے بھی میری کھوئی ہوئی چیز مل جائے گی۔

میری محبت۔۔۔ میری زوئی۔۔۔

زویا نے آئس کریم کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ میرا ارتکاز ایک لمحے کے لیے ٹوٹا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں پھر اسے دیکھ رہا تھا۔

"زوئی۔"

میں میز پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا آگے جھکا ہوا تھا۔

"مجھے پتا۔۔۔ کیوں نہیں چلا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔ محبت نہیں عشق۔۔۔"

"تم شروع سے ہی ایسے تھے۔ تمہیں ہمیشہ بعد میں پتا چلتا تھا کہ کیا ہونا چاہیے۔"

اس نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائی تھیں۔

"لیکن اب ان سب کا کیا فائدہ۔"

"میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔۔۔ نہ بتاتا تو میرا دل پھٹ جاتا۔۔۔"

"مجھے پتا تھا۔ پہلے سے پتا تھا۔"

اس نے آئس کریم کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں زوئی۔۔۔ تم نے بھی اور ماما نے بھی۔ کسی نے کچھ نہیں بتایا۔"

"فیصلے کا اختیار تمہارے ہاتھ میں تھا زین! اور اب اسے نبھانا بھی تم نے ہے۔"

وہ یکدم کھڑی ہوگئی تھی۔

"تم نے جو فیصلہ کیا' ماما اور میں نے اسے قبول کرلیا۔ کیونکہ ہم نے کبھی تمہاری کسی بات کو ڈس اون نہیں کیا تھا۔ حالانکہ ماما تو۔۔۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"فیصلہ میں نے نہیں کیا تھا زویا! میں نے تو سب کے فیصلے کو تسلیم کیا تھا۔"

"ہاں' لیکن تمہیں اختیار دیا تھا کہ تم اس فیصلے کو تسلیم نہ کرتے۔ کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔" وہ آگے بڑھ گئی۔

"زویا! ایک بات بس ایک بات اور بتادو۔" میں تیز تیز چلتا اس کے ہم قدم ہوا۔

"کیا تم بھی۔۔۔ تم بھی ایسا ہی چاہتی تھیں کہ تم اور میں؟"

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا' لیکن اس کی لرزتی پلکوں اور آنکھوں میں پھیلتی نمی سے مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

"ماما بہت اداس رہتی ہے۔" اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ "اسے خوش رکھنے کی کوشش کیا کرو۔"

یہ مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ۔۔۔

اس نے اس رشتے کے حوالے سے مجھے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اس کے دل نے حسان کو پسند کیا تھا جو اس کی کسی کلاس فیلو کا بھائی تھا۔

میں نے اسے آڑے ہاتھوں لے لیا کہ مجھے کیوں نہ بتایا۔ میں خود حسان سے ملتا اور چچا چچی سے بات کرتا۔۔۔

"میں نے سوچا اگر میں نے انکار کردیا تو تم ہرٹ ہوگے۔ شاید تمہیں بہت دھچکا لگے تو اور میں حسان سے کوئی ایسی شدید محبت نہیں کرتی تھی' وہ بس اچھا لگتا تھا مجھے۔۔۔" اور میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

"تم نے یہ اچھا نہیں کیا ماما؟"

"تم نے بھی تو اچھا نہیں کیا زین! اپنے ساتھ' زویا کے ساتھ۔۔۔"

اور ہمارے پاس بات کرنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔

☼ ☼ ☼

زویا کی شادی ہوگئی۔ چچا کی طبیعت خراب تھی سو خرم ایک ماہ کی چھٹی پر آیا اور ایک ماہ بعد چلا گیا۔

میں ماما کو خوب شاپنگ کراتا۔ محبت کے لمبے لمبے ڈائیلاگ بولتا۔ اسے گھمانے' کھانا کھلانے لے جاتا۔ آفس کی ادھر ادھر کی سینکڑوں باتیں کرتا۔ لیکن ماما کبھی پورے طور پر خوش نظر نہیں آتی تھی۔

"عورت کبھی آدھے ادھورے مرد کے ساتھ خوش نہیں رہتی۔"

ایک بار چھوٹے بھائی نے کہا تھا اور میں زویا کے بغیر ادھورا تھا۔۔۔ محبت کا ادراک تو مجھے بعد میں ہوا تھا' لیکن میں پہلے دن سے ہی اسے پورا نہ ملا تھا۔

ہماری مثلث کے تینوں خط الگ الگ ہوگئے تھے۔ بچپن کی معصومیت میں کبھی ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ہم نے دعا مانگی تھی کہ ہم تینوں ہمیشہ اکٹھے رہیں اسی گھر میں اور وہ واقعی لمحہ قبولیت تھا۔۔۔ ہم تینوں اسی گھر میں تھے' لیکن ہماری مثلث ٹوٹ گئی تھی۔۔۔ ساتھ ساتھ ہونے کے باوجود ہم میں کوئی رابطہ نہ تھا۔

میں ہر وقت ٹرانسفر کی کوشش میں لگا رہتا۔ میں اکثر بے وقت کھانا کھاتا۔ دیر سے ٹیبل پر آتا جب زویا جاچکی ہوتی' لیکن مجھے پتا تھا وہ خرم کو خط لکھتی ہے اور فون کرتی ہے کہ وہ اسے جلد سعودیہ بلالے۔

میں کبھی کبھی ماما کے ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔

"ماما میرے لیے دعا کریں۔۔۔ میں پورا سموچا تمہارا ہونا چاہتا ہوں۔۔۔ میں اس سحر سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ جس میں شادی کے ایک سال ایک ماہ نو دن بعد میں گرفتار ہوگیا تھا۔" ماما پورے ضبط سے میری بات سنتی۔

اور زویا فون پر فون کیے جاتی کہ خرم جلد آکر اسے لے جائے۔۔۔ تاکہ میں اور ماما خوش رہ سکیں۔

میں فیصلہ نہیں کرپاتا کہ میں نے زویا کی محبت میں مبتلا ہوکر غلطی کی یا ماما کو دل سے قبول نہ کرکے۔ مگر اس اعتراف میں کوئی شبہ نہیں کہ میری زندگی میں آنے والی دونوں عورتیں اعلا ظرف ہیں۔ ان دونوں عورتوں کے دل۔۔۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔

یہ عورت کا دل

اور یہ عورت کا دل

☼

ادھوری تصویر

سمیرا عثمان گل

تین سال بعد اس کے قدموں نے اپنے ملک کی سرزمین کو چھوا تو دل کو جیسے پنکھ لگ گئے' کاش وہ پہلے اپنے گھر جا سکتی مگر یہ سسرال کے جھنجھٹ' خاص آرڈر تھا کہ پہلے وہاں قیام کیا جائے۔

ایئرپورٹ سے باہر نکل کر وہ ڈرائیور کے انتظار میں کھڑے تھے جو انہیں دیکھ کر خود ہی قریب آچکا تھا عنصر نے گاڑی میں سامان رکھوایا اور خود گھوم کر بیک سیٹ پر آن بیٹھا جہاں وہ اذان کو اٹھائے پہلے ہی بیٹھ چکی تھی اور پھر گاڑی لاہور کی شاہراہ پر فراٹے بھرنے لگی تھی ایک کے بعد دوسرا منظر گزر رہا تھا مسافت سمٹ رہی تھی اور اس کی بے چینیوں میں اضافہ ہو رہا تھا اور اسی اضطراب میں گھری وہ دونوں ہتھیلیوں کو بار بار آپس میں رگڑ رہی تھی۔ تبھی ـــــ عنصر کی آواز آئی۔

"کچھ کھانا ہے؟" گردن گھما کر اس نے ساتھ بیٹھے اپنے ہم سفر کو دیکھا جو کھڑکی سے سر باہر نکالے مختلف ریسٹورنٹس کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جسے اس نے زندگی میں سب سے زیادہ چاہا تھا۔ جس سے وہ گھنٹوں باتیں کرنے کے لیے ترسا کرتی تھی آج وہ بول رہا تھا اور وہ محض ہوں ہاں میں ہی جواب دے رہی تھی۔

ابھی بھی بے دلی سے اس نے نفی میں سر ہلایا تھا اس کا موڈ نہ دیکھ کر وہ بھی اب خاموش ہو چکا تھا۔

تبھی یک دم گاڑی نے یوٹرن لیا اور مریم کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا سامنے بائیک پر ارحم تھا۔

وہ اسے دیکھ کر بے اختیار کھڑکی پہ جھکی تھی مگر وہ زن سے بائیک کو اڑا لے گیا تھا اس نے اسے دیکھ کر بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ مریم کے دل میں جیسے چھن سے کچھ ٹوٹ گیا اتنے سالوں کی دوری بھی اس کی ضد نہیں توڑ سکی تھی وہ آج بھی اس سے ویسا ہی بے نیاز اور لاتعلق تھا۔

جیسا اس کی رخصتی کے لمحے میں' جب اس کی بہن اسے رخصت کر رہی تھی تب پیچھے سے کسی نے کہا تھا کہ بھائی کو رخصت کرنا چاہیے وہ کچھ ہی فاصلے پہ کھڑا تھا۔ دلہن بنی مریم رک گئی تھی۔

اس نے امید بھری نظروں سے اپنے بھائی کو دیکھا تھا۔

مگر وہ یونہی پتھر کے بت کی مانند سپاٹ سے تاثرات لیے اپنی جگہ جم کر کھڑا رہا تھا۔

"مریم چلو گھر آگیا ہے۔" عنصر کی آواز نے اسے چونکایا وہ اس کی گود سے اذان کو اٹھا رہا تھا وہ دوسری جانب سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

سسرال میں اس کا خوب والہانہ استقبال ہوا تھا سب نے ہال میں ہی ڈیرا جما لیا اس کی تینوں نندیں شوخ و شنگ طبیعت کی مالک تھیں بے تحاشا ہنسنے والی مگر اسے ان ساری خوش گپیوں' لطیفوں باتوں چٹکلوں سے شدید کوفت ہو رہی تھی نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا مسکرا ــــ کر اس کے جبڑے دکھنے لگے تھے۔

بس نہیں چل رہا تھا کہ سب لوگوں کو منظر سے غائب کرنے کے بعد اڑ کر سڑک کنارے موجود نیلے ٹائلز والے گھر کی گھنٹی بجا دے۔ ایک ایک نوالہ اس نے گن گن کر کھایا اس کے بعد کافی کا دور چل نکلا تھا اور پھر گفٹس کی باری آگئی۔

"اب بہو کو دو گھڑی آرام بھی کرنے دو۔" اماں نے

اپنی بیٹیوں کو گھورا مگر انہیں اپنے گفٹس دیکھے بغیر کہاں چین تھا بچے الگ اودھم مچا رہے تھے مریم کو مزید ان کے تبصروں تک وہاں رکنا پڑا۔

اذان راستے میں ہی سو چکا تھا جب سب اپنے کمروں میں جا چکے تو اس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور عنصر کو بتا کر گھر سے باہر نکل آئی۔

اب اس کے قدم ٹائلز والے گھر کی سمت اٹھ رہے تھے۔ دل کی عجیب کیفیت سی ہو رہی تھی آج تین سال بعد وہ اماں سے ملنے والی تھی گیٹ کے قریب پہنچ کر مکمل استحقاق کے ساتھ اس نے ڈور بیل پہ ہاتھ رکھ دیا۔

مگر یہ کیا دروازہ نہیں کھلا تھا وہ کچھ مایوس سی ہوئی اس سے قبل کہ پلٹ جاتی عنایہ کی آواز گیٹ کے اس پار سے آئی تھی۔

"کون ہے۔"

"میں ہوں۔" وہ محض اتنا ہی کہہ پائی تھی جب

دروازہ کھل گیا۔

"آپ کون؟" عنایہ نے اس سے سپاٹ سے انداز میں پوچھا تھا۔

"میں مریم ہوں تمہاری خالہ۔" وہ اسے پیار کرنے کو آگے بڑھی تو عنایہ دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اسے خفگی بھری اجنبی نظروں سے دیکھا۔

"نانو اور مما بازار گئی ہیں جاتے ہوئے دروازہ بند کر جائیے گا۔" کہہ کر وہ اوپر چھت پر بھاگ گئی تھی۔

مریم کچھ دیر وہیں سن سی کھڑی رہی پھر اندر برآمدے میں چلی آئی سامنے ہی اماں کی سلائی مشین رکھی تھی۔ خالی کمرے باتیں کر رہے تھے۔ کبھی اسے گھر میں تنہا رہنے کا کتنا شوق ہوا کرتا تھا وہ دعائیں مانگا کرتی تھی کہ اماں آج تو کسی بھائی بہن کی طرف چکر لگا لیں اور وہ گھر میں اکیلی رہے تب اسے عنصر سے خوب ڈھیر ساری باتیں جو کرنا ہوتی تھیں سہیلیوں کو اکٹھا کر کے وی سی آر پہ فلمیں دیکھنے کا بھی الگ ہی مزہ ہوتا تھا کچن میں جو ہڑبونگ مچتی وہ الگ۔

چلتے ہوئے وہ ارحم کے کمرے میں آئی تو وہ کمرہ آج بھی بالکل ویسا ہی تھا۔ اس میں اماں کی پیٹیوں کے علاوہ تین الماریاں اور ایک انگیٹھی تھی ایک الماری میں ان سب کے کپڑے تہہ لگا کر رکھے ہوئے تھے۔

دوسری میں کانچ کے برتن اور تیسری میں اماں کی سلائی کا سامان بکرم 'نلکیاں' موتیں وغیرہ رکھی ہوئی تھیں۔ کارنس پہ چار سینریاں دو گلدان ایک ٹائم پیس اور دو تصویریں تھیں ایک تصویر اس کے اور ارحم کے بچپن کی تھی جس میں اس نے سفید اسکرٹ پہن رکھا تھا اور ارحم نے نیلی پینٹ پہ سفید شرٹ 'اس کا ایک ہاتھ کمر پہ تھا اور دوسرا ارحم کے شانے پر' ارحم زبان باہر نکال کر اسے چڑا رہا تھا اور اس کی صورت کچھ رونی سی بنی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود یہ تصویر بہت کیوٹ تھی۔

دائیں دیوار کے ساتھ کمپیوٹر ٹیبل تھی اور دو چلتے پائیاں وہ کپڑوں والی الماری کے قریب آن کھڑی ہوئی تھی کبھی اس میں ان تینوں بہن بھائیوں کے کپڑے ہوا کرتے تھے آج اس میں بس اماں اور ارحم کے کپڑے رہ گئے تھے۔

وہ مڑی تو نظر کمپیوٹر ٹیبل کے اوپر لگی الگنی سے ٹکرا گئی اس پر ارحم کی ڈریس پینٹ لٹک رہی تھی۔

"اماں یہ جان کر پینٹ کی کریز ٹھیک سے نہیں بناتی۔" اسے اسکول سے دیر ہو رہی ہوتی تھی اور وہ کبھی اس کا بیگ کبھی کتابیں تو کبھی نوٹس چھپا دیتا تھا۔

"جب تک کریز ٹھیک سے نہیں لگاؤ گی میں جانے نہیں دوں گا۔" اسے لگا جیسے وہ ابھی برآمدے میں کھڑے لڑ رہے تھے۔

اس نے دوسرے کمرے میں جھانکا وہاں ایک چارپائی' سنگل بیڈ' فریج اور ایک بڑی سی دیوار گیر الماری تھی دیوار گیر الماری کے آگے اب فریم شدہ شیشے لگ چکے تھے ورنہ جب بھی اس کا اور مہو کا دھواں دھار قسم کا جھگڑا ہوتا تو وہ ساری الماری کے برتن نکال کر دھونے بیٹھ جاتی تھی مگر در پردہ وہ اسے چڑانے کے لیے ایسا کرتی تھی کیونکہ اماں زبردستی اسے مہو کے ساتھ لگا دیتی تھیں اور پھر گھر میں جو طوفان بدتمیزی بپا ہوتا' کشن' تکیے' گلدان وہ تابڑ توڑ ایک دوسرے پہ برساتے اور زبان سے ساری عمر ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھنے کی قسمیں کھائی جاتی تھیں۔

مریم اسے تپانے کی خاطر ڈرائنگ روم کے صوفوں پر چڑھ کر رسالے پڑھا کرتی تھی' صوفے اس نے اپنی کمیٹی کے پیسوں سے بنوائے تھے وہ اور ارحم جو گھڑی دو گھڑی کے لیے ان پر لیٹ جاتے تو اس کی جان پر بن آتی تھی۔

"جاہلوں کو بیٹھنے کی بھی تمیز نہیں ہے ڈرائنگ روم مہمانوں کے لیے ہوتا ہے۔" اس کی آواز ماضی کے کسی ادھ کھلے دریچے سے آئی تھی۔ مریم نے صوفے پر بیٹھ کر دیکھا مگر آج اس روز جیسا مزہ نہیں تھا۔ لمحے جیسے ریت کی مانند ہاتھ سے پھسل گئے تھے وقت اتنی جلدی بیت چکا تھا وہ جو خوش گمانیوں بے فکریوں کا دور تھا کیسے اس نے بن بانس کی مانند کاٹا تھا۔ "کب اس قفس سے رہائی ملے گی۔" ملاقات نہ ہونے پر وہ تلملا کر سوچا کرتی تھی عنون سننے کے لیے کبھی واش روم تو کبھی چھت پہ جانا زہر لگا کرتا تھا۔ اور جو کبھی کوئی پیچھے آجاتا تو اسے اور غصہ آتا اور وہ پیچھے آنے والا ہمیشہ ارحم ہی ہوتا تھا۔

"تم چھت پر ہو چلو واک کرتے ہیں۔"

"نہیں میری ٹانگوں میں درد ہے۔" وہ خاصی بے مروتی سے جواب دیتی اور وہ ڈھٹائی سے کھڑا اپنے کالج کے دوستوں' پروفیسوں کی باتیں سنائے جاتا اور وہ منہ پر بیزاری سجائے اکتاہٹ بھرے انداز میں سنتی اس کا دھیان اپنے سیل پر آنے والے میسجز کی سمت اٹکا ہوتا تھا۔ اسے ٹلتے نہ دیکھ کر وہ تنگ آکر نیچے آجاتی تھی اور پھر وہ بدلہ لینے کی خاطر صبح صبح اسے لحاف سے باہر نکال کر اپنی بائیک صاف کروایا کرتا تھا ویک اینڈ پر وہ اسے پارک میں گھما کر لاتا تھا دونوں آئسکریم کھانے کے دوران نیو کپل پر کمنٹس پاس کر کے خوب ہنستے تھے۔

اماں کو اس کا ماتھے سے بال کٹوانا سخت ناپسند تھا وہ ارحم سے اس کی شکایت لگاتیں تو وہ اسے خوب گھورتے ہوئے کہتا۔

"میں نے کہا تھا کترینہ کی طرح سامنے سے ہیر کٹ کروانا تم نے سائیڈ پف کٹوالیا۔" اور وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو جاتی تھی۔ اور پھر ایک روز وہ تن فن کرتا اس کے سر پر آن کھڑا ہوا تھا وہ بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی۔

"عنصر ہمارے گھر کی طرف کیوں دیکھ رہا تھا۔" سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ اس کے ہاتھوں کے طوطے' کبوتر سب اڑ گئے وہ منہ کھولے ہونق پن سے اسے دیکھنے لگی جو ماتھے پہ سلوٹیں لیے اسے گھور رہا تھا۔

"مم مجھے کیا پتا۔" وہ ہکلا گئی۔

"آج سے تمہارا اکیڈمی جانا بند گھر سے پاؤں باہر نکالا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔" وہ خوب غصے میں تھا مریم کا میٹر گھوم گیا وہ اٹھ کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"تم ہوتے کون ہو مجھ پہ پابندیاں لگانے والے؟"

"ہوا کیا ہے تم دونوں کو۔" اماں ابھی اندر آئی تھیں۔

"اس کے جو ایک دو رشتے آئے ہیں ان میں سے کوئی فائنل کر کے دفع کروائے' ورنہ یہ ہماری عزت داؤ پر لگا کر رہے گی۔" اس نے ہوا میں تیر چلایا تھا جو ڈائریکٹ نشانے پر لگا۔

"میں شادی کروں گی تو عنصر سے۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا ارحم نے ایک زور کا تھپڑ اسے مارا۔ اماں حق دق سی کھڑی سب دیکھ رہی تھیں۔

"عنصر' وہ ملکوں کا لڑکا۔" انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا وہ دل پکڑ کر بیٹھ گئیں مگر ان دونوں کے درمیان جاری تھی۔

گھر کی فضا عجیب بوجھل سی ہو گئی مہو بھی آچکی تھی اسے سمجھانے' مگر رزلٹ زیرو' وہ اپنی بات پر مصر تھی۔

اکیڈمی جانا چھوڑ دیا' کھانا پینا چھوڑ دیا رشتے کے لیے آئے مہمانوں سے بدتمیزی کی' رو رو کر آنکھیں سجالیں۔

اس سے قبل کہ چرچا زبان زد عام ہوتا اماں نے ملکوں کو رشتہ دے دیا۔ ارحم کا ایک ہی فیصلہ تھا۔

"جائے گی تو ہمیشہ کے لیے۔" وقتی طور پر اس نے حامی بھرلی تھی۔

"اب اس گھر کے دروازے خود پر بند سمجھو۔" وہ کہہ رہا تھا مگر اس نے بے نیازی سے سر جھٹک دیا عنصر کی محبت' اس کی رفاقت' اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواب ہی اس قدر مسرت آمیز تھا کہ وہ ان روایتی دھمکیوں پر کڑھنے کے بجائے آنے والے خوب صورت لمحوں کے متعلق سوچا کرتی تھی۔ اماں اور مہو کا دل جانتا تھا کہ ان پر کیا بیت رہی تھی ان ماں' بیٹی کی آنکھیں بھیگی اور نم سی تھیں اور وہ عنایہ کو گود میں اٹھا کر گول گول چکر لگا کر جھومتی۔

"عنایہ تمہاری خالہ کی شادی ہو رہی ہے۔" سب کچھ بغیر کسی ہنگامے کے ہو رہا تھا وہ اتنے میں ہی بے حد خوش تھی ولیمہ پہ ارحم نہیں آیا تھا بس اماں' مہو اور چند دوست احباب وغیرہ اس کا مکلاوا بھی نہیں گیا تھا مگر اسے ان ساری چیزوں کے نہ ہونے سے کچھ

خاص فرق نہیں پڑتا تھا اس نے یہ سوچ کر سر جھٹک دیا تھا کہ ابھی نئی نئی بات ہے بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

عنصر سعودیہ سے چھٹی پر آیا ہوا تھا جاتے ہوئے اسے بھی ساتھ لے گیا اور اس کے بعد وہ اب لوٹی تھی۔

اماں اور مہو سے رابطہ بس ٹیلی فونک گفتگو تک ہی محدود رہا تھا عنایہ اس سے بات نہیں کرتی تھی اس کا کہنا تھا خالہ مجھے اچھی نہیں لگتی اور یہ ضرور ارحم کا سکھایا ہوا تھا۔

آنگن میں لگے سفید پھولوں کی پتیاں نوچتے ہوئے اسے احساس بھی نہ ہوا کہ پورا ایک گھنٹہ گزر چکا تھا اس گھر میں اس کی فیورٹ جگہ سیڑھیاں تھیں۔ اس وقت بھی وہ املتاس کے نیچے خاموش بیٹھی وہ سہانے دن تلاش کر رہی تھی وہ الھڑپن، وہ بے نیازی وہ کنوار پن کا زمانہ شادی تو ایک دن ہو ہی جانی تھی پھر کیوں اس کی فکر سوار کر کے وہ ان خوبصورت دنوں سے بے زار رہا کرتی تھی۔ کل تک وہ جن کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی تھی آج انہیں دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا اماں کی گود میں سر رکھ کر خوب گہری نیند سوئے مہو سے خوب باتیں کرے۔

اپنے اس گھر میں بہت سارے دن رہے اور ارحم ہمیشہ کی طرح اسے ستائے اسے تنگ کرے گرم گرم لحاف سے نکال کر اپنی بائیک صاف کروائے وہ اب کی بار اس کی پینٹ کی کریز بالکل ٹھیک بنائے گی اور اس کے ساتھ چھت پر واک بھی کرے گی۔

ڈور بیل بجی تھی عنایہ جو اوپر کرائے داروں کے پاس تھی بھاگتے ہوئے نیچے آئی۔

"مما آگئیں۔" اس نے شور مچا دیا تھا۔ مریم سیڑھیوں سے اٹھ کر دروازے کی سمت بڑھی۔

"شکر ہے دلہن کی شاپنگ تو مکمل ہوئی۔" مہو بولتے ہوئے آرہی تھی۔ مریم نے والہانہ انداز میں اسے دیکھا لیکن یہ کیا، مہو اور اماں نے نہ تو اسے گلے سے لگایا تھا نہ اس کی خیریت پوچھی نہ اس کے لوٹنے کا ذکر کیا بلکہ وہ تو لگ رہا تھا جیسے اسے دیکھ کر پریشان ہو چکی تھیں۔

"ارے مریم تم یہاں کیوں چلی آئیں ارحم نے دیکھا تو ہنگامہ مچا دے گا۔" مہو کے انداز میں اس قدر عجلت تھی جیسے اسے بازو سے پکڑ کر گھر سے باہر نکال دینا چاہتی ہو، مریم سکتے کے عالم میں جہاں کی تہاں جم کر رہ گئی۔

"تم ابھی نکلو یہاں سے، ارحم کے سسرال والے بھی آرہے ہیں انہیں ارحم نے یہی کہہ رکھا ہے کہ اس کی بس ایک ہی بہن ہے میں نہیں چاہتی کہ کوئی سین کری ایٹ ہو۔"

"ہاں ہاں مریم جلدی جاؤ۔" اماں نے دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے اسے باہر کا راستہ دکھایا اور وہ بجھے دل اور شکستہ قدموں سے چلتے ہوئے نیلے ٹائلز والے گھر سے دور نکل آئی اس کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اماں اور مہو تو کب کا اسے رو چکی تھیں مگر اسے لگ رہا تھا جیسے آج ہی اس کی رخصتی ہوئی ہو جیسے وہ ابھی ابھی سب کے لیے مر چکی ہو جیسے ابھی اس گھر کے دروازے اس پر بند ہوئے ہوں جیسے آج وہ اپنوں سے بچھڑی ہو۔

دو روز بعد اس نے نیلے ٹائلز والے گھر کو برقی قمقموں سے سجے ہوئے دیکھا تھا وہ ملک ہاؤس کی چھت پر کھڑی تھی۔

"اب اس گھر کے دروازے خود پر بند سمجھو۔" اس کی سماعتوں میں وہ پگھلے ہوئے سیسے جیسے لفظ چنگھاڑے مگر وہ سپاٹ سے تاثرات کے ساتھ وہاں کھڑی رہی اس کے ساتھ عنصر اور ازان بھی تھے مگر اماں، مہو اور ارحم تو نہیں تھے رشتے کی اس مکمل تصویر کو اس نے خود ہی دو حصوں میں بانٹا تھا اور اب اسے اس ادھورے حصے کے ساتھ ہی زندگی گزارنی تھی اور یہ کتنا مشکل تھا اسے لگ رہا تھا جیسے سب ہوتے ہوئے بھی وہ خالی ہے بالکل خالی۔

صباحت یاسمین ملک

تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے اس نے سلیب صاف کی۔ ناشتا فاطمہ نے بنانا ہوتا تھا اور اسے سلیب صاف چاہیے ہوتی لہٰذا وہ لازما" ہی سلیب صاف کرتی' سلیب صاف ہو چکی تو اس نے صافی دھو کر پھیلائی' توا چولہے سے ہٹایا' ابوبکر کے لیے دودھ کے برتن کو ہاتھ لگا کے چیک کیا کہ ٹھنڈا ہوا یا نہیں۔ دودھ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس نے دودھ کی دیگچی پانی سے بھری پرات سے نکال کر سائیڈ پر رکھی اور گرم پانی گرا کر ٹونٹی سے ٹھنڈا پانی بھرا تاکہ چائے کے لیے گرم کیا گیا دودھ ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھا جاسکے۔ پسینے کے قطرے اس کی کمر پہ رینگ رہے تھے اور حلق خشک ہو چکا تھا۔ ابوبکر کے مسلسل رونے بلکہ چیخنے کی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی' جب ہی اس نے روٹیاں بنانے کے دوران ہی جیسے تیسے کرکے تمام برتن دھوئے' پانی کا گلاس لینے کے لیے وہ برتنوں کی ٹوکری کی طرف بڑھی ہی تھی کہ فون بجنے لگا۔ اس نے گلاس وہیں چھوڑا' فٹافٹ ابوبکر کے فیڈر میں دودھ ڈالا۔ چائے والے دودھ کو پرات میں رکھ کر ہاٹ پاٹ سائیڈ پہ رکھا اور فون کی طرف بھاگی۔

"السلام علیکم باجی!"

"وعلیکم السلام کیسی ہو شمسہ؟"

"شکر ہے اللہ کا' ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"ابوبکر کیسا ہے؟ ضد تو نہیں کرتا' روتا تو نہیں؟"

"نہیں باجی ٹھیک ہے۔" اس نے کہنے کے ساتھ ہی اپنے کمرے کے ادھ کھلے دروازے کو دیکھا۔ رو رو کر اس کا گلا بیٹھ چکا تھا۔ لہٰذا اب رونے کی آواز کم آرہی تھی۔

"کیا کررہی تھیں تم؟"

"کچھ نہیں فارغ ہی تھی' آپ بتائیں۔ نند چلی گئی آپ کی؟"

"ہاں' میری نند تو چلی گئی تمہاری نند آنے والی ہے!"

"سچ باجی۔!" وہ بے حد خوش ہوئی۔

"ہاں سچ۔ اچھا سنو۔ فاطمہ کو بلاؤ ذرا ایک ضروری بات یاد آئی ہے کہیں ذہن سے نکل نہ جائے۔"

"جی اچھا۔ ہولڈ رکھیں۔"

"فاطمہ! باجی کی کال ہے۔" اس نے جھانک کر بتایا تو بیڈ پہ نیم دراز ڈائجسٹ پڑھتی فاطمہ کسل مندی سے اٹھی۔ شمسہ اب ابوبکر کے لیے فری تھی۔ اسے اٹھا کر ساتھ لگایا کمر سہلائی' وہ شکوہ کناں انداز میں رونے لگا۔

"آئیم سوری بیٹا! سوسوری۔"

کچھ ہی دیر میں وہ چپ ہوگیا اور ماں کی گود میں سکون سے فیڈر پینے لگا۔ ہولے ہولے چلتی فاطمہ اب فون تک پہنچی تھی۔

"جی باجی۔" فون اٹھا کر وہ سستی سے بولی' جوابا" باجی نے شاید فون پہ دیر سے آنے کا کہا کیونکہ بعد میں وہ وضاحت دیتے ہوئے بولی۔

"کپڑے پریس کررہی تھی ابھی تو بچیوں کو کھانا بھی دینا ہے۔"

ابوبکر کو جھولے میں لٹا کر وہ سیدھی ہوئی تو حارث

نے پوچھا۔

"تم کیسا ہے تمہارے شانوں کا درد؟"

"ٹھیک ہے' آج تو بہتر ہے۔ بہت' کیونکہ باجی اور باجی کے بچوں نے اسے بہت دیر اٹھائے رکھا۔"

"چلو اچھا ہے۔ تمہاری بھی ہیلپ ہو گئی۔" اخبار کا ورق پلٹتے ہوئے اس نے کہا۔ اسے صبح وقت نہ ملتا تھا۔ اس لیے اس نے شام کا اخبار لگا رکھا تھا جسے وہ رات گئے پڑھتا۔

"پتا ہے فاطمہ بہت اچھی ہے۔" وہ صوفے پہ اس کے ساتھ آ بیٹھی۔

"اچھا۔۔ اب نئی اچھائی کیا کر دی اس نے؟" حارث نے اخبار اور نظر کا چشمہ دونوں بند کر کے ٹیبل پر رکھ دیے۔

"جب کوئی آیا ہو تو وہ مجھے میرے حصے کے کام بھی نہیں کرنے دیتی' حالانکہ اسے تو کمر درد رہتا ہے اور عام روٹین میں اس نے کبھی اتنے کام نہیں کیے' لیکن اسے بہت احساس ہوتا ہے کہ کام بڑھ گئے ہیں اور وہ

ایک آدھ دن کے لیے تمام گھر کی ذمہ داری مکمل طور پہ سنبھال لیتی ہے تاکہ میں ابوبکر کو دیکھ لوں۔"

"ہوں۔۔ ہم سے بھی زیادہ اچھی ہے کیا؟" وہ قریب ہوتے ہوئے شرارتی ہوا۔

"جی بالکل کیونکہ جب میں فرش صاف کرنے کے لیے ٹاول دھو کر لائی تو اس نے میرے ہاتھ سے لے لیا اور تمام کمروں میں بھی لگایا اور لاؤنج میں بھی۔۔ آپ نے کبھی کیا ایسا؟" شمسہ پرجوش تھی' مسکرا رہی تھی حارث سوچ میں پڑ گیا کہ اتنی زیادہ بھلائی کی بھلا اسے کیا ضرورت تھی؟

"ارے ارے نیچے مت لیٹیے گا۔" وہ دھلے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے لاؤنج میں داخل ہو رہی تھی کہ اس نے حارث کو فرش پہ تکیہ رکھتے دیکھا۔

"کیوں بھئی؟" اس نے حیرانی سے پوچھا' روز ہی تو وہ آفس سے آ کر کچھ دیر فرش پہ لیٹتا تھا پھر آج بھلا اس نے کیوں روکا۔

"بتاتی ہوں آ کر۔" اس نے کپڑوں کے ڈھیر کو صوفے پر رکھا' اپنے حارث اور ابوبکر کے کپڑے اس میں سے نکالے۔

"وہ آج کام بہت زیادہ تھے تو میں نے اپنے کمرے کی صفائی نہیں کی۔" کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے بتایا۔

"چلو خیر ہے۔ اتنا فیل نہیں ہو رہا اینڈ ایم ہیپی کہ تم نے تھوڑی بہت ڈنڈی مار کر خود کو ذرا ریلیکس کیا۔" اس نے تکیہ اٹھا کر بیڈ پہ واپس رکھ لیا تھا۔

"اچھا۔ میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" کپڑے ٹوکری میں رکھ کر وہ جانے کے لیے مڑی تھی۔

"آپ کے کام ختم ہو گئے ہوں تو ضرور!"

وہ مصنوعی ناراضی سے بولا تھا۔ چند ہی منٹوں میں وہ چائے لے آئی۔ آلو کے سادہ پکوڑے چائے اور پانی۔۔

"کیچپ نہیں ہے؟" حارث کو فوراً" ہی کمی محسوس ہوئی۔

"جی وہ ختم ہو گیا۔"

"اتنی جلدی ختم کیسے ہو سکتا ہے؟" حارث نے برا سامنہ بنایا۔

"نہیں ہے۔ جب ہی نہیں لائی نا' فریج میں کاؤنٹر پہ ٹیبل پہ ہر جگہ دیکھا۔" وہ ٹوکری سے کپڑے اٹھا کر تہہ کرنے لگی۔

"کل بھی تم نے یہی کہہ کر نہیں دیا اور شام میں ثنا فائزہ رول کے ساتھ کھا رہی تھیں۔" وہ بچوں کی طرح روٹھے پن سے بولا۔

"ہو سکتا ہے انہوں نے نیا منگوایا ہو۔"

"وہی پرانا والا پیکٹ تھا۔"

"اچھا پھر کیا سزا ہے میری؟"

"یہ کہ تمہیں چکھنے کو بھی پکوڑا نہیں ملے گا۔"

"ہائے اللہ آپ نے سب ختم کر دیے!" وہ یکایک افسردہ ہو گئی۔

"ہاں وہ پانچ سات ہی تو تھے اور کچھ میری اسپیڈ بھی تیز ہے تو پتا ہی نہیں چلا۔ اچھا شمسہ! سنو۔۔ کمرے کا دروازہ بند تو نہیں رکھتیں تم دن بھر؟"

"دن بھر تو نہیں' لیکن رکھتی ہوں۔۔۔"

"کیوں؟ کیوں رکھتی ہو؟ کھلا رکھا کرو نا!"

"ابوبکر سو رہا ہو اور فائزہ یا ثنا لاؤنج میں کھیل رہی ہوں تب تو دروازہ بند کیے بنا چارہ ہی نہیں۔" وہ اس کے پاس آن بیٹھی۔

"بہرحال تم زیادہ سے زیادہ دیر دروازہ کھلا رکھا کرو۔"

"آپ اتنی تاکید سے یہ بات کیوں کر رہے ہیں؟" وہ حیران ہوئی۔

"بڑی بھابھی سے بات ہوئی تھی آج اسکائپ پہ۔" وہ دھیمے سے بولا۔

"اچھا؟ کیسی ہیں وہ؟ ادھر سب کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔"

"اور کیا کیا بات ہوئی؟"

"کہہ رہی تھیں کہ تمہیں سمجھاؤں۔" حارث کچھ کچھ پریشانی سے بول رہا تھا۔

"بھلا کیا؟" وہ متجسس ہوئی۔

"یہ کہ کمرہ بند کر کے ہر وقت سوئے رہنا اور کام چوری' ضد وغیرہ اچھی بات نہیں' سب سے مل جل کر رہو گھر کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹاؤ۔"

شمسہ سن کر دنگ رہ گئی اور بغور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی کہ آیا وہ واقعی وہی سب کہہ رہا ہے یا اسے سننے میں غلطی ہوئی۔

حارث نے اس کی آنکھوں کے نیچے موجود حلقوں سے نظر چرائی۔ رات میں ابوبکر کئی بار جگاتا اور اکثر بہت دیر تک جگائے رکھتا' دن میں اسے سونے کی فرصت یوں نہ ملتی کہ پہلی بار جب وہ سوتا تو شمسہ بمشکل صفائی ستھرائی کرتی اور وہ اٹھ جاتا' دوبارہ سوتا تو اس کے کپڑے دھوتی نہاتی۔ نماز پڑھتی۔ کالم لکھنا شروع کرتی اور وہ پھر اٹھ جاتا۔ اسے سلا کر بھی وہ سوتی نہیں تھی تبھی حارث کے کپڑے استری کرنے ہوتے کبھی برتن دھونے ہوتے کبھی آٹا گوندھنا ہوتا۔

"تمہیں سمجھ داری سے رہنا ہے شمسہ!" حارث نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شمسہ نے دھیرے سے سر ہلایا اس کے اندر تک اداسی اتر آئی تھی۔

"اور سنو تم نے گھر میں کسی کی کوئی بات ٹالی ہے؟ ابوبکر کے متعلق کوئی مشورہ یا کوئی اور بات؟"

"نہیں تو۔۔ میں تو خود فاطمہ سے پوچھ لیتی ہوں اگر کوئی مسئلہ ہو تو۔۔ اماں کے ٹوٹکے بھی آزماتی ہوں' لیکن حارث اگرچہ میں تجربہ نہیں رکھتی میں نے پہلے بچے نہیں سنبھالے' لیکن میں اس کی ماں ہوں تجربہ نہ ہونے کے باوجود بھی کبھی کبھار مجھے یہ لگتا ہے کہ میں اس کا مسئلہ بہتر طریقے سے سمجھ جاتی ہوں' ایسے میں کبھی کبھار میں اپنی مرضی بھی کرتی ہوں۔" وہ رکی اور پھر اچانک کچھ یاد آنے پہ دوبارہ بولی۔۔ "یوں بھی ہوتا ہے کہ اماں مجھے ایک بہت الگ بات بتاتی ہیں اور فاطمہ بہت الگ' ایسے میں' میں کسی ایک کی بات ہی مان سکتی ہوں بعد میں یا اماں فاطمہ کو قائل کر لیں گی یا فاطمہ اماں کو۔۔ تو تختی پھر بھی میری ہی آتی ہے کہ اپنی من مانی کی۔"

"اچھا چھوڑو۔۔ میں نے پہلے ہی انہیں کہہ دیا تھا

کہ ایسی کوئی بات نہیں اور یہ بھی کہا کہ تین چار ہفتوں سے ہی تو موسم کھلا ہے ورنہ صبح شام اتنی ٹھنڈی ہوا چلتی تھی کہ دروازہ کیا کھڑکیاں بھی ہم بند رکھتے تھے۔"

"تھینک یو حارث۔۔" وہ بے پناہ ممنون ہوئی اور مزید گویا ہوئی۔

"اور ہاں میں ڈائپر چینج کرتے ہوئے بھی دروازہ بند کر لیتی ہوں تاکہ کسی کو کراہیت نہ ہو۔"

حارث دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں سہلانے لگا تھا۔۔ "یو نو شمسہ سگے بہن بھائیوں میں بھی باتیں ہوتی ہیں مگر کسی تیسرے کو شکایت کرنا تب زیب دیتا ہے کہ اگر قصوروار نہ سنے نہ مانے قصوروار بے خبر ہو اور جہاں بھرپا خبر تو شکایتیں رفع نہیں ہوتیں بلکہ نان ایشوز

بھی ایشو بن جاتے ہیں۔ خیر لیواٹ میں نماز کو جارہا ہوں۔"

اچانک ہی اس کی گھڑی پر نظر پڑی تو وہ بات سمیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ شمسہ کچن میں برتن رکھنے چلی گئی۔ اماں اپنے لیے کٹلٹس فرائی کررہی تھیں۔ شمسہ برتن دھونے لگی۔

"فاطمہ کیچپ ہے؟" اماں نے آواز لگائی۔

"جی اماں ہے میں خود دیتی ہوں آکر۔"

اس نے فوراً جواب دیا اور چند ثانیوں بعد کچن میں آگئی۔

"کوئی کیچپ رہنے ہی نہیں دیتا تو... بچیوں کے لیے منگوائی ہوں سو سائیڈ پر رکھ دیتی ہوں۔"

اس کے ہاتھ سے برتن چھوٹ کر سنک میں گرا' آنکھیں یک دم نم ہوگئیں۔

"آہستہ بھئی آہستہ... آرام سے..." اماں نے برتنوں کی فکر میں ہانک لگائی تھی۔ اس نے سر کے اندر کچھ یوں ہلنے لگا جیسے انڈا اپنے شیل میں چھلک رہا ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"پانی زیادہ ٹھنڈا ہے تھوڑا سا تازہ پانی مکس کرلاؤ اس میں۔" وہ کچن سے نمک لے کر آئی تو حارث نے کہا۔ پانی کی بوتل اٹھا کر وہ الٹے قدموں کچن کی طرف گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بوتل کے ساتھ سالن کی پلیٹ بھی تھی۔ حارث کے ساتھ بیٹھ کر اس نے بھی کھانا شروع کیا۔

"بھئی۔ چکن سے کیا چڑ ہے تمہیں؟ کبھی تو کھالیا کرو!" حارث اس کی پلیٹ میں کل کا آلو قیمہ دیکھ کر بولا۔

"کھاتی تو خیر میں یہ بھی نہیں مگر اب اس میں قیمہ برائے نام ہی بچا ہے تو سوچا جیسے تیسے کرکے ہی کھالوں آخر پیٹ تو بھرنا ہے۔"

"پتا نہیں تمہاری کیا خوراک ہے۔ گوشت کسی قسم کا تم کھاتی نہیں' دودھ سے تمہیں رعشہ ہوجاتا ہے۔" حارث چڑ کر بولا تھا۔

"پھر بھی تمام آس پڑوس والے' پرانے محلے دار اور سب رشتہ دار ہی جانتے ہیں۔ میں بہت پیٹو ہوں' ہر وقت کھاتی رہتی ہوں بس۔"

حارث نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ واقعی میل جول کا ہر بندہ اس سے کوئی اور بات کرے نہ کرے یہ ضرور کرتا تھا کہ سنا ہے تم تین چار کلو دودھ پی جاتی ہو بہت اچھا کھاتی پیتی ہو وغیرہ وغیرہ وہ شروع سے ہی حد درجہ حساس تھی' اس لیے سوچ سوچ کر کڑھتی رہتی تھی کہ اگر پریگننسی میں اس کی بھوک ڈبل ہوگئی تھی تو کیا یہ ضروری تھا کہ ہر ملنے جلنے والے کو بتایا جائے؟

"شمسہ تم نے پریگننسی میں پسند ہی وہ چیزیں کیں جن سے وزن بڑھتا ہے جیسے چاول' چپس فرائز... اس لیے ورنہ کوئی بات نہیں۔" اپنے مخصوص ہلکے پھلکے لہجے میں اس نے غیر محسوس انداز میں اس کی شکوہ کناں سوچ کو بدلنا چاہا۔

"حارث! میں خود بہت پچھتا رہی ہوں' مگر کیا کرتی میرا دل ایسی ہی چیزیں کھانے کو کرتا تھا۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ اب ڈے بائے ڈے تمہارا وزن کم ہو تو رہا ہے ان شاء اللہ جلد ہی پہلے جیسی ہوجاؤ گی۔"

"فریج میں سالن رکھا تھا آلو قیمہ کا۔" فاطمہ اچانک سامنے آکر بولی۔

"وہ تو میں کھا چکی۔ بس یہ لاسٹ بائٹ ہے۔" شمسہ نے ہاتھ میں موجود نوالے کی بابت کہا باقی پلیٹ خالی تھی۔

"یہ تو میرا تھا۔ میں نے خاص اپنے لیے رکھا تھا۔" فاطمہ عجیب ہی طرح سے بولی' جانے کیا تھا اس کے لہجے میں کہ شمسہ جس نے باتوں باتوں میں فوراً ہی اپنی روٹی ختم کرلی تھی' آخری نوالہ حلق سے اتارتے ہوئے اسے بہت وقت لگا۔

"شمسہ یار ریلیکس... کچھ نہیں ہوا۔" حسب معمول حارث نے فوراً اس کا دھیان بٹایا۔

"کچھ ہوا تو ہے حارث' میری وجہ سے سب کو اپنے کھانے پینے کی چیزیں سنبھال کر رکھنی پڑتی ہیں اس بات کا تو مجھے اندازہ تھا' لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ انجانے میں اگر ان کی کوئی شے کھالوں گی تو منہ پہ آکر بات کی جائے گی' پوچھا جائے گا وہ بھی اس طرح سے..." اس نے کھوئے کھوئے انداز میں یہ بات کی تھی۔

"لیٹ اٹ گو (Let it go) شمسہ' میں نے شادی سے پہلے ہی تمہیں کئی بار بتایا کہ ہمارے گھر میں کوئی بھی زیادہ حساس نہیں ہے' ایسا نہیں ہے جیسی تم ہو!"

"لیکن تم نے ان سب کو جیسا بتایا یہ ویسے بھی تو نہیں ہیں۔" اس کے لہجے میں' آنکھوں میں' باتوں میں شدید اداسی در آئی تھی۔

"اچھا تم یہ برتن سمیٹو اور چائے بنادو مجھے ورنہ ابوبکر اٹھ جائے گا اور تم کچھ بھی نہیں کرپاؤ گی۔" ایک دفعہ پھر حارث نے اس کی توجہ کسی اور طرف مبذول کرانا چاہی تاکہ وہ پہروں کڑھتی نہ رہے اور اس دفعہ وہ کامیاب بھی رہا۔ شمسہ جی اچھا کہہ کر برتن سمیٹنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"شمسہ..."

کروٹ بدلتے ہوئے ذرا کی ذرا اس کی آنکھ کھلی تو اس نے شمسہ کو کمرے کے بیچوں بیچ ٹہلتے پایا' اس کی آواز پہ وہ جی کہہ کر رکی۔

"گھنٹہ ہوگیا ہے تمہیں کبھی یہاں کبھی وہاں' نیند نہیں آرہی کیا؟"

"گھنٹہ نہیں حارث چار گھنٹے۔" وہ بیڈ پہ اس کے پاس آبیٹھی۔

"چار گھنٹے؟" حارث نے حیرت سے وال کلاک کو دیکھا۔ اس کی چمکتی سوئیاں تین بیس کا ٹائم دکھا رہی تھیں اور وہ لوگ گیارہ بجے لیٹے تھے۔

"تم دودھ پی لیتیں تھوڑا سا۔" وہ ساتھ پریشانی کے اٹھ بیٹھا۔

"پیا تھا' نیند آئی بھی مگر پھر میں سخت ڈر گئی۔" وہ تھکی تھکی نڈھال اور کچھ ڈری ہوئی تھی۔

"ایسے کیسے چلے گا اتنے دنوں سے تمہاری نیند بھی ڈسٹرب ہے اور بھوک بھی... تم زبردستی آنکھیں بند کرکے لیٹو پلیز..."

"لیٹی رہی ہوں حارث' میں نے تو سکون کی دوا بھی لی تھی مگر..."

"سکون کی دوا؟" اسے سن کر دھچکا لگا۔

"کب سے لے رہی ہو اور کس کے مشورے سے لی؟" حارث نے اسے بے طرح جھنجھوڑ دیا۔

"خود ہی لی ہے... ابھی کچھ ہی دن ہوئے..." وہ بے طرح گھبراتے ہوئے بولی۔

"مائی گاڈ شمسہ! تم مجھ سے تو مشورہ کرتیں' اتنی سی عمر میں تم مصنوعی نیند اور مصنوعی سکون کا عادی کرنے والی ہو خود کو!" اسے جیسے بے یقینی سی تھی۔

"تو میں کیا کروں پھر؟" بہت بے بسی سے اس نے پوچھا۔

"تمام باتیں دماغ سے نکال دیا کرو۔ ریلیکس رکھا کرو خود کو بس۔" اب کے وہ نرمی سے بولا۔

"ہوں... اچھا!" غائب دماغی سے وہ کہہ رہی تھی۔

"اچھا تم آکر لیٹو اور جتنی بھی دیر گزر جائے آنکھیں بند ہی رکھنا اور سونے کی کوشش کرتی رہنا۔ ضرور نیند آئے گی۔"

اس کی بات پہ شمسہ نے عمل تو فوراً کیا' مگر پھر بھی وہ بہت مضطرب لگ رہی تھی۔

کھانے کی میز پہ سب جمع تھے اور رغبت کے ساتھ چکن منچورین سے انصاف کررہے تھے۔ کھانے کی کوشش تو شمسہ بھی کررہی تھی' مگر حارث نے نوٹ کیا کہ اس نے ابھی تک برائے نام ہی کھایا ہے نوالہ لیتے ہوئے اس کا چہرہ ایسے زاویے دکھا تاکہ جیسے وہ کوئی بہت اذیت ناک کام کررہی ہو۔ کچھ دیر مارے باندھے بیٹھنے کے بعد وہ اٹھ گئی۔

حارث کا دل اچانک ہر چیز سے اچاٹ ہوگیا۔ دو چار

نوالے مزید زہر مار کرکے وہ بھی اٹھ گیا اور ٹیرس پہ جاکر ٹہلنے لگا۔ ابوبکر کے رونے کی آواز آنے لگی اور ساتھ میں شمسہ کی باآواز بلند لوریاں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ چپ ہوا تو شمسہ غالباً" برتن صاف کرنے لگی۔ اسے کافی انتظار کرنا پڑا اور جب وہ آئی تو ابوبکر کو کندھے کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا اور ایسے میں اسے ماں کی گود میں رہنا بہت پسند تھا۔ اس کی کمر مسلسل تھپکتے ہوئے وہ چپ چاپ حارث کے ساتھ ٹہلنے لگی۔

"مجھے ان سب سے چڑ ہونے لگی ہے۔" بہت دیر بعد حارث بولا۔

"حارث پلیز۔" اس نے فوراً" ہی احتجاج کیا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں کہ اب مجھے یہ بھی سننے کو ملے کہ میں آپ کو سب سے دور کرنا چاہتی ہوں۔"

"نہیں یار۔ مگر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں' کوئی تم سے نفرت کرے تو میں کیسے برداشت کروں؟" بہت پریشانی سے بولا۔

"آپ کو کس نے کہا کہ کسی نے مجھ سے نفرت کی ہے؟"

"دیکھتا نہیں ہوں کیا؟"

"ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو آپ نفرت پہ محمول کررہے ہیں؟"

"باتیں چھوٹی ہوتیں تو ان کے اثرات اتنے گہرے نہ ہوتے۔" حارث کے ذہن میں اس کا بجھا بجھا چہرہ' حلقے اور افسردگی تھی۔

"کوئی ایک فریق کبھی بھی مکمل قصوروار نہیں ہوتا حارث۔ دوسرے کی غلطی کم ہو' برائے نام ہو مگر ہوتی ضرور ہے۔"

"اچھا؟ تمہاری کیا غلطی ہے' جو کبھی دکھائی نہ سنائی دی۔"

"میری غلطی حد سے بڑھی حساسیت ہے۔"

"لیکن تمہیں کبھی بھی کہیں بھی کوئی رعایت نہیں دی جاتی۔ میں بہت گلٹی فیل کرتا ہوں کہ میری وجہ سے تم کتنا برداشت کرتی ہو۔" وہ لہجے سے ہی بے حد پشیمان لگ رہا تھا۔

"تو کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں کہیں اور ہوتی تو کچھ نہ سہنا پڑتا۔ یہ سب نہ ہوتا تو کسی اور طرح کے مسائل ہوتے' مگر آئیڈیل ماحول تو کبھی بھی کسی کو نہیں ملا۔"

"جب تم یہ سب جانتی ہو' سمجھتی ہو' خاموشی سے سہتی ہو تو پھر تمہیں چپ کیوں لگ گئی ہے؟ مسکرانا کیوں بھول رہی ہو؟" وہ روہانسا ہو رہا تھا۔

"کیونکہ میں یہ سب ہمیشہ سے نہیں جانتی تھی اور نہ ہی اس کے لیے تیار تھی' مگر ہر گزرتے دن کے ساتھ میں ان حقائق کو بہتر طریقے سے سمجھنے لگی ہوں اور خاموشی کی وجہ یہ نہیں کہ میں بہت عظیم ہوں' بلکہ ہر ایک کی اپنی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں' میری بھی ہیں' میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کا نام بدنام ہو' کیونکہ آپ مجھے ہر طرح کا آرام مہیا کرتے ہیں' ایک بندے کے بولنے سے شور نہیں ہوتا' مگر آوازیں دو ہو جائیں تو دیواروں سے پار ہو جاتی ہیں' پھر کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ کون صحیح ہے اور کون غلط؟ ہاں ایسا ضرور ہوسکتا ہے کہ چہ مگوئیاں ہونے لگیں کہ حارث کی بیوی نے بدکلامی کی۔"

"لیکن تم کام کی باتیں تو کیا کرو یار! جتایا کرو کہ تم فارغ نہیں رہتیں اور تمہیں کوئی ضد نہیں' سب کی باتیں ٹالنے کی بس کبھی کبھار کوئی بات ماننا ممکن نہیں بھی ہوتا۔"

"پتا ہے حارث! جو ہمیں سمجھ سکتا ہے نا' اسے ہماری وضاحتوں کی' ہمارے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور جس نے سمجھنا ہی نہیں' کبھی آپ کی بات کو درست اور صحیح تسلیم ہی نہیں کرنا' اسے آپ کتنی ہی بار بتائیں' کسی بھی طریقے سے بتائیں' بے سود رہے گا' میں یہ کرکے دیکھ چکی ہوں۔"

"جو بھی ہو یار' مجھ سے تمہاری یہ خاموشی برداشت نہیں ہوتی' اب تو تم عام حالات میں بھی چپ چپ ہی رہتی ہو۔" حارث کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

"پتا ہے حارث میں سمجھتی تھی کہ خاموشی سب مسائل کا حل ہے' پھر مجھے لگا کہ یہ خاموشی ہی کافی نہیں اس کے ساتھ مسکراہٹ اور خوش دلی بھی ہونی چاہیے' میں نے اسے بھی آزمایا تھا' مگر تب بھی تلخ و ترش ہی سننے کو ملیں تو میرا دل اچاٹ ہوگیا اب تو مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں جاتا۔"

وہ گلوگیر لہجے کے ساتھ بولی' من تو تھا کہ پھوٹ پھوٹ کہ روئے' مگر آل ریڈی حارث اتنا پریشان تھا کہ وہ مزید نہ کرسکتی تھی۔

"تو کیا میں تمہیں کبھی پہلے جیسا ہنستا بولتا نہیں دیکھ سکوں گا؟" بہت ڈر کر اس نے پوچھا تھا۔

"دیکھیں گے۔ ضرور دیکھیں گے وقت کے ساتھ ساتھ میں سب کے مزاج کو مزید بہتر طریقے سے سمجھنے لگوں گی مجھے سارے کام مینیج کرنے اور سب معاملات ہینڈل کرنے آتے جائیں گا' میری حساسیت کم ہوگی' جو کوتاہیاں کمیاں مجھ میں آج ہیں وہ نہ ہوں گی اور ہوسکتا ہے تب سب لوگ میری نیچر بھی سمجھنے لگیں پھر سب ٹھیک ہوجائے گا' سیٹ ہوجائے گا۔"

"ہوپ سو کہ ایسا ہی ہو۔" حارث نے اس کے لیے صدق دل سے دعا کی۔

"ان شاء اللہ ضرور ہوگا اور بہت جلد ہوگا۔" شمسہ جھٹ سے بولی تھی۔

تالی تو اب بھی بجتی ہے' مگر اس کی نوعیت بدل چکی۔

شیشے کے سامنے کھڑی شمسہ نے چٹیا کو بل دیتے ہوئے گداز ہو کر سوچا۔

اب ہم ہاتھ پہ ہاتھ مار کر کسی بات پہ ہنس رہے ہوتے ہیں' کسی چیز کو انجوائے کررہے ہوتے ہیں۔

ٹوکری میں نیا برتن آئے تو ٹکرانے کی آوازیں پہلے سے زیادہ ہو جاتی ہیں' مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ ایک دوسرے کو توڑنے پھوڑنے کے اور ایک دوسرے کی جگہ لینے کے درپے ہو جائیں' کچھ کچھ تنگی ہر ایک کے حصے میں آتی ہے' مگر پھر سب ایڈجسٹ ہو جاتے ہیں' اس قدر کہ کوئی موجود نہ ہو تو ادھورا لگنے لگتا ہے۔ کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔

سننے میں عجیب لگے گا' مگر ہوا یہی تھا۔ گھر گرہستی میں مصروف رہنے والی عورت ہوں نا تو مجھے زندگی کا گر بھی گرہستی کے کاموں نے ہی سکھایا اور سمجھایا' جی ہاں برتنوں اور برتنوں کی ٹوکری نے' جانتی ہوں کہ آپ کو ہنسی آئے' مگر اکثر میری ہم خیال ہوں گی بلکہ ساری گرہستن عورتیں ہی ہم خیال ہوں گی جب میں مستقل پریشان رہنے لگی تو سوچا کہ اس سب کا انجام کیا ہوگا؟ اور میں سوچ کے ہی لرز گئی کہ شاید سب کے دل دور ہو جائیں۔

"نہیں نہیں یہ نہیں ہونا چاہیے۔" میرا ضمیر کرلایا' دل رویا "بیشک۔ کچھ مسائل ہیں' مگر چاؤ ارمان بھی تو بہت کیے گئے تھے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ تم بھی عورت ہی بنو؟ تاک پہ غصہ رکھنے والی ہمہ وقت ناراضی کے لیے تیار رہنے والی؟"

کوئی میرے اندر سے بولا۔

"کیوں نہ تم گرہستن بنو' ہر وقت مصروف رہنے کے باوجود مسلسل مسکرانے والی کیونکہ خار تو تم سے کوئی نہیں کھاتا' نفرت بھی نہیں' چڑ بھی نہیں بس ذرا ذرا سی باتیں ہی تو ہیں۔"

آئیڈیا اچھا تھا۔ دل کو لگا' دقت ضرور ہوئی کیونکہ گلاس کے خالی حصے کو نظر انداز کرکے بھرے ہوئے حصے کو دیکھتے رہنا مشکل ہی نہیں مشکل ترین تھا' مگر بہرحال ناممکن نہیں تھا۔ دودھ سے دھلا ہوا تو میں نے خود کو بھی کہا نہ سمجھا ہاں مگر گرہستن بننے کی عقل مندی ضرور کی اور اس پہ مجھے فخر ہے۔

ارے یہ کیا۔ شاید ہانڈی لگ گئی ہے اور شاید کوئی تیز تیز۔ بڑبڑا بھی رہا ہے' میں کچن کو چلی۔ مگر اس بڑبڑاہٹ کو سر پر سوار کرکے میں اپنی پلکیں نم نہ ہونے دوں گی۔

جی ہاں اختلاف رائے اب بھی ہو جاتا ہے' ایک دوسرے کی باتوں کو کبھی کھلے عام اور کبھی ڈھکے چھپے ناپسند بھی کیا جاتا ہے' مگر اب میں سر پہ سوار نہیں کرتی' دل پہ نہیں لیتی۔ اس سب کی عادی جو ہو گئی ہوں اچھی گرہستن بننے کے لیے میں نے ہر مطلوبہ طریقہ اپنایا ہر عادت اپنائی اور کامیاب ہو گئی' مجھے سراہیے گا ضرور آفٹر آل ایک گرہستن کو سب سے زیادہ چاہ پذیرائی کی ہی تو ہوتی ہے۔

☆

شاہدہ طلعت

آوارگی

ناولٹ

رمیز حسن بظاہر تو چائے پی رہے تھے مگر گاہے گاہے احسن پر بھی نظر ڈال لیتے، جو کسی الجھن میں تھا۔ اس کی حرکات و سکنات 'اضطراب' بے چینی کچھ بھی ان کی نظروں سے چھپا نہ تھا۔ کوئی چیز اسے پریشان کررہی تھی مگر کیا۔۔۔ وہ یہ سمجھنے سے فی الحال قاصر تھے۔

چائے ختم کرکے خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے انہوں نے پھر احسن کو دیکھا۔ اس کی پرسوچ نگاہیں چائے کے کپ پر تھیں اور وہ اضطراری کیفیت میں سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرے جارہا تھا۔ رمیز حسن ہلکا سا کھنکھارے۔

"کہو برخوردار۔۔۔ کیا کہنا چاہتے ہو' اگل دو تاکہ سکون ملے کچھ تمہیں بھی' ہمیں بھی۔"

احسن نے چونک کر انہیں دیکھا۔ پھر سنبھل کر سیدھا ہو بیٹھا۔ جیسے اسی انتظار میں ہو۔

"پاپا۔۔۔ مجھے شمائلہ سے شادی نہیں کرنی۔۔۔ کسی صورت بھی نہیں۔"

رمیز حسن کا منہ کھل گیا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ احسن کے دل میں یہ کھچڑی پک رہی ہے۔

"پاگل ہوگئے ہو تم؟ اگر یہ مذاق ہے تو نہایت بھونڈا ہے۔" انہوں نے خفگی سے کہا۔

"یہ مذاق نہیں ہے پاپا۔۔۔ میں سیریس ہوں۔۔۔ اور اگر آپ کو میری زندگی عزیز ہے تو آپ کو میری بات ماننا ہوگی۔"

"مگر کیوں۔۔۔؟" رمیز نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے شمائلہ کو دیکھا تھا۔ پسند کیا تھا۔ باتیں کیں۔۔۔ ملتے جلتے رہے۔ یہ منگنی تمہاری پسند اور مرضی سے ہوئی اور۔۔۔"

"اور اب میں اپنی مرضی سے ہی یہ منگنی توڑ رہا ہوں پاپا! اس کا اور میرا مزاج بالکل نہیں ملتا۔ میں مشرق کو چلوں تو وہ مغرب کو چلتی ہے۔ میں دن کہوں تو وہ رات۔۔۔ پاپا! ایسی لڑکی کے ساتھ دو قدم چلنا بھی مشکل ہے نہ کہ ساری زندگی۔" اس کا لہجہ مستحکم تھا۔

"تو پہلے تم کیا سوئے ہوئے تھے؟" رمیز حسن نے مشتعل ہو کر کہا۔ "چھ ماہ ہوگئے تمہاری منگنی کو اور

اب تمہیں پتا چلا ہے کہ تمہارے مزاج نہیں ملتے؟"

"اگر شادی کے بعد پتا چلتا تو اور برا ہوتا پاپا!" احسن نے جھلا کر کہا۔ "ہمارے درمیان وہ انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ ہی نہیں ہو سکی جو عمر بھر ساتھ نبھانے کے لیے ضروری ہے۔"

"یہ کوئی جواز نہیں ہے احسن!" رمیز حسن تھوڑا نرم پڑے۔ "تمہاری ماما کے ساتھ میری انڈر اسٹینڈنگ شادی کے بعد ہوئی اور ہماری خوش گوار زندگی تمہارے سامنے ہے۔"

"وہ اور زمانہ تھا پاپا۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔ ماما آپ کی ہم مزاج تھیں۔ یہ آپ کی خوش قسمتی تھی۔۔۔ نہ ہوتیں تو روتے سر پکڑ کر۔۔۔ شمائلہ کی الٹی کھوپڑی ہے۔ میرا اس کا گزارا ممکن نہیں۔ لوگ تو سبزی بھی خریدتے ہیں تو ٹھوک بجا کر۔۔۔ یہ تو عمر بھر کا معاملہ ہے۔"

"بند کرو یہ بکواس۔۔۔" رمیز حسن غصے سے کھڑے ہو گئے۔ "اتنی مدت ملتے رہے، تب نہ جانچا، نہ پرکھا۔ اب خیال آیا تمہیں۔ یہ سب تمہیں منگنی سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" ان کا انداز قطعی تھا۔

"تو کیا اب اس بھول کا خمیازہ ساری عمر بھگتوں؟ زندگی ایک بار ملتی ہے اور مجھے اپنی زندگی عذاب نہیں بنانی۔"

"مجھے غصہ مت دلاؤ۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا، کبھی بھی نہیں۔" رمیز نے کمال ضبط کیا۔

"یہ تو ہو گا پاپا۔۔۔ اگر آپ کو میری زندگی عزیز ہے تو۔۔۔" احسن کا انداز حتمی تھا۔ وہ جو دم بخود بیٹھی باپ، بیٹے کی تکرار سن رہی تھیں۔ ایک دم بول پڑیں۔

"احسن بیٹا! فضول ضد مت کرو۔ ہماری بھی کوئی عزت ہے۔ اپنے پاپا کی بات مان لو۔"

"یہ ضد نہیں ماما! میرا فیصلہ ہے اور پاپا سوری۔۔۔ میں نے شمائلہ کو بھی بتا دیا ہے اور اس کے گھر والوں کو بھی۔"

"احمق، نالائق، گدھا۔۔۔" رمیز حسن کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو گیا۔ "سارے فیصلے خود ہی کر لیے اور ہمیں خبر تک نہیں۔"

"سوری پاپا! اتنا اختیار تو مجھے اپنی زندگی پر ہونا چاہیے۔"

احسن نے مدھم لہجے میں کہا اور میز سے گاڑی کی چابی اٹھا کر تیز تیز قدم اٹھاتا باہر چلا گیا۔

انہوں نے رمیز حسن کی طرف دیکھا جو کمرے کا طول و عرض ناپ رہے تھے۔

"دیکھا تم نے اپنے لاڈلے سپوت کو۔" وہ چکر لگاتے لگاتے ان کے سامنے رکے۔ "کیا بے ہودہ حرکت کی ہے۔ انکار تک کہلا بھیجا۔ خود مختار ہو گیا ہے تمہارا ہونہار۔۔۔"

افسوس تو انہیں بھی ہوا تھا مگر طنز کیے بنا نہ رہ سکیں۔

"آپ کا بیٹا ہے۔ آپ پر ہی جائے گا۔"

"بیٹا ہمارا ہے مگر ہم جیسا ہے کہاں۔ ہم والدہ کے انتہائی فرماں بردار۔ تابع دار تھے۔ امی جان مرحومہ نے کہا۔ چڑھ جاؤ بیٹا سولی۔ چڑھ گئے چپ چاپ، بغیر اعتراض و حجت کے۔" رمیز حسن غصے میں اسی طرح بلا سوچے سمجھے بولتے تھے۔

"خیر اتنا مبالغے سے بھی کام نہ لیں۔" انہوں نے تحمل سے کہا۔

"یاد نہیں جو اودھم مچائے تھے آپ نے۔ میرے والدین کو کیسے کیسے پیغام بھیجے، کیا کیا ناٹک رچائے تھے؟"

"وہ تو بس یوں ہی ضد میں۔۔۔ ورنہ امی جان آگ میں چھلانگ لگانے کو کہتیں تو کود جاتے چاپ چپ، بنا سوال کیے اور تمہارے صاحب زادے۔۔۔ بدلحاظ، گستاخ، بدتمیز۔۔۔ اور تم اس کی حمایت کر رہی ہو۔ اس نالائق کی؟" فرحین کی بات پر وہ تھوڑا جھجکے تھے مگر پھر اپنی ٹون میں واپس آ گئے۔

"میں حمایت نہیں کر رہی۔۔۔ اس نے برا کیا، بہت برا، مگر کہا اس نے درست، یہ ہمارا زمانہ نہیں کہ والدین

نے جس کھونٹے سے باندھا، بندھ گئے۔"

"ہمارا زمانہ۔۔۔" انہوں نے پرخیال نظروں سے بیگم کو دیکھا۔

اور ان کی آنکھوں کے سامنے کھلتے گلابوں جیسا وہ دلربا چہرہ آ گیا۔ جو پل بھر میں ان کے حواسوں پر چھا گیا تھا۔ ان کے اعصابی تناؤ سے کھنچے کھنچے۔۔۔ نقوش ڈھیلے پڑنے لگے۔

اور وقت جیسے تیس سال پیچھے چلا گیا۔ جب انہوں نے پہلی بار ان کو دیکھا تھا۔

وہ بھی شاید ماضی میں پہنچ گئی تھیں۔ ان کی کھوئی کھوئی آنکھیں جیسے کوئی خواب دیکھنے لگی تھیں۔

گزرا وقت ہاتھ باندھے ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اور وہ اس کے ایک ایک پل کو اپنے سامنے گزرتے دیکھنے لگے۔

☼ ☼ ☼

بات کچھ زیادہ بڑی نہ تھی مگر گھر میں طوفان آ گیا تھا۔ بابا جان گرج رہے تھے۔ امی جان بھی غصے میں تھیں۔ بھابھی اور بھائی جان دم بخود تھے۔ ضیا جو رمزی کا پیغام لایا تھا، سر جھکائے کھڑا تھا اور فرحین کھڑکی سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"اسے جرأت کیسے ہوئی ایسی بات کہنے کی۔" بابا جان مارے طیش کے منہ سے کف اڑا رہے تھے۔ "کہہ دو جا کر اس سے، شریف گھرانوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ نکال دے یہ خیال ذہن سے اور خبردار جو آئندہ کوئی ایسا ویسا پیغام بھیجا۔"

"ائے اس کی اماں نے دسیوں بار ٹھوک بجا کر دیکھا۔ چوکھٹ گھسا ڈالی، تب جا کر ہم نے ہاں کی۔" امی جان نے تنک کر کہا۔ "ہمیں کوئی لڑکی بھاری نہیں پڑی تھی۔ اب بھلا یہ رمزی میاں کو سوجھی کیا؟"

"پتا نہیں۔۔۔ مگر وہ کہتا ہے کہ ایک نظر دیکھنے کا تو شرع نے بھی حق دیا ہے۔" ضیا نے دبی زبان میں کہا۔

"شرع۔۔۔؟" بابا جان آگ بگولہ ہو گئے۔ "شرع نے حق دیا تھا تو یہ حق پہلے مانگتے۔ اب جبکہ باقاعدہ منگنی ہو چکی ہے۔ اب انہیں اس حق کا خیال آیا ہے۔ یوں بھی ہمارے گھرانے میں ایسا کوئی رواج نہیں۔ اگر انہیں ماں، بہنوں پر اعتماد نہیں ہے تو کوئی اور گھر دیکھیں۔"

"ہائے میری بدنصیب بچی۔" امی جان واویلا کرنے لگیں۔

"جب رشتہ ہوا تھا تو کیسے دشمنوں کے سینے پر تیر چل گئے تھے۔ ایسا اچھا، اعلا تعلیم یافتہ، مقبول لڑکا، ضرور دشمنوں نے کچھ کر دیا ہے، ہائے میری بچی کے نصیب۔"

"تم چپ رہو۔" بابا جان نے امی جان کو ڈانٹ دیا۔ "یہ آہ و بکا کس لیے۔

کہہ دو میاں! جا کر کہ یہ ناممکن ہے، سمجھے؟" وہ دوبارہ ضیا سے مخاطب ہوئے۔

"جی۔۔۔ اچھا۔۔۔" ضیا کندھے اچکاتا کمرے سے نکل گیا۔

فرحین لڑکھڑاتی ہوئی کھڑکی سے ہٹی اور بستر پر اوندھے منہ گر پڑی۔ "یہ کیا ہو گیا میرے خدا!"

اس کا سر چکرا رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے ترمرے ناچ رہے تھے۔

"اگر رمزی ضد پر اتر آئے تو۔۔۔ بابا جان تو کسی صورت ان کی بات نہ مانیں گے۔ پھر کیا ہو گا آخر؟" اس کا دل انجانے خدشات سے لرز رہا تھا۔

"خدانخواستہ۔۔۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو۔۔۔" وہ کانپ اٹھی۔ رمزی جیسے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"بولو۔۔۔ جی پاؤ گی میرے بنا۔۔۔ رہ لو گی میرے بغیر؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" وہ چہرہ بازوؤں میں چھپا کر سسک اٹھی۔ "میں مر جاؤں گی۔ خدایا۔۔۔ یہ کیا ہو گیا؟"

بات صرف یہ تھی کہ رمزی، فرحین کو ایک نظر دیکھنا چاہ رہا تھا۔ جس وقت ان کی منگنی ہوئی وہ لندن میں ایف آر سی ایس کرنے کے بعد وہیں ایک اسپتال میں جاب کر رہا تھا۔ گھر سے خط پر خط آ رہے تھے۔

"جلدی واپس آؤ تاکہ تمہاری شادی کے فرض سے سبکدوش ہو سکیں۔"

مگر رمزی ٹال مٹول کر رہا تھا کہ ایسی کیا جلدی ہے؟ وہ پلاسٹک سرجری میں اسپیشلائزیشن کرنے کے بعد ہی واپس آنا چاہتا تھا۔ مگر ندا نے لکھا کہ ان کو فرحین پسند آگئی ہے اور وہ ان کی منگنی کر رہے ہیں۔ اس لیے وہ ابھی اسپیشلائزیشن کرنے کا خیال چھوڑ دیں اور آکر شادی کریں' پھر چاہے جو کرتے رہیں۔

رمزی حیران ہوا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ وہ باشعور تھا۔ تعلیم یافتہ تھا۔ پھر وہ بغیر دیکھے' بغیر پرکھے کیسے ایک اجنبی لڑکی کے لیے ہاں کر دے۔ اس نے فوراً" کال کی اور بہن سے صاف کہہ دیا کہ وہ کسی انجان' ان دیکھی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے قطعاً" تیار نہیں۔ ندا نے کہا۔

"امی بیمار ہیں اور اگر انہیں ان کی زندگی عزیز ہے تو تاخیر نہ کریں اور فوراً" واپسی کا قصد کریں۔ امی جان اپنی آنکھوں سے انہیں ہنستا بستا دیکھنا چاہتی ہیں اور وہ سہرا بندھا کر ان کی آرزو پوری کریں اور یہ کہ فرحین اچھی لڑکی ہے۔ اس سے شادی کرکے وہ پچھتائیں گے نہیں۔"

رمزی جھنجلا رہا تھا۔ مگر ماں کی بیماری کا سن کر نرم پڑ گیا۔

"ٹھیک ہے' اگر امی جان کی خوشی یہی ہے تو آجاتا ہوں۔" اس نے فوری فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "مگر میرے آنے سے پہلے کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔ میں پہلے اسے ایک نظر دیکھنا اور اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"مگر..." ندا کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ "اچھا خیر... آپ آجائیں... اس کی بھی کوئی نہ کوئی سبیل نکل آئے گی... میں ملوا دوں گی۔"

"ندا... تم ان کو بتا دینا... میری بس یہی ایک شرط ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ کہیں بعد میں کوئی مسئلہ نہ ہو... شادی عمر بھر کا معاملہ ہے۔ مجھے انتخاب کا حق تو ہونا چاہیے نا۔"

ندا کچھ ہچکچائی۔

اسے یوں ہی کچھ احساس سا ہوا کہ جیسے ندا کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ وہ اس سے پوچھنا چاہ ہی رہا تھا۔ مگر رابطہ منقطع ہو گیا۔

وہ واپس آنے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ امی جان کی بیماری کا سن کر وہ در حقیقت پریشان ہو گیا تھا... اور بہر صورت ان کی خوشی پوری کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس سال کی تمام تعطیلات وہ ختم کر چکا تھا۔ اور اب جولائی سے پہلے اسے کوئی چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ کچھ اور بھی چھوٹے موٹے مسائل تھے۔ واپس آتے آتے اسے چھ ماہ لگ گئے۔ اس اثنا میں اس کی منگنی کر دی گئی۔ ندا نے معذرت کرتے ہوئے بتایا۔

"فرحین جیسی لڑکیاں بیٹھی نہیں رہتیں۔ اس کے رشتے آرہے تھے۔ اور گھر والے منگنی کرنے کو تقریباً" تیار تھے۔ چنانچہ انہیں مجبوراً" ایسا کرنا پڑا۔ کیونکہ فرحین جیسی لڑکی کو کھو دینا بڑی بدقسمتی ہوتی۔"

رمزی بہت جھنجلایا۔ غصہ ہوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ ان سب کو وہ اتنی پسند تھی کہ وہ اسے کھو دینے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ رمزی چپ ہو رہا کہ جو ہوا سو ہوا۔ دل میں طے کر لیا کہ شادی مگر اس وقت تک نہیں کرے گا۔ جب تک فرحین سے مل نہ لے گا۔ کیونکہ وہ سمجھوتے کی زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ وہ ایسا جیون ساتھی چاہتا تھا جو اس کا ہم مزاج ہو۔ اسے سمجھ سکے۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ خیالات کا تضاد ٹکراؤ کا سبب بنتا ہے۔ وہ گھر میں اور زندگی میں جھگڑا نہیں سکون اور پیار و خلوص کی فضا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ندا کو جتا دیا کہ وہ فرحین کو دیکھے بنا شادی نہیں کرے گا اور ندا اپنا وعدہ پورا کرے۔

ندا نے اسے بتایا کہ اس کا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جہاں پرانی اقدار و روایات کی پاسداری جان سے بڑھ کر کی جاتی ہے۔ ان کے ہاں شادی سے پہلے لڑکی کا سسرال عزیزوں کے سامنے جانا سخت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ منگیتر بے چارہ تو اس کی جھلک تک نہیں دیکھ سکتا۔ فرحین کو صرف امی جان اور ندا نے دیکھا۔

"یہ کیا جہالت ہے؟" رمزی بڑبڑایا۔ "اتنا چھپا چھپا کر کیوں رکھ رہے ہیں؟ کیا عیب ہے اس میں؟"

"کوئی عیب نہیں۔" ندا نے اطمینان سے کہا۔ "میں نے بتایا نا کہ ان کے ہاں روایات کی پابندی سختی سے کی جاتی ہے۔ پھر بھی میں کوئی نہ کوئی صورت نکال لوں گی۔ آپ کچھ صبر کریں۔"

"یاد رکھنا ندا... جب تک میں اس سے مل نہیں لوں گا۔ شادی نہیں کروں گا۔" اس نے وارننگ دی۔

"ٹھیک ہے... ایک' دو دن تک موقع نکال کر ادھر جاؤں گی اور کسی نہ کسی بہانے آپ کو ملوا دوں گی۔"

رمزی مطمئن ہو گیا۔ مگر ندا اپنا وعدہ پورا نہ کر سکی۔ اسرار احمد کو گردے کی تکلیف تھی۔ ندا' امی کی بیماری کا سن کر پاکستان آئی تھی۔ پھر ماں کی خاطر رمزی کے لیے لڑکیاں دیکھنے لگی۔ اور پھر رمزی کی منگنی کے بعد بھی نہ جا سکی۔ اس کا ارادہ بھائی کی شادی کے بعد جانے کا تھا۔ کینیڈا سے آئے اسے سال بھر ہونے کو تھا۔ اس دوران اسرار احمد کی تکلیف بڑھ گئی۔ چنانچہ اس نے فون کرکے ندا کو بلوایا۔ بے چاری ندا کو افراتفری کے عالم میں کینیڈا جانا پڑا۔ اس کے اس طرح جانے کا افسوس سب کو ہی تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ سب سے زیادہ اثر رمزی پر ہوا... سالوں بعد وہ بہن سے ملا تھا۔ دوسرا اس کا کام نہ ہو پایا تھا۔

رمزی اپنی ضد پر قائم تھا کہ جب تک فرحین کو دیکھے گا نہیں' شادی نہیں کرے گا۔

ان ہی دنوں اسے معلوم ہوا کہ ضیا فرحین کا کزن ہے۔ اس نے ساری صورت حال اس کے سامنے رکھ دی۔ ضیا نے اس کی مدد کا وعدہ تو کر لیا' مگر اسے بھی کوئی تدبیر نہیں سوجھ رہی تھی۔

"کیوں نہ ماموں جان سے براہ راست بات کروں... کیا پتا مان جائیں۔" ضیا نے رمزی سے کہا۔

"یار... کچھ بھی کرو... اس سے ایک بار ملوا ضرور دو۔"

"ٹھیک ہے... پھر میں ان ہی سے بات کرتا ہوں۔ انہیں قائل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ آگے تمہاری قسمت..."

مگر جب ضیا نے بات کی تو اعجاز حسن ہتھے سے اکھڑ گئے اور رمزی کے ساتھ ساتھ ضیا کو بھی بے نقط سنا ڈالیں۔ ضیا نے جا کر رمزی کو بتایا کہ بات بگڑ گئی ہے اور اب تو وہ کسی صورت فرحین کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکتا۔ کجا کہ بات کرنا۔

ضیا کو افسوس ہو رہا تھا۔ "مجھے عذرا بھابھی یا ارسلان بھائی سے کہنا چاہیے تھا۔ وہ ضرور کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتے۔"

"مگر اس میں اتنا طیش میں آنے کی کیا بات تھی؟" رمزی کو سخت برا لگا۔ "منگیتر ہے میری... مجھے اس سے ملنے کا حق ہے۔ میں کوئی ان کی لڑکی کو اغوا نہیں کرنے جا رہا' نہ میں کوئی آوارہ ہوں اور ایسا ہی انہیں میری شرافت پر شک ہے تو بٹھائیں لڑکی کو اپنے گھر میں..."

"ٹھیک ہے... ہمیں لڑکی کوئی بھاری نہیں ہے۔" اعجاز حسین غصے سے ضیا پر برس پڑے۔ "ہم کسی صورت اس کی بات ماننے کو تیار نہیں' خبردار! جو ہماری لڑکی کا نام لیا یا کبھی ہمارے گھر جھانکا بھی کہہ دو اسے وہیں لندن جا کر بیاہ رچالے' دیکھ سن کر... ہمارے ہاں نمائش نہیں لگتی۔" ضیا نے پیغام پہنچا دیا۔

"لندن میں جا کر بیاہ کیوں رچاؤں۔" رمزی نے پیغام بھیجا۔ "جس سے منگنی کی ہے اسی سے بیاہ رچاؤں گا۔"

"ہم شریف لوگ ہیں۔ آن پر جان دینے والے... ایسی ذلت آمیز شرط پر شادی کے لیے تیار نہیں... کوئی اور گھر دیکھو... ہماری طرف سے جواب ہے۔" اعجاز حسن نے کہلا بھیجا۔

"بدمعاش ہم بھی نہیں۔" رمزی نے تلملا کر جواب بھجوایا۔ "فرحین ہماری مانگ ہے۔ دیکھتے ہیں کوئی اور کیسے لے جاتا ہے۔"

"خبردار... جو فرحین کا نام لیا۔" اعجاز حسن نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے پیغام بھیجا۔ "زبان کاٹ ڈالوں گا کم بخت کی۔ سمجھا لو اپنے اس چہیتے کو... ورنہ سچ مچ جان سے جائے گا۔"

"نام کیوں نہ لیں فرحین کا... نام بھی لیں گے'

ملیں گے بھی' بیاہ بھی رچائیں گے اور جو کسی نے روکا تو اٹھالے جائیں گے۔ تم بھی کہہ دو جاکر۔"

ضیا اِدھر سے اُدھر پیغام لانے' لے جانے میں گھن چکر بنا ہوا تھا۔ معاملہ سلجھانے کی کوشش میں اور زیادہ بگڑا جارہا تھا اور وہ جس کے بارے میں یہ سارے فیصلے ہورہے تھے۔ اس سے کوئی نہیں پوچھتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے غش پر غش آرہے تھے۔ آنکھیں سوج کر انگارہ ہورہی تھیں اور آنسو تھے کہ خشک ہونے میں نہ آتے تھے۔ عذرا بھابھی بار بار بے چین ہو کر اس کے پاس آتیں۔ اسے گلے لگاتیں' تسلی دیتیں' مگر وہ روئے چلی جاتی۔ کتنی بار ان کا جی چاہا کہ بابا جان سے جاکر کہہ دیں۔

"بابا جان! اتنی معمولی سی بات کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائیں۔ اگر رمزی اسے ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں تو اس میں کیا حرج ہے۔"

مگر حوصلہ نہ پڑتا۔

بابا جان اندر ضیا پر گرجتے برستے رہے۔ وہ اپنے کمرے میں رو' رو کر بے حال ہوتی رہی۔

ضیا بابا جان کے کمرے سے باہر نکلا تو منہ لٹکا ہوا تھا۔ جاتے جاتے وہ ذرا دیر کو فرحین کے پاس آیا۔

"کیا ہوا فرحین رو کیوں رہی ہو؟"

فرحین اور زور' زور سے رونے لگی۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ گھبرا کر ضیا پانی لانے دوڑا۔ بمشکل اس کے آنسو تھمے۔

"ہاں اب بتاؤ۔ کیا بات ہے؟" اس نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں مرجاؤں گی ضیاء بھائی۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"ہیں۔ وہ کیوں؟ اچھا۔ سمجھا۔ مگر مرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم خود ہی کیوں نہیں مل لیتیں اس سے؟ اکڑا ہوا ہے۔ دونوں طرف سخت کشیدگی ہے۔ معاملہ سیریس ہے۔ اب جانے کیا ہو۔ کہو کیا کہتی ہو؟"

وہ سر جھکائے روتی رہی۔

"بولو۔ ملوگی رمزی سے؟" ضیا بھائی نے اصرار سے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر رونے دھونے کا فائدہ۔ بزدل۔ جو ہوتا ہے ہونے دو۔ روئے جاتی ہیں بس۔ ذرا سی ہمت نہیں کرسکتیں۔" ضیا بھائی خفا ہو کر چل دیے۔

اس کے آنسو اور بھی روانی سے بہنے لگے۔ وہ کیا کرے؟ کس قدر بے بس ہوگئی تھی وہ۔ نہ تو وہ بابا جان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانا چاہتی تھی اور نہ ہی اسے دل پر کوئی اختیار تھا جو رمزی کے نام پر دھڑکے چلا جاتا۔

منگنی کے بعد جب اسے رمزی کی تصویر دکھائی گئی تو وہ دیکھتی رہ گئی۔ اسے اپنی قسمت پر ناز ہونے لگا۔ خوش رو' جاذب نظر' ہنستی ہوئی روشن آنکھوں والا رمزی پل بھر میں اس کے دل میں اتر گیا۔ چپکے چپکے اس کی آنکھوں نے کتنے ہی خواب دیکھ ڈالے' اور وہ جیسے اس کی رگ رگ میں لہو کی طرح دوڑنے لگا۔ کبھی کبھی اسے حیرت ہوتی' کیسے وہ ایک بالکل اجنبی' ان دیکھے' انجان شخص کی محبت میں پور پور ڈوب چکی ہے۔ حالانکہ اسے اس شخص کی عادات' مزاج کسی چیز کا پتا نہ تھا۔ وہ تو یہ تک نہیں جانتی تھی کہ اسے کیا چیز پسند ہے اور کیا ناپسند۔ اس کے باوجود وہ اس کے دل کی گہرائیوں میں بڑے ٹھاٹھ سے براجمان تھا۔ اس کے نام کی انگوٹھی پہن لینے کے بعد وہ اسے کتنا اپنا اپنا سا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ اسے اپنی ملکیت سمجھنے لگی تھی' مگر اب یہ اعزاز چھننے والا تھا۔ وہ امی جان سے' بابا جان سے' ارسلان بھائی سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اسے کس جرم کی سزا دی جارہی ہے۔ کیوں اس سے پوچھے بنا اس کی زندگی کا فیصلہ کیا جارہا ہے؟

وہ انہیں بتانا چاہتی تھی کہ اسے رمزی ہر حال میں پسند ہے۔ چاہے اس میں ہزار عیب ہوں۔ مگر وہ یہ سب کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ کیونکہ اس کی زبان پر حیا

کے تالے تھے۔ وہ تو انہیں یہ بھی نہ جتا سکی کہ یہ منگنی اس نے اپنی مرضی سے نہیں کی تھی۔ اس کی زندگی کا ساتھی انہوں نے چنا تھا اور اس نے اسے قبول کرلیا تھا۔ ذہن و دل اور روح کی پوری گہرائیوں کے ساتھ۔

اور اب اس کے دلی احساسات سے بے خبر بابا جان اس بندھن کو توڑنا چاہ رہے تھے۔ گویا اس کے جسم سے روح نکال لینا چاہتے تھے۔ وہ اندر ہی اندر مر رہی تھی۔ مگر منہ سے کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ وہ چپکے چپکے روتی اور رو دھو کر خود ہی چپ ہوجاتی۔ کسی کام سے کمرے سے باہر نکلنا پڑتا تو اپنی روئی روئی آنکھوں کو چھپانے کی کوشش کرنے لگتی۔ بھوک پیاس اڑ گئی تھی۔

عذرا بھابی کو تو اس کی دلی کیفیتوں کا کچھ کچھ اندازہ تھا۔ البتہ ضیا بھائی کے سامنے پھوٹ کر رو پڑنے پر وہ شرمندہ تھی۔

پل بھر کے لیے اسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ رمزی کو خط لکھ کر اس سے التجا کرے کہ وہ فی الحال بابا جان کی بات مان لیں۔ بعد میں اگر وہ ان کی پسند پر پوری نہ اتری تو خاموشی سے ان کی زندگی سے نکل جائے گی۔ مگر وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔

کیا پتا رمزی کا مزاج کیسا ہو؟ اگر وہ اس کے لفظوں کی خوشبو کو محفوظ نہ رکھ سکا تو۔ وہ کیسے بابا جان سے نظریں چار کرسکے گی؟ کیا پتا وہ ضدی شخص اس کا خط جاکر سیدھا بابا جان کے سامنے رکھ دے کہ حضرت! صاحب زادی تو یہ کہتی ہیں اور آپ ہیں کہ خوامخواہ اکڑے جارہے ہیں۔

نہیں۔ وہ بابا جان کو شرمندہ نہیں کرسکتی تھی۔ نہ ہی اس میں اتنا بڑا قدم اٹھانے کا حوصلہ تھا۔

پھر بھی بار بار اسے یہ خیال آتا رہا کہ کسی بھی طرح منت سماجت کرکے ہاتھ جوڑ کے اور ضرورت پڑے تو پاؤں پڑ کے رمزی کو روک لے۔ اس طرح امکان تھا کہ شاید رمزی اسے پسند کرلے۔ آخر اس میں کمی کیا تھی۔ گھٹاؤں جیسے سیاہ' گھنے' لمبے بال' خوب صورت مدھ بھری آنکھیں۔ سانچے میں ڈھلا جسم اور تیکھے تیکھے دل میں اتر جانے والے نقش و نگار جو دیکھنے والے کی توجہ فوراً" اپنی طرف کھینچ لیتے۔ اسے اپنی قوت تسخیر سے اچھی طرح آگاہی تھی۔ اسے امید تھی کہ شاید وہ اس کی سیاہ زلفوں کے گھنے جنگلوں میں سے واپس جانے کا راستہ بھول جائے اور اس کی جادو نگاہ آنکھوں کے طلسم میں گرفتار ہوجائے۔ جبکہ بابا جان کا فیصلہ اسے یکسر اس کی دنیا سے جدا کررہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ضیا' رمزی کے پاس آیا تو رمزی بیڈ پر لیٹا ریلوے کا انجن بنا منہ اور ناک سے دھواں اڑا رہا تھا۔ ضیا سخت جھنجلایا۔

"یار رمزی۔ مجھ سے نہیں ہوتا یہ پیغام رسانی کا واہیات کام۔ اِدھر سے تم ہٹ لگاتے ہو۔ اُدھر سے ماموں جان ٹھوکر مارتے ہیں۔ میں غریب تو مارا گیا خوامخواہ۔ اور ایک وہ صاحبہ ہیں کہ رو' رو کر ہلکان ہورہی ہیں۔ جان دے رہی ہیں۔"

رمزی جو ضیا کا غیر دلچسپ بیان بے نیازی سے سن رہا تھا اٹھ بیٹھا۔

"کون۔ کون صاحبہ؟"

"فرحین اور کون۔ جان دینے پر تُلی ہیں۔ وہ تو میں نے سمجھایا کہ ٹھہرو ابھی۔ کیا پتا حالات سدھر جائیں۔" ضیا نے مبالغے سے کہا۔

"اچھا۔ فرحین۔" رمزی سیدھے ہو بیٹھا آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا ہوئی۔ "کیا کہتی ہیں وہ محترمہ؟"

"کہتی ہیں۔ زہر پھانک لوں گی مگر رمزی کے علاوہ کسی اور سے۔ ارے وہ تو سنکھیا منگوائے بیٹھی ہیں کہ اِدھر منگنی کے جوڑے واپس ہوئے اور اُدھر انہوں نے اس دنیا سے ناتا توڑا۔ تجھ سے بانگڑو' ضدی' ہٹ دھرم کے لیے جان دے رہی ہے۔ زیادتی ہے کہ نہیں؟"

"اچھا۔ واقعی؟" رمزی کو اچنبھا سا ہوا۔ شاید مشرقی وفا اسی کا نام ہے۔

"جان کیوں دیتی ہیں؟" رمزی زیرلب بڑبڑایا۔ "اپنے ابا کو کیوں نہیں سمجھاتیں جو ظالم سماج بنے بیٹھے ہیں۔"

"ماموں جان کو؟" ضیا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ "وہ تو زندہ گارڈین ہیں اسے۔"

"ضدی تو میں بھی کچھ کم نہیں۔" رمزی کے ہونٹ بھنچ گئے۔ "دیکھتا ہوں کیسے نہیں مانتے۔"

ضیا جو مبالغہ آمیزی سے رمزی کے جذبہ ہمدردی کو ابھارنا چاہ رہا تھا۔ سرپیٹ کر رہ گیا۔

"یار۔۔۔ تم دونوں ہی ظالم ہو۔۔۔ ایک ہی مٹی سے بنے۔۔۔ ایک معصوم کی جان سے کھیل رہے ہو۔۔۔ اب کیا اپنی ضد میں اسے جان سے مار دوگے؟"

"نہیں۔۔۔" رمزی نرم پڑ گیا۔ "تم ایسا کرو، کسی طرح انہیں منگنی توڑنے سے روکے رکھو اور اگر معاملہ حد سے بڑھ جائے تو بے شک کہہ دینا کہ رمزی شرمندہ ہے۔ معافی مانگنے کو تیار ہے۔ میں اتنے میں کچھ سوچتا ہوں۔"

"کیا سوچو گے اب؟" ضیا نے پوچھا۔

"بہتر تو یہ ہے کہ اپنی ضد چھوڑ دو۔۔۔ فرحین بہترین لڑکی ہے۔ تم پچھتاؤ گے نہیں اور جب وہ تجھ جیسے احمق کو بن دیکھے قبول کر رہی ہے تو تم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟"

"چاہتا تو میں بھی نہیں کہ منگنی ٹوٹے کیونکہ امی جان کو وہ بہت پسند ہے اور اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو وہ بہت اثر لیں گی۔"

ضیا نے منہ بنا کر اسے دیکھا۔

"تم فکر مت کرو۔۔۔ مجھ سے غلطی ہوئی جو میں نے اس تک سیدھے راستے سے پہنچنا چاہا۔ اب میں کوئی اور طریقہ سوچتا ہوں۔"

"یار! کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھنا کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔" ضیا نے ہاتھ جوڑے۔

رمزی نے ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"اچھا یہ بتاؤ۔۔۔ یہ ارسلان حسن کیسے شخص ہیں؟"

"مطلب؟" ضیا نے اسے گھورا۔

"مطلب یہ کہ کیا اتنے براڈ مائنڈڈ ہیں کہ ہمارا ساتھ دیں۔"

"براڈ مائنڈڈ تو ہیں۔۔۔" ضیا نے ہچکچا کر کہا۔ "اور ماموں جان کی ضد پر تھوڑا برہم بھی۔۔۔ مگر معاملہ ان کی بہن کا ہے۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ویسے ارادہ کیا ہے تمہارا؟" ضیا نے تجسس سے اسے گھورا۔

"یار۔۔۔ یہ فرحین تمہاری ماموں زاد ہے نا۔" رمزی نے اچانک پوچھا۔ "کیا یہ تمہارے گھر نہیں آتی جاتی؟"

"ہاں مہینے میں ایک آدھ بار آجاتی تھی۔ ممانی یا عذرا بھابھی کے ساتھ۔" ضیا نے خفگی سے کہا۔

"اور میں نے کہا بھی تھا کہ تھوڑا صبر کرو۔ مگر تم تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کو تیار تھے۔ میری عقل پر بھی پتھر پڑ گئے کہ دوڑا ماموں جان کے پاس۔۔۔ انتظار کرتے تو میں کسی دن اپنے گھر ہی دکھا دیتا۔ مگر اب تو جب سے یہ سلسلہ چلا ہے۔ اس نے کہیں آنا جانا چھوڑ دیا ہے۔"

"تم نہیں لا سکتے کسی طرح؟"

"نہیں۔۔۔ کیونکہ میں ہی اس معاملے میں پڑا ہوں۔۔۔ اصرار کیا تو انہیں شک ہو جائے گا اور میں ماموں جان کے ہاتھوں جاں بحق ہونا نہیں چاہتا۔"

"غلطی ہوئی جو تم سے مدد مانگی۔"

"اسے کہتے ہیں نیکی کر دریا میں ڈال۔" ضیا نے تلملا کر کہا۔

"اچھا خیر۔۔۔ تم اب اس معاملے سے نکل جاؤ۔ میں خود ہی کچھ سوچ لوں گا۔"

ضیا منہ بناتا اٹھ کھڑا ہوا۔

رمزی کی والدہ کو کوئی خبر نہ تھی کہ صاحب زادے کیا گل کھلا رہے ہیں۔ ندا کے جانے کے بعد کچھ تو پریشانی کی وجہ سے وہ کہیں آ جا نہ سکیں۔ پھر ان کی طبیعت بھی نرم گرم رہی۔ فرحین کے گھر سے بھی کوئی نہ آیا تھا جو انہیں حالات کی خبر ہوتی۔ خدا خدا کر کے ان کی طبیعت سنبھلی تو انہوں نے سوچا کہ اب شادی کی تاریخ طے کر لی جائے۔ ندا تقریباً تمام تیاری

کر چکی تھی۔ بری کے تمام جوڑے، زیور تیار تھے۔ صرف کپڑے سلوانے رہ گئے تھے، تو اس میں کون سا وقت لگتا تھا۔ تاریخ طے ہوتے ہی وہ کپڑے سلنے کو دے دیتیں۔ چنانچہ اپنے طور پر وہ مطمئن تھیں۔

اس دن ان کی طبیعت بہتر تھی۔ سو انہوں نے فرحین کے گھر جانے کا سوچا۔ ابھی وہ تیار ہو رہی تھیں، کہ ان کی ایک ملنے والی بیگم وقار آ گئیں۔ بیگم وقار کا فرحین کے ہاں بھی آنا جانا تھا۔ اس لیے انہیں حالات کی تھوڑی بہت خبر تھی۔

"کہاں کے ارادے ہیں؟" انہوں نے انہیں تیار ہوتے دیکھا تو پوچھا۔ "فرحین کے لیے دل تڑپ رہا ہے۔ بہت دن ہو گئے بچی کو دیکھے۔ پھر شادی کی تاریخ بھی طے کرنی ہے۔ رمزی کی چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں۔ پہلے ہی بہت وقت ضائع ہو گیا۔" انہوں نے بیگم وقار کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ لوگ تو رشتہ توڑنے کو تیار بیٹھے ہیں اور آپ ہیں کہ شادی کی تاریخ لینے جا رہی ہیں۔ حد ہو گئی بے خبری کی۔" بیگم وقار کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

"کچھ غلط نہیں۔۔۔ یقین نہ آئے تو خود پوچھ لیں جا کر۔"

"مگر کیوں؟ وہ لوگ تو اتنے خوش۔۔۔ اتنی عزت کرتے تھے۔ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہوئی جو رشتہ ٹوٹنے کی نوبت آئی۔" انہوں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"بات تو آپ اپنے صاحب زادے سے پوچھیں۔ ویسے یہ میں جانتی ہوں کہ وہ رشتہ توڑنے والے نہیں۔"

"تو کیا رمزی نے کچھ کہا؟" انہوں نے چونک کر پوچھا۔

جواب میں بیگم وقار نے تمام قصہ ان کے گوش گزار کر دیا۔ وہ جیسے سکتے کے عالم میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔ انہیں رمزی سے یہ امید نہ تھی۔

رمزی آیا تو وہ منہ سر لپیٹے پڑی تھیں اور ان کا بی پی ہائی ہو رہا تھا۔ وہ گھبرا گیا۔

"امی جان! کیا طبیعت زیادہ خراب ہے۔ ڈاکٹر کو بلاؤں؟" وہ ۔۔۔ چپ رہیں۔

"کیا بات ہے امی جان! صبح تو آپ کافی بہتر نظر آ رہی تھیں۔"

"مجھے تم سے یہ امید نہ تھی رمزی!" وہ بمشکل کہہ سکیں۔ رمزی انجان بن گیا۔

"تم نے مجھے ساری دنیا کے سامنے شرمسار کر دیا۔"

یہ کہہ کر وہ اس بری طرح روئیں کہ رمزی کے لیے انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

"اگر میری کوئی بات بری لگی ہے تو مجھے جو چاہے سزا دیں، الٹا لٹکا دیں یا پھانسی چڑھا دیں، جو چاہیں سلوک کریں میرے ساتھ۔۔۔ اچھا۔۔۔ امی میں خوش ہیں تو کھڑے کھڑے شادی کرا دیں میری۔"

"تم نے ایسا کیوں کیا رمزی! میں کسی سے آنکھیں چار کرنے کے قابل نہیں رہی۔"

"اف امی جان۔۔۔ آپ نے ذرا سی بات کو مسئلہ بنا دیا۔ میں فرحین کو دیکھنا چاہتا تھا اور بس۔۔۔ آپ نہیں چاہتیں تو نہ سہی۔" اس نے ہاتھ جھاڑے۔

"وہ لوگ رشتہ توڑنا چاہ رہے ہیں۔"

"کیا ان کی طرف سے کوئی پیغام آیا؟" رمزی چونک پڑا۔

"نہیں۔۔۔ مگر میں نے سنا ہے کہ وہ رشتہ توڑنے کی سوچ رہے ہیں۔"

"ایسا نہیں ہوگا امی جان!" رمزی نے یقین دلایا۔ "اگر انہوں نے رشتہ توڑنا ہوتا تو اب تک توڑ چکے ہوتے۔"

"شاید وہ ابھی فیصلہ نہیں کر پا رہے۔ مگر جلد یا بدیر۔۔۔ اگر بھائی صاحب نے کوئی فیصلہ کر لیا تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔ تم نے آخر ایسی بچکانہ حرکت کی کیوں؟"

"غلطی ہو گئی۔" اس نے معصوم سی صورت بنا کر کہا۔ "آپ جو چاہیں کریں۔ اب میں آپ کے

معاملات میں بالکل دخل نہیں دوں گا۔"

"مجھے حوصلہ نہیں پڑ رہا ان سے بات کرنے کا۔" امی جان ہچکچائیں۔

"آپ بات کرکے دیکھیں۔ زیادہ سے زیادہ انکار کردیں گے' تو ٹھیک ہے' دنیا میں صرف فرحین ہی نہیں ہے۔"

"تمہاری ان ہی باتوں کی وجہ سے معاملہ بگڑا ہے۔ اگر بات بن گئی تو میں اسی ماہ کی کوئی تاریخ شادی کی رکھ دوں گی۔"

"جو مرضی آئے کریں۔ میں نے کہا نا' میں آپ کے معاملات میں کوئی دخل نہ دوں گا۔"

رمزی نے سر جھکا کر کہا۔ امی جان نے رمزی کی پیشانی چوم لی۔

"بتا اگر تجھے فرحین کا ساتھ منظور ہے کہ نہیں؟"

"سو بار منظور ہے۔ ہزار بار منظور ہے۔ بس آپ ناراض نہ ہوں اور یوں ہی خوش رہا کریں' اچھا۔"

"ٹھیک ہے۔ تو پھر میں بات کرتی ہوں فرحین کی امی سے۔ دیکھتی ہوں کیا کہتے ہیں وہ۔" امی جان نے کچھ سوچ کر کہا۔ رمزی سر جھکا کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

نازنین بیگم اب اس معاملے کو زیادہ التوا میں نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔ وہ اسی شام بیگم وقار کے ساتھ فرحین کے گھر پہنچ گئیں۔

گلے' شکوے ہوئے' ناراضی' غصہ' بے اعتنائی۔ اعجاز حسن پہلے تو ہتھے سے اکھڑنے لگے۔ مگر نازنین بیگم نے سارا قصور رمزی کا مان کا معاملہ سنبھال لیا۔ نرمی سے کہا۔

"بے شک ساری غلطی رمزی کی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس کی خواہش کچھ بے جا بھی نہ تھی۔ ہر ایک کو اپنی منسوبہ کو دیکھنے کا اشتیاق ہوتا ہے۔ مگر اب اپنی فرمائش شرمندہ ہے۔ بے شک آپ اسے دو جوتے لگائیں۔ میں اف بھی نہیں کروں گی۔"

اعجاز حسن بھی نرم پڑ گئے۔ جانتے تھے رمزی اچھا لڑکا ہے۔ ضدی تو ضرور ہے۔ مگر اب خود جھک رہا ہے۔

"ٹھیک ہے۔ اب آپ آئی ہیں تو۔ مگر سمجھا دیجیے اس نالائق کو۔ آئندہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے اور جہاں تک تاریخ کی بات ہے تو اگلے ماہ کی کوئی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔ آج انیس رجب ہے۔ شعبان کی پندرہ تاریخ کیسی رہے گی؟"

"لیجیے' پہلے منہ میٹھا کریں۔ مبارک ہو' تاریخ طے ہونے کی۔" بلقیس خاتون نے ان کی طرف گلاب جامن بڑھائے۔

"آپ کو بھی۔" نازنین بیگم نے گلاب جامن اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اور اگر آپ لوگوں کے دل میں کوئی ملال ہے بھی تو نکال دیں۔ میں ایک بار پھر معافی مانگتی ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں بہن۔ شرمندہ نہ کریں۔" بلقیس خاتون نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "بچہ ہے۔ غیر ملک میں پلا بڑھا ہے۔ اسے یہاں کی روایات کا کیا پتا۔ اور یہ جو آپ اتنے ٹوکرے مٹھائی کے لے آئی ہیں۔ کیا ضرورت تھی اس کی؟"

"یہ بھی تو ہماری روایات میں ہے۔" نازنین بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور بہن۔ میرا تو ایک ہی بیٹا ہے۔ ساری رسمیں' دستور کروں گی' مہندی' مایوں۔ تیار رہیے گا اور اب اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی بیٹی سے مل لوں۔"

"ضرور۔ ضرور۔ کیوں نہیں آئیں۔"

بلقیس خاتون انہیں فرحین کے پاس لے گئیں۔ فرحین سے ملتے ہوئے انہوں نے اپنے دس تولے کے کنگن فرحین کی کلائی میں پہنا دیے۔

"ارے۔ یہ کیا۔ ابھی اس کی کیا ضرورت۔ شادی پر آپ جو چاہیں' مگر ابھی تو۔"

بلقیس خاتون نے منع کرنا چاہا۔ مگر نازنین بیگم نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔

"یہ بھی ہمارے ہاں کی رسم ہے۔ ایک قسم کا

شگن۔ تاریخ طے ہونے پر بہو کو خاندانی کنگن پہنانا۔ اور فرحین اسے اب شادی تک ہاتھ سے نہ اتارنا۔ اچھا۔"

انہوں نے فرحین کو پیار کیا اور خوش خوش تاریخ طے کرکے گھر آگئیں۔ رمزی کو ساری بات مناسب لفظوں میں بتا کر سمجھایا کہ اب وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرے۔ رمزی کی یقین دہانی پر وہ مطمئن ہو کر شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

رمزی نے ماں کو تو مطمئن کر دیا مگر دل میں ٹھان لیا کہ اپنی ضد پوری کرکے رہے گا۔ مگر جب اس مسئلے کا کوئی حل سمجھ میں نہ آیا تو پریشان سا ضیا کی طرف چل دیا۔

"یار رمزی! وہ سالگرہ والی اسکیم تو ناکام ہو گئی۔"

"ایں۔ وہ کیوں۔ ابھی تو سالگرہ آئی نہیں۔ اور اسکیم پہلے ہی ناکام۔" رمزی کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

"ہاں۔ وہ ماموں جان سے باتوں باتوں میں ببلو کی سالگرہ کا ذکر کیا کہ میرے ببلو کی پہلی خوشی ہے۔ سب کو آنا ہو گا۔ مع فرحین کے۔ ماموں جان چونک پڑے کہ آج تک تو سالگرہ منائی نہیں۔ پھر اچانک یہ خیال کیسے؟ میں نے کہا۔ ماموں جان۔ کیا کروں فضا کی ضد ہے۔ ببلو تین سال کا ہو رہا ہے۔ تھوڑا ہلا گلا ہو جائے تو کیا حرج ہے؟ کہا' حرج تو کوئی نہیں' پر میاں۔ یہ خاص طور پر فرحین کیوں؟ وہ شادی تک اب گھر سے نہیں نکل سکتی۔ سمجھے۔ ہاں۔ ہمیں آنے میں کوئی اعتراض نہیں۔" ضیا نے منہ لٹکا کر ساری بات کہہ سنائی۔

"خوب۔" رمزی نے قہقہہ لگایا۔ "لگتا ہے تمہارے ماموں جان کو شک ہو گیا۔ جانتے ہیں کہ تم میرے دوست ہو۔ اسی لیے منع کر دیا۔"

"تو اور کیا۔" ضیا نے منہ بنایا۔ "اب خوامخواہ کا خرچ آپڑا مجھ غریب پر۔"

"خیر۔ اتنے غریب بھی نہیں ہو کہ اپنے بیٹے کے لیے چار پیسے نہ خرچ کر سکو۔ مگر یار۔ وقت کم ہے۔ بتاؤ کیا کیا جائے؟"

"بہتر تو یہ ہے کہ اپنی ضد چھوڑ دو اور چپ چاپ سہرا باندھ لو۔ شریف بچوں کی طرح۔"

"تو گویا اب تم کوئی مدد نہیں کرو گے؟" رمزی نے کہا۔

"نہیں۔" ضیا نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"ہونہہ۔" رمزی نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

☼ ☼ ☼

رمزی گھر آکر بھی اسی سوچ میں ڈوبا رہا کہ ایسا کیا کرے کہ فرحین کو بھی دیکھ سکے اور بات بھی نہ بگڑے۔ دو دن اسی سوچ میں غلطاں رہا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ناچار تنگ آکر ضیا کو فون کیا۔

"یار۔ میں اتنی مشکل میں پڑا ہوں اور تم ہو کہ نہ فون کیا' نہ خود آئے اور وقت ہے کہ بھاگا جا رہا ہے۔"

"اپنی ضد چھوڑ دو۔ ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ اور جہاں تک میرے آنے کا تعلق ہے تو یار۔ میں ڈیڈ بزی ہوں۔ ارسلان کو حیدر آباد جانا پڑ گیا ہے اور ماموں جان نے ان کے حصے کا سارا کام میرے ذمے لگا دیا ہے۔ ابھی ماموں جان کے ساتھ میرج ہال بک کروانے گیا تھا اس کے بعد فرنیچر والے کے پاس۔ تم جانتے تو ہو شادی والے گھر میں کتنے کام ہوتے ہیں۔"

"ہاں۔ ہاں پتا ہے سب۔ مگر یہ ارسلان حیدر آباد کیوں گئے؟ خیریت تو ہے۔" کسی فوری خیال کے تحت رمزی نے پوچھا۔

"کمپنی کے کام سے گئے ہیں۔ چھ' سات دنوں کے لیے۔ پھر آگے بھی چھٹیاں لینی تھیں شادی کے لیے۔ اس لیے ضروری تھا۔"

"سو طے ہوا۔ تم میرے کسی کام کے نہیں۔ کیا فائدہ ایسی دوستی کا۔" رمزی نے جل کر فون رکھ دیا۔

تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ کیسا ہو' اگر وہ ارسلان کا دوست بن کر فرحین کے گھر پہنچ جائے تو؟

جب کوئی بہتر ترکیب سمجھ میں نہ آئی تو ناچار رسک لینے کا فیصلہ کرلیا۔

نازنین بیگم کو جا کر بتایا کہ اسے کسی دوست سے ملنے بہاول پور جانا ہے۔ دو دن کے لیے ' بڑا ضروری۔۔۔

نازنین بیگم نے بادل نخواستہ جانے کی اجازت دے دی۔

رمزی نے بریف کیس میں ضروری سامان رکھا۔ امی جان کو خدا حافظ کہا اور ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں جا کر کمرا بک کرالیا۔

☼ ☼ ☼

رمزی نے کوئی لمبا چوڑا اہتمام نہ کیا۔ صرف ایک چھوٹی سی فرنچ کٹ داڑھی لگائی۔ سیاہ شیشوں والا چشمہ لگایا اور فرحین کے دروازے پر جا پہنچے۔

ایک پل کے لیے رک کر گردو نواح پر نظر ڈالی پھر بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

"جی فرمایے۔۔۔ کس سے ملنا ہے؟" تھوڑا سا دروازہ کھول کر پوچھا گیا۔

رمزی کے تمام حواس بیدار ہوگئے۔ بے حد چوکنا ہو کر آنکھیں پوری کھول کر نظریں دروازے پر جما دیں۔ مگر جو کوئی بھی تھا' دروازے کی اوٹ میں تھا۔

"ہم جی۔۔۔ ولدار حسین ہیں۔۔۔ بہاول پور سے آئے ہیں۔ ارسلان سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"وہ تو یہاں نہیں ہیں۔" اجڈ' گنوار' روکھا لہجہ۔ فرحین تو نہیں ہوسکتی۔ شاید کوئی ملازمہ۔۔۔ رمزی نے اندازہ لگایا۔

"کہاں گئے۔۔۔ ہم تو اتنی دور سے آئے ہیں ملنے۔۔۔ کیا پتا تھا کہ۔۔۔"

"وہ تو حیدر آباد گئے ہیں۔ دو دن بعد لوٹیں گے۔" عجلت بھرا انداز۔۔۔ جیسے بات سننے کی بھی فرصت نہ ہو اور دروازہ کھٹ سے بند ہوگیا۔

رمزی سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ خواہ مخواہ ہی اتنا تردد کیا۔ لحہ بھر حسرت سے بند دروازے کو دیکھتے رہے۔ پھر اپنی ناکامی پر دل گرفتہ سے پلٹے تو اعجاز حسن پر نظر پڑی۔ جو محل قدمی کے سے انداز میں گیٹ کی طرف آرہے تھے۔

بریف کیس دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے رمزی ست قدموں سے آگے بڑھا اور بہت مودب ہو کر سلام کیا۔

"میاں۔۔۔ کس سے ملنا ہے۔۔۔ کہاں سے آئے ہو؟" چھڑی کو گھماتے ہوئے وہ رک گئے اور بغور سر سے پاؤں تک انہیں دیکھا۔

"کیا بتائیں صاحب۔۔۔ یہاں اپنا جگری یار رہتا ہے ارسلان۔۔۔ اس سے ملنے آئے تھے بہاول پور سے۔ سرپرائز دینے کے چکر میں بغیر اطلاع کے آگئے۔ مگر یہاں نہیں ہے۔"

"اور اب کہاں جارہے ہو؟" انہوں نے چھڑی زمین پر مارتے ہوئے پوچھا۔

"ہوٹل جانے کے سوا اور کہاں جاسکتے ہیں محترم! وہاں ٹھہر کر ارسلان کی واپسی کا انتظار کریں گے۔ اب ملے بغیر تو ہم جانے والے نہیں۔" رمزی نے قدرے بے زاری سے کہا۔

"میاں! ارسلان یہاں نہیں ہے۔ مگر اس کا گھر تو یہیں ہے۔ اب آہی گئے ہو تو بیٹھو۔ چائے وائے پی کر' کھانا کھا کر جانا۔"

"مگر آپ۔۔۔" رمزی نے الجھے ہوئے انداز میں انہیں دیکھا۔

"میں ارسلان کا والد ہوں۔"

"اخاہ۔۔۔ تو آپ ہیں ارسلان کے والد۔۔۔" رمزی نے نہایت تپاک سے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "کس قدر اشتیاق تھا مجھے آپ سے ملنے کا۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ ارسلان آپ کی اتنی تعریفیں کرتا تھا کہ حد نہیں۔ بہت عظیم ہیں آپ انکل۔۔۔ بہت گریٹ۔"

رمزی نے لپک کر ان کے ہاتھ چوم لیے۔

"اچھا۔۔۔" انہوں نے قدرے تعجب سے رمزی کے عقیدت بھرے انداز کو دیکھا۔

"جی ہاں۔۔۔ آپ کی محبت و شفقت کا ذکر سن سن کر میں نادیدہ آپ کا مشتاق ہوگیا۔ سوچتا تھا جب بھی اس طرف سے گزرا آپ سے ضرور ملوں گا۔ سو آج یہ سعادت نصیب ہوئی۔" رمزی نے بے حد نیاز مندی سے کہا۔

"اچھا میاں۔۔۔ اندر تو چلو۔" وہ کچھ متاثر سے ہونے لگے۔

بیل پر دروازہ ملازمہ نے کھولا۔ "برکت۔۔۔ بی بی سے کہو' ارسلان کے دوست آئے ہیں۔ اچھی سی چائے بھجوادیں اور ہاں کھانے کا انتظام بھی کرلیں' یہ کھانا کھا کر جائیں گے۔" انہوں نے ملازمہ سے کہا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ کھانے کا تکلف رہنے دیں۔ چائے البتہ ہم پی لیں گے۔" رمزی نے جلدی سے کہا۔

"تکلف تو میاں تم کررہے ہو۔ اتنی دور سے آئے ہو۔ کھانے کے بغیر تو جانے نہ دیں گے۔" اعجاز حسن نے اقرار کیا۔

"دراصل ہمیں ایک اور دوست سے بھی ملنے جانا ہے۔ اس لیے پلیز آپ۔۔۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔۔۔ کھانے کے بعد چلے جانا۔" انہوں نے بات کاٹ کر کہا۔

رمزی چپ ہوگیا۔ کیا پتا اس اثنا میں فرحین کو دیکھنے کی کوئی سبیل نکل آئے۔

تھوڑی دیر بعد پُر تکلف سی چائے آگئی۔ چائے کے دوران رمزی کچھ سچ' کچھ جھوٹ ملا کر باتیں کرتا رہا۔

تب ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اعجاز حسن نے معذرت کرکے ریسیور اٹھایا اور کان سے لگالیا۔ چائے پیتے ہوئے رمزی کا سارا دھیان ادھر ہوگیا۔ اعجاز حسن کہہ رہے تھے۔

"تم پہنچو تو کھانا اکٹھے کھاتے ہیں اور سنو! تمہارا ایک دوست بھی یہاں تمہارا منتظر ہے۔۔۔ ولدار حسین۔" رمزی کے کان کھڑے ہوگئے۔ "کون ولدار؟ ارے بھئی' یہ خود بات کرلو۔" انہوں نے ریسیور رمزی کی طرف بڑھایا۔

"یہ لو بھئی۔۔۔ فون ہے ارسلان کا۔۔۔ پہنچ رہا ہے۔"

چائے کا گھونٹ بھرتے بھرتے رمزی کو بڑے زور کا اچھولگا۔

ادھر اعجاز حسن کے ہاتھ سے ریسیور گر گیا۔ اٹھاتے اٹھاتے کال کٹ چکی تھی۔

"او وہ لائن کٹ گئی۔۔۔ مگر پہنچ رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں۔۔۔ یہیں سے فون کیا تھا۔۔۔ آفس سے ہو کر آنا ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔۔۔ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔" رمزی نے قدرے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"برا ہوا۔۔۔ اب تو گئے جان سے۔۔۔ یہاں سے نکلنے کی کوئی صورت' کوئی طریقہ۔۔۔ کیسے جان چھڑائیں؟" اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ تب ہی اس کا موبائل بجنے لگا۔ آن کیا تو چمکتی اسکرین پر ضیا کا نام جگمگا رہا تھا۔

"اوہ ہیلو۔۔۔ ہاں سہیل۔۔۔ پہنچ رہا ہوں' ابھی گھنٹہ ڈیڑھ میں۔۔۔" رمزی نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

"ایں۔۔۔ کیا بک رہے ہو۔۔۔ میں ضیا ہوں۔۔۔ سہیل نہیں۔" ضیا نے اچنبھے سے کہا۔

"کیا؟ تمہارے والد کا ایکسیڈنٹ ہوگیا؟ اسپتال میں ہو۔۔۔ کون سے اسپتال؟" رمزی اپنی ہی ہانک رہا تھا۔

"کون ہو تم؟ دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا؟ اور یہ رمزی کہاں ہے؟" ضیا نے اب کے بدلی ہوئی آواز پر غور کیا۔

"فکر نہ کرو سہیل۔۔۔ ابھی پہنچ رہا ہوں' منٹوں میں۔۔۔" اس نے جھپٹ کر بریف کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ارے کھانا تو کھا کر جاؤ۔ اعجاز حسن نے روکا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ سہیل بہت پریشان ہے۔ اس کے والد کا ایکسیڈنٹ۔۔۔ پھر آؤں گا۔۔۔ ارسلان کو میرا سلام۔۔۔"

اعجاز حسن ارے ارے کرتے رہ گئے اور وہ آدھی ادھوری بات کرتے ہوا کے گھوڑے پر سوار باہر نکل

گیا۔ دروازے کے پاس پاؤں رپٹا۔ گرتے گرتے بچا۔ مگر پل بھر رکنے کی زحمت نہ کی۔ فوراً" رکشا کیا اور ہوٹل پہنچ کر ہی دم لیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ضیا کا دوبارہ فون آگیا۔

"کہاں ہو بھئی؟ اور یہ تمہارا سیل کس کے پاس تھا۔ عجیب اونگی بونگی مار رہا تھا احمق۔"

"ہاں وہ۔۔۔ ہے ایک جاننے والا مسخرہ ہے بالکل۔۔۔ مذاق کر رہا ہوگا۔" رمزی نے بات بنائی۔ وہ ابھی اسے بتانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"عجیب بے تکا انسان تھا۔۔۔ خیر کہاں تک پہنچیں شادی کی تیاریاں۔۔۔ مجھے تو ماموں جان نے کچھ اس طرح مصروف کر دیا ہے کہ حد نہیں۔۔۔ ارسلان آئے تو کچھ فرصت ملے۔"

"ارسلان تو۔۔۔" رمزی نے بمشکل بات دبائی۔

"اور ہاں۔۔۔ یہ کون سا دوست ہے تمہارا بہاول پور میں جسے میں نہیں جانتا۔۔۔ آنٹی بتا رہی تھیں کہ تم بہاول پور۔۔۔"

"ہاں ادھر ہی ہوں۔۔۔ اور ضروری نہیں کہ تمہیں ساری خبریں ہوں۔۔۔ کولیگ تھا میرا لندن میں۔۔۔ ان دنوں ہالینڈ میں ہے۔۔۔ شادی کے لیے آیا ہے تو جانا ضروری تھا۔" رمزی نے فی الحال ضیا کو اپنی ناکامی کی داستان سنانی مناسب نہ سمجھی کہ جب ملاقات ہوگی تو دیکھا جائے گا۔

"شکر ہے تم نے فرحین کو دیکھنے کی ضد چھوڑی۔۔۔ بلاوجہ کی ٹینشن۔۔۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔" ضیا کو خیال آیا۔

"اوں ہوں۔۔۔ ضد چھوڑنے والے نہیں ہم۔ مرد بچے ہیں۔ فرحین کو دیکھ کر رہیں گے۔" رمزی نے ڈینگ ماری۔ خود بھی جانتا تھا۔۔۔ کہ ممکن نہیں۔ بری طرح مایوس تھا۔۔۔ ناامید۔۔۔ بے آس۔۔۔ مگر دعویٰ کرنے میں کیا حرج تھا۔

"اب تو ہفتہ دس دن رہ گئے مایوں مہندی کی رسم میں۔۔۔ پھر نکاح اور رخصتی۔۔۔ کیا کرلو گے اتنے دنوں میں۔۔۔"

"آپ سے مطلب؟" رمزی نے ناراضی سے کہا۔

"یار خفا نہ ہو۔۔۔ میرے بس میں ہوتا تو ضرور کچھ کرتا۔"

رمزی جانتا تھا کہ ضیا کے اختیار میں کچھ نہیں۔۔۔ پھر بھی تھوڑے نخرے، غصہ، ناراضی دکھائی۔ فون بند کیا تو ایک بار پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ وقت تھا کہ اڑا جا رہا تھا۔۔۔ اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تھی۔

جب کچھ نہ سوجھا تو غصہ غالب آنے لگا۔ موبائل ابھی ہاتھ میں ہی تھا۔۔۔ بے اختیار فرحین کے گھر کا نمبر ملا دیا۔۔۔ بنا سوچے سمجھے۔

"ہیلو۔۔۔" دوسری طرف کسی لڑکی کی آواز تھی۔

"کون فرحین؟" رمزی نے باریک لڑکیوں والی آواز میں پوچھا۔

"جی۔۔۔ میں فرحین۔۔۔ مگر آپ کون؟" نرم۔۔۔ ملائم آواز۔۔۔ شائستہ لہجہ۔

"ہم۔۔۔ رمیز حسن۔۔۔ کہے دیتے ہیں۔ جب تک دیکھ نہ لیں گے۔۔۔ شادی نہ کریں گے۔۔۔ عین نکاح کے وقت انکار کردیں گے۔۔۔ ہاں۔۔۔ اپنی ہٹ سے ہٹنے والے نہیں۔" اب کے رمزی نے اپنی اصل آواز میں کہا۔۔۔ اور فون بند کر دیا۔

فرحین ہکا بکا۔۔۔ بھونچکا کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ منہ سے آواز تک نہ نکلی۔

"یہ کیا۔۔۔ کیا واقعی یہ رمیز تھے۔۔۔ اور اگر وہی تھے تو۔۔۔ کیا اتھرے بالک کی طرح ضد کیے جا رہے ہیں۔" اسے ہنسی آگئی۔۔۔ ساتھ ہی متفکر ہوگئی۔ اگر سچ مچ انہوں نے۔۔۔ مگر شرفا میں کب ایسا ہوتا ہے؟ پھر ان کی امی کی یقین دہانی، شرافت اور رکھ رکھاؤ۔۔۔ لمبے گھرانے بات پر جان دینے والے ہوتے ہیں۔ وہ کیا اپنے بیٹے کو ایسا کرنے دیں گی؟

خدشات، واہمے، پریشانی۔۔۔ مگر آخر فیصلہ کیا۔ کچھ بھی ہو۔۔۔ کسی کو بتاؤں گی نہیں۔۔۔ آگے میری قسمت جو ہو سو ہو۔

رمزی فون کرکے مطمئن ہوگیا "اچھا ہے، ذرا وہ بھی تو تڑپے، جلے۔۔۔ اکیلا میں ہی کیوں؟

پل بھر کے لیے خیال نہ آیا کہ اگر انکار ہو گیا تو کیا ہوگا۔۔۔ کیسے ماں کو سنبھالے گا۔

اپنے کیے پہ خوش خوش رمزی گھر آیا تو نازنین بیگم منتظر بیٹھی تھیں۔ کتنے ہی کام رکے پڑے تھے۔

بے دلی سے سوجے منہ کے ساتھ سارے کام نپٹاتا رہا۔ مگر دل میں گانٹھ سی پڑی تھی۔ ایک کسک سی کہ جو کہا تھا پورا نہ کرسکا۔ جذبات میں آکر جو حرکت کر بیٹھا تھا۔ اس پر پچھتاوا بھی تھا۔ سوچا کیا حماقت کی۔ اگر فرحین نے گھر میں بتا دیا تو سمجھو شادی کی ساری تیاریاں دھری کی دھری رہ گئیں۔۔۔ صاف انکار۔۔۔ اور ایسا تو وہ قطعاً" نہ چاہتا تھا۔ امی جان بے انتہا خوش تھیں۔۔۔ اور ان کی خوشیوں کو آگ لگانا اسے کسی طرح بھی گوارا نہ تھا۔ دل کو دھڑکا سا لگا تھا۔ مگر جب دوسری طرف خاموشی رہی تو سکون سا ہوا۔ یقین ہو گیا کہ فرحین نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ شاید مذاق سمجھا ہو۔۔۔ بڑبولا پن۔۔۔ یا دیوانے کا خواب۔

پھر ضیا آگیا تو تھوڑا سا دل بہل گیا۔ مگر ضیا نے رمزی کی بے زاری۔۔۔ اکتاہٹ۔۔۔ بے دلی صاف محسوس کی۔ چہرے پر وہ رونق نہ تھی جو ہمیشہ نظر آتی تھی۔

"کیوں۔۔۔ دولہا میاں اتنے اکھڑے اکھڑے سے کیوں ہو؟" ضیا نے بغور اسے دیکھا۔

"تو کیا بھنگڑے ڈالوں۔۔۔ بلی چڑھا رہے ہیں۔۔۔ قربانی کا بکرا۔۔۔ کولہو کا بیل۔۔۔ آنکھوں پہ ٹوپہ چڑھا دیا ہے۔ کہ لو۔۔۔ گھومتے رہو آنکھیں بند کرکے۔۔۔ اور میں احمق، بے وقوف گدھا۔۔۔ بھاگا چلا آیا وہاں سے۔۔۔ ماں کی آرزو۔۔۔ شادی کی خواہش۔۔۔" رمزی بھرا بیٹھا تھا۔ ضیا نے ذرا سا چھیڑا تو پھٹ پڑا۔

"وہیں شادی رچا لیتا۔۔۔ اپنی مرضی سے تو اچھا تھا۔۔۔ اس طرح آنکھیں باندھ کر تو کنویں میں نہ پھینکتے۔۔۔ اور جو کنواں پھاندنا ہی پڑتا۔۔۔ تو کم از کم اپنی مرضی سے آنکھیں کھول کر چھلانگ لگاتے۔۔۔ کسی سے گلہ تو نہ ہوتا۔" ضیا منہ کھولے حق دق دیکھتا رہ گیا۔

"اتنی بے زاری۔۔۔ خفگی۔۔۔ غصہ۔۔۔ اور اپنے بارے میں ایسی گل افشانی۔۔۔ یہ بیل منڈھے چڑھ بھی گئی تو کیا ہوگا اس کا انجام۔"

اندر سے بے حد متفکر۔۔۔ مگر بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں اس نے سمجھایا۔

"چھوڑو یار۔۔۔ اب ان باتوں کو۔۔۔ کل مہندی ہے اور وہ تمہاری فرحین جائے گی بیوٹی پارلر تیار ہونے۔۔۔ تو تم کیا یوں ہی چل پڑو گے؟ جانے دو ساری ناراضی۔۔۔ اور چلو ذرا میرے ساتھ۔۔۔"

"ہیں۔۔۔ بیوٹی پارلر۔۔۔" رمزی نے چونک کر کہا۔

"ویسے تو بڑے روایت پسند بنتے ہیں۔۔۔ پھر تھوپ لیتے میک اپ خود ہی۔۔۔ اور کون سے بیوٹی پارلر؟ کیا تمہارے ساتھ۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ ارسلان آگیا ہے تو اسی کے ساتھ۔۔۔ دھنک بیوٹی پارلر۔۔۔ اور تم کوئی الٹی پلٹی مت سوچو۔۔۔ شادی بالکل تیار ہے۔۔۔ اب راضی برضا ہو جاؤ۔۔۔ ویسے بھی ارسلان تمہیں اچھی طرح پہچانتے ہیں۔۔۔ یہ نہ ہو کہ جا کر بیوٹی پارلر کے دروازے پر کھڑے ہو جاؤ۔" ضیا جیسے اس کے دل کی بات سمجھ رہا تھا۔

رمزی سوچ میں ڈوب گئے۔

"سن بھی رہے ہو یا نہیں؟ اب سب بے کار ہے رمزی میاں۔۔۔" ضیا نے جیسے تھک کر کہا۔

"ہاں جانتا ہوں۔۔۔ سب کچھ۔۔۔ اور میں ایسے ہی جاؤں گا نکاح میں بھی۔۔۔ اور بارات میں بھی۔۔۔ بغیر تیار ہوئے اور کوئی مجھے مجبور کرکے تو دیکھے۔"

رمزی مایوس بھی تھا، ناراض بھی اور مشتعل بھی۔۔۔ کسی ضدی بچے کا سا انداز۔۔۔ ہٹ دھرمی۔۔۔ ضیا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا ہو گیا ہے یار۔۔۔ تم تو اچھے بھلے سمجھ دار ہو۔" وہ دیر تک اسے سمجھاتا رہا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن پہلے تو دھنک بیوٹی پارلر فون کرکے معلوم کیا کہ فرحین کب تک فارغ ہوگی۔ پارلر والی نے ٹائم بتا دیا۔ رمزی وقت سے کچھ پہلے گیا اور بیوٹی پارلر کے

دروازے سے ذرا ہٹ کر ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

وہ ہی پرانا گیٹ اپ، فرنچ کٹ داڑھی، سیاہ گاگلز، کرتا پاجاما اور بے نیاز سا انداز۔۔۔ کچھ دیر بعد ارسلان کی گاڑی آکر رکی تو وہ ذرا ترچھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ارسلان بھائی گاڑی سے باہر نکلے۔۔۔ وہ موبائل کانوں سے لگائے بات کر رہے تھے۔ رمزی آہستہ آہستہ پارلر کے دروازے کی طرف بڑھا۔

"ہاں۔۔۔ میں پہنچ گیا ہوں۔۔۔ کتنی دیر ہے؟؟" ارسلان کہہ رہے تھے۔

"اچھا۔۔۔ گیٹ کے پاس ہو۔۔۔ آجاؤ۔۔۔ میں یہیں ہوں۔" وہ غالباً" فرحین سے بات کر رہے تھے۔ رمزی نے ارسلان کی بات سنی تو گیٹ پر نظریں جما دیں۔

لڑکیوں کے ہنسنے، کھلکھلانے اور باتوں کی آواز کے ساتھ گیٹ بڑی تیزی سے کھلا۔۔۔ سرخ جوڑے میں ملبوس نکھرے میک اپ اور بھرے نقوش والی چھلاوا سی لڑکی بڑی عجلت میں باہر نکلی اور ادھر ادھر دیکھے بغیر بے نتھے بیل کی طرح رمزی سے ٹکراتی ارسلان کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

رمزی جو ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے کھڑا تھا۔ گرتے گرتے بچا۔ گاگلز زمین پر گر گئے۔۔۔ اٹھانے کے لیے جھکا تو کانوں میں ارسلان کی آواز آئی۔

"دیکھ کر نہیں چلا جاتا۔۔۔ چلو بیٹھو گاڑی میں۔۔۔ اس طرف۔۔۔" رمزی جھکا کا جھکا رہ گیا۔

"ایں۔۔۔ تو یہ تھی وہ چمپا کلی جو امی نے پسند کی۔۔۔ اپنے اتنے ہونہار، خوب صورت، شہزادوں جیسے بیٹے کے لیے۔" وہ سخت شاک میں آگیا۔

بمشکل گاگلز اٹھا کر سیدھا ہوا تو محسوس ہوا کہ جیسے داڑھی اپنی جگہ سے اکھڑ رہی ہے۔ ہاتھ لگا کر دیکھا تو واقعی داڑھی ایک طرف سے اکھڑ گئی تھی۔۔۔ گھبرا کر چپکانا چاہی۔۔۔ ساتھ ہی ارسلان کو دیکھا کہ وہ تو متوجہ نہیں۔۔۔

وہ سیل کانوں سے لگائے بڑے مصروف سے انداز میں کسی سے بات کر رہے تھے۔

اس کے پاس اس چھلاوا لڑکی کے علاوہ ایک اور لڑکی بھی کھڑی تھی۔ جس نے سر سے پاؤں تک آف وائٹ چادر لپیٹ رکھی تھی۔ چادر ٹھیک کرنے کے لیے لڑکی نے ہاتھ اوپر اٹھایا تو اس کی کلائی میں سنہری کنگن چمکے۔

"ایں۔۔۔ یہ تو ہمارے خاندانی کنگن ہیں، جو امی جان ہمیشہ پہنے رکھتی تھیں۔۔۔ تو کیا یہ۔۔۔؟"

وہ آنکھیں پھاڑے آف وائٹ چادر والی کو دیکھ رہا تھا۔ جس کا چہرہ مکمل طور پر چادر سے ڈھکا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

"تو گویا ساری تگ و دو لاحاصل۔" رمزی نے مایوسی سے سوچا۔ تب ہی چادر ٹھیک کرتے کرتے لڑکی کی نظر رمزی پر پڑی۔

رمزی کو اپنی حالت کا احساس ہوا۔ سٹپٹا کر اس نے اپنی اکھڑی داڑھی پر ہاتھ رکھ لیا مگر نظریں لڑکی پر ہی جمی رہیں۔

لڑکی کی آنکھوں کا تاثر۔۔۔ کچھ ناقابل فہم سا۔۔۔ حیرت۔۔۔ بے یقینی۔۔۔ شناسائی۔

چادر ٹھیک کرتے کرتے اس کے ہاتھوں سے چادر کا پلو گر گیا۔۔۔ اور چہرہ بے نقاب ہو گیا۔ رمزی کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوندی۔۔۔ اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

سنہری دمکتی رنگت، مسکراتے لب، سحر آگیں آنکھیں یعنی کہ۔۔۔ ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں کی مکمل تفسیر۔۔۔

پل بھر کی بات تھی۔۔۔ اگلے ہی لمحے اس نے پلو چہرے کے گرد لپیٹ لیا۔۔۔ کنگن ایک بار پھر چمکے۔۔۔ زور سے چھنکے۔۔۔ لڑکی نے کچھ کہتی، بولتی، مسکراتی بھید بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔۔۔ اور مڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

گاڑی چلی گئی تو بت بنا رمزی جیسے کسی سحر کے اثر سے باہر آیا۔

یہ تو سچ مچ چمپا کلی تھی۔۔۔ مڑی ہوئی گھنی پلکوں والی خوب صورت سیاہ آنکھیں، سیدھی اس کے دل میں ترازو ہو گئی تھیں۔

رمزی نے ایک گہری سانس لی۔ دنوں سے مضطرب دل میں سکون سا اتر آیا۔۔۔ بے حد مطمئن اور خوش خوش وہ واپس لوٹا۔۔۔

☼ ☼ ☼

مہندی اور نکاح کا فنکشن ایک دن تھا۔ ضیا کو ڈر تھا کہ یوں ہی سر جھاڑ منہ پہاڑ چلا آتا۔

مگر رمزی کو دیکھ کر حیرت سے آنکھیں کھل گئیں۔ رمزی نک سک سے درست پوری آن بان کے ساتھ نکاح کے لیے آیا۔ یہ ہی نہیں نکاح کے بعد دوستوں کے ساتھ مل کر بھنگڑا بھی ڈالا۔۔۔ ضیا ششدر اسے دیکھتا رہا۔۔۔ دل میں کھدبد سی لگی تھی۔ کہاں تو منہ پھلائے پھرتا تھا۔۔۔ اور کہاں بھنگڑے ڈالے جا رہے ہیں اور دانت ہیں کہ اندر ہی نہیں جا رہے۔ موقع نہ ملا اور رمزی بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا۔

بارات والے دن کام دار کالر اور کف والی سیاہ شیروانی اور آف وائٹ کلاہ پہنے شہزادوں کی سی شان سے چھ گھوڑوں والی بگھی سے اترا۔

دودھ پلائی اور سلامی کے وقت رمزی کی شگفتگی، برجستگی اور بذلہ سنجی عروج پر تھی۔

ہر کوئی فرحین کے مقدر پر رشک کر رہا تھا۔۔۔ ایسا خوبرو، اعلا تعلیم یافتہ اور اتنا خوش مزاج دولہا۔۔۔

جبکہ فرحین کو دیکھ کر رمزی کو اپنی خوش بختی پر کوئی شک نہ رہا تھا۔ گلاب کی پتیوں اور دودھ سے گندھی، خوشبوؤں سے مہکتی، سحر انگیز آنکھوں پر پلکوں کی چلمن گرائے وہ سیدھی دل میں اتر رہی تھی۔ نکاح تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس لیے رخصتی بھی جلدی ہو گئی۔

رات گئے رمزی اپنے کمرے میں آیا تو گلاب اور موتیا کی ملی جلی خوشبو کے ساتھ کسی انجانی سی مدہوش کن مہک نے استقبال کیا۔ پھولوں کی لڑیوں کو ہٹا کر اس کے قریب بیٹھا تو اس کے بے داغ حسن کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ آنکھیں تو جیسے جھپکنا بھول گئیں۔ حالانکہ اسٹیج پر رسومات کے دوران اور فوٹو گرافی کے وقت بھی چوری چوری دیکھتا رہا تھا۔ مگر یوں اپنے روبرو اتنے نزدیک سے دیکھنا۔۔۔ اور پھر تاب لانا" کار دارد۔۔۔

وہ رمزی کی محویت پر ذرا سا کسمسائی۔۔۔ کنگن ہلکے سے بجے تو رمزی جیسے ہوش میں آیا۔ کلائی میں پڑے کنگنوں کو دیکھ کر مسکرایا اور اس کے خوب صورت، نازک، ملائم، مہندی سے سجے ہاتھ کو بڑی نرمی سے تھام کر ہیرے کی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔ پھر متبسم نگاہوں سے فرحین کو دیکھا۔

"اور اگر ہم نکاح کے وقت انکار کر دیتے تو؟" رمزی کے لہجے میں شرارت تھی۔ فرحین کے لبوں پر دبی دبی سی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے پل بھر کے لیے نظریں اٹھائیں۔

"اور اگر ہم چہرے سے پلو نہ گراتے تو۔۔۔" مدھ بھری سحر آگیں آنکھیں رمزی کی خمار آلود نگاہوں سے ٹکرا کر جھک گئیں۔

وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اگر وہ اسے نہ دیکھ پاتے تو کیا سچ مچ انکار کر دیتے؟

وہ بتانا چاہتی تھی کہ اس نے تو ان کے چہرے کے

ایک ایک نقش کو ازبر کرلیا تھا۔ ان کی تصویر ساری ساری رات اس کے ہاتھوں میں رہتی تھی۔ تب ہی تو ان پر نظر پڑتے ہی اس نے ان کی روشن چراغوں جیسی فروزاں آنکھوں کو پہچان لیا تھا۔ یہ رمزی جیسی فروزاں آنکھیں بھلا کسی اور کی بھی ہو سکتی ہیں؟ پل بھر کے لیے اس نے تحیر سے سوچا۔ مگر اگلے ہی لمحے رمزی کو سٹپٹاتے اور اکھڑی ہوئی داڑھی پر ہاتھ رکھتے دیکھ کر سب سمجھ گئی... سارا تحیر جاتا رہا۔

سوچا... رمزی پر احسان کردے اس کی ضد پوری کرکے... سو پلو چہرے سے گرادیا۔

"ہیں...؟" رمزی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"جی..." نازو ادا سے کہا گیا ایک مختصر سا جی...

"جب آپ ہمارے مقدر میں تھیں... تو ہم کیسے انکار کرتے..."

بے پناہ حیرت کے جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے رمزی نے اس کی خوب صورت آنکھوں میں جھانکا۔ جذبوں میں ڈوبا مسحور کن لہجہ' نگاہوں کا والہانہ پن' بے تابی اور محبت...

فرحین کے سارے شکوے جاتے رہے... اور نظریں بے اختیار جھکتی چلی گئیں۔

رمیز حسن ماضی کے سفر سے واپس آئے تو ان کے چہرے پر ملائمت اور نرمی تھی۔ انہوں نے فرحین کی طرف دیکھا۔ اتنے سالوں بعد بھی ان کا چہرہ اتنا ہی روشن' اتنا ہی شاداب تھا۔ فرحین کی کھوئی کھوئی آنکھیں ان کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔

"فرحین حسن! اگر تم اتنی حسین' اتنی دلربا نہ ہوتیں... تب بھی ہم یوں ہی نبھاتے عمر بھر۔ بخدا ہم اپنی والدہ کے کہے سے کبھی باہر نہ تھے۔" انہوں نے بے ساختہ کہا۔ فرحین بھی جیسے حال میں آگئیں۔

"نافرمان آپ کا بیٹا بھی نہیں... آپ کا غصہ' ملامت' ڈانٹ' پھٹکار سب سر جھکا کے سنتا ہے۔ ہر بات مانتا ہے۔ ہاں مگر یہ اس کی زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ وہ کمپرومائز نہیں کرے گا۔ زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ یہ آج کے بچے ہیں۔ اڑ جانے والے' ڈٹ جانے والے' اپنی منوانے والے اور نہ ماننے کی صورت میں جان سے گزر جانے والے۔ ان کی ماننی پڑتی ہے رمیز حسن صاحب۔" فرحین نے بھرپور طریقے سے بیٹے کی وکالت کی۔

رمیز حسن نے قائل ہوجانے والے انداز میں اپنی رفیقہ حیات کو دیکھا۔ جو حسین ہی نہیں معاملہ فہم اور ذہین بھی تھیں۔

"اور اگر ہم بھی اڑ جاتے' ڈٹ جاتے' انکار کردیتے تو..." نرم نرم سی مسکراہٹ نے ان کے چہرے کا احاطہ کرلیا۔ شاید وہ ابھی پوری طرح ماضی کے اثر سے باہر نہ نکلے تھے۔

"تو..."

فرحین نے مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھا اور ایک گہری طمانیت کا احساس انہیں سرشار کرگیا۔

"تو ہم بھی مرجاتے' مٹ جاتے' فنا ہوجاتے۔" وہ کہنا چاہتی تھیں مگر کوئی بھولی بسری یاد ان کے ذہن سے ٹکرائی۔ مدتوں پہلے کا کہا ہوا جملہ۔

"اگر آپ ہمارے مقدر میں تھے تو آپ انکار کیسے کرتے؟"

گزرے ہوئے کسی خوب صورت لمحے نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ رمیز حسن نے قہقہہ لگایا۔

"ہم نے تو آپ کی بات رکھی تھی۔ سوچا تھا احسان کردیں جناب پر۔"

"بہت شکریہ۔ احسان مند تو ہم آج تک ہیں آپ کے۔" رمیز حسن نے تھوڑا جھک کر کہا۔

دونوں کے قہقہے ایک ساتھ گونجے۔

ماضی کی خوش گوار یادوں نے ان کے چہروں کو ہی نہیں سارے ماحول کو روشن کردیا تھا اور گزری حماقتوں پر ہنستے مسکراتے وہ بھول گئے کہ کچھ دیر پہلے ماحول میں کتنا تناؤ تھا۔

نعیمہ ناز

دوپے نگر کی رام کہانی

مکمل ناول

وہ دو گھنٹے سے لیپ ٹاپ لیے بیٹھا تھا۔ وجیہہ چہرے پر سنجیدگی اب ایک معمول بن چکی تھی۔
شانزے آہستہ سے اس کے مقابل کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ابھی تک کام ختم نہیں ہوا تمہارا؟"
"نہیں' ابھی کچھ دیر اور لگے گی' تم سو جاؤ۔" احمد نے لگے ہاتھوں جواب کے ساتھ مشورہ بھی دے ڈالا۔
یہ مشورہ بھی اب ایک معمول بنتا جا رہا تھا۔
"ڈھائی بج رہے ہیں۔" شانزے نے گویا اطلاع دی۔
"ہاں' میں نے ابھی کچھ دیر پہلے ٹائم دیکھا ہے' مگر مجھے اپنا کام ختم کرنا ہے۔" احمد کی سنجیدگی اور انہماک میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔
"بچوں کے اسکول میں کل پیرنٹس میٹنگ ہے۔" شانزے نے چند لمحوں بعد ایک اور اطلاع دی۔
"اچھا!"
"کچھ کہا ہے میں نے۔" شانزے سے اس کی مختصر سی 'اچھا' ہضم نہیں ہوئی۔ تو کچھ دیر بعد دوبارہ بولی۔
"سن لیا ہے میں نے' کیا کروں؟"
اس کی یہ لاپروائی اور بے نیازی دیکھ کر شانزے کی جان بری طرح جل گئی۔
"تمہیں نہیں پتا' کیا کرنا ہے؟" اپنے غصے اور کھولن پر قابو پاتے ہوئے شانزے نے اس سے الٹا سوال کیا۔
"مجھے اپنے فرائض بہت اچھی طرح یاد ہیں اور انہیں میں بخوبی نبھا رہا ہوں' البتہ تمہیں ضرورت ہے اپنے فرائض یاد رکھنے کی۔" احمد لیپ ٹاپ آف کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔
"کیا کوتاہی ہو رہی ہے مجھ سے' اپنی تمام تر

مصروفیات میں سے تمہارے بچوں کے لیے ٹائم نکالتی ہوں' ہر ممکن توجہ دینے کی کوشش کرتی ہوں۔ گھر کو' بچوں کو' خود کو سب کو ہی مین ٹین رکھا ہوا ہے۔ اتنی ٹف روٹین میں مزید اور کیا کروں؟" شانزے نے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا' وہ جب دور تھا تو دھڑکنوں سے بھی زیادہ قریب تھا اور اب قریب آکر جیسے اس سے میلوں دور ہو رہا تھا۔

"جب تم ماشاء اللہ سے اچھی طرح ہر چیز مینج کر رہی ہو تو کل پیرنٹس میٹنگ میں بھی چلی جانا۔ مجھے بتانے کی یا فورس کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میرا مارننگ شو لائیو ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے' میں کیسے پیرنٹس میٹنگ میں جا سکتی ہوں۔ تمہیں معلوم نہیں ہے کیا' انجان بننے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" شانزے تڑخ گئی۔

"تمہارے مارننگ شوز!" احمد کے لہجے میں تلخی اور طنز کی آمیزش برابر تھی۔

"تم اپنے گھر اور کیریر میں سے ایک چیز کو چوز نہیں کر سکتیں؟" احمد نے آج وہ بات کھلے لفظوں میں کہہ دی' جو وہ کئی مہینوں سے دبے لفظوں میں کہہ رہا تھا۔

"ایک چیز کا انتخاب؟" شانزے بیک وقت صدمے اور حیرانی سے دوچار اسے دیکھنے لگی۔

"یہ نام' یہ عزت' یہ شہرت اور یہ صلاحیت' ہزاروں لاکھوں میں سے کسی ایک کا نصیب ہوتی ہے۔ میں تمہارے فضول اعتراضات کے پیچھے اپنے جگمگاتے فیوچر کو ٹھوکر مار دوں؟"

"جب تک بچے کچھ بڑے نہیں ہو جاتے' انہیں تمہاری زیادہ ضرورت ہے شانزے!" احمد کے لب و لہجے میں بہت عرصے بعد وہی ملائمت در آئی تھی جو کبھی اس کا خاصا تھی۔

"بچے اور گھر صرف میرے نہیں تمہارے بھی ہیں۔ ہم دونوں ہی اس گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اسے چلانے کی آگے بڑھانے کی ذمہ داری ہم دونوں کی ہے۔ تم سارا وزن میرے پلڑے میں ہی کیوں ڈال دیتے ہو؟"

"اس لیے کہ تم پہلے ایک بیوی اور ایک ماں ہو' اس کے بعد کچھ اور۔" احمد نے سنجیدگی سے اسے دیکھا تھا۔

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ میں ایک عورت ہوں' دوسرے تیسرے درجے کی مخلوق' اسی لیے میں اپنے کیریر کی قربانی دے کر گھر میں ہانڈی چولہا کروں۔ تم کیوں نہیں دے دیتے یہ قربانی' تم چھوڑ دو نا اپنی جاب' اپنی ایڈور ٹائزنگ ایجنسی' اپنا کیریر۔" شانزے ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی۔

"یہ میرا فرض ہے' اپنی فیملی کے لیے کمانا اور اسے سپورٹ کرنا میں....."

"یہ سب میں بھی کر سکتی ہوں' اس کے لیے تمہیں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" شانزے نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"بس..... اسی بات کا زعم ہے تمہیں۔" احمد نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی کشادہ پیشانی پر نمودار ہونے والا بل غماز تھا کہ اندر ہی اندر وہ اشتعال میں آ چکا ہے۔

"زعم نہیں ہے' حقیقت کا ادراک ہے۔ مرد کی محتاجی اور غلامی ہی عورت کو اس کا محکوم بناتی ہے۔ میں نے اپنے پیروں میں یہ زنجیریں نہیں ڈالی ہیں۔" شانزے پھر تلخ ہو گئی۔

"زنجیریں تو آل ریڈی تمہارے پیروں میں ہیں۔ ایک گھر' شوہر اور بچے۔" احمد نے کاٹتی ہوئی ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ جو کبھی بے حد محبوب تھی' اب کتنی اجنبی سی لگنے لگی تھی۔

"میرے قدم کسی بھی زنجیر کی مجبوری میں نہیں بندھے۔ اپنی مرضی سے اپنے قدم روکے ہوئے ہیں میں نے' لیکن اگر پانی سر پر سے گزرنے لگا تو ضرور مجھے کچھ سوچنا پڑے گا۔" شانزے ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

احمد اپنے لب بھینچے چند ثانیے تک اسے دیکھتا رہا پھر یوں سر جھٹکا جیسے کہہ رہا ہو۔ "جہنم میں جاؤ۔"

شانزے اس کے انداز اور مزاج کے ایک ایک رنگ سے واقف تھی' اپنے اندر ابلتے غصے اور اشتعال کے ابال کو بمشکل دباتی وہاں سے چلی آئی۔

تین بجنے والے تھے۔ اسے علی الصبح ہی اٹھنا ہوتا تھا۔ بچوں کے اسکول جانے کی تیاری' احمد کے آفس جانے کی تیاری' سب کو نمٹا کر پھر اس کی اپنی تیاری۔

کبھی کبھی تو وہ بغیر ناشتے کے ہی بھاگم بھاگ اسٹوڈیو پہنچتی۔ اگر کبھی دس پندرہ منٹ ہوتے اس کے پاس تو ہلکا پھلکا سا کوئی اسنیک' جوس' دودھ چائے یا کافی اپنے موڈ کے مطابق لے کر وہ مقررہ وقت پر اپنا شو اسٹارٹ کر دیتی۔

وہ ایک مشہور و معروف مارننگ ہوسٹ تھی۔ ابتدا میں اس نے ایک دو ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر بھی دکھائے اور چند ایک کمرشلز میں بھی کام کیا مگر اصل شہرت اسے اپنے مارننگ شو کی بدولت ہی ملی۔ اس کی خوب صورت کھنکتی آواز' پُراعتماد لب و لہجہ' مقناطیسی شخصیت اور مقابل کو اپنے سحر میں گرفتار کرتی گفتگو..... سب نے مل کر اسے شہرت کی بلندیوں پر کھڑا کر دیا تھا اور بلندی شہرت کی ہو یا عزت کی' دولت کی ہو یا کامیابیوں کی۔ کسی بھی بلندی پر اپنے قدم جما کر مضبوطی سے ساتھ کھڑے رہنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ معمولی سی ہوا سے بھی توازن بگڑ جاتا ہے' قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں۔

شانزے کے قدم بھی اب لڑکھڑانے لگے تھے۔ حالانکہ اس نے اپنی۔ پوری کوشش کی تھی اب تک اپنے قدم جما کر مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہونے کی' مگر سارا قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ وہ جو اس کی محبت تھا' اس کا شریک سفر' ہم دم و ہم ساز' اس کی آنکھوں میں جلتی محبت کی لو کم ہوتی جا رہی تھی۔ شانزے کیسے اپنا راستہ دیکھتی۔ احمد کے ہاتھوں کی گرفت اس کے ہاتھوں پر ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ وہ بھلا کیسے اپنا توازن قائم رکھتی۔

"نیند تو اب لگتا ہے صبح ہی آئے گی' جب اٹھنے کے لیے الارم بجے گا۔" شانزے نے جھنجلا کر کروٹ لی تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح شانزے کا موڈ خراب تھا۔ احمد کا منہ اس سے زیادہ پھولا ہوا تھا وہ بغیر ناشتا کیے ہی تیار ہو کر گھر سے نکل گیا۔

"ہونہہ! ناشتا کیا' لنچ اور ڈنر بھی چھوڑ دے' مجھے کیا۔" شانزے کا دل جل کر کباب ہو گیا تھا۔ احمد تیار ناشتا ٹیبل پر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

ملازمہ کی مدد سے اس نے جلدی جلدی بچوں کا لنچ بنایا' بچوں کو اسکول بھیج کر اس نے سکون کا سانس لیا' مگر سکون کا یہ سانس محض لمحاتی اور وقتی تھا۔ اسے اپنی تیاری کرنی تھی۔ وقت کم تھا' جلدی جلدی شاور لے کر اس نے ناشتے کے نام پر سلائس کا ایک کونا کترا' جوس کا گلاس پیا اور بھاگم بھاگ اسٹوڈیو جا پہنچی۔

میک اپ کروا کر وہ کیمرے کے سامنے آئی تو ایک بدلی ہوئی شانزے تھی۔ ہنستی مسکراتی' ترو تازہ چہرے کے ساتھ' ایک ترو تازہ صبح کا آغاز کرنے والی۔ ڈراموں میں اس کی اداکاری بہت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ مگر مارننگ شو میں وہ خوش باش نظر آنے کی اتنی اچھی ایکٹنگ ضرور کر لیتی کہ اسے دیکھنے اور سننے والا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کے دل اور گھر کے حالات کیسے ہیں۔

شو ختم ہونے بعد وہ کچھ دیر یاسیت اور بے زاری کے عالم میں بیٹھی تھی جب فواد حسن اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ وہ ماڈل بھی تھا ایکٹر بھی اور آج کل اس کا مارننگ شو پروڈیوس کر رہا تھا۔

"کیا ہوا طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے۔"

"پریشان لگ رہی ہو؟"

"پریشانیاں تو زندگی کا حصہ ہیں۔ دنیا کا ہر شخص ہی کسی نہ کسی وجہ سے پریشان ہے۔" شانزے نے گول

مول جواب دیا۔

"فلسفہ مت بگھارو۔ ٹھیک ٹھیک جواب دو میری بات کا۔" فواد حسن نے اسے بڑے استحقاق کے ساتھ ڈپٹا۔ پچھلے آٹھ ماہ میں دونوں کے درمیان اتنی اچھی انڈر اسٹینڈنگ اور فرینڈشپ ہو چکی تھی کہ وہ شانزے کو ڈپٹ بھی لیتا تھا۔ دھونس بھی جمالیتا تھا اور اس کی بہت سی مشکلات اور پریشانیوں کو شیئر بھی کرلیتا تھا۔

"بچوں کے اسکول میں پیرنٹس میٹنگ تھی 'احمد سے کہا تھا مگر پتا نہیں وہ گیا کہ نہیں۔ اس کے آفس سے واکنگ ڈسٹینس پر ہے اسکول 'اور ایک آدھ گھنٹہ نکالنا اس کے لیے کوئی مسئلہ بھی نہیں۔ پچھلی دو میٹنگز میں بھی ہم دونوں میں سے کوئی نہیں جاسکا۔" شانزے کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

"تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ احمد کو فون کرکے پوچھ لو کہ وہ گیا یا نہیں۔" فواد نے اسے مشورہ دیا۔

"اس نے انکار کیا کہ وہ نہیں گیا تو میری ٹینشن اور بڑھ جائے گی۔"

"ایک تو تمہیں ٹینشن پالنے کا بہت شوق ہے 'بات بات پر ٹینس ہو جاتی ہو 'ایسے لائف گزارو گی تو بس گزار چکیں۔"

"کبھی ہم لائف کو گزارتے ہیں 'کبھی لائف ہمیں گزارتی ہے بس اس گزارا گزاری میں زندگی اور ہم دونوں ہی گزر جاتے ہیں۔"

"تم نے کہیں فلاسفی میں تو ماسٹرز نہیں کیا؟" فواد نے بے حد سنجیدگی سے سوال کیا۔

"نہیں۔" شانزے نے بھی سنجیدگی سے نفی میں سرہلایا۔

"صبح ناشتا ٹھیک سے کیا تھا؟" اگلا سوال ہوا۔

"جوس پیا تھا ایک گلاس۔" شانزے نے سچ سچ بتایا۔

"تب ہی۔" فواد نے سرہلایا۔

"خالی پیٹ اسی قسم کی باتیں سوجھتی ہیں۔ چلو آؤ میں تمہیں اچھا سا لنچ کراتا ہوں۔"

"اونہوں!" شانزے نے موبائل میں ٹائم دیکھتے ہوئے نفی میں سرہلایا۔ "دیر ہو جائے گی مجھے 'بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت ہو جائے گا۔"

"بچوں کو ڈرائیور لے کر آتا ہے اسکول سے اور گھر پر میڈ ہوتی ہے 'میرا خیال ہے اتنا تو وہ سنبھال ہی لے گی 'فون کرکے انسٹرکشن دے دو کہ بچوں کو چینج کرواکے کھانا کھلادے۔ تم دیر سے آؤگی 'اس سے پہلے بھی تو دو چار بار جب تم لیٹ ہوئیں تو ایسے ہی مینیج کیا تھا تم نے۔"

"ہاں 'کیا تو تھا۔" شانزے کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ اس کا ذہن منتشر تھا اور طبیعت بے زار ہو رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

احمد کو فون کرنے کے لیے اس نے موبائل اٹھایا کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر موبائل پٹخ دیا۔

"ہونہہ مائی فٹ! اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ٹینس ہو رہی ہوں گی۔ وہ خود بھی تو فون کرکے بتا سکتا تھا مگر کیوں کرے 'اکڑو تو وہ شروع سے ہی ہے۔ میں ہی ہمیشہ جھکتی آئی ہوں 'کب تک جھکوں 'جتنا میں نرم ہوتی ہوں 'وہ اتنا ہی سخت ہو جاتا ہے 'جتنا میں کمپرومائز کرتی ہوں وہ اتنا ہی اکڑ جاتا ہے۔"

"چلیں؟" فواد تھوڑی دیر پہلے اٹھ کر چلا گیا تھا' واپس آکر دوبارہ پوچھنے لگا۔

"ایک منٹ! پہلے میں گھر فون کرلوں 'میڈ کو بتادوں کہ میں لیٹ ہو جاؤں گی۔ وہ بچوں کو دیکھ لے۔" شانزے نے پھر موبائل اٹھالیا۔

☼ ☼ ☼

فواد اسے ساحل سمندر پر بنے ایک ریسٹورنٹ میں لے آیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ریسٹورنٹ میں لوگ آجا رہے تھے۔

"یہاں کیوں آئے ہو؟" شانزے نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

"اس لیے کہ تمہیں سی فوڈ پسند ہے۔ جو یہاں بہت اچھا ہوتا ہے اور یہاں کی ہوا لگے گی تو تمہارا موڈ بھی فریش ہو جائے گا۔"

"کچھ زیادہ ہی نہیں جان گئے میرے بارے میں؟" شانزے مسکرادی۔

"آفٹر آل میری پیاری سی دوست ہو۔ دوست کی معمولی پسند ناپسند بھی معلوم نہ ہو تو فرینڈشپ کا فائدہ؟"

"فرینڈشپ فائدے کے لیے کی جاتی ہے؟" شانزے نے اس کا جملہ پکڑلیا۔

"اوہ 'منہ سے کچھ غلط نکل گیا۔" فواد حسن نے سرکھجایا۔ "آئی مین کہ ایسی فرینڈشپ بھلا کس کام کہ آپ کو اپنے دوست کی پسند ناپسند بھی معلوم نہ ہو۔" فواد نے تصحیح کی۔

"اچھا 'اب کچھ منگوالو۔ بھوک لگ رہی ہے 'بہت زبردست قسم کی۔"

"بالکل بالکل۔ بھوک تو مجھے بھی زبردست قسم کی لگ رہی ہے۔ آج میں نے بھی ناشتا ڈھنگ سے نہیں کیا۔ آنکھ ہی دیر سے کھلی۔ اتنا ٹائم بھی نہ ملا کہ اپنے لیے ایک کپ چائے ہی بنالیتا۔ جلدی جلدی تیار ہوکر بھاگ نکلا۔ اسٹوڈیو آکر بھی کچھ نہیں کھایا۔ سوچا لنچ تگڑا قسم کا کرلوں گا۔" فواد ہلکے پھلکے لہجے میں معمول کے مطابق باتیں کر رہا تھا۔

"اکیلے رہو گے تو یہی ہو گا۔ مہینے میں مشکل سے پانچ دن ہی اپنے گھر سے ناشتا کرکے آتے ہو۔ کوئی اچھی لڑکی دیکھ کر شادی کرلو 'کم سے کم تمہارے کھانے پینے کا خیال تو رکھ لے گی۔"

"جب کوئی اچھی لڑکی ملے گی تو سوچیں گے۔ ابھی تو ایک ہی اچھی لڑکی سے بڑی مشکل سے چھٹکارا حاصل کیا ہے۔" فواد حسن مسکرایا۔ پچھلے سال اس کی اپنی بیوی سے علیحدگی ہوئی تھی۔ دو سالہ ازدواجی زندگی بڑے بھونڈے طریقے سے گزری اور بڑے برے طریقے سے انجام سے دوچار ہوئی۔

شانزے خاموشی سے فرائی فش کا ٹکڑا پلیٹ میں رکھ کر کھانے لگی۔

گھر پہنچی تو بچے کھانا کھا کر سو چکے تھے۔ ملازمہ اپنے کوارٹر میں تھی۔ بس چوکیدار گیٹ پر اونگھ رہا تھا۔ شانزے تھکی تھکی سی لاؤنج میں صوفے پر آن گری۔ پورے گھر میں سناٹے کا راج تھا۔ ایرکنڈیشنڈ کی مخصوص گھوں گھوں کے سوا کہیں اور کوئی آواز نہ تھی کچھ دیر وہ وہیں آڑی ترچھی پڑی رہی 'پھر باتھ روم میں گھس گئی۔ ٹھنڈے پانی کا ایک طویل شاور لے کر وہ باہر آئی تو اس کی ساری تھکن 'ٹینشن سب غائب تھی۔ فقط ایک تازگی کا احساس باقی رہ گیا تھا۔

کل رات سے اس کے کشیدہ اعصاب اب خاصے پرسکون تھے 'اپنے تراشیدہ بالوں کو ڈرائر سے خشک کر

کے خنک اور معطر فضا میں آرام سے لیٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

احمد نے بڑی محنت اور جدوجہد کے بعد اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا آغاز کیا تھا۔ اس کی ٹیم گو مختصر تھی مگر محنتی اور باصلاحیت افراد تھے۔ ان کے بنائے ہوئے بہت سے کمرشلز ہٹ ہوئے تھے اور انہی کمرشلز کے ذریعے کچھ نئے چہرے بھی شہرت پا رہے تھے۔ انہی میں ایک نام کومل خان کا تھا۔ کومل اسم بامسمیٰ تھی۔ اسے دیکھ کر کسی بہت ہی نازک مگر بے حد خوب صورت کھلے ہوئے پھول کا خیال دل میں آتا تھا۔ وہ طرح دار تھی۔ باصلاحیت تھی مگر ابھی شوبز کی دنیا میں اپنا نام و مقام بنانے کے لیے جدوجہد کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق ہونے کے باوجود بہت ماڈرن اور آزاد خیال بلکہ کسی حد تک بے باک تھی۔ احمد ویسے تو عام طور پر ایک سنجیدہ مزاج اور لیے دیے رہنے والا شخص تھا مگر کومل کے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی دوستی اب بے تکلفی میں ڈھل گئی تھی۔

خوش شکل اور خوش ادا کومل بتدریج اس کے قریب آرہی تھی۔

"اف!"

دو گھنٹے کی بحث کے بعد کلائنٹ رخصت ہوا تو احمد نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اس فیلڈ میں اس کے پاس انواع و اقسام کے لوگ آتے تھے۔ یہ کلائنٹ موصوف بھی ان ہی میں سے ایک تھے۔ رنگ گورا کرنے والی کریم کا کمرشل بنوانا چاہتے تھے۔

اشتہار میں انہیں زیادہ منٹ اور زیادہ لوگ چاہیے تھے، معاوضہ کم سے کم ہو اور پھر ان کا مزاج اور معیار اللہ کی پناہ۔ بحیثیت کونسیپٹ رائٹر احمد انہیں تقریباً پچیس سے تیس آئیڈیاز بتا چکا تھا مگر ان کو اب تک کوئی آئیڈیا پسند نہیں آیا تھا۔

"احمد صاحب! کوئی نئی چیز، کوئی نئی سوچ لائیں نا مارکیٹ میں، یہ سب تو عوام پہلے ہی اسکرین پر دیکھ چکے ہیں۔"

ان کے اعتراض پر احمد سلگ کر رہ گیا۔ وہ گھسی پٹی لکیروں پہ چلنے کا قائل نہیں تھا۔ اب تک اس نے جتنے بھی کمرشل بنائے تھے۔ وہ اپنی انفرادیت اور تھیم کی وجہ سے کافی پسند کیے گئے تھے۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کا کام کتنا ہی اچھوتا اور خوب صورت کیوں نہ ہو وہ کسی کسی کو متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ یہ کلائنٹ بھی ان ہی میں سے ایک تھے، احمد نے انہیں اگلے ہفتے آنے کا کہہ کر رخصت کر دیا تھا۔

اس وقت وہ آنکھیں بند کیے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھا تھا۔

آج وہ اتنا مصروف رہا کہ لنچ کے نام پر فقط دو بسکٹ اور ایک چائے کا کپ لیا تھا اور اب شام کے چھ بجے محاورتاً "نہیں حقیقتاً" اس کے پیٹ میں بھوک کے مارے چوہے دوڑ رہے تھے۔ صبح ناشتا بھی نہیں کرکے آیا تھا۔ نہ ہی آفس آکر کچھ کھایا پیا۔

"گھر جاؤں یا کسی ریسٹورنٹ؟" وہ بیٹھا یہی سوچ رہا تھا۔

جس دن شانزے کے ساتھ کچھ کھٹ پٹ ہوتی، اس کا گھر جانے کا موڈ مشکل سے ہی بنتا تھا۔ شانزے ٹھیک کہتی تھی اس کے مزاج میں سنجیدگی کے ساتھ واقعی تھوڑی اکڑ تھی، جو شانزے کے ساتھ جھگڑے کے بعد کچھ زیادہ ہی عود کر آجاتی۔ موبائل پہ میسج آیا۔

کومل نیچے بلڈنگ کی پارکنگ میں کھڑی تھی، اس کی گاڑی خراب ہوگئی تھی، اُسے لفٹ چاہیے تھی۔

"میں آرہا ہوں۔" جوابی میسج کرکے وہ اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔

نیچے پہنچا تو کومل اس کی بلیک کرولا کے پاس ہی کھڑی اس کا انتظار کررہی تھی، سفید سوٹ میں ملبوس، سفید موتیوں کی بالیاں، بہت لائٹ میک اپ، بال سمیٹ کر

ایک طرف کیے ہوئے تھے۔ وہ بہت فریش اور بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

"ہیلو!" وہ احمد کو دیکھ کر مسکرائی۔

"ہائے!" احمد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ "تمہارا شوٹ ختم ہوگیا؟"

"ہاں، کل لاسٹ ڈے تھا نا۔"

"کیسا ایکسپیرینس رہا؟"

"بہت اچھا بلکہ بہت زبردست۔ اتنا مزا آیا کہ کیا بتاؤں۔" وہ بچوں کی طرح آنکھیں میچ کر پُرجوش سی کہہ رہی تھی۔

"بس ذرا۔۔۔" بولتے بولتے وہ ایک لمحے کو رکی۔ "بس ذرا تھکن ہوگئی۔" کومل کے لہجے میں بے ساختگی کے ساتھ معصومیت بھی تھی۔

"ظاہر ہے، جس کام میں محنت ہوتی ہے اس میں تھکن بھی ہوتی ہے۔" احمد مسکرا دیا۔ "اسکرین پر ایک آدھ منٹ کا کمرشل دیکھ کر کون سوچتا ہوگا کہ اس کے پیچھے کتنے لوگوں کی کتنی محنت ہے۔ اینی وے ابھی تو تمہارا اسٹارٹ ہے، جتنی محنت کرسکتی ہو کرو، تھکنے کی پروا مت کرو۔ اگر آگے بڑھنا ہے تو۔"

"آپ کو کیا لگتا ہے، مجھ میں اسپرٹ نہیں محنت کرنے کی؟"

"آف کورس ہے، صلاحیت کے ساتھ تم میں لگن بھی ہے جذبہ بھی، میں نے تو بس ایز اے فرینڈ یونہی ایڈوائز دے دی۔ کیا تم نے مائنڈ کیا میری بات کو؟"

"نہیں نہیں، بالکل بھی نہیں۔ بلکہ مجھے تو آپ کا اس طرح کہنا بہت اچھا لگا۔" کومل نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔

"کیوں؟"

"کیونکہ جناب! انسان اس کو ہی ایڈوائز دیتا ہے جسے وہ کچھ سمجھتا ہے۔ مجھے تو اچھا لگتا ہے یہ سوچ کر کہ آپ مجھے اہمیت دیتے ہیں یا مجھے کچھ سمجھتے ہیں۔" کومل جلدی جلدی بولتی چلی گئی۔

احمد خاموش رہا مگر مسکرا دیا۔ اے سی کی خنک فضا کا کمال تھا یا کومل کی سنگت کا۔ اس کا موڈ بہت خوشگوار ہو چلا تھا۔

پوش ایریا کی رہائشی بلڈنگ کے بیس منٹ میں احمد نے گاڑی روکی تو کومل نیچے اترنے کے بجائے اس سے مخاطب ہوئی۔

"آئی ایم سوری احمد! میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا، میری گاڑی ٹھیک ہے، یہیں کھڑی ہے۔" کومل نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" احمد نے حیرانی سے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"اس کیوں کا جواب اوپر ہے۔ آپ میرے فلیٹ میں چلیں گے؟"

"شیور۔" احمد نے کندھے اچکائے، آج وہ پہلی بار اس کے ساتھ اس کے فلیٹ پر جا رہا تھا۔

تھرڈ فلور پر تین کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ بہت خوب صورتی اور نفاست سے سجا ہوا تھا۔ احمد دیکھ کر متاثر ہوا تھا۔

"آپ ایزی ہو کر بیٹھیں، میں ایک منٹ میں آتی ہوں۔"

کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو لوازمات سے لدی پھندی ٹرالی کے ہمراہ تھی، جس میں سب سے نمایاں کیک تھا، اس پر لگی شمعیں روشن تھیں۔

"اوہ۔۔۔!" احمد آنکھیں بند کرکے بے اختیار مسکرا دیا۔

کومل ایک بار پھر کمرے سے باہر گئی، واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں گٹار تھا۔

احمد کو کیک کاٹنے کا اشارہ کرکے وہ گٹار کے تار چھیڑنے لگی۔

ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ کی دھن گٹار کے تاروں سے نکل کر فضا میں پھیل رہی تھی۔

"اف۔۔۔!" احمد نے بے حد حیرانی اور سرخوشی کے عالم میں گردن ہلاتے ہوئے کچھ دیر اسے یوں دیکھا جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا ہو پھر ایک مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ کیک کاٹنے لگا۔

"تمہیں کیسے پتا آج میری برتھ ڈے ہے؟"
"آپ کو یاد ہے میں نے ایک بار آپ کا اسٹار پوچھا تھا۔ آپ نے اپنی ڈیٹ آف برتھ کے ساتھ اپنا اسٹار بتایا تھا۔ مجھے یاد رہ گیا۔"
"اچھا اور یہ؟" احمد نے گٹار کی طرف اشارہ کیا۔
"تمہیں آتا ہے یہ پلے کرنا؟"
"نہیں! صرف ہیپی برتھ ڈے کی دھن بجانی سیکھی ہے تین دن میں۔" کومل نے سر ہلاتے ہوئے سچ بتایا۔
"کیوں سیکھی؟" احمد نے روانی سے پوچھا۔
"آپ کے لیے۔" کومل نے بھی اسی بے ساختگی اور روانی سے جواب دیا۔ احمد یکدم خاموش ہو گیا۔
"آپ کو برا لگا؟" کومل نے گھبرا کے سوال کیا۔
"نہیں، برا تو نہیں لگا۔" احمد نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔
"پھر؟ اچھا لگا؟"
"اس کا جواب بعد میں بتاؤں گا۔ ویسے سچ بتاؤں تو اس وقت مجھے زبردست قسم کی بھوک لگ رہی ہے اور غالباً" تم نے میرے بارے میں کافی ریسرچ کی ہے تب ہی کیک کے کلر اور فلیور سے لے کر اس ٹرالی میں موجود تمام چیزیں میری فیورٹ ہیں۔ میں تکلف بالکل نہیں کروں گا۔ بائی دا وے، ان میں سے تم نے کیا بنایا ہے؟"
"کچھ بھی نہیں، سب کچھ بازار کا ہے، میری کوکنگ کوئی خاص نہیں ہے۔" کومل نے گٹار ایک طرف رکھا۔ "آپ تو اٹھ کر ہی بھاگ جاتے میرے ہاتھ کا بنا کچھ کھا کر۔" احمد مسکرا دیا۔
"اینی ویز، آپ ان باتوں کو چھوڑیں، اپنی برتھ ڈے انجوائے کریں۔"
"تم کچھ نہیں لوگی؟"
"ہاں، بس یہ کیک پیس۔" کومل نے ایک چھوٹا سا کیک پیس کاٹ کر پلیٹ میں رکھا۔
احمد پیٹ پوجا کے دوران ہلکی پھلکی ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا بلکہ زیادہ تر باتیں تو کومل ہی کر رہی تھی۔ وہ جواب دے رہا تھا یا اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ کولڈ ڈرنک کے گھونٹ لے رہا تھا جب کومل نے ایک چھوٹا سا گفٹ پیک اس کے سامنے رکھا۔
"یہ کیا بھئی؟"
"برتھ ڈے گفٹ۔"
"اس سب کے بعد یہ ضروری تھا؟"
"بالکل۔۔۔"
"میری سالگرہ پہ مجھے کوئی خالی وش کرے اور گفٹ نہ دے تو مجھے تو بالکل بھی اچھا نہیں لگے گا۔ اسی سے تو پتا چلتا ہے کہ آپ کسی کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ کتنی محبت کرتے ہیں اس سے اور۔۔۔" کومل نے روانی اور بے اختیاری میں بولتے ہوئے ایک دم ہی خود کو روکا۔
"گفٹ دیکھ لوں۔ اجازت ہے۔" احمد نے اس کے چہرے پر خجالت کے آثار دیکھ کر بات پلٹی۔
"آپ کا گفٹ ہے۔ جب چاہیں دیکھ لیں، مگر یہاں نہیں۔"
"یہاں کیوں نہیں؟"
"بس ایسے ہی۔"
"کوئی بم وغیرہ تو نہیں ہے کہ میں گفٹ کھولوں اور۔۔۔"

"میرا دھماکے کرنے کا انداز مختلف ہے۔ میں اس کے لیے کسی بم کو استعمال نہیں کروں گی۔" کومل نے ہنستے ہوئے اسے جواب دیا۔
"اوکے، اب میں چلتا ہوں، باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔" کچھ دیر بعد احمد اٹھ کھڑا ہوا۔ "تھینکس فار اوری تھنگ۔"
"تھینکس تو مجھے کرنا چاہیے، آپ نے میری جرات کو عزت بخشی۔" کومل بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔
دروازے پر پہنچ کر وہ ایک بار پھر رکا۔
"ایک سرپرائز تم نے مجھے دیا اور ایک گڈ نیوز میرے پاس ہے تمہارے لیے۔"
"کیسی گڈ نیوز؟"
"ریکا اینڈ کمپنی والوں نے اپنے ایڈ کے لیے دو ماڈلز فائنل کی ہیں، ان میں ایک تم ہو۔" احمد نے تو سچ مچ دھماکا کر ڈالا۔
"کیا؟" کومل انتہائی حیرت اور خوشی کے عالم میں چیخ ہی پڑی، ریکا اینڈ کمپنی سے منسلک ہونے کا مطلب، شہرت اور دولت کے دروازے کھلنا۔
"اب اپنا یہ کھلا ہوا منہ بند کرو اور آرام سے بیٹھ کر اس نیوز کو انجوائے کرو۔" احمد بائے کرتا ہوا نکل گیا۔
"اوکے بائے۔ ٹیک کیئر۔" کومل جیسے کسی خواب سے چونکی تھی اور واقعی یہ ایک خواب ہی تھا۔ ریکا اینڈ کمپنی کے ساتھ منسلک ہونے کا خواب ہر ماڈل دیکھتی تھی مگر بہت کم خوش نصیب ایسی ہوتیں جو یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوتیں۔ کومل دروازہ بند کر کے اندر آئی تو مارے خوشی کے اس کا برا حال تھا۔
کمرے کے وسط میں خوشی کے عالم میں جھومتی ہوئی، گھومتی ہوئی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ بالآخر اس کے سپنے پورے ہونے کا وقت قریب آ رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

شازے شام میں سو کر اٹھی تو بالکل فریش تھی۔ مزاج کی گرمی اور احمد کے ساتھ ہونے والی جھڑپ کی تلخی کے اثرات بہت حد تک کم ہو چکے تھے۔
بچے بھی کب کے سو کر اٹھ چکے تھے اور گیمز لگا کر بیٹھے تھے، شازے نے ٹائم دیکھا۔ ٹیوٹر کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔
بتول سرونٹ کوارٹر سے آ گئی تھی، اس وقت وہ بچوں کو تیار کر دیتی تھی، ٹیوٹر کے آنے سے پہلے بچے ریڈی ہوتے تھے۔
"میڈم جی!" بتول نے اسے مخاطب کیا۔
"ہوں۔"
"کل شام میں مجھے چھٹی چاہیے، میں کام جلدی نپٹا کر چلی جاؤں؟"
"خیریت؟"
"وہ جی کل میرے چھوٹے بیٹے کی سالگرہ ہے۔ وہ الہ دین جانے کی ضد کر رہا ہے اسے الہ دین پارک لے کے جانا ہے۔"
"اچھا، کل سالگرہ ہے تمہارے بیٹے کی؟" شازے نے چینل بدلتے ہوئے سرسری سا کہا۔
"جی کل بارہ اپریل ہے نا، پورے آٹھ سال کا ہو جائے گا میرا شہزادہ۔" بتول کے لہجے میں ممتا بھری محبت تھی۔
"کل بارہ اپریل، آج۔۔۔" یک دم ہی شازے کے ذہن نے کچھ کلک کیا۔
"آج گیارہ اپریل۔۔۔ اوہ خدایا! میں اتنا اہم دن کیسے بھول گئی۔ ہر سال ہی تو اس اکڑو خان کو وش کرتی ہوں اس کی سالگرہ پہ۔" شازے ٹی وی آف کر کے مضطرب ہو کر کھڑی ہو گئی۔
"کیا ہوا میڈم جی؟" بتول نے گھبرا کر اسے دیکھا۔
"کچھ نہیں، ذرا کمرے سے میرا بیگ تو لے کر آؤ۔"

بتول جا کر اس کا ہینڈ بیگ لے آئی۔
"یہ لو، اپنے بچے کے لیے کوئی گفٹ لے لینا میری طرف سے۔" شازے نے ہزار ہزار کے تین نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔
بتول ہچکچائی۔ "مہربانی، اللہ آپ کا سکھ چین سلامت رکھے، آمین!" بتول نے احسان مندی سے اسے دیکھا اور نوٹ لے لیے۔
کک آج کل چھٹیوں پر گیا ہوا تھا، اس کی غیر موجودگی میں بتول با آسانی کچن سنبھال لیتی تھی، اسے کانٹی نینٹل کھانے بنانے تو نہیں آتے تھے مگر دیسی اور روایتی پکوان وہ بنا لیتی تھی اور خوب بناتی تھی۔
"بات سنو بتول!" شازے نے کچھ سوچتے ہوئے اسے پکارا۔
"جی۔۔۔!"
"ایسا کرو، رات کا کھانا رہنے دو، ہو سکتا ہے ہم لوگ ڈنر باہر ہی کریں، تم بس اپنے اور اپنے بچوں کے لیے کچھ بنا لو۔" بتول کو رہائش کے ساتھ ساتھ کھانا پینا بھی فری تھا۔
"فریج میں کافی ساری چیزیں پڑی ہیں ان میں سے کچھ لے لوں گی، دوپہر کا کھانا بھی اچھا خاصا بچا ہوا

ہے۔ ہم چاروں کے لیے بہت ہوگا۔"
"جیسے تمہاری مرضی۔" شانزے اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ اب وقت کم تھا اور مقابلہ سخت۔ چینج کر کے خود کو ہلکا پھلکا سا سنوار کر باہر آئی۔
"بتول! بچوں کا دھیان رکھنا' میں ابھی آتی ہوں"۔

گاڑی نکال کر مین روڈ پر آئی تو سڑکوں پر ٹریفک کا سیلاب رواں دواں تھا۔
"یا اللہ' بس آگے ٹریفک جام نہ ہو۔" شانزے نے دل ہی دل میں دعا کی۔ وہ چاہ رہی تھی کہ احمد کے گھر آنے سے پہلے وہ گھر پہنچ جائے' تاکہ اس کے لیے ایک چھوٹی سی سرپرائزنگ برتھ ڈے کا اہتمام کر سکے۔

مقام شکر تھا کہ بے پناہ اور بے ہنگم ٹریفک کے باوجود' کہیں بھی ٹریفک جام نہیں تھا۔ شہر کی سب سے مہنگی اور مشہور بیکری سے احمد کے پسندیدہ فلیور کا کیک لیا۔ فلاور شاپ سے ٹیولپس کا بوکے خاص طور پر بنوایا۔ موتیا کے ڈھیروں پھول لیے' دونوں پھول احمد کے پسندیدہ تھے۔
گھر واپس آئی تو کیک فریج میں رکھ کر پھول ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ بچوں کو پتا چل جاتا تو فورا" پاپا جان کو فون کر کے اس کے سرپرائز کی ایسی کی تیسی ہو جاتی۔
شیشے کی میز کو ٹیولپس اور موتیے کے پھولوں سے سجا کر اس نے درمیان میں کیک کی جگہ چھوڑ دی۔
پچھلے آٹھ سال سے ان کا یہی معمول تھا کہ سالگرہ دونوں میاں بیوی میں سے کسی کی ہو' بچوں کی ہو یا دونوں کی ویڈنگ اینورسری' احمد ڈنر کرانے ضرور لے جاتا سب کو۔ پہلے تو عام دنوں میں ابھی اکثر وہ لوگ ڈنر پر چلے جاتے تھے مگر پچھلے سال' ڈیڑھ سال سے جب سے دونوں کے درمیان تلخیوں اور فاصلوں نے جنم لینا شروع کیا تھا' ایک ساتھ باہر جانے کا سلسلہ بہت کم ہو گیا تھا۔ بچوں کی کوئی خوشی یا موقع تو پھر بھی ایک ساتھ سیلیبریٹ کر لیتے مگر دونوں کے ذاتی معاملات اور خوشیاں اب پس پشت جاتی جا رہی تھیں۔
"اور کیا ضروری ہے کہ یہ سلسلہ یونہی چلے۔ یہ خلیج اور گہری ہوتی رہے۔ فاصلے اور بڑھتے ہی رہیں۔ کسی نہ کسی کو تو اپنے رویے میں لچک لانی ہے۔"
شانزے نے حقیقت پسند بن کر سوچا۔
"محبت کر کے شادی کی تھی پھر شادی کر کے محبت کہاں چلی گئی؟" شانزے کبھی کبھی حیران ہو کر سوچتی تھی۔
جو کچھ بھی ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے' ٹھیک نہیں ہے۔ حالات اور معاملات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہو جائیں' آپس میں ڈسکس کر کے ٹھیک بھی ہو سکتے ہیں۔ وہی ڈائیلاگز تھیوری۔ شانزے سوچتے سوچتے مسکرائی۔
"گفٹ کا کیا کروں؟" اس کے خیالات کی رو اب دوسری جانب مڑ گئی' احمد کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ جب احمد آئے تو وہ اسے گھر پر ہی ملے۔
"چلو گفٹ کی خیر ہے' ڈنر پر جائیں گے تب ہی کچھ لے لوں گی۔"
ٹیوٹر بچوں کو پڑھا کر جا چکا تھا۔ شانزے بچوں کے ساتھ مگن ہو گئی۔ یہ ٹائم اس کا اور بچوں کا ہوتا تھا' پھر احمد بھی آجاتا' چینج کر کے فریش ہو کر وہ بھی شامل ہو جاتا۔
مگر آج کافی دیر ہو گئی تھی' احمد اب تک نہیں آیا تھا۔ شانزے کی منتظر نظریں بار بار گھڑی کی جانب اٹھ رہی تھیں اور کان احمد کی گاڑی کے مخصوص ہارن پر لگے ہوئے تھے' اکثر وہ لیٹ ہو جاتا تھا مگر میسج کر دیتا تھا کہ دیر ہو جائے گی۔ مگر آج ابھی تک کوئی میسج بھی نہیں آیا تھا۔
"میں ہی فون کر کے پوچھ لوں؟" اس کے دل نے کہا مگر پھر فورا" ہی دل کے کہے پر انا غالب آگئی۔ ناک تو شانزے احمد کی بھی بہت اونچی تھی۔
"ساری لچک میں ہی دکھاؤں۔ ہر بار میں ہی کمپرومائز کرتی ہوں' اب فون کر کے بھی میں ہی پوچھوں کہ موصوف کہاں ہیں۔ خود بھی تو بتا سکتے ہیں کہ کب آئیں گے۔" شانزے کی تنک مزاجی عود کر آ

رہی تھی۔
"چلو' تیار ہو جاتی ہوں' تھوڑی دیر تو ہو ہی جاتی ہے' کیا پتا ٹریفک میں پھنسا ہوا ہو۔" شانزے نے احمد کو مارجن دیتے ہوئے خود کو تسلی دی۔
اپنی وسیع و عریض وارڈ روب سے اس نے پستئی رنگ کے سوٹ کا انتخاب کیا۔ اصلی شیفون پر سچے ریشم اور چاندی کے تاروں کا بے حد خوب صورت اور نفیس کام تھا۔
پون گھنٹہ لگا اس نے تیار ہونے میں۔ آئینہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔
"میں ہی فون کر کے پوچھ لیتی ہوں اب تک کیوں نہیں آیا۔" شانزے نے پرفیوم لگاتے ہوئے خود کو تنقیدی نظروں سے آئینے میں دیکھا اور مطمئن ہو کر اپنے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عین اسی لمحے اس کا موبائل بج اٹھا۔
"فون آگیا موصوف کا۔" شانزے نے جھپٹ کر موبائل اٹھایا' مگر اسکرین پر چمکتے نمبر دیکھ کر اس کی خوشی کچھ کم ہو گئی۔
"ہیلو۔"
"ہیلو' شانزے کیسی ہو؟"
"ٹھیک' تم سناؤ۔"
"بس' میں نے سوچا تمہاری خیریت معلوم کر لوں' صبح والا ڈپریشن اور ٹینشن کچھ ختم ہوا یا نہیں؟"
"بالکل ختم ہو گیا۔" شانزے کھلکھلائی۔
"گڈ' ویری گڈ۔ یونہی ہنستی رہا کرو اور سناؤ' کیا ہو رہا ہے۔"
"انتظار۔"
"کس کا؟"
"آئی تھنک کہ اس وقت عموما" ہر اچھی بیوی اپنے ہزبینڈ کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔"
"بعض اچھی بیویاں بہت بھولی بھالی ہوتی ہیں۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ اچھی بیوی کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا ہزبینڈ کہاں ہے اور کس کے ساتھ ہے۔" فواد حسن کا معنی خیز لب و لہجہ سن کر وہ ٹھٹک گئی۔
"ایکسپلین کرو۔"
"میرا خیال ہے احمد آج دیر سے گھر آئے گا۔ شام میں کومل کے ساتھ دیکھا تھا میں نے اسے' ویسے۔۔۔"
وہ ایک لمحے کو رکا۔
"مجھے اچھا تو نہیں لگ رہا تمہیں بتاتے ہوئے مگر تمہارے علم میں یہ بات ضرور ہونی چاہیے کہ احمد اور کومل ایک دوسرے کے کافی قریب ہو رہے ہیں۔ دونوں کے قریبی حلقوں میں گوسپس شروع ہو چکی ہیں۔ حیرت ہے کہ تم ابھی تک لاعلم ہو۔ آئی ایم سوری شانزے! میں نے شاید تمہیں ہرٹ کیا مگر۔۔۔"
"تم نے مجھے ہرٹ نہیں کیا فواد! بلکہ میری آنکھیں کھولی ہیں' ہرٹ تو کسی اور نے کیا ہے۔ تم کیوں گلٹی فیل کر رہے ہو۔" شانزے بمشکل مسکرائی۔ ایک بے حد تلخ مسکراہٹ۔ اندر تک وجود پورا کڑوا ہو رہا تھا' مسکراہٹ کیوں نہ کڑوی ہوتی۔
"ویسے کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ بیوی وہ فرد ہوتی ہے جسے سب سے آخر میں اپنے شوہر کی بے وفائی کا علم ہوتا ہے۔ اینی ویز' تھینکس ٹو ٹیل۔"
"بات سنو! زیادہ ٹینشن لینے کی اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کرائسس آتے ہیں' گزر بھی جاتے ہیں یہی لائف ہے۔"
"فواد! میں بعد میں بات کروں گی' ٹھیک ہے۔" شانزے نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ یہ ٹھہراؤ ایسے سمندر کی سطح جیسا تھا' جس کی تہہ میں بے شمار طوفان مچل رہے ہوں۔
"او کے' او کے ہم بعد میں بات کر لیں گے' خدا حافظ۔" فواد نے جلدی جلدی کہا۔
"خدا حافظ۔" شانزے نے زیر لب کہہ کر فون آف کر دیا۔
کتنی دیر وہ خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی رہی۔ اندر سے دل چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر روئے مگر حیرت انگیز طور پر اس کی آنکھیں خشک تھیں۔

"کیا یہ میرے لیے صدمے کی بات نہیں؟" شانزے نے خود سے سوال کیا۔ اسے اپنی کیفیت پہ حیرانی ہو رہی تھی۔ رونا آ رہا ہے مگر آنسو نہیں آ رہے آنکھ میں۔

"یا پھر میں مینٹلی اتنی اسٹرونگ ہو چکی ہوں کہ بڑے سے بڑا شاک بھی بغیر آنسوؤں کے سہ جاؤں۔" وہ ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے خود کو غور سے دیکھا۔

کچھ دیر پہلے جب اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تھا تو خود پر کسی بے حد خوب صورت مجسمے کا گمان ہوا تھا۔ ہر عیب اور شکن سے پاک، بے داغ سراپا، مگر اب اس مجسمے میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں۔

ایک گہری سانس لے کر اس نے جیولری اتارنی شروع کی، لباس تبدیل کر کے میک اپ صاف کیا اور بالوں کو بینڈ میں جکڑ کر باہر آ گئی۔

"بتول!" لاؤنج میں آ کر اس نے بتول کو مخاطب کیا۔

"جی!"

"فریج میں کیک رکھا ہے۔ لے جانا، اپنے بیٹے کی برتھ ڈے پہ کاٹ لینا اور ڈرائنگ روم میں ٹیبل صاف کر کے سارا کچرا ڈسٹ بن میں ڈال دو۔"

بتول نے اچنبھے سے اسے دیکھتے ہوئے سوچا، کچھ پوچھنے یا کہنے ہمت نہ ہوئی۔

شانزے کچھ دیر وہیں بیٹھی جانے کیا سوچتی رہی، پھر بیڈ روم میں آ کر نیند کی ایک گولی پانی کے گلاس کے ساتھ پھانکی اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ اس وقت وہ ہر چیز سے بے خبر ہو کر ایک پرسکون نیند چاہتی تھی۔ صبح اس کا اسپیشل مارننگ شو تھا۔

☆ ☆ ☆

اچھا خاصا گھر جاتے جاتے اس نے گاڑی کا رخ سی ویو کی طرف موڑ دیا۔ اک دم ہی اس کا دل بوجھل ہو گیا تھا۔

"تو تمہیں یاد ہی نہیں رہا کہ آج کیا دن ہے؟" جھاگ جھاگ سمندر کی بپھری لہروں کو دیکھ کر وہ سوچتا رہا۔

"نہ کوئی میسج، نہ کوئی کال۔" اس نے موبائل نکال کر ایک بار پھر چیک کیا۔ حالانکہ نتیجہ اچھی طرح معلوم تھا۔

"تم ہی کر لو کال۔" اس کے دل نے چپکے سے مشورہ دیا۔

"مگر میں کیوں کر لوں۔ آج میرا دن ہے، میری برتھ ڈے۔ کتنی بھی ناراضی ہو، لڑائی جھگڑا ہو، وہ ہر سال خود مجھے وش کرتی ہے، سالگرہ منانے کا اہتمام کرتی ہے، ساری رنجشیں اور تلخیاں یوں ختم ہو جاتی ہیں کہ جیسے تھیں ہی نہیں۔ مگر اس بار یہ رسم بھی گئی تو تم خود یہ چاہتی ہو کہ فاصلے قائم رہیں، دوریاں اور بڑھ جائیں۔ کیا انڈیپینڈنٹ ہونے کا زعم اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ محبت کو نگل جائے۔" احمد کی نظریں سامنے جمی تھیں۔ شوریدہ سر لہریں بڑے جوش کے ساتھ آگے تک آتیں اور پتھروں سے سر پٹخ پٹخ کر وہیں دم توڑ دیتیں۔

"پتھروں سے سر ٹکرانا سراسر بے وقوفی ہے مگر پھر بھی یہ لہریں باز نہیں آتیں۔" احمد نے موبائل پینٹ کی جیب میں ڈالا تو انگلیاں کسی اور چیز سے بھی ٹکرائیں۔ اس نے وہ پیکٹ کھینچ نکالا۔

"کومل کا دیا ہوا گفٹ۔" اس نے غور سے پیکٹ کو دیکھا۔

ایک لمحے کو اس کا دل چاہا اسے سمندر کے سپرد کر دے مگر بس ایک لمحے کو یہ خیال آیا اور گزر گیا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے ریپر ہٹایا۔

بہت ہی خوب صورت اور مہنگی رسٹ واچ تھی، ایک مختصر سی عبارت کے ساتھ۔

"دیکھتے ہیں، یہ تعلق وقت کے ساتھ کمزور ہوتا ہے یا مضبوط۔"

تعلق؟ کیا تعلق ہے ہمارا آپس میں، ایک اچھی فرینڈ شپ یا اس سے بھی آگے بڑھ کچھ؟ احمد الجھن میں تھا، وہ ابھی تک خود بھی اپنی فیلنگز ٹھیک سے

سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

کیا شانزے کے ساتھ بڑھتی ہوئی دوری اسے کومل سے قریب کر رہی تھی۔ کیسا عجیب تھا یہ بندھن، مجبوری کا یا مرضی کا؟

کتنی دیر وہ وہاں بیٹھا رہا ہلکے اندھیرے میں تاحد نگاہ تک بس ایک سیاہی مائل سی چمکتی چادر پھیلی ہوئی تھی، لہروں کا شور اور ہنگامہ اس پر سوار تھا۔

بالآخر بڑے مضمحل انداز میں وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

زندگی بہت عجیب سی ہو چلی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ اپنے کیریر کے لیے جدوجہد کی تھی، محنت کی تھی، ایک ساتھ مل کر خوشیوں کے اور کامیابیوں کے خواب دیکھے تھے، بہت سے خواب اک اک کر کے پورے ہوئے مگر دونوں کے آپس کے تعلقات اور خوشیوں میں بہت سی دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے قریب رکھنے والی ایک دوسرے سے جوڑنے والی محبت کی، الفت کی نازک سی ڈور ہاتھوں سے پھسلی جا رہی تھی۔

اور اگر کسی دن یہ ڈور پوری ہی ہاتھوں سے نکل گئی تو؟ احمد نے دانت بھینچ کر بڑی تیزی سے موڑ کاٹا تھا، کار کے ٹائر چرچرا اٹھے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ گھر میں داخل ہوا تو پھر بھی جانے کیوں ایک موہوم سی امید کا دیا اس کے دل میں روشن تھا۔

اس کی محبت کرنے والی بیوی ہر سال اسے سرپرائز دیتی تھی، شاید آج بھی..... کاش آج بھی.....

اپنی سوچوں میں الجھا الجھا وہ تھکا تھکا سا لاؤنج میں صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ کچھ دیر بعد کسل مندی سے اٹھ کر اس نے پانی نکال کر پیا۔

ریفریجریٹر کے یخ پانی نے اسے اندر تک کافی پرسکون کر ڈالا تھا۔

پورے گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ اس نے بچوں کے بیڈ روم کا دروازہ کھولا۔ کمرے کی نیلگوں اور ٹھنڈی فضا میں دونوں بچے سو چکے تھے۔ احمد نے ایک نظر اپنی گھڑی پر ڈالی۔

گیارہ بجنے والے تھے۔

"ٹائم بھی تو بہت ہو گیا آج۔" اس نے سوتے ہوئے دونوں بچوں کو باری باری پیار کیا۔

دونوں ذرا کی ذرا کسمسائے۔ احمد ان کو تھپک کر باہر آ گیا۔ آہستگی سے دروازہ بند کیا۔

اپنے بیڈ روم میں آیا تو ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔

شانزے دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی۔

دل میں ٹمٹماتا اس کا دیا یکلخت بجھ گیا۔

نازک سی ڈور، دھیرے سے کچھ اور پھسلی ہاتھ سے۔

بھولی بسری سی کوئی بازگشت کانوں میں گونجی۔

"تمہارا برتھ ڈے میری زندگی کا سب سے اسپیشل دن ہے۔ پتا ہے کیوں.... کیونکہ تم دنیا میں آئے ہو تو مجھے ملے ہو نا۔ تمہارا ساتھ میری خوش بختی ہے، تمہارا دنیا میں آنا میری خوش نصیبی، بہت ہی مبارک دن ہے میرے لیے تمہارا برتھ ڈے، ہم ہر سال یوم الفت کے نام سے منایا کریں گے، ٹھیک ہے۔"

اف وہ باتیں!

"اتنی جلدی فراموش کر گئیں سب کچھ؟" احمد نے ایک شکائتی نظر شانزے کے خوب صورت خوابیدہ چہرے پہ ڈالی۔

چینج کر کے آڑا ترچھا بیڈ پر لیٹ گیا مگر کتنی دیر ہو گئی کروٹیں بدلتے بدلتے، نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ وہ بیڈ روم سے ملحق اپنی اسٹڈی میں چلا آیا۔

ایک سگریٹ سلگا کر ہونٹوں میں دبائی اور دھیرے دھیرے کش لینے لگا، وہ عادی نہیں تھا، بس کبھی کبھار جب بہت زیادہ ٹینشن میں ہوتا تو کڑوا دھواں اپنے اندر اتارتا رہتا۔

لیپ ٹاپ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ اسکرین پر چمکتے نمبر دیکھ کر اس نے کال ریسیو کر لی۔

"ہیلو، کیسے ہیں آپ۔"

"فائن اور تم سناؤ؟"
"بس سوچا فون کرکے پوچھ لوں گفٹ پسند آیا؟"
"ہاں اچھا ہے۔"
"صرف اچھا؟" من کیا یوسی ہوئی۔
"پھر کن الفاظ میں تعریف کروں کہ تم خوش ہو جاؤ۔"
"لفظوں کے جادوگر تو آپ ہیں۔ ہم تو بس سیدھے سادے انداز میں اپنی بات کہنے والے لوگ ہیں؟" کومل ہنسی۔
"میں بھی سیدھے سادے انداز میں ہی اپنی بات کہتا ہوں' پتا نہیں کیوں کسی کو جادوگری لگتی ہے' کسی کو ساحری۔" احمد کا موڈ غیر محسوس طریقے سے خوشگوار ہونے لگا۔ تقریباً" آدھ گھنٹے کومل سے بات کر کے اس نے فون آف کیا تو اسے یوں لگا جیسے اس کا وجود بہت ہلکا پھلکا ہو گیا ہو۔
اس کی ہنسی میں' اس کی باتوں میں کچھ تو تھا' اس کی اداسی' افسردگی سب کچھ اس ہنسی نے سمیٹ لی تھی۔ دل کا بوجھ یکلخت غائب ہو گیا تھا۔
"کس رستے پہ قدم رکھ رہے ہو میاں صاحبزادے؟" اندر سے کسی نے سرزنش کی۔ جب ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی کسی کی قربت اور ہم سفری کا احساس نہ ہو' آنکھوں میں اجنبیت اور رویے میں سرد مہری اتر آئے تو رستے بدل ہی جاتے ہیں۔ یہ تسلی شاید دل نے اسے دی تھی' یہ دل بھی عجیب بے ایمان سا ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ پرانے رستے کو چھوڑتے ہوئے دھڑک بھی رہا تھا اور نئے رستے پہ قدم رکھنے کے لیے ہمک بھی رہا تھا۔
"کیا صحیح ہے کیا غلط' اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔ میں سوچ سوچ کر خود کو ٹینشن میں کیوں مبتلا کروں۔" وہ خود غرض نہیں تھا مگر اس وقت خود غرضی کے ساتھ ساتھ سوچتے ہوئے وہ سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

دونوں کے درمیان ایک خلیج تھی' جو دن بدن گہری ہو رہی تھی۔ ایک فریق ایک قدم پیچھے ہٹاتا تو دوسرا دو قدم پیچھے ہٹ جاتا۔
شانزے ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب تھی۔ ازدواجی زندگی میں پھیلتا تنہائی کا' خاموشی کا' فاصلوں کا خلا تیزی کے ساتھ بڑا ہوتا جا رہا تھا' وہ بے بسی سے اس بڑھتے خلا کو دیکھ رہی تھی۔
وہ ذہنی ابتری کا شکار تھی۔ بکھر رہی تھی۔ قریب تھا کہ وہ اپنا مارننگ شو ختم ہی کر دیتی مگر سارے مشکل حالات اور ہر کڑے لمحے میں ایک شخص تھا جو اس کے ساتھ ساتھ کھڑا تھا۔ اسے تسلی دینے کو' اس سے ہمدردی کرنے کو' اسے سہارا دینے کو۔ فواد حسن اس کا غم گسار بھی تھا اور چارہ ساز بھی۔ تسلی و تشفی دینے کا ہر لفظ اسے ازبر تھا' زخموں پہ پھاہے رکھنے کے انداز اسے خوب آتے تھے' اسی کا دم تھا کہ وہ خود کو سمیٹ کر رکھنے کی اور معمولات زندگی جیسے تیسے جاری رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
چائے کا کمرشل تھا۔ بہت محنت سے بنایا گیا تھا۔ سب نے ہی اپنی اپنی جگہ خوب محنت کی تھی۔ محنت تو کومل نے بھی بہت کی تھی مگر نہ جانے کیا بات تھی۔ کمرشل اور ماڈل کو تھوڑی بہت پسندیدگی تو ملی مگر اس طرح ہٹ نہیں ہوا جیسے کہ سب کو خصوصاً" کومل کو توقع تھی' اسے اپنی امیدوں کے پورا نہ ہونے پر خاصا دھچکا لگا تھا۔
اس کے چہرے پہ چھائے مایوسی کے رنگ احمد سے پوشیدہ نہ رہ سکے تھے۔
"آج رات فارغ ہو؟" احمد نے اسے کال کر کے پوچھا تھا۔
"ہاں' میری کیا مصروفیت ہو گی بھلا؟" کومل کا لہجہ پھیکا پھیکا سا تھا۔
"آج ڈنر میرے ساتھ کرو گی؟"
"اٹس مائی پلیژر۔" کومل کے پھیکے سے لہجے میں خوشی کا رنگ بج گیا۔
"میں پک کر لوں گا تمہیں' کتنے بجے آؤں؟"
"جب بھی آجاؤ میرا انتظار تو ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔"
"ابھی تو لنچ ٹائم بھی شروع نہیں ہوا۔ اتنا لمبا انتظار کرو گی؟"
"میں اس سے بھی لمبا انتظار کر سکتی ہوں' آزما کر دیکھ لیں۔" کومل نے معنی خیز انداز میں دعوا کیا۔
"ہم آزمانے کے قائل نہیں ہیں' کوئی بھلا مانس آزمائش پہ پورا نہ اترے تو؟"
"اور جو کوئی بھلا مانس آزمائش پہ پورا اتر جائے تو؟" کومل اسی کی ٹون میں بولی۔
"پھر تو اس کا انعام ڈیو ہے۔"
"مرضی کا۔ منہ مانگا انعام؟"
"بالکل۔"
"یہ انعام دے گا کون؟" کومل نے سوال کیا۔
"یہ انعام لے گا کون؟" احمد نے اسی کے انداز میں سوال کیا۔
"جو آزمائش پہ پورا اترے گا۔" کومل کا جواب برجستہ تھا۔
"تو پھر انعام بھی وہی دے گا جو کسی کو آزمائے گا۔" احمد کو نہ جانے کیوں اپنے مزاج سے ہٹ کر اس غیر سنجیدہ اور کسی حد تک بے سروپا گفتگو میں مزا آ رہا تھا۔
"ہم تو منتظر ہیں مگر..." کومل نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑا۔
"کسی کسی انتظار میں بڑا لطف ہوتا ہے۔" احمد ذرا سنجیدگی سے گویا ہوا۔
"کوفت بھی تو ہوتی ہے۔" کومل نے ایک گہری سانس لی۔
"بے یقینی بھی ہوتی ہے' کسی انتظار میں مایوسی اور ناامیدی کی چبھن بھی ہوتی ہے۔" کومل کو یکایک یاسیت نے آن گھیرا۔
"ایک تو تم بڑی جلدی ملکہ جذبات بن جاتی ہو' اتنی جلدی نہ تو ناکام ہونا چاہیے نہ ہی مایوس۔ اب ابھی سے اچھا اچھا سوچنا شروع کر دو تاکہ آگے بھی اچھا اچھا ہی ہو۔" احمد نے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔
"ایک اچھا تو رات میں ہونے والا ہے۔"
"کیا؟" احمد چونکا۔
"آپ کے ساتھ ڈنر۔"
وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔
"چلو پھر اس اچھے کے بارے میں سوچو۔ بالکل فریش اور ہیپی فیس چاہیے مجھے۔ نو ٹینشن' نو ڈپریشن۔"
احمد نے فون آف کیا اور کچھ سوچ کر مسکرانے لگا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنی گاڑی پارکنگ سے نکال رہی تھی' جب فواد حسن تیزی سے اس کی گاڑی کی طرف آیا۔ ہاتھ لہرا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا تھا۔ شانزے نے کار روکی اور شیشہ نیچے کیا۔
"کیا ہوا۔ خیریت تو ہے؟" اس نے کچھ حیرانی اور پریشانی سے فواد کو دیکھا۔
"ہاں ہاں خیریت ہی ہے' تم پروگرام ختم ہوتے ہی اتنی جلدی بھاگ لیں۔ مجھے کچھ کہنا تھا تم سے۔" وہ کھڑکی پہ دونوں ہاتھ جمائے جھکا ہوا اس سے مخاطب تھا۔
"بولو۔"
"تمہیں بتانے آیا تھا آج کا پروگرام بہت زبردست' بہت ہی شاندار کیا ہے تم نے۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ تم جن کرائسز سے گزر رہی ہو' اسے ایک طرف کر کے اتنی زبردست پرفارمنس بھی دے سکتی ہو' یو آر ریئلی آبریلینٹ اینڈ بریو لیڈی۔"
"کبھی کبھی نہ بریلینٹ ہونا اپنے کچھ کام آتا ہے نہ بریو ہونا' بلکہ یہ دونوں باتیں بعض اوقات ہمارے گلے کا طوق بن جاتی ہیں۔" شانزے پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔
"سب کچھ ہماری تھنکنگ اور وے آف تھنکنگ پر ڈیپینڈ کرتا ہے' میرے نزدیک تمہاری یہ دونوں خوبیاں ایسی ہیں جو تمہارے گلے کا طوق نہیں بلکہ تمہارے پیروں میں پڑی زنجیروں سے آزاد ہونے میں تمہاری مدد کر سکتی ہیں۔" فواد سنجیدگی سے گویا تھا۔

شانزے کے دل کو کرب کی ایک لہر کاٹتی ہوئی گزر گئی' کوئی بہت زیادہ پرانی بات تو نہیں تھی مگر لگتا یہی تھا کہ وہ کوئی بہت بھولا بسرا دور تھا جب ان دونوں کی شادی کے دن قریب تھے۔

"میں تو شادی کے بعد جاب واب سب چھوڑ دوں گا" احمد اکثر اسے چھیڑتا۔

"کیوں؟" وہ کچھ خفگی اور کچھ پیار سے اسے گھورتی۔

"بس۔

ابھی سے دل چاہتا ہے کہ

خوب صورت سی پیروں میں اک زنجیر ہو

گھر میں بیٹھا رہوں میں گرفتار سا"

وہ ہنس پڑتی۔

"ہیلو' کہاں کھو گئیں؟" فواد کی آواز پر وہ چونک پڑی۔

حال سے ماضی میں جانا تکلیف دہ تھا' اور ماضی سے واپس حال میں آنا اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ۔

"او کے' تم جاؤ۔ دھیان سے جانا اور خیریت کے ساتھ گھر پہنچنا' ٹیک کیئر۔" فواد نے اس کے گم صم چہرے کو دیکھ کر ہدایت کی۔

"اللہ حافظ!" شانزے ایک گہری سانس لے کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگی۔

فواد پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا' اس کے جانے کے بعد بھی وہ کچھ دیر وہیں کھڑا سوچتا رہا۔

☼ ☼ ☼

آج چھٹی کا دن تھا۔ عموماً" چھٹی کے دن وہ دیر سے سو کر اٹھتی تھی۔ پورے ہفتے کی تھکن اور نیند ان دو دنوں میں ہی پوری ہوتی تھی' مگر اب تو کئی ہفتوں سے چھٹی کے دن بھی سویرے آنکھ کھل جاتی اور پھر کروٹوں پہ کروٹیں بدلنے پر بھی نیند آنے کا نام نہیں لیتی تھی' وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی' باہر لان میں نکل جاتی' ننگے پاؤں چہل قدمی کرتے ہوئے کتنے ہی چکر لگا لیتی۔ آنکھوں کو تراوٹ بخشتا سبزہ' رنگ و خوشبو لٹاتے پھول' اب کچھ بھی تو دل کو نہیں بھاتا تھا۔

حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ احمد اور اس کے درمیان فاصلوں کی دراڑ بڑھ کر خلیج بن گئی تھی اور بڑھتی ہی جا رہی تھی' تلخ جھڑپیں اور لڑائی جھگڑے ختم ہو کر اب بات چیت بھی برائے نام ہی رہ گئی تھی۔ کومل اور احمد کے بڑھتے ہوئے تعلقات اب دوستوں اور شناساؤں کی زبانوں سے آگے نکل کر اخبارات اور میگزینز کی چٹ پٹی خبروں کی زینت بن رہے تھے۔

کتنی دیر لان میں چہل قدمی کر کے وہ اندر آئی تو ٹھٹک گئی۔ خلاف معمول احمد ٹک سک سے تیار ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا تھا۔ بتول ناشتا بنا کر کچن سے لا رہی تھی۔

"آپ کا ناشتا بھی لے آؤں جی؟" بتول نے اس سے سوال کیا۔

"بس ایک گلاس جوس۔" شانزے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

چھٹی کے دن کہاں کی تیاری ہے؟ احمد کو کن اکھیوں سے ایک نظر دیکھتے ہوئے اس نے سوچا مگر انا نے سوال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس نے ٹیبل پر پڑا تازہ اخبار اٹھالیا' مین پیج احمد کے پاس تھا۔ وہ دوسرے صفحے کھولنے لگی۔ معاً" احمد کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"ایک گھنٹے بعد میری فلائیٹ ہے ملائشیا کی۔"

شانزے کی سماعتوں پر جیسے کوئی بم پھوٹا تھا۔

"بہت جلدی خیال آگیا بتانے کا۔" اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے احمد کو دیکھا۔

"تم ملتی ہی کب ہو۔ صبح میرے اٹھنے سے پہلے جا چکی ہوتی ہو' رات کو سوئی ہوئی ہوتی ہو۔ کس وقت بتاتا؟"

"موبائل کس مرض کی دوا ہے؟" شانزے کی بات آدھی منہ میں ہی رہ گئی۔ وہ اب بے یقینی کے ساتھ اخبار کے اس اندرونی صفحے کو دیکھ رہی تھی جہاں شوبز کی چٹ پٹی خبریں چھپی ہوئی تھیں۔

اس کی بے یقین نظریں تیزی کے ساتھ اخبار کی سطروں پر پھسل رہی تھیں۔

"ابھرتی ہوئی ماڈل کومل خان اور معروف ایڈور ٹائزنگ ایجنسی کے مالک احمد مغل کی بڑھتی ہوئی دوستی اور قربت رشتہ ازدواج میں بدل گئی۔ شنید ہے کہ ہنی مون کے لیے دونوں نے ملائشیا کا انتخاب کیا ہے۔"

آگے اور جانے کیا کیا لکھا ہوا تھا۔ شانزے کی نظریں دھندلانے لگیں۔

"اس لیے جا رہے ہو ملائشیا؟" شانزے نے شوبز کی خبر والا وہ صفحہ اس کے سامنے پٹخا۔

احمد نے پہلے تو کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ایک نظر اسے دیکھا۔ ایک نظر اخبار کو' پھر وہ صفحہ اٹھا کر پڑھنے لگا۔

جیسے جیسے وہ پڑھتا جا رہا تھا اس کے ماتھے کے بل بڑھتے جا رہے تھے۔ "وہاٹ ربش!" اس نے طیش میں اخبار ایک طرف پھینکا۔

"پتا نہیں کیا کیا بکواس چھاپتے رہتے ہیں یہ لوگ"۔ وہ بڑبڑایا۔

"کچھ بکواسیں سچ بھی ہوتی ہیں۔"

"مگر یہ جھوٹ ہے۔" وہ غرایا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے میں تمہارے اس جھوٹ پر یقین کرلوں گی؟" شانزے کا پورا وجود جیسے کسی طوفان کی زد میں تھا۔

"تمہیں یقین کرنا ہے کرو' نہیں کرنا تو مت کرو۔" وہ ناشتا ادھورا چھوڑ کر تن فن کرتا کھڑا ہو گیا۔

"ہمت ہے تو سچ کا سامنا کرو۔ میدان چھوڑ کر کیوں بھاگ رہے ہو۔" شانزے حلق کے بل چلائی۔

"یہ میدان نہیں۔ میری زندگی اور گھر ہے جسے میں نے بڑی محنت اور محبت سے بنایا تھا مگر تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی نے سب کچھ تباہ کر دیا ہے۔" وہ لب بھینچے کچھ دیر اسے دیکھتا رہا' پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"وہ کہتا ہے' میں نے۔ میں تباہ کر دیا ہے سب کچھ' اس کی زندگی اور یہ گھر' یہ گھر جسے میں نے بڑے ارمانوں سے بنایا تھا' جس کے لیے اتنی جان ماری' اتنی قربانیاں دیں۔ شادی اس نے کی ہے اور گھر کی تباہی کا الزام مجھ پر۔ کیا خوب لطیفہ ہے۔"

شانزے فواد حسن کے سامنے پھٹ پڑی۔ وہی ایک تھا اس کا رازدار' غم گسار' ورنہ دوست تو بہت تھے مگر ہر ایک کے سامنے' اسے اپنے دکھ رونے کی عادت نہیں تھی۔

"یہ تو ہونا ہی تھا اک دن۔" فواد ترحم سے اسے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

"اب' اب کیا کرو گی تم؟" فواد نے بدستور اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میرے پاس کیا آپشن ہے کچھ کرنے کے لیے؟" شانزے نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو بدقت پیچھے دھکیلا۔

"جو آپشن احمد کے پاس تھا' وہی تمہارے پاس بھی ہے۔ وہ اپنے لیے نئے راستے' نئے لوگ چن سکتا ہے تو تم بھی۔۔۔" فواد حسن نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کے ردعمل کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

"نئے راستے نئے لوگ؟" شانزے کو جیسے چند لمحے لگے تھے اس کی بات سمجھنے کے لیے۔

"تو کیا بٹی ہوئی زندگی گزارو گی؟ کمپرومائز کرو گی؟" فواد نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" شانزے نے قطعیت کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔

"کچھ بھی ہو' تم کچھ بھی کرو' خود کو کبھی اکیلا مت سمجھنا۔ زندگی کے ہر ہر لمحے اور مرحلے پر میں تمہارے ساتھ ہوں۔" فواد کی بات پر شانزے نے چونک کر اسے دیکھا۔

"احمد بہت بدنصیب ہے' تمہاری قدر نہیں کر سکا۔" چند لمحے بعد وہ پھر دھیرے سے بولا تھا اور شانزے یک ٹک اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ آج تک اسے ایک دوست اور بہت اچھا دوست سمجھ کر اپنے معاملات شیئر کرتی چلی آئی تھی مگر اس وقت

اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس دوستی نے یکایک ایک نیا رخ ایک نیا انداز اختیار کرلیا ہو۔

زندگی کب کس وقت کیا سے کیا ہو جاتی ہے کچھ پتا نہیں چلتا شانزے نے بے اختیار ایک گہری سانس لیتے ہوئے سوچا۔

"فواد! میں اس وقت بہت پریشان اور بہت الجھی ہوئی ہوں۔ تم پلیز ایسی کوئی بات مت کرنا جس سے میری الجھنوں میں اضافہ ہو۔"

"میں تمہاری الجھنوں اور پریشانیوں کو بڑھانا نہیں انہیں بانٹنا چاہتا ہوں۔"

"بہت بڑا دعوا کر رہے ہو۔" شانزے نے بغور اسے دیکھا۔

"آزما کر دیکھ لو۔" فواد نے چیلنج کیا۔

شانزے فقط سر ہلا کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

احمد ملائشیا سے واپس آگیا تھا۔ دونوں کے درمیان تناؤ اور سرد مہری کی دیوار اونچی سے اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

کیا سچ تھا کیا جھوٹ۔

کیا حقیقت تھی کتنا افسانہ تھا۔

نہ احمد نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی نہ شانزے نے اس سے کوئی وضاحت طلب کی۔

کومل نے بھی یہ خبر پڑھی اور احمد کے سامنے ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔

"اس میں اتنا ہنسنے کی کیا بات ہے؟" احمد نے انتہائی سنجیدگی سے اس کے گلابی ہوتے چہرے پہ نظریں جمائیں۔

"اوہ سوری آئم سوری! مجھے بس یہ سوچ کر ہنسی آ رہی تھی کہ ہمارے فیوچر کے بارے میں بھی ہم سے پہلے ان میڈیا والوں نے فیصلہ کر دیا ہے۔" کومل اسے سنجیدہ دیکھ کر اپنی ہنسی کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ان لوگوں کو کوئی اور کام نہیں ہے۔ رائی کا پہاڑ بنانے میں ماہر ہیں۔" احمد بڑبڑایا۔

"کول ڈاؤن احمد! شوبز میں آنے اور رہنے کی قیمت تو چکانی پڑتی ہے۔ یہ اسکینڈلز بھی اسی قیمت کا ایک حصہ سمجھ لو اور ویسے بھی۔۔۔" کومل ایک لمحے کو رکی۔ "رائی ہوتی ہے تو پہاڑ بنتا ہے نا۔"

"رائی اور پہاڑ کے وجود میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔" احمد نے اسے جتایا۔

"آف کورس!" کومل نے کندھے اچکائے۔ "ویسے اگر تمہیں یہ نیوز یا گوسپ اتنی ہی بری لگی ہے تو تم ڈینائے کر سکتے ہو۔" وہ گزرتے دنوں میں کافی بے تکلف ہو گئی تھی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے ان بکھیڑوں میں الجھنے کی آج میں تردید کر دوں کل کو یہ صحافی اس کا بھی یقین نہیں کریں گے اور پھر کچھ نہ کچھ چھاپ دیں گے۔ یہ لوگ ہر معاملے ہر شخص کو شک کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ دال میں کچھ نہ کچھ کالا نظر آتا ہے۔" احمد نے قدرے جھنجلا کر کہا۔

"بائی داوے یہ ڈینائے تو تم بھی کر سکتی ہو تم کیوں نہیں کر دیتیں یہ نیک کام؟"

"کیونکہ مجھے یہ خبر بری ہی نہیں لگی۔" کومل بیگ کندھے پہ ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا مطلب؟" احمد کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"کم آن احمد! تم بچے نہیں ہو نہ ہی ٹین ایجر سوچنا ضرور۔" وہ بائے کہتی ہوئی مسکرا کر نکل گئی اور احمد نہ جانے کیوں متحیر سا بیٹھا رہا۔

یہ تو ہونا ہی تھا دوستی اور بے تکلفی نئی منزلوں کی طرف اشارہ کر رہے تھے کومل نے کھل کر اظہار کر دیا تھا مگر وہ خود کیا کر رہا تھا۔

کیا وقت گزاری؟

یا پھر اپنی ازدواجی زندگی کی الجھنوں اور پریشانیوں سے فرار کی ایک غیر شعوری کوشش؟

وہ سوچتا رہا اور اپنے آپ سے الجھتا رہا۔

☼ ☼ ☼

شانزے اپنے بیڈ روم میں تھی۔ بچے ٹیوٹر سے پڑھ

رہے تھے۔ مضمحل سی وہ یونہی آنکھیں بند کیے لیٹی جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ ماضی کے بارے میں حال کے بارے میں مستقبل کے بارے میں۔

وہ اپنے خیالات میں گم تھی جب ایک مانوس آواز پر چونک اٹھی۔ وہ میٹھی محبت بھری آواز لاؤنج سے دوبارہ آئی تو وہ بے اختیار اٹھ بیٹھی۔ تقریباً" بھاگتے ہوئے وہ لاؤنج میں آئی تھی۔

بڑی خالہ کا مہربان چہرہ سامنے تھا۔ وہ دوڑ کر ان کی بانہوں میں سما گئی۔

"خالہ آپ۔۔۔ اچانک کیسے؟" شدت جذبات سے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ صرف بڑی خالہ ہی نہیں بلکہ اس کی ماں بھی تھیں۔ دو سال کی عمر میں اپنی ممی کی وفات کے بعد وہ خالہ کی گود میں آگئی تھی اور انہوں نے خالہ کے ساتھ ساتھ ماں ہونے کا بھی پھر پورا حق ادا کیا تھا۔ شانزے کی شادی کے بعد وہ کینیڈا اپنے بڑے بیٹے کے پاس شفٹ ہو گئی تھیں۔ ابتدا میں شانزے کا ان سے مستقل رابطہ رہا تھا پھر وقت کے ساتھ ساتھ ذمہ داریاں اور مصروفیات بڑھیں تو اس رابطے میں کمی آنے لگی پھر بھی دو چار مہینوں بعد خیر خیریت دریافت ہو ہی جاتی تھی۔

آج انہیں اچانک یوں اپنے روبرو پا کر شانزے کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

"کیسی ہو میری جان؟" ایک گرم جوش اور بھرپور معانقے کے بعد انہوں نے شانزے کی پیشانی بڑی محبت کے ساتھ چومی۔

"میں ٹھیک ہوں آپ سنائیں اتنی ویک کیوں ہو گئی ہیں؟" شانزے نے بیک وقت انہیں غور اور تشویش سے دیکھا۔

"ویک؟ ارے بھئی پاکستان آنے کے لیے اسپیشلی ایکسر سائز کر کر کے فائیو کے جی ویٹ لوز کیا ہے۔ میری اسمارٹ نیس کو ویک نیس تو نہ کہو۔" خالہ نے زندہ دلی سے بھرپور انداز میں بھانجی کو دیکھا۔

"اوہ سوری غلطی ہو گئی۔" شانزے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان چھو کر دل سے ہنسی تھی۔

لاؤنج دونوں کی ہنسی اور آوازوں سے گونج رہا تھا۔ جب احمد آیا۔

بڑی خالہ سے وہ بھی بہت اچھے طریقے سے ملا۔ پھر معذرت کر کے اٹھ گیا۔ فریش ہو کر چینج کر کے دوبارہ واپس آیا اور ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔

"میں ذرا بتول کو دیکھ لوں۔" شانزے کچن میں چلی گئی۔

احمد کی طرف ایک نگاہ غلط انداز بھی نہ ڈالی اس نے ایک سرد مہری تھی جو اس کے دل اور پورے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

خالہ نے اس کے اس طرح اٹھ جانے پر ایک گہری سانس لی تھی۔ احمد کا چہرہ بے تاثر تھا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ بے حد نارمل ہو کر بڑی خالہ سے باتیں کر رہا تھا۔

"آج کا ڈنر اسپیشل ہونا چاہیے۔ کسی چیز میں کوئی کمی نہ ہو ٹھیک ہے۔"

وہ یونہی بتول کو ہدایت دے رہی تھی۔ حالانکہ وہ اچھی خاصی ماہر تھی شاید ہی شکایت کا موقع دیا ہو۔

"آپ اطمینان رکھیں میڈم جی! نہ آپ کو کوئی شکایت ہو گی نہ بڑی بیگم صاحبہ کو۔" بتول بڑے انہماک سے ڈنر کی تیاری میں مگن تھی۔

شانزے کچھ دیر بے مقصد وہیں کھڑی رہی پھر باہر آگئی۔

"مما جان! آپ ریسٹ کر لیں کچھ دیر۔" احمد کو نظر انداز کر کے وہ بڑی خالہ سے مخاطب ہوئی۔

"ہاں میں شاور لوں گی مگر ابھی نہیں تھوڑی دیر میں۔"

"اچھا میں ابھی آتی ہوں۔" شانزے کھڑے کھڑے ایسے عجلت میں بولی جیسے سچ مچ کوئی بہت ضروری کام ہو۔

خالہ نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا۔

احمد کو آئے اتنی دیر ہو گئی تھی اور شانزے نے اسے مخاطب کیا تھا نہ ہی احمد نے اس سے کوئی بات کی تھی۔ خالہ جان کے لیے یہ بڑے اچنبھے کی بات تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کو وہ اپنے بیڈ روم کے بجائے خالہ جان کے ساتھ گیسٹ روم میں تھی۔ ان کے استفسار کرنے پر شانزے نے انہیں اپنی پوری رام کہانی سنا ڈالی تھی۔ وہ حیران ہوئیں مگر نہایت سنجیدگی سے سب کچھ سنا۔

"احمد تو بہت سلجھا ہوا اور سمجھ دار لڑکا تھا' اسے کیا ہوگیا۔" خالہ جان دھیرے سے بڑبڑا ئیں۔

"یہ وہ احمد نہیں ہے' جسے میں جانتی تھی' آپ جانتی تھیں۔ یہ تو کوئی اور ہے بالکل اجنبی سا۔ جسے میں بھی بری لگتی ہوں' میرا فیم' میری کامیابی' میرا کیریر اسے سب کچھ برا لگنے لگا ہے۔" شانزے پھٹ پڑی۔

"مگر کیوں ؟" خالہ نے بے یقینی سے آنکھیں پھاڑیں۔

"بس' وہی میل شاونزم' میں کما رہا ہوں' کافی ہے تم گھر بیٹھ کر بچے پالو' گھر کو دیکھو' ہونہہ! میں تو اپنے اچھے بھلے کیریر پہ لات مار کر گھر بیٹھ جاؤں' جاہل عورتوں کی طرح گھرداری کروں' اس کے بچے پالوں اور یہ باہر جو دل چاہے کرتا رہے' دوستیاں کرے' افیر چلائے یا شادی کرے' مرد کو ہر بات کی آزادی ہے۔"

کئی دنوں سے شانزے کے اندر پکتا ہوا لاوا آج پھٹ کر بہہ نکلا تھا۔

"شانی! تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ گھرداری کرنے والی عورتیں جاہل ہوتی ہیں؟" خالہ نے بے حد تاسف سے اسے مخاطب کیا۔

"جن عورتوں میں باہر نکل کر کچھ کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی وہ گھر میں بیٹھ کر گھرداری نہیں کریں گی تو اور کیا کریں گی۔" شانزے نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں انہیں جواب دیا۔

"تمہاری اس بات پر کئی گھنٹے بحث ہو سکتی ہے کہ بچوں کو پالنے پوسنے' اچھی تربیت کرنے اور طریقے سلیقے سے گھر گرہستی کی ذمہ داریاں نبھانے والی عورت معاشرے کی کتنی باصلاحیت اور کار آمد رکن ہوتی ہے۔ ویسے تمہارے منہ سے اس طرح کی بات سن کر خاصی تکلیف ہوئی مجھے۔" خالہ جان نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"جاہل عورت وہ ہوتی ہے جو اپنے ہنستے بستے گھر کی بنیادیں ڈھا کر اس پر اپنے کامیاب کیریر کی بنیاد رکھتی ہے۔" وہ دوبارہ بولیں تو شانزے چند لمحے کچھ بولنے کے قابل ہی نہ رہی۔

"آپ مجھے بلیم کر رہی ہیں مما!"

"نہیں! میں فقط جاہل عورت کی اصطلاح کی وضاحت کر رہی ہوں۔"

"کیا عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی صلاحیت کا' اپنے ہنر کا اظہار کر سکے' اسے کام میں لا سکے۔ عزت' دولت اور شہرت کے سفر میں عورت اگر مرد سے آگے نکل جاتی ہے تو مرد کی انا اسے برداشت نہیں کر پاتی۔ وہ فوراً" اسے گھرداری کے نام پر پنجرے میں کیوں قید کر دینا چاہتا ہے؟" شانزے نے تابڑ توڑ سوال کر ڈالے۔

خالہ جان کی کشادہ پیشانی پر شکنیں ابھریں۔

"میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ اصل مسئلہ ہے کیا! ایک طرف تم یہ بتا رہی ہو کہ وہ کسی ماڈل سے شادی کر چکا ہے یا کرنے والا ہے اور دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ تم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر بیٹھ جاؤ۔"

"وہ کئی سالوں سے یہی چاہ رہا تھا کہ میں شوبز چھوڑ کر گھر بیٹھ جاؤں۔ بچے پالوں' گھر سنبھالوں۔ پہلے دبے لفظوں میں کہتا تھا پھر واضح لفظوں میں کہنے لگا۔ بہت پریشرائز کیا مجھے' مگر میں نہیں مانی' پھر کومل والا معاملہ شروع ہو گیا۔ سننے میں تو یہی آیا ہے کہ دونوں نے شادی کر لی ہے مگر کنفرم نہیں ہوا ابھی۔"

"تم نے احمد سے بات کی اس معاملے پر؟" خالہ نے سوال کیا۔

"مجھے کیا ضرورت ہے اس سے کچھ پوچھنے کی یا بات کرنے کی۔ چور کب اعتراف کرتا ہے کہ اس نے چوری کی ہے؟ ایک نہیں دس شادیاں کر لے میری طرف سے۔ بھاڑ میں جائے مجھے کیا۔" شانزے کا لہجہ پھنکاریں مارنے لگا۔

خالہ نے ایک گہری سانس لی۔

"شانی بیٹا! گھر بنانا آسان نہیں ہوتا۔ بہت وقت اور محنت لگتی ہے مگر بگڑنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔ تم نے اتنی آسانی سے' اتنے آرام سے سرینڈر کر کے خود کو حالات کے دھارے پہ چھوڑ دیا؟"

"میں نے سرینڈر نہیں کیا۔" شانزے نے تیزی سے جواب دیا۔ "اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے آگے روؤں گی یا گڑگڑاؤں گی تو یہ اس کی خوش فہمی ہے۔ میں کسی بھی لحاظ سے نہ اس سے کمزور ہوں نہ کم تر۔ وہ نئے راستے تلاش کر سکتا ہے تو نئی راہیں میرے لیے بھی کھلی ہیں۔" نادانستگی میں وہ فواد حسن کی کہی ہوئی بات اپنی زبان سے دہرا رہی تھی۔

"تم آج بھی اتنی ہی جذباتی اور بے وقوف ہو' جتنی شادی سے پہلے تھیں۔" خالہ جان نے اسے بغور دیکھتے ہوئے بڑے آرام سے تبصرہ کیا۔

"اب سو جاؤ' باقی باتیں کل کریں گے' میں بہت تھکی ہوئی ہوں' نیند آ رہی ہے اب۔"

"اچھا ٹھیک ہے' آپ آرام کریں' گڈ نائٹ۔" شانزے نے جھٹ ان کی بات مانی۔

"گڈ نائٹ!" خالہ جان نے آنکھیں موند لیں۔ وہ تو شاید فوراً" ہی سو گئی تھیں' مگر شانزے کو نیند کی مہربان بانہوں نے بہت دیر میں لیا۔

☼ ☼ ☼

"تمہارا ڈریس بہت اچھا ہے آج' کافی کول لگ رہے ہو۔" شانزے نے کھلے دل سے فواد کی تعریف کی۔ سفید اسٹائلش کرتا شلوار میں وہ واقعی بہت فریش اور ہینڈسم لگ رہا تھا۔

"یہ ڈریس۔۔۔" وہ ہنسا۔ "گفٹ ہے۔"

"ڈریس ڈیزائنر سے فرینڈ شپ کے یہی بینی فٹس ہیں۔ ویسے نیہا کا دوائی بڑی مہربان ہیں آج کل تم پر۔" شانزے نے مسکراتے ہوئے اس پر فقرہ کسا۔

"وہ مہربان ہو تو ہو۔ ہم تو کسی اور کی نظر عنایت کے منتظر ہیں۔" فواد کا لہجہ گمبھیر ہو گیا۔ اس کی والہانہ اور پرشوق نظریں شانزے کے خوب صورت چہرے پر جمی تھیں۔

شانزے اس کی نظروں اور باتوں کے مفہوم خوب سمجھتی تھی مگر فی الحال اس کی واضح حوصلہ افزائی سے گریز کر رہی تھی۔

"تانیہ بلال کی پارٹی میں آؤ گی کل؟" فواد نے خود ہی موضوع بدلا۔

"مشکل ہے۔"

"کیوں؟"

"بتایا تو تھا تمہیں' میری امی آئی ہوئی ہیں کینیڈا سے۔ آج کل میرا جتنا بھی فارغ وقت ہے ان کے لیے ہے۔"

"کب واپس جائیں گی یہ محترم خاتون؟" فواد نے شرارت سے اسے دیکھا۔

"فواد۔۔۔!" شانزے نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

"مذاق کر رہا ہوں یار! تم سیریس مت ہو۔"

"اچھا ہوا! تم نے بتا دیا کہ مذاق کر رہے ہو۔ ورنہ میں تو سیریس ہونے والی تھی۔" شانزے نے ہنستے ہوئے ذو معنی بات کی۔

"میری ہر بات مذاق نہیں ہوتی۔ کچھ معاملات میں میں واقعی بالکل سیریس ہوں۔ بلیو می۔" فواد نے فوراً" اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"ایک بار بھروسا ٹوٹ جائے تو کسی پر بھی یقین کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔" شانزے سنجیدگی سے کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"چلتی ہوں۔" اس نے اپنا موبائل بیگ میں ڈالا۔

"ایک شخص پر سے بھروسا اٹھ جائے تو کیا ساری دنیا بے اعتبار ہو جاتی ہے؟" فواد نے بھی سنجیدگی سے سوال کیا۔

"کبھی کوئی ایک شخص ہی ہماری پوری دنیا اور کل کائنات ہوتا ہے۔ اس سے اعتبار ختم ہو جائے تو سمجھو ساری دنیا سے بھروسا اٹھ جاتا ہے۔" شانزے نے بمشکل مسکراتے ہوئے اسے بائے کہا اور باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

رات ۔۔ بہت سنجیدگی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے خالہ نے جو کچھ کہا اُسے سن کر شانزے اچھل پڑی۔

"آپ نے احمد سے بات کی ہماری ریلیشن شپ کے بارے میں؟ کیوں آپ سے کس نے کہا تھا اس شخص کے آگے گڑگڑانے کو؟" شانزے بیک وقت صدمے اور حیرانی کی کیفیت سے دوچار ان سے مخاطب تھی۔

"پہلی بات تو یہ کہ میں نے احمد سے صرف بات کی تھی' نہ اس کے آگے گڑگڑائی ہوں نہ کسی قسم کی کوئی ریکویسٹ کی ہے اور جہاں تک تمہارے "کیوں" کا سوال ہے تو یاد رکھو میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہارا گھر اور زندگی آباد دیکھنا چاہتی ہوں میں۔"

"میں نے بھی تو یہی کوشش کی تھی مگر میں اکیلی کب تک اس گاڑی کو گھسیٹتی رہوں۔ تھک گئی ہوں بےزار ہو گئی ہوں میں۔ جب اسی نے ہاتھ چھوڑ کر راستہ بدل لیا تو میں کیوں اس کے پیچھے پیچھے اس کی ہمراہی کی بھیک مانگوں۔" شانزے چیخ چیخ گئی۔

"احمد کا کہنا ہے کہ تمہارے رویّے نے اسے تم سے دور کیا ہے' بقول اس کے۔ بچے بہت نگلیکٹ ہو رہے ہیں' وہ مرد ہے' اس کی ذمہ داریاں اور فرائض کا دائرہ گھر سے باہر ہے۔ تمہاری ذمہ داریاں اور فرائض کا دائرہ گھر کے اندر ہے' انہیں نبھاتے ہوئے اپنے کیریر کو بناؤ' یا صلاحیتوں کا اظہار کرو' مگر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔۔۔"

"آپ بھی اسی کی زبان بول رہی ہیں خالہ۔" شانزے ان کی بات کاٹ کر تلخی سے گویا ہوئی۔

"وہ غلط نہیں ہے بیٹا! اس وقت تمہارے بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔"

"بچوں کی اور گھر کی ساری ذمہ داریاں اٹھا تو رہی ہوں۔ سارے فرائض نبھا رہی ہوں اب اور کیا کروں؛ گھر پہ بیٹھ کر روٹی ہنڈیا کروں' جھاڑو پوچا لگاؤں یا کپڑے دھوؤں۔ بتایئے میں کیا کروں' گھر ہم دونوں کا ہے' بچے ہم دونوں کے ہیں' لیکن ذمہ داریاں اور فرائض صرف میرے حصے میں آئے ہیں۔ یہ کون سا اصول ہے؟ اور آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ دوسری شادی کر کے وہ خود اپنے بیوی بچوں کے کون سے حقوق ادا کر رہا ہے۔" شانزے بولنا شروع ہوئی تو بولتی ہی چلی گئی۔

"مجھے یقین نہیں ہے کہ احمد ایسا کر سکتا ہے۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائیں۔

"یہی یقین' بھروسا اور اعتبار ہی تو ہمیں مار ڈالتا ہے۔" شانزے کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

"چپ رہنے سے غلط فہمیاں اور دوریاں بڑھتی ہیں۔ وہ تم سے خفا ہے تم اس سے خفا ہو۔ بات کرو تو مسائل کا کوئی حل نکلے۔" خالہ نے دھیمے دھیمے اسے سمجھاتے ہوئے تجویز دی۔

"ہم اتنی دور جا چکے ہیں ایک دوسرے سے کہ نہ میں اسے نظر آتی ہوں' نہ وہ مجھے نظر آتا ہے۔"

"یہ تمہارا وہم ہے۔ وہ اب بھی تمہارے قریب ہے۔ اسے دیکھو تو محسوس تو کرو۔"

"یہ وہم مجھے پہلے تھا کہ وہ میرے قریب ہے۔ اب تو ساری خام خیالی اور غلط فہمی دور ہو گئی ہے۔" شانزے کے چہرے پہ درد و کرب کے سائے پھیل گئے۔

"تم کیا فیصلہ کرنے والی ہو؟" خالہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا' جیسے اس کا فیصلہ اس کے چہرے اور خدوخال میں کہیں چھپا ہو۔

"فیصلہ تو تقدیر کرے گی' میرے اختیار میں کیا ہے۔" شانزے نے گول مول جواب دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پہ الجھن اور کشمکش کے آثار اس کی اندرونی حالت کی غمازی کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"یہ آنکھ مچولی کب تک رہے گی احمد! تم کوئی فیصلہ کیوں نہیں لیتے۔" اپنی گداز گوری کلائی میں کنگن گھماتے ہوئے وہ بہت سنجیدگی سے بول رہی تھی۔

"فیصلہ؟" احمد نے کسی حد تک بےبسی سے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔ وہ نہ جانے کیوں اتنا الجھا ہوا اور متذبذب تھا۔ اپنی مرضی سے دریا میں اترا تھا' اب دزدیدہ نظروں سے اس ساحل کو دیکھ رہا تھا جہاں سے اس دریا میں چھلانگ لگائی تھی۔

وہ تو ہمیشہ ہر معاملے میں بہت کلیئر رہا تھا' زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک مبہم اور غیر واضح رستے کا انتخاب کر بیٹھا تھا' جس پر وہ چل بھی رہا تھا۔ اتنا بےبس اور بےاختیار تو وہ کبھی نہیں ہوا تھا۔

"اب کیا سوچنے لگے؟" کومل نے جیسے اکتا کر سوال کیا۔

"تم کیا چاہتی ہو؟" احمد نے گیند اس کے کورٹ میں ڈالی۔

"وہی' جو تم چاہتے ہو۔" کومل کا جواب فوری اور برجستہ تھا۔

"میں کیا چاہتا ہوں؟" احمد نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا۔

شانزے اور اس کی محبت کی دوری نے اسے کومل سے قریب کر دیا تھا۔ مگر اس دوستی اور قربت میں محبت کہیں نہیں تھی؟ اپنے سکون اور خوشی کے لیے وہ کوئی انتہائی قدم اٹھا بھی لیتا مگر بچوں کا خیال آتے ہی اس کے قدم وہیں رک جاتے۔

"اس سارے معاملے میں بچوں کا کیا قصور ہے؟" ہر خیال کی تان یہیں آ کر ٹوٹ جاتی اور وہ بےبسی سے خود کو دیکھتا رہ جاتا۔

"لوگوں کی گوسپ سے تنگ آ گئی ہوں میں۔ نیوز میں آئے دن ہمارے بارے میں کچھ نہ کچھ آتا رہتا ہے۔ میں تنگ آ گئی ہوں اس سب سے۔" وہ بھی جھنجلا گئی تھی' حالات کی تلخی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"شانزے کو کب ڈائیورس کر رہے ہو؟" کومل نے اس کی سماعتوں پہ ایک بم پھوڑا تھا۔

"میں اپنی محبت کسی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کر سکتی۔ وہ تمہاری زندگی سے نکلے گی تب ہی میں تمہاری لائف میں آؤں گی۔" کومل اس کے احساسات سے بےخبر اس کی سنے بغیر اپنی اپنی کہی جا رہی تھی۔

"اور بچے؟" احمد کی کچھ سوچتی ہوئی نظریں کومل پر مرکوز ہو گئیں۔

"واٹ ڈو یو مین! کیا بچے تم رکھو گے اپنے پاس؟ کیا وہ ایگری ہے اس بات کے لیے؟" کومل کو اس کے سوال سے خاصا دھچکا لگا تھا۔

"ہو سکتا ہے میں ہی رکھ لوں اپنے بچوں کو' پھر؟"

"میرا نہیں خیال کہ تمہاری مسز اتنی آسانی سے بچوں کو تمہارے پاس رہنے دے۔ ایک ماں کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے یہ سب۔" کومل نے نفی میں سر ہلایا۔

"میری مسز کے لیے یہ سب بہت آسان ہے۔" احمد پلک جھپکے بنا اس کی طرف دیکھ کر بات کر رہا تھا۔

"میں تو فی الحال کئی سال تک اپنے بچے بھی پالنے کے موڈ میں نہیں ہوں تو۔۔۔" کومل نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی مگر اس کا مفہوم عیاں تھا۔

"ڈونٹ مائنڈ احمد! بچوں کو جو پیار ان کی سگی ماں دے سکتی ہے۔ جیسے وہ ان کی کیئر کر سکتی ہے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ مجھ سے اس قسم کی کوئی ایکسپکٹیشن نہیں رکھنا۔" کومل نے صاف گوئی سے اسے جتایا۔

"ہوں!" احمد نے لب بھینچے۔

کومل کا موڈ کچھ خراب سا ہو گیا تھا۔ وہ شیشے سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی اور احمد اس کے چہرے کو۔

☼ ☼ ☼

آج پارلر میں کافی دیر لگ گئی۔ بالوں کو نئے انداز میں ترشوایا تھا پھر اپنی معمول کی بیوٹی ٹریٹمنٹ' گھر پہنچی تو بچے اور خالہ کھانے کی میز پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"آئم سوری۔ ویری سوری! میری وجہ سے آپ کو ویٹ کرنا پڑا۔ حالانکہ اتنی جلدی جلدی مچائی میں نے' پھر بھی دیر ہو گئی۔" کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے اس نے معذرت کی۔

"ہم بس ابھی ابھی ہی بیٹھے تھے۔" خالہ جان نے اپنی پلیٹ میں سالن نکالا۔ شانزے نے بچوں سے پوچھ کر انہیں چاول دیے اور خود اپنے لیے سلاد نکالا۔

"کھانا کھاؤ ٹھیک سے۔ یہ کیا کھا رہی ہو؟" خالہ نے اسے ٹوکا۔

"خالہ امی! چار پونڈ وزن بڑھ گیا ہے میرا۔ کھانے پینے میں پرہیز نہ کیا تو یہ چار کا فیگر بڑھ کر آٹھ' بارہ اور سولہ بھی ہو سکتا ہے۔" شانزے نے کھیرے کا ٹکڑا کانٹے میں پھنسایا اور منہ تک لے گئی۔

کھانے کے بعد خالہ اپنا چائے کا کپ اور شانزے گرین ٹی کا مگ لے کر بیٹھ گئیں۔

"ٹی وی دیکھیں گی؟" صوفے پہ آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے شانزے ریموٹ ہاتھ میں لیا۔

"میں یہاں ٹی وی دیکھنے نہیں آئی۔ ہٹاؤ اسے!" خالہ نے کچھ کوفت اور کچھ بے زاری سے کہا۔ "تم لوگوں کو دیکھنے' ملنے اور باتیں کرنے آئی ہوں۔" انہوں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اپنی بات میں مزید اضافہ کیا۔

"کیا ہوا؟" شانزے کو لگا کوئی خاص بات ہے۔

"شانو بیٹا! میری بات سمجھنے کی کوشش کرنا۔" خالہ نے ایک توقف کے بعد آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

"احمد کو تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی نے تم سے دور کیا ہے' تمہارے اس زعم نے اسے راہ بھٹکنے پر مجبور کیا کہ تمہارے جیسی کامیاب کیریر وومین کو شوہر کی کوئی خاص پروا اور ضرورت نہیں ہوتی۔" خالہ امی نے اسے آئینہ دکھایا۔

"اچھا!" وہ تلخی سے مسکرائی۔

"میں نے مان لیا کہ مجھ میں بہت ساری برائیاں ہیں' خامیاں ہیں مگر کیا ان سب کا حل یہی ہے کہ وہ کسی اور کی بانہوں میں جھولنے لگے' یا پھر مجھے نیچا دکھانا' سبق سکھانا مقصود ہے۔ عورت اپنے شوہر کے ہاتھوں شاید ہر قسم کی ذلت برداشت کرلے مگر یہ ذلت کبھی برداشت نہیں کر سکتی جسے بے وفائی کہتے ہیں۔" شانزے کے خوب صورت چہرے پر غصہ بھی تھا' برہمی بھی اور بے بسی بھی۔

"احمد راستہ بھٹکا ضرور ہے مگر راستہ بدلا نہیں ہے اس نے۔ نہ وہ عیاش ہے نہ بے وفا اور۔۔۔"

"لوگ جو کچھ بتاتے ہیں اس کے متعلق وہ جھوٹ ہے؟ میگزینز میں جو کچھ چھپتا ہے اس کے اور کومل کے متعلق وہ سب بکواس ہے؟"

"لوگ رائی کا پہاڑ بھی تو بناتے ہیں۔" خالہ مسلسل احمد کا دفاع کر رہی تھیں۔

"رائی کا وجود ہوتا ہے تو پہاڑ بنتا ہے نا۔" شانزے اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔

"رائی اور پہاڑ کے فرق کو سمجھو شانزے! انہیں ایک ترازو میں تولنا کہاں کا انصاف ہے؟"

"آپ کیوں اتنی وکالت کر رہی ہیں اس شخص کی؟" شانزے چڑ گئی۔

"آپ بالکل بھی اندازہ نہیں کر سکتیں کہ اس کی اور کومل کی خبروں کو لے کر مجھے کس کس طرح کی نظروں اور باتوں کو فیس کرنا پڑا ہے۔ لوگ بظاہر ہمدردیاں جتاتے ہیں۔ پیٹھ پیچھے مذاق اڑاتے ہیں۔ میں تو خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ گئی ہوں۔"

"میری احمد کے ساتھ تفصیلی بات ہوئی تھی' نہ تو اس نے کومل کے ساتھ شادی کی ہے اور نہ ہی فیوچر میں ایسا کوئی ارادہ ہے۔"

"آپ کرلیں اس بات پر یقین' مگر میں نہیں کر سکتی۔" شانزے نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے جس نے ان دونوں کے نکاح کے بارے میں بتایا ہے وہ میرا اچھا ویل وشر ہے۔ اتنا بڑا جھوٹ مجھ سے نہیں بول سکتا۔"

"کس نے گمراہ کیا ہے تمہیں احمد کے بارے میں' اتنا زہر بھر دیا دل و دماغ میں کہ صحیح بات سننے کی بھی روادار نہیں رہیں۔" خالہ امی بھی جھنجلا اٹھیں۔

"میرے دل و دماغ میں یہ زہر خود احمد نے ہی بھرا ہے اپنی حرکتوں سے' کسی اور کو کیا ضرورت ہے یہ حرکت کرنے کی۔" شانزے نے دوبدو جواب دیا۔

"کیا چاہ رہی ہو تم۔ کھل کر تو بتاؤ۔"

"سیپریشن۔" شانزے کے دوٹوک جواب نے ان پر جیسے کوئی بم گرایا تھا۔ وہ خاموش ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

"پھر کیا سوچا تم نے؟" فواد نے آج واضح الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ پھر یہ سوال۔

"میں نے احمد سے کہہ دیا ہے کہ وہ مجھے ڈائیورس کر دے۔" ایک لحظے کو شانزے کی آواز کپکپا گئی تھی۔ حالانکہ احمد کے سامنے تو اس نے بڑی آسانی سے کہہ دیا تھا مگر اس وقت۔۔۔

"کیا کہا اس نے؟" فواد کے لہجے میں چھپی بے تابی پر شانزے نے غور نہیں کیا۔ ابھی ابھی اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔

"کچھ بھی نہیں۔"

"کیا مطلب کچھ بھی نہیں۔" فواد تقریباً چلا اٹھا۔

"وہ خود تو دوسری بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہے۔ تمہیں کیوں بیچ میں لٹکا کے رکھا ہے؟ فیصلہ کیوں نہیں کرتا۔"

"فیصلہ تو اسے کرنا ہی پڑے گا۔" شانزے بجھی بجھی سی تھی۔

"ڈونٹ وری شانزے! میں ہوں نا تمہارے ساتھ' خود کو اکیلا مت سمجھو۔"

"میں اکیلی نہیں ہوں فواد! میرے دو بچے بھی ہیں۔" شانزے نے اسے بتایا نہیں جتایا تھا۔

"اس بات کا کیا مطلب ہے؟" فواد نے نسبتاً محتاط لہجہ اختیار کیا۔

"مطلب یہ کہ میرے ساتھ میرے بچوں کو بھی قبول کرو گے؟" شانزے نے واضح الفاظ میں اس سے کہا۔

"بچے صرف تمہاری ذمہ داری تو نہیں ہیں' وہ بھی تو کچھ لگتا ہے ان کا۔"

"احمد نے میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ان کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی تو اب الگ ہو کر یہ ذمہ داری کیسے اٹھائے گا۔"

"ٹیک اٹ ایزی یار! ہاسٹل اور بورڈنگ کس مرض کی دوا ہیں۔" فواد نے لاپروائی سے بولتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"ہاسٹل؟" شانزے نے حیرت میں لپٹی بے یقینی کے ساتھ اسے دیکھا۔

"میں اپنے بچوں کو اپنے ساتھ' اپنے پاس رکھوں گی۔ ہاسٹل میں نہیں۔" شانزے کا لہجہ قطعی اور الفاظ دوٹوک تھے۔

"اوکے' اوکے۔" فواد نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ "جو تمہاری مرضی اور خوشی' وہی کرنا۔ میں تمہاری مرضی پہ راضی اور تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔" فواد نے کہا۔

"پتا نہیں کیا ہو رہا ہے' میں کیا کر رہی ہوں۔" شانزے نے دھیرے سے بڑبڑاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"تم جو کچھ کر رہی ہو' بالکل ٹھیک کر رہی ہو۔" فواد کے حساس کانوں تک اس کی بڑبڑاہٹ پہنچ گئی۔

"تم اسٹرونگ ہو تو اسے پروو کرو' احمد کو دکھاؤ کہ تم اس کے سہارے کے بغیر بھی ایک کامیاب اور پرفیکٹ لائف گزار سکتی ہو۔ اب وہ دور نہیں رہا کہ عورت ایکسپلائٹ ہوتی رہے' روتی رہے' سسکتی رہے' پھر بھی مرد کے آگے پیچھے گھومتی رہے کہ اس کے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں۔"

فواد کی جوشیلی تقریر بھی اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں رونق کی کوئی جوت جگانے میں ناکام ہی رہی' وہ خالی خالی نظروں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

"کم آن یار! چیئر اپ۔"

شانزے نے زبردستی مسکرانے کے انداز میں ہونٹ پھیلا دیے۔

"یوں نہیں۔ جیسے تم مسکراتی ہو دل سے' ویسے ہی مسکراؤ۔" فواد نے آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

"گڈ گرل۔" وہ مسکرا دیا۔

"میں چلتی ہوں۔" وہ اک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی

تھی۔

☆ ☆ ☆

انگلیوں میں سلگتا سگریٹ ختم ہونے کو تھا' اس نے بے دردی سے ایش ٹرے میں مسلا' جو پہلے ہی بھر چکی تھی۔

مسلسل بیداری اور سگریٹ نوشی سے آنکھیں سرخ اور بوجھل ہو رہی تھیں" تو یہ انجام ہونا تھا۔ ایک محبت کا اور محبت بھری زندگی کا۔" احمد نے شدت کرب سے آنکھیں بند کیں۔

جب سے شانزے نے واشگاف لفظوں میں اس سے علیحدگی کی بات کی تھی' وہ ایسی تکلیف محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی دو دھاری تلوار اسے کاٹتے ہوئے گزر گئی ہو۔ اتنا خالی' اتنا ادھورا' نامکمل اپنا آپ پہلے کبھی نہ لگا تھا۔

دل کو سینے سے نوچنے کی کوشش کر رہا تھا کوئی۔

سارے جھگڑے' اختلافات اپنی جگہ' مگر اب جب کہ یہ سب معاملات اپنے منطقی انجام کو پہنچنے والے تھے تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بدن سے روح نکلنے کو ہے۔

شانزے کے ساتھ اس کے تعلق' محبت اور رشتے کی جڑیں بہت اندر تک۔ گہرائی میں کہیں پیوست تھیں۔ اسے اک دم جڑ سے اکھاڑنا انتہائی مشکل اور تکلیف دہ کام تھا۔ جسم و جاں کے اندر دور دور تک پھیلی ہوئی جڑیں' نکالنا بھلا کس کے بس میں ہوتا ہے؟

☆ ☆ ☆

آج بہت عرصے بعد وہ دونوں ڈنر کی میز پر اکٹھے ہوئے تھے۔

سب ہی اپنے اپنے خیالات میں' فکرات میں گم تھے۔ خالہ امی کبھی کبھار کوئی بات احمد اور شانزے سے کرلیتیں' جس کا مختصر سا جواب مل رہا تھا۔ اچانک شاہ میر کو ہی کچھ یاد آیا۔

"مما! ہم اس بار سمر ویکیشن میں کہاں جائیں گے؟"

"پلے لینڈ اور..." چھوٹی بہن کی بات شاہ میر نے جلدی سے کاٹ دی۔

"میں یہاں کی بات نہیں کر رہا فولش گرل! ہم آؤٹ آف کنٹری کہیں جائیں گے۔ ہے نا پاپا!" اس نے باری باری کنفرمیشن کے لیے ـــــ ماں' باپ کا منہ دیکھا۔

"ضرور جائیں گے بیٹا!" احمد نے اسے تسلی دی۔

"کہاں؟" دونوں بچوں کے چہروں پہ بے حد اشتیاق تھا۔

"جہاں آپ کہیں۔"

"پرامس۔" شاہ میر نے جگمگاتی آنکھوں سے احمد کو دیکھا۔

"پکا پرامس۔" احمد مسکرایا۔

"ٹھیک ہے' پھر ہم لندن چلیں گے۔ میں' علیزے' مما اور پاپا' ہم سب ڈن؟"

"اوکے۔ ڈن۔"

"ہم ڈزنی لینڈ بھی جائیں گے۔" علیزے نے بھولپن سے اپنی فرمائش بیان کی۔

"ڈزنی لینڈ امریکا میں ہے اسٹوپڈ! لندن میں نہیں۔" شاہ میر نے فوراً" اپنی معلومات کا رعب جھاڑا۔

"ڈونٹ وری! ہم اپنی بیٹی کو ڈزنی لینڈ بھی دکھائیں گے۔ نیکسٹ ایر چلیں گے ٹھیک ہے۔" احمد نے بیٹی کو تسلی دی۔

☆ ☆ ☆

کیسی خزاں خزاں سی سہ پہر بے رنگ' اجاڑ' ویران سی' سرمئی شام اپنے پر پھیلانے کو تھی۔

کچھ ضروری شاپنگ کرکے وہ مال سے نکل رہی تھی۔ تب ہی اس کا موبائل بجنے لگا۔ شانزے نے چیک کیا۔

"ہیلو!"

"ہیلو' کیسی ہو؟ کہاں ہو؟" اس نے ایک ساتھ دو سوال کر ڈالے۔

"ٹھیک ہوں' تم سناؤ۔" وہ مال کی سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔

"اب فون پر کیا سناؤں' تم آؤ تو کچھ کہوں۔"

شانزے خاموش ہو گئی۔

"آج کا کیا پروگرام ہے تمہارا۔ آجاؤ ڈنر ساتھ کرتے ہیں۔ کچھ یاد ہے آخری بار ایک ساتھ ڈنر کب کیا تھا؟" فواد کا لہجہ جتانے والا تھا۔

"آج تو میں بزی ہوں! خالہ امی نیکسٹ ویک چلی جائیں گی' میں زیادہ تر ٹائم ان کے ساتھ ہی گزارتی ہوں۔"

"چلو ڈنر نہ سہی' شام کی چائے ہی ساتھ پی لو۔ کچھ تو ٹائم نکال لو مجھ غریب کے لیے بھی۔"

"وعدہ نہیں کرتی' کوشش کروں گی آنے کی۔" شانزے نے آہستہ سے کہا۔

"تو آرہی ہو ابھی؟"

"ابھی نہیں' کل' پرسوں یا اس کے بعد۔"

"بہت انتظار کرواتی ہو تم۔ خیر کرتے ہیں انتظار تمہاری کل پرسوں کا۔ اوکے اللہ حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

موبائل آف کرکے وہ اپنی گاڑی میں بیٹھی۔ اسٹارٹ کرنے سے قبل چند لمحے اس نے کچھ سوچا پھر مسکرا کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگی۔

اس کا ارادہ تھا فواد حسن کو سرپرائز دینے کا۔

گاڑی کا رخ اس نے فواد کے آفس کی طرف موڑ دیا۔

شام کا وقت تھا۔ سڑکیں ٹریفک سے بھری ہوئی تھیں مگر خوش قسمتی سے کہیں زیادہ ٹریفک جام نہیں ملا۔ صحیح ٹائم پر وہ پہنچ گئی اور پھر شاید ساری عمر اب اسے اللہ کا شکر ادا کرنا تھا کہ وہ صحیح وقت پر وہاں پہنچی تھی۔

واپسی کا سفر کچھ طویل اور کچھ مشکل تھا مگر واپس تو اسے آنا ہی تھا۔ وہ جسے ٹھنڈے' میٹھے' خوشگوار پانی کا چشمہ سمجھی تھی وہ گندا' بدبودار سڑے ہوئے پانی کا جوہڑ نکلا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس گندے جوہڑ کو دیکھ رہی تھی جس کی بدبو اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ اس متعفن جوہڑ سے فوراً" دور چلی جائے۔ وہ واپس ہو رہی تھی۔ دور جا رہی تھی' مگر خنجر کی سی نوک تھی کوئی جو دل میں اترتی جا رہی تھی' تکلیف بے پناہ تھی۔

"مرد کی فطرت میں ہی دھوکے بازی ہے۔ عیاری ہے' چال بازی ہے۔ بے ایمانی ہے۔" وہ شدت کرب سے لب بھینچے مرد کو مورد الزام ٹھہرا رہی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ خود کتنی غلط تھی۔ اپنی خامیوں اور برائیوں پر کبھی نگاہ ہی نہ کی' انسان تھی نا' بیشتر انسانوں کی طرح بے صبرا پن' ناشکرا پن اس میں بھی تھا' وہ بھی بزعم خود پارسا تھی اور اپنی زندگی میں آنے والے دو مردوں احمد مغل اور فواد حسن کو کٹہرے میں کھڑا کرکے فرد جرم عائد کر رہی تھی۔ خود کو مظلوم سمجھ کر آنسو بہا رہی تھی۔

اتنی باصلاحیت اور اتنی مشہور' کامیاب' شانزے احمد کے ساتھ کیا کچھ غلط ہوا اور کیوں ہوا؟

☆ ☆ ☆

شانزے گھر پہنچی تو سارا وجود یوں شل تھا۔ جیسے صدیوں کا سفر طے کرکے آئی ہو اور شاید یہ صدیوں کا ہی سفر تھا۔ کتنا کچھ بدل گیا تھا اس دوران۔ وہ خود' اس کا دل اور زندگی... اور آج کا یہ دن... اس سے زیادہ برا دن' اس سے زیادہ تکلیف دہ دن شاید ہی اس کی زندگی میں آیا ہو۔

"کیا ہوا؟" خالہ امی نے تشویش سے اس کا چہرہ دیکھا جس پر دکھ کی تحریر تھی۔ صدمہ بھی رقم تھا اور ساتھ ساتھ شکست کا احساس بھی۔

"کچھ نہیں بس سر میں درد ہے۔" وہ ان سے نگاہیں چراتی سر درد کا بہانہ کرکے کمرے میں بند ہو گئی۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھایا مگر صبح تو اسے اٹھنا تھا۔ اپنا مارننگ شو کرنا تھا۔

"زندگی میں کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے جب انسان خواہ مرد ہو یا عورت' مشین بن جاتا ہے۔ ہر احساس سے عاری صرف اپنا کام سرانجام دیتا ہے' جو اس کے

ذے ہو۔ آج شانزے احمد مشین بن گئی تھی۔ صبح معمول کے مطابق وہ بیدار ہوئی۔ تیار ہو کر کیمرے کے سامنے آئی اور اپنا پروگرام شروع کر دیا۔ کسی چابی والی گڑیا کی مانند۔ چابی بھر دو تو ہنستی مسکراتی رقص کرتی ہے' دل لبھاتی ہے۔

شو ختم ہوا تو کچھ دیر بعد فواد حسن اس کے پاس آیا۔ معمول کے مطابق مسکراتا ہوا۔ اس کے چہرے پہ اتنا خلوص بکھرا ہوا تھا کہ اس کے اندر فواد حسن کا اصلی چہرہ کھوجنا انتہائی مشکل ہو رہا تھا۔

شانزے یک ٹک اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ وہ واقعی بہت اچھا اداکار تھا۔

"کل سے تمہارا موبائل ٹرائی کر رہا ہوں' مسلسل آف جا رہا ہے۔ خیریت تو ہے؟"

"خیریت نہیں تھی اسی لیے موبائل آف تھا میرا۔" شانزے نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں' کیا ہوا؟" وہ چونکا۔

"میں کل تمہارے آفس گئی تھی شام میں۔"

"میرے آفس۔۔۔ شام میں؟" فواد کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"ہاں شام میں۔ جس وقت تم کومل سے باتیں کر رہے تھے۔" شانزے کے اطمینان میں ہنوز کوئی فرق نہیں آیا تھا مگر اس کا یہ اطمینان مصنوعی تھا۔ اس کے اندر تو جیسے بھانبھڑ جل رہے تھے۔

"کک۔۔۔ کومل سے۔" انتہائی باصلاحیت اور پُراعتماد' فواد حسن کی نہ صرف زبان لڑکھڑائی بلکہ وہ خود بھی لڑکھڑا گیا۔ اس کی حالت ایسے کوہ پیما جیسی تھی جو چوٹی سے محض چند قدم کے فاصلے پر ہو اور اچانک پاؤں پھسل گیا ہو۔

وہ بے بسی سے خود کو گرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ممکنہ تسخیر شدہ چوٹی اس سے دور' بہت دور ہو رہی تھی۔

"میری بات سنو شانزے! لیٹ می ایکسپلین۔" فواد نے خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیری۔

شانزے نے بیگ اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔

فواد حسن ناکامی اور نامرادی کی اتھاہ گہرائیوں میں نیم جان پڑا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

کتنی دیر ہو گئی تھی اسے دراز میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے۔ چیزیں نکالتی اور واپس رکھ دیتی۔ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی۔

"کیا ڈھونڈ رہی ہو؟ اتنی دیر ہو گئی ہے مجھے دیکھتے ہوئے۔" بالآخر خالہ امی نے مداخلت کر ہی ڈالی۔

"کچھ بھی نہیں وہ۔۔۔ پتا نہیں کیا ڈھونڈ رہی تھی بھول گئی۔" شانزے غائب دماغی سے کہتی بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

"شانزے مجھے بتا دو کہ کیا بات ہے۔ پچھلے تین دن سے تمہیں دیکھ رہی ہوں آنسوؤں کو اپنے اندر مت روکو' رونا آ رہا ہے تو رو لو جی بھر کے۔"

خالہ امی کے کہنے کی دیر تھی کہ شانزے جیسے بکھر گئی۔ ان کے کندھے پہ سر رکھ کر وہ بلک بلک کر رو دی۔

بہت دیر رونے کے بعد اس نے اپنی آنکھیں اور چہرہ صاف کر کے خالہ امی کی طرف دیکھا۔

احمد کی بے رخی' بے اعتنائی' اس کے ساتھ لڑائی جھگڑے' احمد اور کومل کا افیئر' تعلقات اور شادی کی خبریں' ان سب نے اسے فواد حسن کی طرف مائل ہونے پر مجبور کر دیا' جو کب سے دوستی سے آگے بڑھ کر اس کی محبت کا دم بھرنے لگا تھا۔ اور آخر میں اس نے تین دن پہلے والی اس شام کے بارے میں بھی بتایا' جب فواد حسن کا مکروہ چہرہ اس کے سامنے آیا۔

"مجھے معلوم ہے' غلطی میری تھی' میں۔۔۔" شانزے نے الف سے لے کر ے تک سب کچھ بتانے کے بعد مزید کچھ کہنا چاہا تھا کہ خالہ امی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"غلطی؟ یہ صرف غلطی نہیں تھی شانزے! گناہ تھا۔ شوہر کے ہوتے ہوئے تم کسی اور کی طرف مائل کیسے ہوئیں۔ خیانت محض عملی نہیں ہوتی' ذہنی بھی ہوتی ہے۔ اپنے شوہر کے علاوہ تم نے کسی اور کے بارے میں سوچا بھی کیسے؟"

"آپ جانتی ہیں میں نے احمد سے کتنی محبت کی ہے۔ کتنا چاہا ہے اسے' اسے چاہنا میری عادت بن گئی تھی' ایسی عادت جسے انسان کبھی چھوڑ نہیں سکتا۔ اس نے کسی اور کی طرف نگاہ کی تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ مجھے فواد سے کوئی قلبی لگاؤ نہیں تھا خالہ۔ محض دوستی ہی تھی مگر احمد کو نیچا دکھانے کے لیے' اس سے انتقام لینے کے لیے میں فواد کی طرف بڑھی۔" شانزے شکست خوردہ لہجے میں بول رہی تھی اور ساتھ ساتھ رو بھی رہی تھی۔

"مجھے معلوم ہے میرے اندر برداشت کی کمی ہے۔ میری طبیعت میں انتقام کا جذبہ ہے۔ اسی لیے اسی لیے تو آج میں اپنی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ گئی ہوں۔"

شانزے سچائی اور دیانت داری سے اپنا محاسبہ کر کے سارے اعترافات کرتی جا رہی تھی۔

تین روز پہلے کی وہ شام کیسے بھول سکتی تھی جب وہ ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گری تھی۔

وہ فواد حسن کو سرپرائز دینے اس کے آفس پہنچی تھی اور خود سرپرائز ہو گئی تھی۔

"تم سے اتنا ذرا سا کام نہیں ہو سکا۔ اتنا عرصہ لگا دیا۔ کیسی حسینہ ہو تم؟ تمہارے حسن اور اداؤں کا جادو چلا نہیں احمد پر؟"

"فضول بکواس مت کرو۔" کومل شاید بھڑک کر بولی تھی۔

"پہلے تم اپنی بات کرو۔ تم نے پرامس کیا تھا کہ جہانزیب کاروانی کے ساتھ میرا کانٹریکٹ سائن کرواؤ گے۔ تم پتا نہیں کیا کر رہے ہو اور وہ نیہا واڈیا کو سائن کر رہا ہے۔"

کومل نے ایک نئی ابھرتی ہوئی ماڈل کا نام لیا۔ "اور جہاں تک احمد کو رام کرنے کی بات ہے تو میں کسی انسان کو اپنے بس میں کر سکتی ہوں پتھر کو نہیں' اس چٹان کو اپنے مرکز سے ہٹانا میرے بس کی بات نہیں۔ وہ کیسا شخص ہے۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں' وہ میرے قریب آتے آتے مجھ سے یکایک دور ہو جاتا ہے۔ کبھی بہت اپنا اپنا سا لگتا ہے اور کبھی بالکل اجنبی بن جاتا ہے۔" کومل نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"میں نے بہت کوشش کی مگر اس کی روٹس اپنی فیملی میں ہی گڑی ہوئی ہیں۔ وہ وقتی طور پر اپنی فیملی سے دور ہو سکتا ہے مگر ہمیشہ کے لیے نہیں؟"

"امیزنگ' اٹس ویری امیزنگ۔۔۔ یو سی! ایک عورت جو وفا' ایثار اور قربانی کا پیکر سمجھی جاتی ہے' جسے فیملی میکر کہا جاتا ہے' اسے میں نے کیسے مٹھی میں کر لیا۔ اپنے شوہر' بچوں اور گھر کی پروا کیے بغیر وہ میرے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے اور تم ایک مرد کو اپنی مٹھی میں نہیں کر سکیں۔ وہ مرد جسے راستہ بدلنے کو' منہ کا ذائقہ بدلنے کو محض بہانہ چاہیے ہوتا ہے۔ وہ تو منتظر ہوتا ہے۔ کسی کی نظروں سے شکار ہونے کا' کسی کی اداؤں سے گھائل ہونے کا۔ تم سے تر نوالہ بھی نہیں کھایا گیا۔" فواد حسن کچھ استہزائیہ انداز میں اور کچھ طیش میں کومل کا مذاق اڑا رہا تھا۔

"شانزے احمد تمہارے لیے سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہے۔ اس کی دولت اور صلاحیت سے تمہیں آئندہ کئی فائدے اٹھانے ہیں۔ ہم جیسے قلاش اور کنگال انسان کو اس کا زرخیز بنک بیلنس زمین سے آسمان پر

لے جا سکتا ہے' سو تمہیں جو کچھ چاہیے تم نے اس کے حساب سے محنت کی اور کامیاب ہو گئے یا پھر شاید وہ عورت ہی ایسی ہے' شاخ سے ٹوٹے پھل کی طرح کسی کی بھی آغوش میں گرنے کو تیار... ہو سکتا ہے تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی شانزے کو اسی طرح ٹریپ کر لیتا۔ اس کی کمزوریوں اور خامیوں نے تمہیں اتنا طاقت ور بنا دیا کہ وہ تمہارے پھیلائے جال میں آسانی سے آ گئی' مگر اس کا شوہر' وہ کچھ اور ہی ہے۔"

کومل سانس لینے کو رکی۔ "سچ کہوں... احمد مجھے اتنا اچھا لگنے لگا ہے کہ میں سوچتی ہوں' کاش اس کے جیسا لائف پارٹنر مجھے بھی مل جائے جو میرا وفادار ہو۔"

"اوہو! شکاری خود شکار ہو گئے۔" فواد نے زور سے قہقہہ لگایا۔

باہر کھڑی شانزے احمد پتھر کی مورت بن چکی تھی۔ اپنی ذات کا زعم' اپنی صلاحیت کا سارا گھمنڈ' سب کچھ فواد حسن کے پیروں تلے کچلا جا رہا تھا۔

بڑی مشکل سے خود کو گھسیٹتی وہ باہر آئی تھی۔ اس کا پورا وجود بری طرح کانپ رہا تھا' غصے سے بھی اور توہین اور ذلت کے احساس سے بھی۔

وہ کس طرح گھر پہنچی تھی' وہی جانتی تھی۔

خالہ امی کے آگے دل کا بوجھ ہلکا کر کے اب وہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

بچوں کے کپڑے سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر سب چیزوں کا جائزہ لیا' کہیں کچھ رہ نہ جائے۔ اپنے جائزے سے مطمئن ہو کر شانزے نے سکون کی ایک گہری سانس لی۔

تیاری تقریباً" مکمل ہی تھی۔ دونوں بچے بے حد خوش اور پُرجوش تھے احمد اسٹڈی روم میں تھا۔ شانزے کچھ دیر کھڑی سوچتی رہی' پھر دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

احمد لیپ ٹاپ پر کام کر رہا تھا۔ تیزی سے مصروف اس کی انگلیاں ایک لمحے کو رکیں۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے نظر اٹھا کر شانزے کو دیکھا۔

"کتنے دن کی چھٹیاں لی ہیں تم نے؟" احمد لیپ ٹاپ چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"چھٹیاں تو نہیں لی ہیں میں نے۔" شانزے نے دھیرے سے جواب دیا۔

"اوہ...!" احمد نے ایک گہری سانس لی۔

"تو تم... ہمارے ساتھ نہیں جا رہیں؟"

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔"

"پھر؟" احمد کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

"مجھے ایک دوسرے چینل سے برنچ شو کی آفر تھی' میں نے اسے جوائن کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے' نیکسٹ منتھ سے میرا شو اسٹارٹ ہو گا۔"

"یہ چینل کیوں چھوڑ دیا؟" احمد اب بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"برنچ شو دیر سے شروع ہو گا۔ مارننگ میں گھر اور بچوں کے لیے ٹائم مل جائے گا۔" شانزے سادہ سے انداز میں بولی۔

احمد خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"تمہاری واپسی اچھی لگ رہی ہے۔" وہ اک دم ہی مسکرایا تھا۔

شانزے کے لبوں پہ بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ بے اختیار آ گئی۔

"میں اس لیے واپس نہیں آئی کہ میرے گھر کو میری ضرورت ہے' بلکہ اس لیے واپس آئی ہوں کہ مجھے تم سب کی ضرورت ہے۔" شانزے نے اعتراف کیا اور آخر اعتراف کرنے میں حرج ہی کیا تھا' پھر اس پر بہت سا شکر بھی واجب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی عزت رکھ لی تھی' جو ذلت اس نے اپنے اوپر جھیلی' وہ دنیا کے سامنے طشت ازبام نہیں ہوئی۔ وہ رسوائی احمد کے سامنے نہیں آئی۔

وہ ندامت اور توبہ کے عمل سے گزر رہی تھی' اپنی جنت اور محبت اسے واپس مل ہی جانی تھی۔

☼

مصباح علی

اس نے پانچویں بار کروٹ بدلی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے نہیں بلکہ دل سے روٹھی لگتی تھی۔ وہ چت لیٹی بس چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے چھت پر کئی برسوں کی دھول پڑی ہو' جو وہ اپنی پلکوں سے جھاڑ رہی ہو۔ اس کی سوچوں میں کچھ مخل تھا تو وہ اس کے ہلکے خراٹے۔ اس نے ذرا سی گردن موڑ کر اس کی پشت کو گھورا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا۔ خراٹوں میں اس کا خمار بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"کتنے بے خبر ہیں یہ' کیسے سمجھاؤں؟ مجھے تو کبھی کسی قابل سمجھا ہی نہیں۔" اس نے آہ بھر کر رخ بخن پھیر لیا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اس کا چہرہ خاصا بجھا لگ رہا تھا۔ وہ اپنی حلقہ زدہ آنکھیں دیکھنے لگی۔

"اٹھارہ برسوں میں شکل کیا سے کیا ہو گئی۔ بھاگتے بھاگتے جوڑ' جوڑ دکھنے لگا' مگر اس کے معیار تک نہ پہنچ سکی۔"

اس نے تاسف بھری سانس کھینچی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پاؤں میں چپل اڑسی' دوپٹا اٹھا کر گلے میں ڈالا۔ اک نظر... اسے دیکھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اس کی نظر سامنے کمرے کے ادھ کھلے دروازے میں سے آتی روشنی کی لکیر پر پڑی اور ساتھ "کھی کھی ہاہا" کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ سوچیں جھٹک کر کمرے کی طرف چل دی۔

"تم ابھی تک سوئے نہیں۔" وہ دروازے کھول کر اندر آ گئی۔ ربیحہ' ضماد' عفان بیڈ پر پھسکڑا مارے منوپلی کھیل رہے تھے۔ ربیحہ نے ضماد کا کان زور سے پکڑ رکھا تھا اور وہ "اوئی اوئی" کرتا چلا رہا تھا۔ جبکہ عفان بند منہ سے ہنسی روکنے کی ناکام کوشش میں۔

"ربیحہ! چھوڑو بھائی کا کان' شرم نہیں آتی' اتنی بڑی ہو گئی ہو اور جانوروں کی طرح لڑتی ہو۔" ارم نے کہا۔

"جانوروں کی طرح کہاں مما! میں نے تو انسانوں کی طرح پکڑ رکھا ہے۔ یہ دیکھیں۔" اس نے اور زور سے اس کا کان کھینچا اور ہنستے ہوئے بولی۔

"مما! یہ چور کی سزا رکھی ہے۔ اس نے پہلے یہاں

سے پانچ سو پونڈز کا کارڈ چرایا تھا اور اب آکسفورڈ اسٹریٹ کا کارڈ۔" اس نے ایک جھٹکا اور دیا۔

"نہیں مما۔ آکسفورڈ اسٹریٹ کا میں نے نہیں چرایا' یہ جھوٹ بول رہی ہے۔" ضماد چلا' چلا کر اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ مگر وہ ماننے تب نا' وہ مسلسل "نکال نکال" کی تکرار کر رہی تھی۔ عفان فوراً" بیڈ سے چھلانگ مار کر اتر گیا اور سامنے کھڑا ہو کر آکسفورڈ اسٹریٹ کا کارڈ "ناچ ناچ" کر دکھا رہا تھا۔

"یہ تو میرے پاس ہے۔"

"خبیث' کمینے۔" اس نے ضماد کا کان چھوڑا اور تکیہ اٹھا کر عفان کو مارا' مگر وہ موقع پر ہی بیٹھ گیا۔ اس کی تو بچت ہو گئی۔ لیکن سامنے رکھا ٹیبل کا گل دان تکیے کی چوٹ سے نیچے جا گرا۔ آج ویسے کمال تھا۔ ارم کو غصہ نہیں آیا۔ نہایت شرارتی لاپروا ربیجہ تھی تو سترہ برس کی' مگر چھوٹے بھائیوں سے ابھی تک کھیل کود' مار پٹائی جاری تھی۔ اور منع کرنے پر یا تو رونے لگ جاتی یا پھر ماں کے آگے منہ پھاڑ کر ہنستی رہتی۔ اپنی بچکانہ حرکتوں پر اکثر ہی ارم سے ڈانٹ سنتی اور کبھی کبھار دھموکے بھی کھا لیتی۔ مگر ملے گلے کے علاوہ اس کی زندگی میں کچھ تھا ہی نہیں۔ مگر آج وہ خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔ اس کی کسی حرکت پر غصہ نہیں آیا تھا۔ پھولے پھولے گھنگھریالے بالوں کی مزید الجھی ہوئی پونی بنائے' کہنیوں تک آستینیں چڑھائے اور دوپٹا تو جانے کہاں تھا۔ مگر بھائی کو مارنے پر پورا دھیان تھا اور ایم پی تھری الگ اس کی گود میں راگ الاپ رہا تھا۔

"ربیجہ! تمہارے پیپرز ہونے والے ہیں اور تم کتنی بے فکری سے کھیل رہی ہو۔" وہ کھوئی سی بولی۔

"میں کہاں کھیل رہی تھی' وہ تو یہ بدتمیز چور اچکے کھیلنے کی ضد کر رہے تھے۔ چلو اٹھو۔ میری کتاب پر ہی بیٹھ گئے جاہل۔"

اس نے ضماد کو دھکیلتے ہوئے اس کے نیچے سے کتاب کھینچی اور نیم دراز ہو گئی۔

"بارہ تو بج گئے ہیں۔ اب کیا پڑھو گی۔ سو جاؤ اب۔"

ارم نے ایک اور بڑا کمال کیا۔ "کیا پڑھو گی' سو جاؤ۔" وہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑے ماں کو دیکھنے لگی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔" وہ گلدان ٹیبل پر رکھتے ہوئے مسکرائی۔

"دیکھ رہی ہوں آپ کا غصہ کہاں گیا؟" وہ اس کی بات پر پھر مسکرائی۔

"چلیں آپ کہتی ہیں تو لیٹ جاتی ہوں۔" اس نے کتاب بند کر کے سرہانے رکھی۔ "مما! اب صبح آٹھ بجے ہی نہ آوازیں دینا شروع ہو جایئے گا۔ کل کالج سے چھٹی ہے' دیر سے اٹھوں گی۔" اس نے رضائی ٹانگ مار کر کھولی اور لیٹ گئی۔

"اور ہاں۔" جب ارم جانے کے لیے مڑی تو اس نے پھر پکارا۔

"مما! یہ اپنا لنگور ساتھ لیتی جائیں۔ اسے کبھی ڈر لگتا ہے۔ کبھی پانی مانگتا ہے۔ مجھ سے نہیں پلایا جاتا راتوں کو اٹھ اٹھ کر پانی۔" اس کا اشارہ چھوٹے عفان کی طرف تھا' جو اس کی رضائی میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ارم اس کی بات پر ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ غالباً" سوچ رہی تھی۔ "یہ تو کسی کو اٹھ کر پانی نہیں پلا سکتی اور باپ کے ارادے دیکھو۔" وہ سوچ ہی رہی تھی۔ جب ربیجہ کی لاتیں کھا کر بارہ سالہ عفان اپنا سا منہ لے کر اس کے ساتھ چل پڑا۔

"لائٹ تو بند کرتی جائیں۔" اس کی ہانک پر وہ پھر مڑی' اک نگاہ اس کی بے خبری کو دیکھ کر لائٹ بند کی اور باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

شام کا پنچھی اپنے پروں میں دن سمیٹ چکا تھا۔ بچوں کے کمرے سے خوب اودھم مچانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جن میں نمایاں ربیجہ کی تھی۔ ارم بھی اپنا کام سمیٹ کر ان کے درمیان آ بیٹھی۔ ٹی وی پر ایشیا کپ لگا تھا اور آخری گیندوں پر آفریدی کے چھکوں کی بارش ہو رہی تھی اور پھر آفریدی نے آخری بال پہ چھکا لگایا تھا شاید۔

"ہرے۔" اس نے دونوں ہاتھ اونچے اٹھا کر زمین سے تقریباً" ڈیڑھ فٹ اونچی چھلانگ ماری تھی۔ یقیناً" پاکستان میچ جیت گیا تھا۔ جس کی خوشی ربیجہ کے انگ انگ سے پھوٹتی نظر آ رہی تھی۔ وہ تینوں بہن بھائی ٹی وی کے ساتھ چپکے کھڑے تھے اور ارم کرسی کے بازو پر کہنی ٹکائے ایسے بیٹھی تھی کہ بند مٹھی پر گال ٹکا تھا اور نظریں اسکرین کے بجائے ربیجہ پر تھیں۔ جانے وہ سوچوں کی کس کشتی میں سوار تھی۔ مگر یقیناً" اس کمرے میں بالکل نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی! پلیز آگے سے ہٹ جائیں' پلیز۔ پلیز امی۔" ارم سر پر اچھی طرح دوپٹا لپیٹے ہاتھ میں سورہ یاسین پکڑے خوب ہل ہل کر دعا مانگ رہی تھی۔ جب الماس بیگم اس کے سر پر پہنچ گئیں۔ اس نے آیت پر انگلی رکھ کر پھر ان کی منتیں کیں۔

"امی پلیز! اب آگے سے تو ہٹ جائیں' راجہ کی سنچری مکمل ہونے والی ہے۔"

"راجے کھیل رہے ہیں اور رانیاں دعائیں مانگ رہی ہیں۔" وہ اپنی پاٹ دار آواز میں بولیں۔

"کب سے آوازیں دے رہی ہوں' سنائی نہیں دیا۔' چلو اٹھو آٹا گوندھو' ابا آنے والے ہیں تمہارے۔"

"اچھا گوندھ دیتی ہوں' آپ بیٹھ تو جائیں۔" اس نے کھسک کر الماس کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔

اس کا خشوع تو تب ٹوٹا جب الماس نے آگے بڑھ کر ٹی وی کا تار کھینچ دیا۔

"سارا دن برباد کر دیتا ہے یہ میچ۔ اللہ کرے شروع میں ہی ہار جائیں کم بخت' مہینہ تو چین سے گزرے گا۔"

"اوں ہوں امی۔" بددعا پر دونوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ "ان بے چاروں کے ایسے ہی پیچھے پڑ گئی ہیں' آٹا ہی گوندھنا ہے نا' گوندھ دیتی ہوں' ابا بڑا افریقہ سے روزہ رکھ کر آ رہے ہیں' وہ بھی کہیں بیٹھے میچ ہی دیکھ رہے ہوں گے۔" وہ بڑبڑاتی اٹھی۔

جاتے جاتے ٹی وی کا تار لگا کر فل آواز بڑھا دی۔ ابھی اس نے آٹا گوندھنا ہی شروع کیا تھا۔ جب فارینہ کی تالیاں پیٹنے کی آواز آ گئی۔ یقیناً" رمیز راجہ کی شاندار سنچری مکمل ہوئی تھی۔ پھر بھلا ارم کیسے کچن میں ٹک سکتی تھی۔ وہ آٹے میں لتھڑے ہاتھ لیے چلاتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔

"کیا ہوا' کیا ہوا۔"

"راجہ کی سنچری ہو گئی۔" فارینہ زور سے اس کے گلے جا لگی اور گوندھا آٹا فارینہ کی پشت سے۔ الماس نے ان کی لاپروائی پر دو حرف بھیجے اور خود ہی کچن میں چلی گئیں۔ ابھی اس کی عمر ہی کتنی تھی۔ ارم سولہ سال کی اور فارینہ پندرہ سال کی۔ کھیل کود' پھول رنگ' تتلیاں موسم اس کی عمر کے یہی تقاضے تھے اور وہ اپنی عمر کے رنگوں پر کھلکھلاتی ہوئی۔ بالکل پوری اتری تھی۔ لاابالی' کچھ شرارتی اور کچھ ناسمجھ۔ اور بے ضرر سی خواہشات' ان ننھی منی خواہشات پر اسے اکثر ہی ڈانٹ پڑ جاتی تھی۔

چند دن پہلے الماس تین فینسی سوٹ لے کر آئی تھیں۔ گھر آتے ہی پہلے اسے پیار سے دکھائے۔ اس کی رائے لی اور پھر اٹھا کر پیٹی میں ڈال دیے۔

"امی!" وہ لجاجت سے بولی۔ "وہ آپ نے رکھ کیوں دیے؟ ہمارے اسکول میں پارٹی ہونے والی ہے۔ ہم دونوں کو اس پر سلوا دیں۔"

"سل جائیں گے' پہلے جو رکھے ہیں وہ پہنو۔" ان کی اتنی بے نیازی پر اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

"پیٹی میں رکھے رکھے کیسے سل جائیں گے' باہر نکالیں۔ میں درزن کو دے آتی ہوں۔" وہ پیار بھرے لہجے میں کہتی ان کے کندھے پر جھول رہی تھی۔

"جب شادی ہو جائے گی نا' تب سلوا کر پہن لینا' اب میرا دماغ نہ کھا۔ جا کر برتن دھو۔" وہ مٹر کے دانے نکالتے ہوئے اسے کام بتانے لگیں اور وہ حیرانی سے انہیں تک رہی تھی۔

"میں نوکرانی بنی کام کروں اور چیزیں بیٹی کے لیے لیویں۔"

وہ منہ ناک چڑھا کر چھت پر چلی گئی۔ بات بھی کسی حد تک جائز تھی۔ بھئی ہر چیز ہی شادی کے لیے۔ اتنا خوب صورت ڈنر سیٹ لائیں' سنبھال کر رکھ دیا۔ شوخ رنگوں کی بیڈ شیٹ لائیں' پلاسٹک کے لفافے چڑھا کر پیٹی میں پھینک دی۔ کانچ کے گلاس شادی کے لیے' نرم رضائیاں شادی کے لیے' زیور بنوائے شادی کے لیے اور تب تو حد ہی ہو گئی۔ ارم کی سہیلی کی سالگرہ تھی۔ اس نے جانے کی ضد کی مگر الماس تو مان کر نہ دیں۔

"جب شادی ہو جائے گی نا' تو جہاں مرضی آنا جانا' جیسا مرضی کھانا پینا' اوڑھنا پہننا' اب بھلا کنواری لڑکیوں کو کون راتوں میں کسی کے گھر جانے دے۔" وہ الماس کی بات پر ششدر کھڑی تھی۔ اس کی ہر خواہش کو دبانے کے لیے ان کے اندر ایک روایتی ماں انگڑائی لیتی جو ڈانٹ ڈپٹ کر اسے راضی کر لیتی تو کبھی وہ رو دھو کر انہیں منا لیتی۔

☼ ☼ ☼

دوپہر سے تیز بارش ہو رہی تھی۔ دونوں بہنیں رسی لے کر چھت پر چڑھ گئیں۔ موسلا دھار تیز بارش' قہقہے لگاتی تالیاں پیٹتی' رسی کودتی دونوں بہنیں۔۔۔ الماس نے انہیں کتنی آوازیں دی۔ مگر ان کی سماعتوں میں قہقہے اور بارش کے سر تھے۔ آخر تنگ آ کر وہ خود ہی اوپر آ گئیں۔ بھیگے بالوں سے پانی ٹپکتا' گیلے کپڑے جسم پر چپکے اور انگ انگ میں رعنائی۔ وہ چند لمحے انہیں دیکھتی رہیں۔ پھر اپنی آواز میں بجلی کی کڑک پیدا کر کے بولیں۔

"کب سے آوازیں دے رہی ہوں' سنائی نہیں دیتا کیا؟" مستی میں ہونٹ بھینچ کر ہنسی روکتے ہوئے ارم نے دونوں ہاتھ سے "نہیں" کا اشارہ کیا رسی کودتے ہوئے گردن بھی نفی کی ترجمانی کر رہی تھی۔ اس کے معصوم انداز پر انہیں پیار تو ٹوٹ کے آیا۔ مگر چہرے پر مصنوعی خفگی پیدا کر کے کڑکا۔

"ابھی بتاؤں تمہیں۔"

اس نے اسی انداز میں اچھلتے ہوئے ہاں میں گردن ہلائی۔

"بدتمیز نیچے چلو جلدی سے۔" وہ قدرے مسکراتی ہوئی آگے بڑھیں اور رسی پکڑ لی۔

"امی۔۔۔" فارینہ نے منہ بنایا۔

"آ جائیں گے نا' بارش تو رکنے دیں۔" ارم منتیں کرتی ہوئی ان کے گلے کا ہار بن گئی۔ الماس اس کی آنکھوں کے رنگ دیکھ رہی تھیں۔ جو خوشی کے مارے بار بار بدل رہے تھے۔ انہوں نے اس کے گیلے بال چہرے سے ہٹائے اور ماتھے پر بوسہ لیا۔

"ارم! اب تم بڑی ہو گئی ہو' بچپنا چھوڑ دو اور چلو نیچے۔ حلیہ درست کرو' کسی مہمان نے آنا ہے۔" وہ ان کی رسی ہاتھ پر لپیٹتے ہوئے نیچے اترنے لگیں' جب فارینہ نے ہانک لگائی۔

"امی کس نے۔"

"بتاؤں گی۔ نیچے آؤ۔" وہ تقریباً" ساری سیڑھیاں اتر گئی تھیں۔

انہیں اوپر گئے تقریباً" گھنٹہ ہوا تھا۔ اس ایک گھنٹے میں نیچے کا سارا منظر نامہ ہی بدل گیا تھا۔ ہر چیز ضرورت سے زیادہ قرینے سے رکھی تھی۔ صاف ستھری اور اپنی اپنی جگہ پر۔ کچن سے آنے والی خوشبوؤں نے نتھنوں سے گزر کر منہ میں پانی بھر دیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے کچن میں ہی آ گئیں۔

"امی! کیا بنایا ہے۔"

"جو بھی بنا ہے' چھوڑو اور جلدی سے کپڑے بدل کر آؤ' تمہارے ابا بھی آنے والے ہوں گے۔"

غالباً" جو بھی آ رہے تھے خاصے وی آئی پی تھے۔ تب ہی الماس بہت پرجوش تھیں۔ ڈھیر چیزیں بنا ڈالیں اور بطور خاص ارم کو تیار ہونے کے لیے اچھے کپڑے اور چیزیں دی تھیں۔ جب وہ دونوں نہا دھو کر' صاف ستھری اندر آئیں تو ڈھیر ساری نصیحتیں بھی کر دیں جن میں سر فہرست خاموش بیٹھنا' دوپٹا سر پر رکھنا' بے

وقوفوں کی طرح منہ پھاڑ کر نہ ہنسنا اور وہاں ان کے منہ کو بھی تکتی نہ رہنا۔" وہ آنکھیں بند کیے قوالوں کی طرح سر دھنتی رہیں اور یقیناً" وہ سر دھننے کا ہی اثر تھا کہ وہ بہت سمجھ داری خاموش بیٹھی رہی۔ جس کی آنے والی مہمان خاتون بھی قائل ہو گئیں۔

"بہت کم گو ہے' آپ کی بیٹی۔" امی کی گردن فخر سے تنی ہی تھی کہ ارم کو اپنا گونگا پن کھٹکا۔

"نہیں آنٹی! امی نے منع کیا تھا زیادہ بولنے سے۔" اس کی بات پر جہاں امی کھسیانی ہو کر زبردستی مسکرائی تھیں۔ وہیں مہمان خاتون کو اس کی خوب صورت شکل اور برجستگی پسند آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کا وقت تھا۔ الماس نے پانچویں چھٹی بار انہیں کھانا کھا لینے کی یاد دہانی کروائی تھی۔ غالباً" ٹی وی پر کوئی سیریل لگا ہوا تھا اور دونوں ہی وقفے کے انتظار میں تھیں۔ جیسے ہی وقفہ آیا وہ کھانا لینے کے لیے کچن کی جانب بڑھی۔ اس کے قدم صحن کے بیچ ہی رک گئے تھے۔ غالباً" امی' ابا آپس میں کوئی بات کر رہے تھے۔

"دیکھ لو ارم کے ابا۔۔۔ سوچ کر ہی فیصلہ کرنا' ابھی تو وہ سولہ کی ہی ہے۔" امی کی تفکر بھری آواز پر ابا خاصے مضبوط لہجے میں بولے تھے۔

"وہ کون سا آج ہی شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں' کرتے کرتے بھی سال ڈیڑھ سال لگ جائے گا اور ویسے بھی شادی کے بعد خود ہی لڑکیاں بڑی ہو جاتی ہیں۔"

"کہہ تو تم صحیح رہے ہو مگر۔" امی کی فکر کسی طور دور نہ ہو رہی تھی۔

"اگر۔۔۔ مگر چھوڑو۔۔۔ قسمت بار بار دستک نہیں دیتی الماس بیگم۔۔۔ اتنا بڑا گھر' کاروبار ہے' پھر سارے بہن' بھائی شادی شدہ اور لڑکا بھی بڑا شریف ہے' ہماری بچی عیش کرے گی۔"

"گھر کاروبار کی بات تو ٹھیک ہے مگر۔" وہ کچھ لمحے کے لیے رکیں۔ "لڑکا بھی تو ارم سے بہت بڑا ہے۔ ستائیس' اٹھائیس تو ماں اپنے منہ سے کہہ رہی ہے۔"

"اگر لڑکا بڑا ہے تو عقل بھی تو بڑی ہو گی' ویسے بھی بڑی عمر کا مرد زیادہ بہتر رہتا ہے اور پھر جیسی وہ لاابالی ہے' وہ سنبھال لے گا۔ بس تم فکر نہ کرو' دعا کیا کرو' اللہ بہتر کرے گا۔"

ابا کے بہتر بہتر کی رٹ نے اماں کے تفکرات مٹا دیے اور واقعی وہ سال بعد بیاہ کر انیق کے گھر کی رونق بن گئی۔ دلہن بنی وہ اس قدر خوش تھی جیسے ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ لگ گئی ہو۔ ظاہر ہے اب اماں کی روک ٹوک سے جان چھوٹی' نئے فیشن کے کپڑے' جوتے' نرم گداز بستر' نئے ڈھیر سارے زیور اور پھر اب اپنی مرضی سے سونا جاگنا۔ اپنی مرضی سے آئے جائے گی' نہ کتابیں چاٹنی پڑیں گی۔ بس اپنا گھر' اپنا کمرہ' اپنی مرضی۔۔۔ واہ کیا بات ہے۔

شادی کے شروع دن تو بہت اچھے گزرے تھے۔ ہر روز ڈھیروں میک اپ تھوپ کے' نت نئے کپڑے پہن کے روزانہ ہی کسی کے ہاں دعوت ہوتی۔ وی آئی پی پروٹوکول ملنے پر وہ اندر تک خوش ہو جاتی۔

ایک شام انیق کے کسی رشتے دار کے ہاں دعوت تھی۔ اس نے خوب میک اپ کر کے بالوں کی اونچی سی پونی بنالی۔ وہ کچھ دیر تو دیکھتا رہا پھر قدرے ناگواری سے بولا۔

"اسے ذرا کم کرو۔" اس کا اشارہ میک اپ کی طرف تھا۔ جو اس نے مرے دل سے اسفنج پھیر پھیر کر ہلکا کیا۔

"اور یہ بھی کھولو۔" اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے انگلی سے اس کی پونی ہلائی تھی۔ غالباً" پونی بنا کر وہ اس کے ساتھ اور بھی چھوٹی لگ رہی تھی۔ بہرحال اس نے بات مان لی۔

وہ دونوں بائیک پر تھے۔ ابھی رشتے دار کے گھر سے خاصے فاصلے پر ہی تھے۔ جب اس کی نظر سامنے سے آتی گول گپوں کی ریڑھی پر گئی۔ اس کے منہ میں بھر

گیا۔ "انیق! مجھے گول گپے کھانے ہیں۔" اس نے لجاجت سے کہتے ہوئے اس کی کمر ہلائی۔

"ہم کھانے پر ہی جارہے ہیں۔"

"میں وہ بھی کھالوں گی۔" وہ جھٹ سے بولی اور "پلیز۔۔۔ پلیز بائیک روکیں۔" شروع ہوگئی۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔ اتنا میک اپ تھوپ کر سڑک پر کھڑے ہوکر گول گپے کھلاؤں تمہیں۔۔۔ گھر لے آؤں گا۔" اس کے لہجے کی تیزی بھی اسے سمجھ نہیں آئی۔

"میں نے یہاں کھانے ہیں پلیز۔۔۔" وہ اپنے سابقہ انداز میں اسے جھولے دے رہی تھی تو اس نے زور سے جھڑک دیا۔

"ارم۔۔۔ شرافت سے بیٹھو۔" اس نے ارم کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے لی۔ "میرے ساتھ اگر کہیں آنا جانا ہو تو انسان بن کے، تمیز کے ساتھ جایا کرو، سمجھیں۔" کھسیانی ہوکر ہنستی رہی۔ واپسی پر اس نے امی کی طرف جانے کی فرمائش کی، جو وہ سہولت سے ٹال گیا۔

"ابھی کچھ دن پہلے تو گئی تھیں، پھر کسی دن چلیں گے۔"

"اچھا چلیں سامنے والی گلی میں، میری سہیلی کا گھر ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے ادھر چلتے ہیں۔" اس کی بے جا فرمائشوں پر وہ زچ ہوگیا۔

"یار! اب تمہاری شادی ہوگئی ہے۔ بھول جاؤ سہیلیوں کو اور اماں کو، میاں ہے اسے ٹائم دو۔"

وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ کوشش تو وہ بھرپور کرتی، مگر کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہوجاتی۔ کبھی کپڑے پریس کرنا بھول جاتی، کبھی جوتے، جرابیں سنبھالنا بھول جاتی۔ وہ صبح جلدی اٹھنے کا عادی تھا اور وہ دیر سے سونے کی وجہ سے اٹھ نہ پاتی۔ وہ اسے جھنجوڑ، جھنجوڑ کر اٹھاتا تو وہ آنکھیں ملتی گرتی پڑتی اٹھتی۔

"صبح ہو بھی گئی، ابھی تو سوئے تھے۔" وہ جمائی روکتے ہوئے جھول رہی تھی۔

"خدا کے لیے مجھے ناشتا دے دو، بھلے پھر سارا دن سوتی رہنا۔" اس نے تولیے سے بال رگڑ کر گیلا تولیہ اس کے منہ پر اچھالا۔ نمی کے احساس سے اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

"اٹھو۔" اس نے ارم کی نرم کلائی پکڑ کر کھینچی۔

"اور کتنا آرام کروگی، ناشتا لے بھی آؤ۔"

"ناشتا۔۔۔"

وہ منہ میں بدبدائی ۔۔۔ اس کے بعد برتنوں کا ڈھیر، پھر صفائی والی کے ساتھ کھپائی، پھر بھابھی کے ساتھ دوپہر کا کھانا تیار کروانا، پھر برتن، پھر چائے، پھر برتن اور اگر مشین لگالی میرا تو بینڈ ہی بج جائے گا۔ پھر رات کا کھانا اور پھر برتن اف۔۔۔ ناشتے کے نام سے ہی دن بھر کی تھکا دینے والی روٹین اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔

"کیا ہوا، جاؤ واش روم، پھر ناشتا بھی بنانا ہے۔" احمقوں کی طرح اپنی طرف گھورتی ارم کو اس نے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"اچھا۔۔۔" اس کی آواز ڈوب کر ابھری تھی۔

آملیٹ اور بریڈ کی سوندھی خوشبو سے سجی ٹرے، جس میں چائے، دودھ، بسکٹ، کباب، کی طرح کے لوازمات تھے، لاکر انیق کے سامنے رکھی۔ نکھری سی، صاف ستھری کم عمر بیوی سامنے بیٹھی خاصی دلکش لگ رہی تھی مگر اس کی دلکشی نوالہ منہ میں رکھتے ہی غائب ہوگئی۔

"یہ کیا۔ اتنا آئل۔"

"وہ۔" وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔

"امی نے کہا تھا، آپ فرائیڈ سلائس لیتے ہیں۔"

"یہ تو نہیں کہا ہوگا آئل سے کھاتے ہیں۔ تم میں خود عقل ہے یا نہیں۔" اس نے بچا نوالہ اس کے سامنے ہی پٹخ دیا۔

"ابھی تک ناشتا بنانا نہیں آیا، جانے آئے گا بھی یا نہیں بے وقوف!" وہ بڑبڑاتا ہوا بسکٹ کے ساتھ چائے چڑھا کر ادھورا سا ناشتا کرکے چلا گیا۔ وہ کچھ پل اس کی باتوں کے زیر اثر رہی۔ پھر "ہونہہ" کرکے خود کھانے لگ گئی۔

ایسا اس کے ساتھ اکثر ہی ہوتا تھا۔ آج تو تلتے ہوئے تیل زیادہ ہوگیا تھا۔ کبھی آملیٹ میں نمک مرچ کا تناسب بگڑ جاتا تو کبھی چائے ٹھنڈی انڈیل لاتی۔ اگر قسمت سے ناشتا اچھا ہو جاتا تو کسر دوپہر کے کھانے میں نکل جاتی۔ اپنی طرف سے اچھا اور بہترین کرنے کی کوشش میں ایسا ضرور ہوتا کہ انیق کا مسرور انداز ۔۔۔ تلخی میں بدلتا اور وہ اسے ڈپٹتا گھورتا باہر نکل جاتا۔ ابھی چند دن پہلے کی بات تھی۔ وہ ہنڈیا کا سارا پھیلاوا سمیٹ کر کچن سے باہر نکل رہی تھی۔ حقانی صاحبہ نے بہت پیار سے کہا۔

"ارم! پلیز آٹا گوندھ دینا، میں بازار سے ابھی لیس لے کر آئی۔" وہ چادر لپیٹ کر باہر نکل رہی تھیں۔ جب آواز دے کر اسے یاددہانی بھی کروائی۔

"ذرا حساب سے گوندھنا۔" رات کو بھی اسی نے گوندھا تھا۔ دس افراد کے لیے اتنا آٹا گوندھا کہ بمشکل سات، آٹھ روٹیاں بنی تھیں۔ انیق تو اسے گھورتا رہ گیا تھا۔ کیونکہ اسے کھانے کے لیے بہت دیر انتظار کرنا پڑا تھا۔ اب وہ ہل ہل کر آٹا گوندھتے ہوئے بھابھی کی رات والی ہنسی یاد کررہی تھی۔ سب کو خوش ہوکر بتا رہی تھیں۔

"انیق کی کنجوس بیگم نے آٹا گوندھا تھا بھئی۔"

"چلو آج تو نہیں مذاق بنائیں گی میرا اور انیق کا۔" اس نے آٹا گوندھا اور کمرے میں آکر پھیلاوا سمیٹنے لگی تھی۔ چھٹی کا دن تھا۔ وہ بیڈ پر نیم دراز کوئی مووی دیکھ رہا تھا۔ اس کے کمرے میں آتے ہی اپنے قریب بیٹھنے کی فرمائش کرڈالی۔

"ابھی آتی ہوں، ذرا الماری ٹھیک کرلوں۔" وہ کہہ کر کپڑوں کی الماری کھولنے لگی۔

"بعد میں کرتی رہنا ٹھیک۔ ابھی میں باہر چلا جاؤں گا۔ ایک تو مجھے دیکھ کر ہی تمہیں سارے کام یاد آجاتے ہیں۔" اس کے نروٹھے پن پر وہ الماری کا پٹ بند کرکے اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"جی کیا کہنا ہے۔"

"کچھ نہیں کہنا۔" وہ اسی کے انداز میں چبا کر بولا۔

"جاؤ کرو اپنے کام۔" اس کے بے گانے انداز پر وہ ریموٹ بیڈ پر اچھال کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ ہلکی دستک دے کر اس کی ساس نے دروازہ کھول کر جھانکا۔

"یہ آٹا کس نے گوندھا ہے۔" انیق کی نظر ماں سے ہٹ کر اس کی فخریہ صورت پر گئی۔ وہ سمجھی اچھا گوندھنے پر تعریف ہوگی۔

"میں نے۔" اس کی سوچ کا فخر لہجے میں در آیا۔

"کیوں؟ کسی بارات نے آنا ہے، جو اتنا ڈھیر گوندھ دیا۔" آواز سے زیادہ ان کی آنکھیں شعلہ بار ۔۔۔ تھیں۔ وہ بے چاری یک لخت ہی گھبرائی۔

"وہ۔۔۔ امی بھابھی نے کہا تھا حساب سے گوندھنا۔"

"ہاں تو حساب سے کہا ہوگا نا۔۔۔ بے حساب تو نہیں کہا ہوگا۔" وہ کھڑاک سے دروازہ بند کرکے جیسے آئیں ویسے چلی گئیں۔

"کوئی کام عقل سے نہ کرنا، ہمیشہ سب کے سامنے شرمندہ ہی کروانا، احمق کہیں کی۔" وہ اس کی تیز چلتی سانسوں کی پروا کیے بغیر بائیک کی چابی اٹھا کر دانت پیستا باہر نکل گیا۔ کتنے آنسو تھے جو اس کی آنکھوں میں مرچوں کی صورت چبھنے لگے۔ وہ گرنے کے انداز میں بیڈ پر بیٹھی تھی۔ نظر ٹی وی اسکرین پر جا ٹھہری، جہاں اس کی پسندیدہ مووی لگی تھی۔ اس نے کلائی سے آنکھیں رگڑیں اور ناخن کاٹتے ہوئے مووی دیکھنے لگی تھی۔ یقیناً وہ چند لمحے والی بات بھول چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

شام کا وقت تھا۔ ہلکے گہرے بادلوں کے بیچ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس کی بڑی نند بچوں سمیت رہنے آئی ہوئی تھی۔ وہ اس کے بچوں کو باؤلنگ کروانے کے بہانے چھت پر لے آئی۔ آج کل ویسے ہی بچے اسے بہت اچھے لگتے تھے۔

"کاش! تیز بارش آجائے۔" اس نے آسمان پر بادلوں کو ملتے دیکھ کر سوچا تھا۔

"کاش! انیق بھی آجائیں۔۔۔ پر وہ نہ ہی آئیں تو اچھا

ہے۔" دماغ نے خواہش کی فوراً" ہی تردید کردی۔

"آتے ہی مجھے کہیں گے' اوپر کیا بے وقوفوں کی طرح۔ دیکھ رہی ہو۔ میں کیا بے وقوف لگتی ہوں؟" اس نے اپنے گالوں کو انگلی اور انگوٹھے میں بھینچ کر سوچا۔ آسمان کو اس کی بے ضرر خواہش اچھی لگی اور چند بوندیں اترنے لگیں اور ساتھ ہی ساس کی تیز پکار بھی۔ وہ دل مسوس کر نیچے چلی گئی۔

"جی۔" اس نے قریب جاکر پوچھا۔

"کچن میں دیکھو' کیا ہو رہا ہے' اکیلی اسما لگی ہوئی ہے۔ اور تم میٹھے میں کسٹرڈ بنالو۔" وہ فرماں برداری سے گردن ہلاتی جانے لگی تو انہوں نے ایک بار پھر تصدیق کی۔

"آتا ہے نا بنانا' یا وہ بھی نہیں آتا۔"

وہ ان کے انداز کو خاطر میں لائے بغیر خوشی' خوشی سرہلانے لگی۔ "جی جی وہ تو آتا ہے۔"

خواہ دل کتنا ہی موسم میں اٹکا ہوا تھا۔ مگر وہ دل جان سے بولی تھی اور اس نے اتنا غلط بھی نہیں کہا تھا۔ کسٹرڈ' نوڈلز' چائے' سینڈوچ' پکوڑے یہ سب چیزیں وہ اچھی بنالیتی تھی۔ اس نے کچن میں آکر دودھ کی دیگچی چولہے پر چڑھائی' باؤل میں کسٹرڈ پاؤڈر گھولنا شروع کیا۔ وہ آمیزہ اس میں ڈالنے والی تھی کہ باجی اپنے بیٹے کے لیے پانی لینے کچن میں آگئیں۔ وہ اسے اسٹرابری فلیور حل کرتے دیکھ کر مسکرائیں۔

"انیق کو کسٹرڈ بہت پسند ہے۔ کلر فل ڈش ہے نا۔" وہ بھی باجی کی تائید مسکرا کر کرنے لگی اور یقیناً" انیق کی پسند سن کر بات دل میں گدگدائی تھی۔

"چلو موسم تو اچھا ہے' وہ بھی خوش ہو جائیں گے۔" وہ پانی گلاس میں ڈال کر سیدھی کھڑی ہوئیں۔ "میں تو اس کے لیے اسٹرابری اور بنانا اکٹھے بناتی تھی۔" وہ بچے کی پکار پر مڑتے مڑتے "جیلی بھی بنالینا" کا مشورہ دے گئیں۔ جیلی تو وہ پہلے ہی بنا چکی تھی۔ اب بنانا فلیور کا ڈبا ڈھونڈنا تھا۔ اس نے کیبنٹس چھاننے شروع کیے۔ ڈبا نکالا اور پہلے سے حل شدہ آمیزے میں پانچ' چھ چمچے بھر کے ملائے اور پکتے دودھ میں ڈال کر چمچہ ہلانے لگی۔ وہ تو ابال آنے سے پہلے ہی تیار ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے ڈونگے میں انڈیل کر سیٹ کیا۔ رنگ اسے قدرے عجیب لگا مگر میاں کی پسند تھی۔ وہ کھل گئی۔ قدرے ٹھنڈا ہونے پر اورنج جیلی کے ٹکڑے کاٹ کر بہت پیار سے اس پر سجائے اور فریج میں رکھ دیا۔

باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ برآمدے کے پردے پھڑپھڑاتے ہوئے چند بوندیں بھی کھانے پر چھڑک دیتے۔ وہ کھانے کے دوران بار' بار صحن میں بنتے بلبلے دیکھ رہی تھی اور فارینہ کو یاد کر رہی تھی۔ کھانا کھا چکے تھے۔ ساس نے اسے کسٹرڈ یاد دلایا۔ وہ "جی اچھا" کہہ کر پیالا نکال لائی اور درمیان میں رکھ دیا۔ پیالا دیکھتے ہی جیٹھ نے ناک چڑھائی۔

"یہ۔ یہ کیا ہے؟"

"بھائی جان! کسٹرڈ ہے۔" وہ مسکرائی تھی۔

"اس کے رنگ کو کیا ہوا؟" باجی نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ بنانا بھی مکس کیا تھا نا' آپ نے ہی کہا تھا کہ اکٹھے ہی۔"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی باجی ہنس پڑیں۔ "لیکن میں نے اکٹھے مکس کرنے کا تو نہیں کہا تھا۔ خیر چھوڑو' یہ نئی ڈش بن گئی۔"

"فریقہ کی" باجی کے بات بدل کر کسٹرڈ انیق کی طرف بڑھانے پر وہ "فریقہ کی" چبا کر کہہ گیا۔

"یہ کیا؟" جب جمے حلوے کی طرح دھپ سے ایک ٹکڑا پلیٹ میں آگرا تو اس کی آنکھیں مزید پھیل گئیں۔ اس نے کلر فل کرنے کے لیے اسفنج کیک کے چند ٹکڑے بھی درمیان میں لگائے تھے جنہوں نے پہلے سے ہی سخت کسٹرڈ کی بچی نمی بھی جذب کرلی تھی اور کسٹرڈ کو ڈھیلے کی شکل دے دی۔

"یہ کسٹرڈ ہے یا' کسٹرڈ کا حلوہ۔" وہ براؤنش سے ٹکڑے جس پر تیل جیسی جیلی رکھی تھی دیکھ کر اندر تک کلس گیا۔ اس نے پلیٹ ہاتھ سے پرے سرکائی۔

"اگر ایسے ہی نقصان کرتی رہیں نا تو سال کے اندر میں سڑک پر آجاؤں گا۔ گھر میں اتنے افراد موجود ہیں' جب خود عقل نہیں ہے تو دوسروں سے لے لیا کرو' ــــ نہیں شان گھٹتی تمہاری۔" وہ غصے میں گھورنے کے ساتھ ساتھ ڈانٹ رہا تھا۔

"کوئی کام ڈھنگ سے نہ کرنے کی لگتا ہے' قسم کھا کر آئی ہو۔" وہ سب کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اسے صلواتیں سنا کر کمرے میں جاچکا تھا۔ غالباً" اسے اپنی سگھڑ بہن اور بھابھی کے سامنے ــــ سبکی محسوس ہوئی تھی۔ دل میں تو وہ اکثر ہی اس کے کام اور بہن' بھابھی کے کاموں کو موازنہ کرتا رہتا تھا۔ زبان سے اب شروع کیا تھا۔ بادلوں کی تیز گرج چمک ارم کو اپنے اندر محسوس ہوئی تھی۔ اتنے لوگوں میں وہ بمشکل اپنے آنسو روک پائی تھی۔

☆ ☆ ☆

زندگی کا چلن یوں ہی قائم تھا۔ وہ کاموں میں مہارت حاصل کرکے اس کا دل جیتنا چاہتی تھی۔ مگر کاموں کا پھیلاوا تھا' جو دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ پہلے ہی سال اس کی گود میں ربیحہ آگئی۔ اس کی پیدائش کے تکلیف دہ مراحل' پھر چھوٹی سی بچی کے نہ ختم ہونے والے کام' گھر گرہستی کی مصروفیت اور پھر میاں کی فرمائشیں اور تقاضے وہ بالکل الجھ کر رہ جاتی۔ اسے شکایت کا موقع نہ دینے اور دل جیتنے کی دوڑ دھوپ میں کبھی ارم کی کلائی جل جاتی۔ کبھی انگلیاں کٹ جاتیں۔ کبھی کسی چیز سے ٹکرا کر چوٹ کھالیتی اور کبھی تو اس کی "جلدی جلدی" کی پکار میک اپ کرتے ہوئے مسکارہ پلکوں کے بجائے آبرو میں سجا دیتا۔ ان حرکتوں پر ہونے والی عزت افزائی نے مسکراتے چہرے کا بھولپن احساس کمتری اور گھبراہٹ میں بدل دیا تھا۔ ہاں البتہ ایک بات تھی کہ وہ ڈانٹ ڈپٹ کے بعد کام سلیقے سے کرنے لگی تھی۔ گھر کے سارے کام بھابھی اور ساس کے مشورے سے خاموشی سے کرتی رہتی' کام کچھ ٹھیک ہوتے' کچھ غلط ہوتے' کبھی ساس اچھی خاصی سنا دیتیں' تو کبھی جیٹھانی اپنے تجزیے کرتیں تو لمحے دل میں اتر جاتے۔ ایسے میں اگر ربیحہ "بھاں بھاں" کرکے روتی تو اس کا جی چاہتا اس کے گلے میں گیند پھنسا دے یا منہ پر اسکاچ ٹیپ لگا دے۔ آج کل اس آفت کی پڑیا نے نیا نیا چلنا سیکھا تھا۔ مچھلی کی طرح پانی پر لپکتی اور سارے کپڑے بھگو لیتی۔

اس نے کچھ دیر پہلے ہی اس کا منہ ہاتھ دھلوا کر' صاف ستھرے کپڑے پہنا کر بیڈ سے اتارا اور اپنے قریب ہی کارپٹ پر کھڑا کیا تھا اور خود کمرے کی سیٹنگ میں لگ گئی۔ ٹی وی چل رہا تھا۔ بیڈ شیٹ جھاڑتے ہوئے اس کی نظریں بار بار اسکرین پر جا رہی تھیں۔ شارجہ کپ لگا ہوا تھا۔ پاکستان اور بھارت کا میچ تھا۔ بھارت کی باری کے بعد کھانے کا وقفہ آگیا تھا۔ اس نے صبح ہی صبح اپنے سارے کام بھگتائے۔ ساس نے واشنگ مشین لگوائی' اس نے بھابھی کے ساتھ مل کر جلدی' جلدی کپڑوں کا بکھیڑا سمیٹا۔ دوپہر کا کھانا وقت سے پہلے تیار کیا۔ برتن دھوئے اور پھر ربیحہ کو سلانے کے خیال سے پاس کھڑا ہی کیا' تاکہ اس کا بستر سیٹ کردے۔ مگر وہ آفت کی مخلوق جانے کب چلتی ہوئی ساس کے باتھ روم میں گھس گئی۔ ارم بیڈ شیٹ جھٹکنے والے انداز میں پکڑے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ سعید انور اور عامر سہیل اوپننگ کے لیے بلے گھماتے میدان میں آرہے تھے۔ اس کا جمود ساس کی کرخت آواز نے توڑا۔

"ہر وقت کمرے میں گھسی آرام فرماتی رہنا' اتنی لمبی رات ہوتی ہے۔ اس میں دل نہیں بھرتا۔"

"آرام۔۔۔؟" اس کا دماغ گھوم گیا۔ ساس اور بھابھی کہتی ہیں' رات میں آرام کیا کرو' انیق کہتے ہیں سارا دن ہوتا ہے تمہارے پاس آرام کرنے کے لیے۔ رات میں میرے لیے وقت نہیں نکال سکتیں۔ اوپر سے دن' رات ربیحہ ــــ جانے آرام کہاں تھا؟ اسی آرام کو ڈھونڈنے میکے جاتی تھی کہ وہاں جاکر کئی دن رہوں گی' مسلسل سوؤں گی' مگر وہاں جاتے ہی ایک' دو دن امی بازار پسند کی شاپنگ کروانے لے جاتیں اور باقی دو' تین دن کو کنگ میں طاق کرنے'

سسرالیوں سے نپٹنے، شوہر کی کمزوری کو پکڑنے کے حربے سکھاتیں۔ البتہ وہاں جاکر ربیحہ سے جان چھوٹ جاتی تھی۔ فارینہ اس کے کام بھاگ بھاگ کر بڑے شوق سے کرتی تھی۔ اسے میکے آئے چار، پانچ دن گزرتے تو میاں صاحب ٹپک پڑتے۔ دل نہ لگنے کا ربیحہ بہانہ اچھا تھی اور آرام دھرا رہ جاتا۔ اس وقت ساس اسی آرام کے طعنے دیتیں گیلی ربیحہ کو اٹھائے کمرے میں لے آئیں۔

"ذرا دھیان نہیں رکھا جاتا ایک بچی کا، اگر بالٹی میں الٹ جاتی تو کیا ہوتا۔" عامر سہیل نے ایسا زور کا شارٹ لگایا۔ گیند اچھلتی کودتی باؤنڈری تک گئی۔ پورا شارجہ اسٹیڈیم میں ناچنے لگا۔ اس نے ذرا کی ذرا نگاہ اسکرین پر ڈالی اور پھر گیلی ربیحہ پر، اس کا جی چاہا اس سمندری خلقت کو سمندر میں ہی ڈبو آئے، تاکہ خوب تیر کر اپنا جی خوش کرلے۔

"جانے کون مائیں ہیں جنہیں اپنے بچے اچھے لگتے ہوں گے۔ میرا تو جی چاہ رہا ہے۔ اسے صندوق میں بند کردوں۔" وہ دل میں کڑھتے ہوئے اس کے کپڑے خوب کھینچ کھینچ کر اتار رہی تھی اور بچی کان، بال، گردن کھینچنے سے خوب چیخ رہی تھی۔ اس کے چلانے پر ساس نے پھر آواز دی۔

"کیوں رو رہی ہے یہ، اسے کچھ کھلا پلا کر سلاؤ۔ نیند آرہی ہوگی بچی کو۔"

اس نے اسے گود میں بھر کر زور سے دبوچا اور بڑبڑاتے ہوئے فیڈ کروانے لگی۔ زیادہ غصہ اسے یکسوئی سے میچ نہ دیکھنے پر آرہا تھا اور نکل ربیحہ کی کمر پر رہا تھا۔ ایسا تب ہوتا تھا جب انیق سامنے نہ ہوتا۔ اب بھی اس نے اتنی زور، زور سے اسے تھپکایا کہ بچی نہ چاہتے ہوئے بھی سوگئی۔ ارم نے کچھ سکون کا سانس لیا تھا۔

ہدف پورا کرنے کے لیے پاکستانی ٹیم فل فام میں تھی۔ جہاں رنز تیزی سے بن رہے تھے۔ وہاں وکٹیں بھی دھڑا دھڑ گر رہی تھیں۔ صرف چند اوورز کا گیم باقی تھا اور میچ ڈرامیٹک لائن پر کھڑا تھا۔ انیق کو گھر آئے خاصی دیر ہوگئی تھی۔ وہ آج میچ دیکھنے کے لیے جلدی گھر آگیا تھا۔ سارے گھر والے ساس کے کمرے میں بیٹھے محویت سے میچ دیکھ رہے تھے۔ وہ ربیحہ کو گود میں لیے دل ہی دل میں تسبیح پڑھ رہی تھی۔ وہ گھنٹہ سو کر باپ کی آواز آتے ہی اٹھ گئی تھی اور اب کبھی ماں کی ناک میں انگلی دیتی، کبھی آنکھوں میں۔ وہ بار بار اس کی انگلی دبوچ کر اسے گھورتی، مگر وہ مسکرانے لگ جاتی۔ بھابھی کو میچ سے دلچسپی نہیں تھی اور ان کے بچوں کا ہوم ورک بھی رہتا تھا۔ وہ بچوں کو لے کر اٹھیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ساس نماز پڑھنے کے لیے اٹھیں تو اسے بھی حکم صادر کرگئیں۔

"ارم! یہ سارے دن کا تھکا ہوا آیا ہے، کھانا دے دو اسے۔" ان کا حکم اس کے اندر تک کڑواہٹ گھول گیا تھا۔ اس نے حمایتی نگاہوں سے انیق کو دیکھا۔ یقیناً" وہ اس کی محویت دیکھتے ہوئے ضرور میچ دیکھنے کی حمایت کرے گا اور ویسے بھی کچھ دیر پہلے ہی اسے چائے پلائی تھی۔ مگر وہ تو لگتا تھا جنات کی گھٹی ہے۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔" اس نے اقرار کرتے ہوئے گردن ہلائی اور اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے ہی ہاتھ ربیحہ کو پکڑنے کے لیے بڑھا دیے۔ ارم نے ربیحہ کو اس کی گود میں پٹخا۔ جس پر وہ گھور کر رہ گیا اور پھر اس کے مڑنے پر ہانک لگائی۔

"اس کا فیڈر بھی دے جانا۔"

اس کا جی چاہا دودھ، دیگچی سمیت اس کے منہ پر مارے، یا زور، زور سے روئے۔ بے بسی سے اس کی آنکھوں میں دھندلا پانی آگیا تھا۔ مگر انیق نے اس کی خاطر آواز ضرور اونچی کردی تھی، تاکہ وہ کچن میں ہی کمنٹری سنتی رہے۔

روٹی بیلتے ہوئے اس کا سارا دھیان معین خان کی بیٹنگ پر تھا۔ کیونکہ سارا گیم اسی کے شارٹس پر منحصر تھا۔ اس کے اندر بھی روایتی حریف کے خون نے جوش مارا تھا۔ اس نے بھرپور شارٹ لگائی تھی۔ روٹی توے پر ڈالتے ہوئے اسے لگا جیسے وہ اس کی گیند دھکیل کر باؤنڈری پار کروا رہی ہو۔ باؤنڈری تو جانے پار ہوئی تھی کہ نہیں، مگر اس کی ساری کلائی توے پر رکھی گئی تھی۔ اس کی دلخراش چیخ پر انیق دوڑتا ہوا آیا تھا۔

"یہ کیا ہوا؟ کیا سوتے ہوئے بنا رہی تھیں۔" وہ اس کی کلائی پکڑے پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ "یہ جو بھیجا ہے نا اس میں، کبھی اسے بھی استعمال کرلیا کرو۔" اس کے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں اس کی کن پٹی پر دباؤ دے رہی تھیں۔ ایک شدید تکلیف، اوپر سے میاں سے بے عزتی اس کی آنکھیں بھاری اور جبڑے جمنے لگے۔

"دو سال ہوگئے شادی کو مگر مجال ہے، کوئی کام ڈھنگ سے کیا ہو، جانے کن خیالوں میں کھوئی رہتی ہو، جب شادی کے قابل نہیں تھیں، تو پتا نہیں تمہارے ماں باپ کو، میرے سر پر ضرور لادنا تھا۔" اک ندی تھی جو آنکھ کنارے تیزی سے امڈنے لگی۔

"اتنا کام نہیں ہوتا جتنا سر۔۔۔" اس کی نگاہ کلائی سے ہٹ کر اس کے سرخ گالوں پر پھسلتے پانی پر گئی۔ آنکھیں تو بھاری ہونے کی وجہ سے کھل نہیں رہی تھیں۔ غصہ تو اسے بہت آرہا تھا، مگر اس کے آنسو دیکھ کر وہ زور سے ہنس پڑا۔

"اب بچوں کی طرح رو کیوں رہی ہو، میں نے تھوڑی جلائی ہے، خود ہی آنکھیں بند کرکے پکا رہی تھیں احمق۔" اس نے کیبنٹ میں رکھی برن آئنٹمنٹ نکالی اور اس کی کلائی پر مل دی۔ جلد اچھی خاصی جل گئی تھی۔

"درد کچھ کم ہوا۔" اس کے ہنستے ہوئے پوچھنے پر ارم نے گردن "ہاں" میں ہلادی۔

"یہ اتنی بڑی کھوپڑی ہلا دیتی ہو، جو بالکل خالی ہے، ذرا سی زبان نہیں ہلا سکتیں۔" اس کے آنسو اور تیز ہوگئے۔

"جاؤ، جاکر کمرے میں بیٹھو، امی دے دیں گی مجھے کھانا اور ہاں۔۔۔ جیت گیا ہے پاکستان۔" اس کی بھاری پلکیں اٹھیں اور تکلیف کی جگہ حیرت اور مسرت پھیل گئی تھی۔ درد کچھ کم ہوا تھا یا تو میاں کے ہاتھ سے مرہم لگا تھا اس لیے یا پاکستان کے جیتنے کی خوشی تھی۔

فی الحال وہ ہر بات بھول گئی تھی۔ مگر وقت کے ساتھ وہ جملہ اس کے دماغ میں گردش کرنے لگا۔ "جب شادی کے قابل نہیں تھیں۔ تو ماں، باپ کو پتا نہیں تھا، میرے سر پر ضرور لادنا تھا۔"

"تو کیا میں اس کے سر پہ لادی گئی ہوں، وہ مجھ سے تنگ آگیا ہے، وہ مکمل مرد ہے، اسے مکمل بیوی چاہیے تھی، جو اس کا خیال رکھے، ناکہ کم عمر لڑکی جس کا اسے خیال رکھنا پڑے، میں اپنی حماقتوں اپنی خواہشوں کی وجہ سے اپنے ماں، باپ کی بے عزتی کرواؤں گی۔"

اسے اپنی حماقتوں پر رونا آنے لگا۔ شروع شروع میں جب کام جھنجٹ لگنے لگتے تو تھک جاتی اور اپنی ماں کے پاس جاکر اکثر روتی، شکوے، شکایتیں کرتی تو الماس بیگم اسے سمجھاتے، پچکارتے، خود رونے لگ جاتیں۔ فارینہ نے بھی سمجھایا۔

"پلیز تم امی، ابا کو کچھ مت بتا کرو۔ تمہارے جانے کے بعد وہ دونوں بہت پریشان رہتے ہیں، ان کی طبیعت خراب ہوجاتی ہے۔"

وہ ماں، باپ کی طبیعت خرابی سے ڈر گئی تھی اور واقعی اس نے کچھ نہ بتانے کی قسم کھالی۔ کم از کم وہ اپنے وجود سے انہیں تکلیف نہیں پہنچائے گی، اپنے آنسو اپنے اندر ہی رکھے گی اور جب جب انیق کے منہ سے ماں، باپ، کے لادنے کی بات سنی تو عہد کیا تھا کہ اب وہ مکمل دھیان سے کام کرے گی۔ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دے گی۔ اپنے ماں، باپ کو باتیں نہیں سنوائے گی۔ وہ اپنی ہر مرضی، خواہش، موسم، میچ، ڈرامے سب اس کے تابع کرتی چلی گئی۔ ڈیل ڈول تو شادی کے بعد قدرے بھاری ہوگیا تھا۔ اب شکل سے معصومیت کی جگہ سگھڑاپا جھلکنے لگا۔ البتہ وہ خود ان سب میں کہیں نہیں تھی۔ شاید اس کی اپنی ذات تو کہیں کھو گئی تھی۔ وقت، عمر کے ساتھ اس میں اچھی خاصی میچوریٹی آگئی تھی۔ ضماد اور عفان ڈھائی ڈھائی برس کے فرق سے آگے پیچھے اس کی گود میں آگئے تھے۔ مگر اب اسے کام کا پھیلاؤ، پھیلاؤ نہیں لگتا تھا۔

وہ ایک گھریلو عورت کی طرح کام میں لگی رہتی۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی اسے بے وقوف' احمق کا طعنہ ضرور دے دیتا' جس پر وہ صرف ایک تھکی نگاہ اس پر ڈالتی' پھر مسکرا کر گردن جھٹکتی اور اپنے کام میں لگ جاتی۔

☼ ☼ ☼

وقت اپنی بیل منڈیر پر چڑھاتا رہا۔ دنیا کی روایت کی طرح رشتے گھر تقسیم ہوگئے تھے۔ سب اپنے اپنے گھروں میں رہنے لگے۔ اس کی معصوم سی ربیحہ سترہ سال کی ہوگئی۔ وہ نہ صرف شکل و صورت میں بلکہ لاابالی پن اور شرارتوں میں ماں کی مکمل کاپی تھی۔ شاید لاپروائی عمر کا تقاضا تھا۔ باجی کا بیٹا سول انجینئرنگ کے بعد جاب کے سلسلے میں کینیڈا گیا تھا اور تقریباً" چھ برس بعد واپس پاکستان آرہا تھا۔ باجی کی خواہش تھی کہ اسے شادی کے بندھن میں باندھ کر ہی بھیجا جائے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے انیق اور ارم سے ربیحہ کا رشتہ مانگا تھا۔ انیق کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر ارم نے ہمت کرکے سوچنے کا وقت مانگ لیا تھا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے' باجی کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اتنا بڑا گھر بار' پڑھا لکھا اور کیا چاہیے تمہیں۔۔۔ ہماری ربیحہ عیش کرے گی۔" وہ کمرے میں آتے ہی اس کی عقل پر ماتم کرنے لگا تھا۔

"گھر گھر بڑا ہے تو عمر میں بھی تو بہت بڑا ہے۔" وہ دودھ کا گلاس اس کے قریب رکھتے ہوئے خود بھی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"ہماری ربیحہ ابھی بہت چھوٹی ہے' شادی کے تقاضے نہیں سمجھ سکتی۔۔۔ آپ باجی کو انکار کردیں۔"

"دو چار سال بعد بھی تو بیاہنا ہے' تو ابھی کیا حرج ہے' کفران نعمت مت کرو۔۔۔ قسمت بار بار دروازے نہیں کھٹکاتی' مگر تم میں نہ عقل ہے اور نہ ساری زندگی آنی ہے۔" انیق نے دودھ کا گلاس پکڑتے ہوئے جس انداز میں کہا۔ اس پر وہ طیش میں آگئی۔ غم و غصے سے اس کی آواز بھی بھرا گئی۔

"اسی لیے کہہ رہی ہوں۔" اس نے دانت جما کر بولتے ہوئے تیزی سے کمبل کھولا اور لیٹنے کی تیاری کرنے لگی۔

"اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ میری بیٹی کم عمری کی وجہ سے ساری زندگی کم عقلی کے کٹہرے میں نہ کھڑی رہے۔ جیسے میں کھڑی ہوں آج تک۔" وہ اپنے آنسو جبڑوں میں دبا کر فوراً" ہی کمبل تان کر سوتی بن گئی۔ وہ بھی چند لمحے اس کی پشت کو گھورتا رہا۔ پھر لیٹا تو نیند نے آلیا۔ کمرے میں صرف اس کے خراٹے تھے یا پھر نیند کا خمار' مگر وہ ساری رات جاگتی رہی۔ اس کی وہ بیٹی جس کی شرارتوں پر وہ خوب پٹائی کرتی تھی۔ اب اس کے سینے پر سوار تھی۔ وہ کسی صورت اسے جلتے' کٹتے اپنے آنسو پیتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایشیا کپ میچ کی تقریب کب کی ختم ہوگئی تھی۔ ربیحہ ایک ہاتھ میں موبائل پر میسج ٹائپ کرتی۔ دوسرے ہاتھ میں ایم پی تھری لیے کمرے سے نکل گئی۔ مگر ارم کرسی پر کہنی ٹکائے ایک ٹک اسے لاپروائی سے لاؤنج میں عفان سے چاکلیٹ چھین کر کھاتے اور پھر ضماد کے چپکے سے چٹکی کاٹ کر انجان بنی کتاب کے صفحے پلٹتے دیکھ رہی تھی۔ وہ صفحے پلٹتے ہوئے ایم پی تھری کی الاپ پر سر دھن رہی تھی۔

"بابا کی رانی ہوں' آنکھوں کا پانی ہوں۔"

"میں ان آنکھوں کی روشنی' ان کی چمک اتنی جلدی بجھنے نہیں دوں گی۔"

اس نے تہیہ کیا اور کمرا سمیٹنے لگی۔ وہ آفس سے آیا۔ ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدلے۔ بچوں کے ساتھ کھانا کھا کر لاؤنج میں بیٹھے اپ ڈیٹ دیکھ رہا تھا۔ وہ چائے بنا کرلے آئی۔

"آپ نے باجی سے بات کی۔"

"تمہارا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔" اس نے چائے کی چسکی بھر کر کپ پرچ میں رکھ دیا۔

"آپ کو اس کی معصومیت پر بالکل ترس نہیں آتا۔"

"میں باپ ہوں اس کا' عقل ہے مجھ میں۔۔۔ اس کے حق میں بہتر فیصلہ ہی کروں گا۔" وہ چند لمحے تو اسے بے فکری سے چینل بدلتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر یاسیت سے بولی تھی۔

"آپ چاہتے ہیں کہ وہ عون کے برابر ہونے کے لیے ساری زندگی پنجوں کے بل کھڑی رہے۔" لمبی سانس بھرتے ہوئے چند لمحے بعد بولی۔ "اپنی اور اس کی عمروں کا فاصلہ ناپتے" کاٹتے' وہ خود تو بالکل بٹ جائے گی' ختم ہوجائے گی' لیکن یہ فاصلہ مستقل رہے گا۔ انیق! مرد کو پہلے دن ہی پرفیکٹ بیوی چاہیے ہوتی ہے۔" اس نے لمبی آہ بھری۔

"کم از کم آج کے مرد میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ بیوی کی لاپروائی' کم عمری پر پردہ ڈال دے' درگزر کردے۔" وہ چائے کا کپ اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔ "میں نے آپ سے کبھی شکوہ نہیں کیا' کسی فرمائش کے لیے ضد نہیں کی' آپ سے ڈر کر دل میں ہی اپنی خواہشیں دباتی رہی' مگر میں اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ میں اس کی شادی کا کم از کم چار' پانچ سال تک نہیں سوچوں گی۔" اس کے جملوں سے انیق کی پیشانی لکیروں سے بھر گئی اور بھنوئیں اچکا کر اسے غصے سے گھورا۔

"آپ بھلے جو مرضی کریں' اب میں کسی سے نہیں ڈروں گی' اس کے لیے بولوں گی' احتجاج کروں گی' میں اس کے اڑان سیکھنے سے پہلے پر نہیں کاٹوں گی۔۔۔ میں باجی سے خود بات کرلوں گی۔"

وہ آخری جملہ مضبوط لہجے میں کہہ کر مڑی۔ ربیحہ' عفان کا موبائل چھین کر بھاگتی ہوئی لاؤنج میں آرہی تھی' کسی چیز میں الجھ کر دھڑام سے گر گئی اور موبائل بھی دور گر گیا۔

"ہائے! بابا میں مر گئی' اوئی مما۔ ہائے۔" وہ اپنا پاؤں پکڑے چلا رہی تھی۔ اس کے آنسو ایسے گر رہے تھے جیسے چوٹ کے منتظر ہی تھے۔ انیق صوفے سے اٹھ کر اس کے قریب ہی پنجوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کا پاؤں دیکھنے لگا۔

"بابا۔۔۔" وہ کہنی سے آنسو رگڑ کر سامنے دانت نکالتے عفان کی طرف اشارہ کرنے لگی۔

"بابا۔۔۔ اس بدتمیز نے بددعا دی ہے' کمینہ بھوکا اپنے موبائل کے لیے مرا جارہا تھا' ہائے! بہت درد ہورہا ہے' بابا! ماریں اسے دیکھیں' دیکھیں کیسے ہنس رہا ہے۔"

اس نے ایک نظر عفان کو دیکھا اور پھر ربیحہ کی برستی آنکھوں کو۔ وہ جانتا تھا کہ اسے اتنی تکلیف نہیں ہورہی' جتنا وہ شور مچا رہی ہے۔ وہ اپنی تکلیف پر بچپن سے۔ ایسے ہی بلبلاتی تھی' جب تک سامنے والے کو ڈانٹ نہ پڑ جائے۔ شاید اس میں ابھی تک بچپنا تھا۔ اس نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ ایک گونج تھی جو ہتھوڑے کی طرح لگی تھی۔

"جب شادی کے قابل نہیں تھیں۔ ماں' باپ کو پتا نہیں تھا۔ میرے سر پر ضرور لاد دیا تھا۔"

اس کی الجھی پھولی ہوئی پونی پر بوسہ دیتے ہوئے اس کی اپنی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ ارم کی تکلیف پر وہ یا تو اسے ڈانٹتا تھا یا پھر زور سے ہنس پڑتا تھا' مگر بیٹی کی تکلیف کے احساس سے ہی آنکھیں بھر گئیں۔ ہاں البتہ ارم نے آگے بڑھ کر اسے پیار نہیں کیا تھا۔ بلکہ اطمینان بھری سانس لی۔ موبائل اٹھایا اور مسکرا کر عفان کو دے دیا۔

☼

سمیرا حمید

امرحہ کی پیدائش کے وقت اتفاقی طور پر رونما ہونے والے چند ناگوار اور نقصان دہ واقعات کے سبب وہ اپنے خاندان میں "منحوس" مشہور ہو جاتی ہے۔ اس کے بابا، اماں، دادی اور تینوں بہن بھائی دانیہ، عماد اور علی اسے اکثر جنم جلی، منحوس، کالی نظر اور کالی زبان کہتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی منگنی بھی ان ہی افواہوں کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اپنی نحوست کے صبح شام قصے سن کر امرحہ خود ترسی کا شکار ہو کر روتی رہتی ہے۔

پورے گھر میں صرف دادا ہی اس کی دل جوئی کرتے ہیں اور گھر والوں کی باتوں کو لغو قرار دیتے ہوئے امرحہ کو بھی ان پر کان دھرنے سے منع کرتے ہیں۔ امرحہ کی اپنے دادا سے خوب بنتی ہے۔ وہ سارا دن ان کے ساتھ پنجاب لائبریری میں گزارتی ہے۔ جہاں وہ لائبریرین تھے دادا اسے سمجھاتے ہیں کہ تم پڑھائی پر دھیان دو اور اسکالر شپ لے کر باہر ملک چلی جاؤ۔ امرحہ اپنے باقی بہن بھائیوں کی طرح پڑھائی میں کمزور ہے، مگر دادا کی بات پر وہ ٹاپ کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دیتی ہے، مگر پھر بھی بہت اچھے نمبر حاصل نہیں کر پاتی۔ اسی دوران اس کی شادی کا سلسلہ چلتا ہے، مگر پندرہ روز قبل دولہا کی جوان بہن کے بیوہ ہو جانے پر اس کی شادی رہ جاتی ہے اور اس کی نحوست پر ٹھپہ لگ جاتا ہے۔ امرحہ دل برداشتہ ہو کر نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد امرحہ کی زندگی مزید تلخ ہو جاتی ہے۔ وہ مختلف بیرون ملک کالج و یونیورسٹیوں کے ہزاروں آن لائن اسکالر شپ فارم بھرتی ہے، مگر ہر جگہ سے انکار ہوتا رہتا ہے۔ بالآخر مانچسٹر یونیورسٹی سے اسے اسکالر شپ مل جاتا ہے۔ جو اس یونیورسٹی کی طلبا سوسائٹی اپنے ذاتی فنڈ سے دیتی ہے۔ جس کی رو سے امرحہ کو تیس فیصد ادا کرنا ہوتا ہے، باقی ستر فیصد کی ادائی ان کی طرف سے ہوگی۔ اس کے علاوہ دو دن کی میزبانی کے

مکمل ناول

بعد امرحہ کو اپنی رہائش اور اخراجات کا خود بندوبست کرنا ہوگا۔ یہ سب باتیں اسے برطانیہ پہنچنے کے بعد دائم بتاتا ہے۔ دادا جی امرحہ کے لیے پیسے اکٹھے کرکے اسے برطانیہ بھجوا دیتے ہیں۔ باقی اسے خود اپنے بل بوتے پر کرنا ہوگا۔ عذرا، شرلی، مینی لو اور للی کول سے اس کی ابتدائی ملاقات ہوتی ہے۔

امرحہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک کافی شاپ میں جاب کرنے لگتی ہے اور لیڈی مہر کے گھر اس کی رہائش کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔ لیڈی مہر بے اولاد خاتون ہیں۔ انہوں نے اپنے شنل کاک نامی اپنے ہاسٹل نما گھر میں مختلف بچوں کو اولاد کی طرح رکھا ہے۔ ان ہی میں ایک عالیان مارگریٹ ہوتا ہے۔ وہیں سادھنا، ویرا اور این اون سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ جاب کے دوران وہ ڈیرک کے ساتھ مل کر ڈاکومنٹری فلم بنانے لگتی ہے۔

اسی دوران امرحہ کے بابا جن کی اعظم مارکیٹ میں قالین کی دکان ہوتی ہے، آگ لگ جاتی ہے۔ جس سے ان کا بیس پچیس لاکھ کا نقصان ہو جاتا ہے۔ انہیں اٹیک ہو جاتا ہے۔ امرحہ انہیں تسلی دیتی ہے اور ڈاکومنٹری فلم سے ملنے والے پیسے ان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ لیڈی مہر بھی اسے ایک چیک دیتی ہیں۔ امرحہ وہ رقم بھی پاکستان بھجوا دیتی ہے۔ امرحہ کے والد بہت خوش ہوتے ہیں۔ امرحہ اپنی کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے جب عالیان مارگریٹ کسی اسپائیڈر مین کی طرح اس کی کھڑکی میں جھانکتا ہے۔ امرحہ کی چیخ نکل جاتی ہے۔

عالیان بتاتا ہے 'یہ اس کا گھر ہے' وہ اس کے کمرے کی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا' تھوڑی دیر بعد گھر میں آوازیں گونجنے لگیں تو سادھنا نے بتایا کہ لیڈی مہر کا بیٹا آیا ہے۔ وہ لیڈی مہر کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ وہ لیڈی مہر کے بیڈ پر بیٹھا انہیں کیک کھلا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ لیڈی مہر نے ایک بار بتایا تھا کہ ان کا بیٹا بھی اس کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے اور بہت قابل ہے۔

امرحہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا نام عالیان تھا اور اس کی ماں کا نام مارگریٹ۔ اسے عجیب سا لگا' ناجائز؟

دوسرے دن لیڈی مہر کی سالگرہ تھی' جوان کے بچوں نے بڑے اہتمام سے منائی۔ انہوں نے امرحہ کو عالیان کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے اسے ایک ادارے سے لیا تھا اور بڑی تن دہی سے اس کی تربیت کی ہے۔ امرحہ کو افسوس ہوا کہ اس کی اماں نے کبھی بیٹوں کی تربیت پر توجہ نہیں دی تھی۔

ویرا کا ساتھ امرحہ کو احساس دلا رہا تھا کہ عورت بھی بہادر ہو سکتی ہے۔ عالیان کی توجہ نے امرحہ کو ایک عجیب احساس سے دوچار کر دیا' وہ لاشعوری طور پر عالیان سے متاثر ہو رہی تھی۔

۳ تیسری قسط

اور مشرقی لڑکیوں کے لیے یہ موت جلد نازل ہوتی ہے

وہ برف سے اٹی زمین پر چل رہی ہے لیکن ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ وہ زمین میں دھنس رہی ہے۔

دل احساسات کا اکھاڑا ہے اور دماغ اس اکھاڑے کا شیر۔۔۔ یہ شیر دھاڑتا ہے تو دل جل کر۔۔۔ بجھ کر۔۔۔ ٹھنڈا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔۔۔

مشرق کے اکھاڑوں میں یہ شیر نگر نگر پایا جاتا ہے۔

مشرق سنیاسی بھی ہے اور سامری بھی۔۔۔

مشرق میں پربت بھی ہیں اور پاتال بھی۔۔۔

سنگ پارس بھی۔۔۔ سنگ راہ بھی۔۔۔

جوت بھی۔۔۔ جھوک دیپ بھی۔۔۔

یہاں جوگ بھی ہے اور جوگن بھی۔۔۔

ایسی زرخیز دھرتی کے باسیوں پر موت کیوں نازل نہ ہوا کرے۔

☼ ☼ ☼

کہا جاتا ہے کہ شادی ایک ایسا مقدس فریضہ ہے جس کی ادائی کے دوران آپ فرشتوں سے "ابدی محبت" کی دعاؤں کے تحائف وصول پاتے ہیں۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شادی خوش نصیب لوگ کرتے ہیں۔

کچھ یہ بھی کہ کائنات میں حقیقی جشن کا لمحہ دو دلوں کے مقدس ملن کا لمحہ ہوتا ہے۔

اور جائز ہونے کی بڑی اہمیت ہے۔

اور اجازت نامے کا بلند رتبہ ہے۔۔۔ بلند بہت بلند۔

اور پاک کتابیں، حکایتیں بتاتی ہیں کہ کائنات کی، اشرف المخلوق کی اولین شادی عرش خدا پر انجام پائی اور بعد ازاں ہونے والی ہر شادی عرش خدا پر انجام پائی شادی کا ہی رتبہ پاتی ہے۔

نکاح۔۔۔ سب سے پاک اور پسندیدہ روایت۔۔۔

نکاح۔۔۔ دو دلوں کی فضیلت۔۔۔

اور داستانیں یہ بھی کہتی ہیں کہ تبت کے برفیلے پہاڑوں میں روپوش ایک مشک باریری' اپنی بہترین پوشاک میں طویل مسافت طے کرتی اس مشک مشک بندھن میں بندھنے والوں پر مشک بید (بید کے خوشبو دار پھول) برسا کر جاتی ہے۔ جاتے جاتے وہ تحفے کے طور پر دولہا دلہن کی مسکراہٹیں اپنی مٹھی میں قید کر کے لے جاتی ہے۔

اور شادی عہد قدیم کا وہ عہد نامہ بھی ہے، جس کا ورد "عہد جدید" میں بھی عزت و احترام اور محبت سے کیا جاتا ہے۔

مورگن کرسمس کی رات کو آچکی تھی۔ ماما مہر نے اس کی شادی کے لیے ٹھیک ٹھاک تیاریاں کی تھیں۔ کیمبرج میں مورگن نے شادی کے بعد رہنے کے لیے جوش کے ساتھ مل کر ایک چھوٹا سا گھر لیا تھا۔ جس کی سجاوٹ کے لیے ماما مہر نے پیسے مورگن اور جوش کو دیے، جو دونوں نے بہت مشکل سے قبول کیے۔ مورگن نے شادی کے لباس، زیورات، شادی کے دن اور آفٹر پارٹی کے سب انتظامات ماما مہر کی پسند سے کیے تھے۔ حتیٰ کہ اس نے شادی کی انگوٹھی بھی ماما مہر کی پسند کی لی تھی۔

ماما مہر کے سامنے ان کی "میں" ختم ہو جاتی تھی اور ماما مہر بھی ان کی آنکھوں میں پڑھ لیتی تھیں کہ ان کے بچے کیا چاہتے ہیں' یہ ماں اور اولاد کا وہ رشتہ تھا جس کی مثال نہیں ملتی تھی۔

اپنی شادی کی تیاری سے زیادہ مورگن کو ماما مہر کے کام کرنے میں دلچسپی تھی۔ پارلر جانے سے زیادہ اسے یہ فکر تھی کہ ماما مہر نے میڈیکل چیک اپ کے لیے جانا ہے۔ جوش فون کرتا رہتا تھا اور وہ اسے چند سیکنڈ بات کر کے ڈانٹ دیا کرتی تھی۔

"مجھے ڈسٹرب نہ کرو' ماما کے ساتھ بات کر رہی ہوں۔" کیمبرج کی ہزاروں داستانیں وہ ماما کو سنایا کرتی اور دونوں کے قہقہوں سے شنل کاک گونجا کرتا۔

مورگن نے سادھنا اور امرحہ کو Mates Brides (شہ بالیاں) بننے کے لیے کہا۔ امرحہ جس نے پاکستان میں اپنی نحوست کی داستانوں کی وجہ سے شادیوں میں شرکت نہیں کی تھی۔ وہ مورگن کی شادی کے لیے اتنی پرجوش تھی جیسے اس کی اپنی شادی ہو۔ لیڈی مہر نے شہ بالیوں کے لیے سنہری رنگ کو پسند کیا تھا۔ سادھنا کی سنہری ساڑھی بنوا دی گئی تھی۔ شارلٹ اور مورگن کی چند سہیلیاں جن کی آمد متوقع تھی اور امرحہ کے لیے انگریزی طرز کی ٹخنوں تک لمبی فراکیں۔

فراک کا اوپری حصہ قدرے چست تھا جو نیچے آتے آتے لہریں بناتے گھیر دار ہوتا چلا جاتا تھا۔۔۔ ذرا سی حرکت سے ان لہروں میں تلاطم پیدا ہو جاتا جو بہت بھلا لگتا تھا۔ سنہرے موتیوں سے فراک کی پشت کو سجایا گیا تھا اور لہروں میں اسے ٹانکا گیا تھا کہ جنبش پر وہ لہروں کے ساتھ جھلمل کرتے گپ چھپ ہونے لگتے تھے۔

امرحہ کے لیے دوپٹے کی جگہ سنہری اسکارف نما کپڑا تھا جسے کندھوں کے پیچھے سے لاکر بائیں شانے پر آگے لہریں دے کر سنہری بروچ لگا کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ کام فراک کی ڈیزائنر نے کیا تھا اور کیا کمال کیا تھا کہ امرحہ دوپٹے کے اس انداز پر حیران رہ گئی۔ دوپٹے کی کمی بھی

پوری ہوگئی اور فیشن بھی ہوگیا۔

فراک بلاشبہ بہت مہنگی تھی اور امرحہ سے ایک پونڈ بھی نہیں لیا گیا تھا۔ لیڈی مہر کی لاڈلی بیٹی کی شادی تھی۔ باقی جن بچوں نے شادیاں کی تھیں انہوں نے رجسٹر میرج کی تھی۔ یہ پہلی شادی تھی جو لیڈی مہر کی خواہش پر اتنے اہتمام سے ہو رہی تھی اگر مورگن کے بس میں ہوتا تو شاید وہ ایک پونڈ بھی اپنی شادی پر خرچ نہ کرتی۔ جب شادی کے ہال میں دلہن کے کمرے میں ماما مہر نے مورگن کو دلہن بنے دیکھا تو وہ بے اختیار رونے لگیں۔ وہ مورگن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھی رہیں۔۔۔ اسے دعائیں دیتی رہیں۔ اس کی نظر اتارتی رہیں۔۔۔ اور مورگن اپنی گھیردار سفید پوشاک کو کارپٹ پر پھیلائے ماما مہر کے قدموں میں بیٹھی ان کے آنسو اپنے ہاتھ میں پکڑے ٹشو سے صاف کرتی رہی۔۔۔ اس سے زیادہ مقدس منظر اور کون سا ہو سکتا تھا بھلا۔۔۔؟

گلابی پھولوں کا دستہ پکڑے کونے میں کھڑی امرحہ اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اپنی آئندہ زندگی میں وہ اس خاتون مہر سے زیادہ عظیم ہستی سے نہیں مل سکتی نہ ہی وہ خود ان جیسی عظیم ہو سکتی ہے۔ جس نے ہر قوم و نسل کے بچوں سے والہانہ پیار کیا۔۔۔ انہیں پالا۔۔۔ انہیں اپنا بنایا۔۔۔ انہیں یقین دلایا کہ وہ ان کے نہ ہو کر بھی ان ہی کے ہیں۔۔۔ وہ ان کی حقیقی ماں بے شک نہیں ہیں لیکن حقیقی ماں سے کسی صورت کم بھی نہیں ہیں۔

یہ سب کرتے خاتون مہر نے بلاشبہ دو رتبے پائے ہیں۔۔۔ ایک عظیم ماں ہونے کے اور ایک عظیم انسان ہونے کے۔۔۔ انہوں نے ان سب کے لیے خوشیوں کے سامان اکٹھے کیے۔۔۔ کامیابی کے بھی۔۔۔ ان کے لیے محبت کو کبھی تفریق نہیں کیا۔۔۔ وہ انہیں جمع کر کر کے دیتی رہیں۔۔۔ انہیں ضرب ہو ہو کر ملتی رہی۔

کائنات میں یہ خصوصیت صرف محبت ہی اپنے نام رکھتی ہے۔ یہ دینے سے اور زیادہ ملتی ہے۔۔۔ یہ پلٹ کر واپس ضرور آتی ہے۔۔۔ خسارے میں رہ کر بھی فائدے میں رہتی ہے۔

محبت جب خلوص دل سے انسانیت کے نام پہ کی جائے تو وہ آپ کو عظیم بنا ڈالتی ہے۔

عظمت کی بلندیوں تک لے جانے کا وصف محبت کے علاوہ کسی اور جذبے میں نہیں۔

اس لمحے میں امرحہ نے یہ سوچا تھا کہ کچھ لوگ ہمارے اپنے نہ ہو کر بھی ہمیں کتنی خوشی دے دیتے ہیں۔۔۔ اور کچھ جو ہمارے اپنے ہوتے ہیں وہ کیسے ہمیں آٹھ آٹھ آنسو رلاتے ہیں۔ وہ دادی اور اماں کے بارے میں سوچ رہی تھی، اپنے خاندان والوں کے بارے میں جنہیں اس وقت راحت ملا کرتی تھی جب وہ کرب میں ہوا کرتی تھی۔ اس کی شکل دیکھتے ہی انہیں یاد آجایا کرتا تھا کہ اسے کیسے کیسے تکلیف دی جا سکتی ہے۔

شہہ بالیاں تین تین کی قطار میں دلہن مورگن کے پیچھے دائیں بائیں اپنے اپنے گلدستے پکڑے کھڑی تھیں۔ وہ ہال کے قد آدم دروازے کے پاس آکر کھڑی ہو چکی تھیں۔ دلہن گھبرا رہی تھی اور وہ بار بار اپنی سانسیں درست کر رہی تھی۔

ہال میں سب اس کی آمد کے منتظر تھے۔ دلہن کا ہی انتظار کیا جا رہا تھا۔ برطانوی معاشرے میں جہاں ایک منٹ ادھر سے ادھر ہونے نہیں دیا جاتا صرف ایک دلہن کو دس منٹ تاخیر کی اجازت ہے۔۔۔ لیکن انگریزی خون کی حامل دلہنیں دس منٹ کی تاخیر بھی گناہ سمجھتی ہیں۔۔۔ برطانوی شہزادی لیڈی ڈیانا کی بہو کیٹ مڈلٹن ڈچز آف کیمبرج نے ایک سیکنڈ کی تاخیر بھی نہیں کی تھی۔۔۔ پاکستانی دلہنیں اور باراتی سن لیں ایک سیکنڈ کی تاخیر بھی نہیں۔۔۔

اور وقت کی پابندی وہی قومیں کرتی ہیں جنہیں وقت پر منزل پر پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے۔۔۔ جو وقت کو ہندوستان کے کوہ نور سے زیادہ قیمتی سمجھتی ہیں۔۔۔ وہ نہیں جن کی کوئی منزل ہوتی ہے نا مقصد۔۔۔ وقت

آئے یا جائے ان کی بلا سے۔۔۔ اور وہ کیا جانے وقت کس "کوہ نور" کا نام ہے۔

اور یہ خوش قسمتی بھی صرف عورت کے نصیب میں لکھی گئی ہے کہ دلہن بنے اسے کسی شہزادی اور ملکہ سے کم نہیں سمجھا جاتا۔۔۔

عورتوں کو اپنی کم مائیگی کے رونے رونے چھوڑ دینے چاہئیں۔۔۔ وہ ماں بنتی ہیں تو وہ سب رشتوں سے الگ اونچے مقام پر کھڑی تصور کرلی جاتی ہیں۔۔۔ ایک کم عقل بھی سمجھ جاتا ہے کہ "عورت ماں" بن جائے تو پھر کوئی اور اس کی برابری نہیں کر سکتا۔

بلند و بالا چھت اور قد آدم پھولوں سے سجی کھڑکیوں سے گھرے، قدیم برطانوی طرز تعمیر کے چرچ نما ہال کے سرخ قالین پر سفید رنگ کی سنڈریلا فراکیں پہنے اور سر پر گلابی ربن باندھے دو انگریز بچیاں اپنی پھولوں کی ٹوکریوں میں سے پھولوں کی پتیاں نکال نکال کر دلہن مورگن کے آگے چلتے ہوئے پھینک رہی تھیں۔

دلہن نے ہال کے کھلے پھاٹک سے اندر قدم رکھا۔۔۔ سب کی گردنیں پیچھے اس کی طرف مڑیں۔۔۔ ٹھیک اسی وقت ہال کے اندر پادری سے ذرا ہٹ کر بیٹھے سولہ رکنی وائلن گروپ نے اپنے ساز سنبھالے اور نرمی سے انہیں چھیڑا۔۔۔ وہ اس دھن کو بجانے کی تیاری کرنے لگے جو فرشتوں کی دعاؤں کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے۔

ٹھیک اسی وقت۔۔۔ عین اسی وقت کوئی تیزی سے بھاگتے کالے سوٹ پر ہلکے نیلے رنگ کی ٹائی باندھتے دلہن کے پیچھے تین ادھر اور ادھر قطار کی صورت چلنے کی تیاری کرتی شہہ بالیوں کے پیچھے آیا۔۔۔ امرحہ دائیں طرف شارلٹ کے پیچھے آخر میں تھی۔۔۔

سنہرے پانیوں سے نکلی۔۔۔ ایک امرحہ۔۔۔

عربی شہزادے کے گھوڑے سے اترا۔۔۔ ایک عالیان۔۔۔

وائلن کے دھیمے سُر اسی وقت دولہا دلہن سے سجے ہال میں بکھرے۔۔۔

عالیان کی آمد کی ایسی خوشی۔۔۔

کیا انٹری تھی عالیان کی۔۔۔ وہ سر سنگیت ساتھ لایا تھا۔

آہٹ پر امرحہ نے گردن موڑ کر دیکھا۔۔۔ وہ جلدی جلدی اپنی ٹائی کو باندھنے کی کوشش کر رہا تھا، شاید اس نے زندگی میں پہلی بار سوٹ اور ٹائی پہنی تھی۔ ٹائی کو وہ ایسے باندھ رہا تھا جیسے گلے میں پھندے کو فٹ کر رہا ہو۔

اسے تو ایک ہفتے بعد آنا تھا، وہ ایک ہفتہ پہلے کیسے آ گیا تھا۔۔۔ امرحہ کے پیچھے چلتے وہ اپنی ٹائی کے ساتھ مصروف تھا۔۔۔ شاید اسے بھی خود کو ہر صورت دولہا کی طرح خوب صورت دکھانا تھا۔۔۔ اس کے بال سلیقے سے جمے تھے۔

"کہا جاتا ہے کہ شادی کے دن کوئی مرد اور کوئی عورت دولہا دلہن سے زیادہ خوب صورت نہیں لگ سکتے۔ اور میرا یہ کہنا ہے کہ اگر کوئی لڑکا لڑکی دولہا دلہن سے زیادہ خوب صورت لگنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کے معاملے میں شدید گڑبڑ ہوتی ہے۔۔۔ اس کی شادی

نہیں بھی ہوتی اور وہ اپنی شادی جیسا خوش ہوتا ہے۔۔۔ ہنسنے کی بات نہیں بھی ہوتی اور وہ ہنس رہا ہوتا ہے۔۔۔ شدید گڑبڑ کا معاملہ ہوتا ہے بلاشبہ۔" مجھے بتایا جائے کہ دلہن کون ہے؟ کیا صرف سفید لباس والی؟"

امرحہ کے عین پیچھے چلتے موتیوں سے گندھے بالوں سے ذرا پیچھے ذرا قریب ہو کر سرگوشی میں پوچھا۔ امرحہ نے اس کی بات پر توجہ نہ دی۔ وہ سفید پھولوں سے سجے ہال کو دیکھ رہی تھی اور بے حد اونچی چھت سے جھولتے کئی میٹر چوڑے اور لمبے فانوس کو جس کی روشنی نے سارے ہال کو بقعہ نور بنا ڈالا تھا۔ وائلن تھے قمقمے تھے' پھول تھے' قہقہے تھے' دولہا دلہن تھے۔ عالیان اور امرحہ تھے اور اس تقریب کو کیا چاہیے تھا؟

لیڈی مہر کے سب بچے اپنے اپنے بچوں' بیویوں اور کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ موجود تھے۔ باقی جوش کے گھر والے' رشتے دار اور دوست تھے۔ کافی زیادہ لوگ تھے' سب دو اطراف نشستوں پر براجمان تھے۔

امرحہ کے پیچھے سے گھوم کر ماما مہر کے ہاتھ کو چوم کر عالیان جلدی سے جا کر دولہا کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس نے جوش سے ہاتھ ملایا۔ اپنا تعارف کروایا اور جوش کے شہ بالا کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔

دلہن پادری کے سامنے اور دولہا کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ سب کھڑے ہو گئے۔ تعظیم میں پھر شادی کی رسم شروع ہو گئی۔

اجازت نامہ دیا جانے لگا۔

اجازت نامہ دہرایا جانے لگا۔

شہ بالیاں دلہن سے پیچھے ہٹ کر قطار میں کھڑی ہو گئیں۔۔۔ وہ سب دولہا اور دلہن کو دیکھ رہی تھیں۔

امرحہ واجد آج بہت خوش تھی۔ یہ پہلی تقریب تھی جس میں وہ روئے بنا شریک تھی۔ ڈرے بنا۔۔۔ اسے کونے میں جھینپ کر بیٹھنے کی جلدی تھی نہ ضرورت۔۔۔ اس کے لیے وقت بدل چکا تھا۔۔۔ وہ پھولوں کو تھامے گردن اٹھائے' مسکراہٹ سجائے۔۔۔ خوب صورت لگ سکتی تھی۔۔۔ خوش ہو سکتی تھی۔

وہ خوب صورت لگ رہی تھی۔۔۔ خوش تو وہ بلاشبہ بہت تھی۔۔۔

مشک بار پری آ چکی تھی اور مشک بید برسا رہی تھی۔۔۔ شاید وہ تھوڑی سی اور مہربان ہو گئی ہو اور اس نے دلہن کی طرح ہی خوب صورت لگنے والی امرحہ پر بھی کچھ مشک بید برسائے ہوں۔

اگر اس نے یہ کام نہیں کیا تھا تو یہ کام عالیان کر رہا تھا۔۔۔ اس کی بھوری آنکھیں سنہری ہوتی جا رہی تھیں۔۔۔ امرحہ اس سے ذرا فاصلے پر سامنے کھڑی تھی۔ امرحہ کو نہیں معلوم تھا کہ وہ دولہا کے پیچھے کہیں کھڑا ہے' نہ ہی اس نے معلوم کرنا چاہا اور عالیان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی ہال میں موجود ہے۔۔۔

"دولہا۔۔۔ دلہن۔۔۔ اچھا۔۔۔ اور دوسرے لوگ۔۔۔ کیا واقعی یہ ہال میں موجود ہیں۔۔۔ ایسا ہو گا۔۔۔ میرا نہیں خیال۔۔۔"

قدیم اور پرشکوہ چرچ نما کئی سو گلد ستوں سے سجے وسیع ہال کے جگمگ کرتے فانوس کے عین نیچے بچھے سرخ قالین پر کھڑا گرانٹ پرنیاں کے سر کی طرف جھک رہا تھا۔ اس بار وہ "Gloxinia" کو اس کے نفاست سے گندھے سنہری موتی جڑے بالوں میں لگا رہا تھا پھر اس نے پرنیاں کے ہاتھوں کو تھام لیا اور دلہن کی طرف دیکھنے کا اشارہ کیا۔۔۔ "تم میرے لیے ہمیشہ اس پہلے دن کی دلہن کی طرح خوب صورت اور خاص ہو گی۔"

"اس بار تمہیں اس عہد نامے کو سب کے سامنے دہرانا ہو گا۔" پرنیاں نے ادا سے کہا۔

"میں عالیان کے ساتھ اس عہد نامے کو دہرانے کے لیے تیار ہوں۔"

"میں امرحہ کی طرح انتظار کرنے کے لیے تیار ہوں۔" پرنیاں نے بالوں میں لگے "Gloxinia" کو محبت سے چھو کر کہا۔۔۔ ساتھ ہی وہ مسکرائی۔۔۔ وہ مسکرا سکتی تھی اس کے ہاتھ گرانٹ نے تھام رکھے تھے۔

عالیان مسکرایا۔۔۔ وہ مسکرا سکتا تھا۔۔۔ اس کی آنکھوں نے سنہرے رنگ کو تھام رکھا تھا۔۔۔ گلابی پھولوں کے گلدستے میں مسکراہٹ اٹکی تھی۔۔۔ جھلمل کرتی موتی جڑی لہروں میں اس کا دل لک چھپ' گپ چھپ ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔۔۔ بھاگ کر جائے اور وائلن کو اپنی ٹھوڑی تلے لے کر دھنا دھن کر ڈالے یا۔۔۔ چھت کے ساتھ جھولتے فانوس کے ساتھ جھول جائے اور اعلان کرتا پھرے۔۔۔ یا کئی سو پھولوں کے گلدستوں کو اپنی بانہوں میں بھر کر سنہری پوشاک کے قدموں تلے ڈھیر کر دے۔۔۔

اور یہ بھی کم تھا۔۔۔ یہ سب بھی کم تھا۔

سب کم ہی ہوتا ہے۔۔۔ سب کم ہی لگتا ہے۔

محبت اس عروج کا جذبہ ہے کہ سب ادائیگیاں تولہ ماشہ ہی لگتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

یونیورسٹی پھر سے آباد ہو چکی تھی۔۔۔ سترہ جنوری سے امتحانات شروع تھے۔ سب دن رات پڑھنے میں مصروف ہو چکے تھے۔ اس کے سب دوست اس کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آئے تھے۔ وہ خوش تھی کہ سب نے اسے یاد رکھا تھا لیکن وہ کسی کو بھی یہ بتا نہ سکی کہ اس نے سب کو کتنا یاد کیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد اس کا کیا حال ہوا تھا۔

"میں واپس آ چکا ہوں۔"

"مجھے نظر آ رہا ہے۔۔۔" مورگن کی شادی کے بعد یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔

"تو چلیے پھر؟" وہ سویڈن کا پانی پی کر پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو کر آیا تھا۔

"کہاں۔۔۔؟"

"ہوم کمنگ ڈرنک کے لیے۔" (گھر واپسی کی دعوت کے لیے)

جو جا چکے تھے انہوں نے جو مانچسٹر میں رہ چکے تھے سے ہوم کمنگ (Coming) ڈرنک پی تھی۔ کھانے پینے کا اچھا انداز تھا۔

"میں کسی ایسی ڈرنک کو نہیں جانتی۔" وہ صاف مکر گئی جبکہ وہ ویرا ایمن اون کو پلا چکی تھی۔

"نہیں جانتیں تو میں بتا رہا ہوں ٹونی ولسن کہتا ہے

"This is Manchester we do things differently here"

(یہ مانچسٹر ہے ہمیں انفرادیت کا خبط ہے)

تو جب ہم گھر واپس آتے ہیں تو اسے بھی مختلف انداز سے ٹریٹ کرتے ہیں۔ تم مانچسٹر میں ہو' تمہیں یہ کرنا پڑے گا۔۔۔ صرف دو پونڈ کی کاک ٹیل۔۔۔ اور بس۔" وہ جان چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

وہ اسے دو پونڈ کی کاک ٹیل کے لیے قریبی کیفے میں لے آئی جہاں اور بھی بہت سے اسٹوڈنٹس دو پونڈ کی کاک ٹیل پی رہے تھے۔

"نئے سال کے لیے کیا کیا عہد و پیمان کیے ہیں تم نے؟"

"سستی نہ کرنا اور وقت پر نوٹس بنانا۔۔۔ دوسرے سمسٹرز میں 80% رزلٹ لانا۔" عزم سے کہہ کر وہ مسکرانے لگی۔

وہ ہنسنے لگا لیکن امرحہ نے تو کوئی لطیفہ نہیں سنایا تھا۔

"اب تم ہنسے کیوں۔۔۔؟"

"کیونکہ تحقیق کہتی ہے کہ ساٹھ فیصد سے زیادہ لوگ سال کے پہلے ہی ہفتے خود سے کیے عہد کو بھلا دیتے ہیں اور باقی کے چالیس فیصد سے زیادہ افراد یہ کام چھ ماہ کے اندر کر گزرتے ہیں۔"

"میں ان ساٹھ فیصد میں سے ہوں نہ ہی چالیس فیصد میں سے۔" اس نے عزم سے کہا۔

"مجھے فخر ہے تم پر۔" اس نے اسے چڑایا۔ دو پونڈ کی ڈرنک وہ آہستہ آہستہ پی رہا تھا کہ وہ ختم نہ ہو جائے۔

"تم دیکھ لینا میں شان دار کامیابی حاصل کروں

گی۔"

"میں ضرور دیکھنا چاہوں گا۔۔۔" سویڈن کا پانی اسے بری طرح سے راس آیا تھا۔

"تم مجھے چیلنج دے رہے ہو۔"

"میں تمہیں چیلنج دے رہا ہوں۔۔۔" ٹیبل پر مکا مار کر اس نے کہا۔

"اگر میں جیت گئی۔۔۔؟" امرحہ نے انگلی اٹھا کر کہا۔

"مشکل ہے۔"

"اگر میں جیت گئی بولو۔۔۔ پھر؟"

"ناممکن ہے۔" دونوں شانے نال میں ہلائے۔

امرحہ نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ "پاکستان میں ایسے موقعے پر کہا جاتا تھا 'تمہارے منہ میں خاک۔" وہ یہ بڑبڑا کر رہ گئی۔

"تو جو تم کہو گی میں وہ کروں گا۔۔۔ وہ گلے میں پھندا ڈال کر چھت سے لٹک جانا ہی کیوں نہ ہو۔" وہ اتنا نالائق سمجھتا تھا وہ امرحہ کو۔۔۔

"ٹھیک ہے پھر ڈیڑھ سال بعد ملتے ہیں۔۔۔ اسی میز پر تیار رہنا پھندا ڈالنے کے لیے۔"

"مطلب تم ڈیڑھ سال تک مجھ سے ملو گی نہیں۔۔۔ میں چیلنج واپس لیتا ہوں۔"

"اف! مطلب اس معاملے کو ہم ڈیڑھ سال بعد دیکھیں گے۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ مسکرانے لگا۔ چڑانے والی مسکراہٹ۔

"یہ انگریز خود کو سمجھتے کیا ہیں۔۔۔ سمجھتے ہیں سب یہی کر سکتے ہیں۔ ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔۔۔ سب کر سکتے ہیں ہم۔۔۔ خیر امرحہ دیکھ لے گی اس انگریز کو اب۔۔۔ امتحانات میں ایک ہفتہ تھا اور سب جنوری کے پہلے ہفتے ہی واپس آچکے تھے اور جنوری کی برف باری میں ایران کا محسن رسولی اور مصر کا موسیٰ فٹ بال کھیلنا چاہتے تھے۔ امتحان تو پھر آجائیں گے بلکہ سال میں دوبار۔۔۔ لیکن ایسی غضب کی سوسالہ ریکارڈ توڑتی برف باری شاید پھر نہ آئے۔ ایرانی اور مصری یقیناً سوتے میں بھی خود کو فٹ بال کھیلتے پاتے ہوں گے اور اپنی زندگی کے خاص دن "شادی" پر بھی فٹ بال کھیلنے کے بلاوے کو رد نہیں کر سکتے ہوں گے۔

محسن رسولی نے دو ٹیمیں جمع کرلی تھیں' میچ کے لیے برف سے اٹے گراؤنڈ میں رات کو میچ تھا۔۔۔ برف کا ڈھیر اور اس پر فٹ بال میچ۔۔۔ واہ۔۔۔

"تم بھی میرے ساتھ کھیلو گی؟" ویرا نے کہا۔

امرحہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

"کیا مصیبت آگئی ہے تمہاری جان پر؟" ویرا نے گھونسا مارا اس کی کمر پر۔

"میں نے کبھی موبائل پر فٹ بال گیم نہیں کھیلی۔ تم مجھے برف پر خونخوار کھلاڑیوں کے ساتھ کھیلنے کو کہہ رہی ہو۔۔۔ یعنی میری موت برف پر واقع ہونی ہے۔"

"کون سا کھیل کھیلتی ہو تم؟" ویرا ایک اور گھونسا مارنے کے لیے تیار ہوئی۔

"لڈو۔۔۔ دادا کے ساتھ۔۔۔ ہاہاہا' کبھی کبھی کرکٹ وہ بھی اگر کوئی بچہ گیند کروائے آہستہ سے تو میں بلا چلا لیتی ہوں۔۔۔ ٹینس بال سے' ہارڈ بال سے بالکل نہیں۔"

"تو تم لڑکیاں فارغ وقت میں کرتی کیا ہو پاکستان میں' سائیکل تم نہیں چلاتیں' دوڑ لگانے کے لیے تمہیں کہا تو تم نے انکار کر دیا تھا۔۔۔ کوئی گیم بھی نہیں آتی تمہیں۔۔۔ کھانے کے علاوہ کچھ کرنا آتا ہے؟"

"ہاں نا۔۔۔ چغلیاں کرنا اور بات بات پر لڑنا۔" امرحہ نے اردو میں کہا اور ہنسنے لگی۔

تو امتحان چھ دن بعد شروع تھے اور وہ میچ کھیلنے کی تیاری کر رہے تھے۔ لڑکیوں میں ایک ویرا تھی اور ایک لاءِ ڈیپارٹمنٹ کی وکٹوریہ۔۔۔ وکٹوریہ کارل کی ٹیم میں تھی اور ویرا محسن رسولی کی ٹیم میں۔۔۔ جس طرح کی بمبار کھلاڑی ویرا تھی اسے دونوں ٹیمیں شامل کرنے کے لیے تیار تھیں لیکن ویرا نے چالاکی کی اس نے محسن رسولی کی ٹیم میں شمولیت کی۔۔۔ محسن رسولی یونیورسٹی میں اپنے فٹ بال کے لیے ہی تو مشہور تھا اس کے امکانات روشن تھے میچ جیتنے کے۔۔۔ اور وہی ہوا' محسن رسولی کی ٹیم میچ جیت گئی۔۔۔ تین دو سے۔۔۔ سو دو سو کے قریب اسٹوڈنٹس آئے تھے میچ دیکھنے' دستانے پہنے' مفلر لپیٹے' کافی پیتے' منہ سے بھاپ اڑاتے۔۔۔ ہر گول پر گراؤنڈ کو سر پر اٹھا لینے والے۔۔۔ امرحہ کو بھی پڑھنا تھا لیکن وہ ویرا کے لیے آگئی تھی۔ اور اچھا ہی کیا آگئی ورنہ برف کے ڈھیر پر فٹ بال کے ساتھ بمباری کرتی ویرا کو کیسے دیکھتی۔ امرحہ کا حلق بیٹھ گیا تھا چلا چلا کر۔۔۔ اس نے کسی قدر حسرت سے ویرا کو دیکھا' وہ برف کے ڈھیر پر فٹ بال کے ساتھ ایسے بھاگ رہی تھی جیسے لاؤنج میں کارپٹ پر بھاگ رہی ہو' اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے کہ وہ برف میں خود کو دفن کر لے گی ہارے گی نہیں۔۔۔ کارل نے پہلا گول کیا تھا اور ویرا نے اسے ایسے دیکھا تھا جیسے اس کی گردن دبوچ لے گی۔۔۔ اور اس نے گردن دبوچ لی تھی' اس نے یکے بعد دیگرے دو گول کیے تھے۔۔۔ مخالف ٹیم کی کمر توڑ ڈالی تھی۔۔۔ وہ پریشر میں آئے اور بمشکل مزید ایک گول کر کے ہار گئے۔

"ویرا۔۔۔ ویرا!" اسٹوڈنٹس نے گراؤنڈ سر پر اٹھا لیا۔ ویرا نے ڈیوڈ بیکھم کی بے نیازی اور میسی کی چھپی رستمی لیے اسٹوڈنٹس کو دیکھا' ہاتھ لہرایا۔۔۔ اور اپنی دائیں آنکھ کے کنارے کو رگڑ کر کارل کو دیکھ کر آنکھ ماری۔۔۔ کارل کو تو آگ ہی لگ گئی۔۔۔ اس کی شکل دیکھنے لائق تھی۔۔۔ ٹیم غصے میں آکر بھڑک چکی تھی اور شاید ویرا یہی چاہتی تھی۔ وہ بھڑک بھڑک کر برف پر گرتے جاتے تھے۔ محسن رسولی کی ٹیم فٹ بال لیے اڑی جاتی تھی۔۔۔ ویرا برف کی پیداوار تھی اسے برف پر ہرانا مشکل تھا۔۔۔ یہ اس کی بے عزتی ہوتی۔۔۔ اور اس نے روس کی برف کی عزت رکھ لی۔۔۔ وہ لوگ میچ جیت گئے۔

امرحہ کو بڑی خوشی ہوئی' ویرا کے جیتنے کی نہیں کارل کے ہارنے کی۔۔۔ وہ سب لوگ گراؤنڈ کے گرد گھیرا بنائے کھڑے دونوں ٹیموں کے میچ دیکھ رہے تھے۔ میچ ختم ہوا تو سب کو پھر سے پڑھائی یاد آگئی اور سب جلدی جلدی کھسکنے لگے۔ اب امرحہ نیٹ کے پاس کھڑی منہ کھولے ہنس رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا ویرا کو کندھوں پر اٹھا لے۔۔۔ ورنہ کارل کو ہی اٹھا کر پھینک دے۔۔۔ اور نہیں تو پیٹ پکڑ کر برف پر لوٹ پوٹ ہوتے ہنسے۔۔۔ کچھ میچ اس نے دادا کو بھی دکھایا تھا اور وہ بھی ویرا ویرا چلا کر لاہور میں بیٹھے ویرا کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔

"تمہیں بڑی ہنسی آرہی ہے۔" وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا' کافی سنجیدہ لگ رہا تھا جیسے ہار کے بعد لوگ لگا کرتے ہیں۔

"ہاں آرہی ہے۔۔۔" امرحہ نے منہ کھول کر ایک اور قہقہہ لگایا۔۔۔ برا کیا۔۔۔

آنکھوں کو چندھیا کر کارل نے اسے تاڑا۔۔۔ جیسے کہا "اچھا ہم۔۔۔ تم ٹھیک ہے پھر۔"

وہ چند قدم آگے چلا' اس کے ہاتھ میں فٹ بال تھا اور پھر وہ ایک دم سے پلٹا۔ امرحہ ویرا کی طرف جانے ہی لگی تھی۔ اس کا دھیان کارل کی طرف نہیں تھا' کارل نے پلٹ کر پوری قوت سے اس کے سر پر فٹ بال کی کک لگائی۔۔۔ امرحہ توازن قائم نہ رکھ سکی اور گر گئی۔۔۔ جیسے ہی وہ گری' کارل نے تیزی سے اس کے سر پر جمی سرخ اونی ٹوپی کو کھینچ کر اس کی ناک تک گھسیٹ دیا۔۔۔ جی ناک تک۔۔۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" امرحہ چلائی۔۔۔ یہ بھی برا کیا امرحہ نے۔ کارل نے مٹھی بھر برف اس کے چلاتے منہ میں ٹھونس دی۔۔۔ امرحہ نے ہاتھ سے برف منہ سے نکالی۔ کارل نے تیزی سے اپنے گلے میں سے اونی مفلر کو نکال کر اس کی گرہ بنا کر اس کے دونوں ہاتھوں میں ڈالی اور گرہ کس دی۔۔۔ وہ جو اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی اور لڑھک گئی۔

"یہ کیا؟ ٹوپی ناک تک۔۔۔ برف منہ میں۔۔۔ ہاتھ بندھے ہوئے۔۔۔ چچ چچ' اب کارل نے کسی مشین کی طرح اس پر برف اچھالنی شروع کر دی۔۔۔ امرحہ منہ سے بمشکل برف اگل سکی۔ اس کے دانت ٹھنڈ سے ٹوٹ جانے کے قریب تھے اور کارل منحوس اسے برف کے ڈھیر میں دفن کر رہا تھا۔۔۔ وہ کھلے عام منہ کھول کر

ہنس رہی تھی۔ اب ظاہر ہے ہارے ہوئے لوگوں کو ایسی ہنسی بری بھی لگ سکتی ہے۔

"ویرا!" امرحہ بمشکل چلائی۔۔۔ ویرا ذرا دور محسن رسولی کے ساتھ میچ کی صورت حال پر غور کر رہی تھی' امرحہ کی طرف اس کی پشت تھی۔ کارل کسی کرین کی طرح اس پر برف اچھالتا ہی جا رہا تھا اور اس نے امرحہ کو برف کے ڈھیر میں دفنا دیا۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے امرحہ برف میں۔۔۔ یہ دن بھی دیکھنا تھا امرحہ نے۔۔۔

"ویرا!" اس کی آنکھوں پر ٹوپی تھی۔ اسے نظر ہی نہیں آ رہا تھا کہ ویرا کہاں ہے۔ برف کا ایک ڈھیر اس کے منہ پر آ کر گرا کہ لو اور چلاؤ۔۔۔ کاش دادی کا کہا سچ ہوتا' وہ واقعی منحوس ہوتی اور کارل کے ہاتھ ٹوٹ جاتے اس کے ساتھ یہ سب کرتے۔

"کارل!" ویرا کی دھاڑ سنائی دی۔۔۔ اس نے بڑھ کر امرحہ کے سر سے ٹوپی اٹھائی اور امرحہ نے دیکھا کہ ویرا نے ایک بے حد ناکام کوشش کی اپنی ہنسی کے فوارے کو روکنے کی۔

وہ گردن تک برف میں دھنس چکی تھی' ناک سرخ ہو چکی تھی۔۔۔ ہونٹ نیلے اور غصے سے وہ نیلی' پیلی' لال سب ہو رہی تھی۔

جیسے ہی ویرا نے ٹوپی اٹھائی۔ کارل اور ویرا دونوں کے منہ سے ہنسی کے فوارے نکلے۔

"دادا! آپ ٹھیک کہتے ہیں' مجھے امرحہ نہیں ویرا ہونا چاہیے۔" امرحہ نے دل میں سوچا جب ویرا اسے برف سے نکال کر کھڑا کر چکی تو کارل نے امرحہ کی طرف اشارہ کیا۔

"میچ ہو جائے۔۔۔ تم اور میں۔" کیا بات کی تھی کارل نے۔ وہ بھی امرحہ سے۔۔۔

"اسے فٹ بال نہیں آتا۔۔۔ مجھ سے بات کرو۔"

"تم پرے رہو۔۔۔ Ginger Ball ۔۔۔ مجھے اس The Lost Duck سے بات کرنے دو۔"

"The Lost Duck" وہ چپ کارل کی شکل دیکھنے لگی غصے میں اتنا لال پیلا ہونے کے باوجود وہ اس کے خلاف کچھ نہ کر سکی۔۔۔ چچ چچ۔۔۔ افسوس۔۔۔

"بیس پچیس فٹ کے فاصلے سے ہم ایک دوسرے کے سر پر فٹ بال کی کک لگائیں گے۔ وقت دس منٹ بولو پلوٹو سر پر لگا بال ایک گول ہو گا۔"

"پلوٹو۔۔۔ ایک اور نام۔" پلوٹو خاموش کھڑا اندازہ لگا رہا تھا کہ کیا وہ یہ کر سکتی ہے' نہیں وہ یہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔۔۔ اندازہ لگایا جا چکا تھا۔۔۔

"چلو اسے اور آسان کر لیتے ہیں۔۔۔ فاصلہ پندرہ فٹ۔۔۔ وقت دس منٹ۔۔۔"

"نہیں۔" امرحہ نے انکار کر کے جان چھڑائی۔

"فاصلہ دس فٹ۔۔۔" وہ آج ہر صورت اس کے سر پر کک لگانا چاہتا تھا۔

"نہیں۔" امرحہ نے ایسے کہا جیسے شاہ ایران اسے اپنا تخت پیش کرتے ہوں کہ آج سے آپ اسے سنبھالیں اور وہ کہتی ہو "نہیں بھئی۔۔۔ بس نہیں کہہ دیا نا۔۔۔ بس نہیں۔"

"نہیں۔" کارل نے واضح دانت پر دانت جمائے اور غصے کو چھپا کر اس کی طرف دیکھا کہ وہ یہ بھی نہیں کر سکتی جو پانچ سال کے بچے بھی کر کے جیت سکتے ہیں۔ کارل کو بس موقع چاہیے تھا اس کا سر پھوڑنے کا' اسے برف کی مار مارنے کا۔۔۔

"چلو دس قدم۔۔۔ ہارنے والے کو برف میں گردن تک صبح تک دھنسے رہنا ہو گا۔ Ginger Ball نے امرحہ کو آنکھ ماری کہ کھیل لو۔۔۔ پر پاگل تھی کیا وہ ابھی شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کی حیثیت نہیں ہوئی تھی اس کی۔۔۔

"امرحہ کے لیے میں کھیلتی ہوں۔" ویرا نے ہاتھ اٹھایا۔

"تمہارے لیے کھیل بدل جائے گا۔۔۔ بیس فٹ کا فاصلہ رکھ کر بھاگتے ہوئے ہاتھ سے ہمیں سر پر بال مارنی ہو گی۔۔۔ وقت دس منٹ۔۔۔"

"ٹھیک ہے!" شاہ ایران کا تخت ویرا نے قبول کیا۔

اسٹاپ واچ امرحہ کو دے کر ان کا کھیل شروع ہو گیا۔

بیس فٹ کا فاصلہ رکھ کر فٹ بال کو درمیان میں رکھ دیا گیا۔ فٹ بال پر پہلے کارل جھپٹا' ویرا بھاگی لیکن کارل نے پھرتی سے اس کے سر پر بال دے ماری۔۔۔ بال ویرا کے ہاتھ آ گئی۔۔۔ اس نے کارل کا نشانہ لیا لیکن کارل جُل دے گیا۔۔۔ بال کارل کے ہاتھ آ گئی' ویرا کو بال کو اپنے سر پر لگنے سے بچانا بھی تھا اور بال کو اپنے قابو میں بھی کرنا تھا۔ برف پر پھسلتے' گرتے' بال پر جھپٹتے مقابلہ نویں منٹ میں پانچ چار تھا۔ کارل پانچ۔۔۔ ویرا چار۔۔۔ دسویں منٹ میں کارل نے ویرا کے سر پر ایک اور گول کر دیا۔۔۔ ویرا بری طرح سے برف پر گری۔

"آخری منٹ!" امرحہ چلائی۔ وہ بھاگنے کی تیاری کر رہی تھی۔ آخری منٹ میں ویرا زیادہ سے زیادہ ایک ہی گول کر سکتی تھی نا۔۔۔ گراؤنڈ میں چند ایک اسٹوڈنٹس ہی موجود تھے جو ویرا اور کارل کی مستیاں دیکھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا' وہ مذاق میں کوئی کھیل کھیل رہے ہیں۔

"آخری پندرہ سیکنڈز۔" امرحہ پھر زور سے چلائی' وہ بھاگتے بھاگتے ویرا کے قریب جا چکی تھی۔۔۔ کارل ان سے دور تھا۔۔۔ بال ویرا کے ہاتھ میں تھی۔۔۔ اس نے کارل کے سر پر دے ماری لیکن کارل پھر بچ گیا۔۔۔ اور وہ بال پر جھپٹا۔۔۔ وہ پھرتی سے جھک کر بال اٹھا ہی رہا تھا کہ ویرا پھولے ہوئے سانس کے ساتھ چلائی۔

"امرحہ۔۔۔ بھاگ۔" کہتے وہ خود بھی برفانی چیتے کی طرح گیٹ کی طرف بھاگی۔۔۔ امرحہ بھاگنے کی تیاری تو کر ہی رہی تھی پر ویرا کے کہتے ہی اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

"بھاگ امرحہ!" ویرا پھر چلائی۔ کارل ان کے پیچھے جنگلی تیندوے کی طرح لپکا۔

امرحہ نے اپنی لاہور میں کھائی خوراکیں زندہ کیں اور پورا زور لگا کر بھاگی۔۔۔ ویرا نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنی رفتار کے ساتھ بھگانے لگی۔۔۔ لیکن کہاں ویرا' کہاں امرحہ۔۔۔ امرحہ برفانی چیتا تھوڑی ہی تھی۔

جتنی مرضی صحت بخش غذائیں کھائی ہوں۔۔۔ ان کا استعمال تو کبھی نہیں کیا گیا تھا نا۔۔۔ بھاگی تو کبھی نہیں تھی۔۔۔ ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔۔۔ ایسے برف ملی تھی نہ کارل نامی بلا۔۔۔ جو ان کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

ویرا کے ساتھ بھاگتے امرحہ منہ کے بل گرتے گرتے کئی بار بچی۔۔۔ امرحہ گر جاتی۔ کارل (موت) اسے پیچھے سے آلیتی تو بہت ہی برا ہوتا۔۔۔

کارل کہیں پیچھے برف پر پھسل کر گر گیا تھا ورنہ وہ ان سے دس قدم پیچھے نہ ہوتا۔۔۔ ویرا اپنی سائیکل پر جھپٹی اور اسے چلایا۔۔۔ امرحہ چلتی سائیکل پر بیٹھی۔۔۔ ویرا نے ہی اسے چلتی سائیکل پر بیٹھنا اور اترنا سکھایا تھا اس کا ماننا تھا۔ ایمرجنسی میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں کام آتی ہیں۔

ایمرجنسی "کارل" میں یہ بات کافی کام آ رہی تھی۔

ویرا نے اپنی رولر کوسٹر کو دنیا کی تیز رفتار ترین جاپانی ٹرین بنا ڈالا جو چلتی ہے تو لگتا ہے اڑ رہی ہے۔۔۔ رولر کوسٹر بھی اڑ رہی تھی۔

"ویرا!" کارل کی آواز ان کے پیچھے آئی۔ پھولے سانس کے ساتھ وہ چلایا۔

"کون ویرا؟" ویرا چلائی اور یہ جا وہ جا۔

جب وہ کارل کی پہنچ سے دور ہو گئی تو رولر کوسٹر کی رفتار آہستہ کی گئی۔۔۔ ہنس ہنس کر ان کا برا حال تھا۔ برف سے ڈھکے چھپے مانچسٹر میں ان کی ہنسی کے قمقمے جل بجھ رہے تھے۔ امرحہ شاید ہی اپنی زندگی میں کبھی اتنا ہنسی ہو گی۔۔۔ اس کا پیٹ پھٹنے کے قریب تھا۔

"تم ہار کیسے گئیں؟" امرحہ نے اس کی کمر میں چٹکی بھری' یعنی میرے لیے کھیلتے ہی ہار گئیں تو "Ginger Ball"

"کبھی انسان ہار بھی تو جاتا ہے' ہے نا۔۔۔ ویسے اگر میں جیت جاتی تو کارل نے بھاگ جانا تھا۔۔۔ ہم اس جن کو برف میں دھنسا سکتے تھے بھلا۔۔۔؟"

"میری دادی کا ماننا ہے میں منحوس ہوں۔۔۔ میری وجہ سے سارے کام خراب ہو جاتے ہیں۔۔۔ آگ

لگ جاتی ہے۔۔۔ تباہی' بربادی' ایسا سب ہو جاتا ہے۔"

"اچھا؟ تم تو بڑے کام کی ہو پھر۔۔۔ تم وائٹ ہاؤس کے سامنے ایک گھر کیوں نہیں لے لیتیں۔۔۔ روس کے تھوڑے حساب کتاب باقی ہیں امریکہ کے ساتھ' ۔۔۔ تم وہ حساب کتاب کیوں برابر نہیں کروا دیتیں ہمارے۔۔۔؟ اگر تم واقعی ویسی ہی ہو تو سچ تم ہمارے بہت کام کی ہو۔۔۔ ہمارا حساب چکا چکو تو روس آنا۔۔۔ گارڈ آف آنر دیا جائے گا تمہیں۔۔۔"

"گارڈ آف آنر!" امرحہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔ اس کی نحوست کو گارڈ آف آنر۔۔۔ کمال ہو گیا۔

"یہ میری زندگی کا بہترین وقت ہے ویرا۔۔۔ تم ہو' میں ہوں' برف ہے' مانچسٹر ہے اور تمہاری سائیکل ہے۔۔۔ میرے لیے اتنے خزانے تھے زندگی کے پاس۔"

"سب سے بڑا خزانہ کارل۔۔۔ ہاہاہا!" ہنستے ہنستے ویرا سائیکل گرا بیٹھی دونوں سڑک پر گر گئیں۔۔۔ انہیں ہلکی سی چوٹ بھی آئی لیکن اس چوٹ کی پروا کسے تھی' وہ دونوں تو سڑک پر گری سائیکل کے پاس ہنسنے میں مصروف تھیں۔

"اس کا نام لیتے ہی ہم گر گئے اف' اصل میں منحوس تو کارل ہے۔"

امرحہ کو بڑی خوشی ہوئی کارل کو منحوس ثابت کر کے۔ اس نے جیسے اپنے منحوس ہونے کا بدلہ کارل سے لے لیا اور ساری روشن خیالی کے باوجود وہ دادی کی طرح پورا زور لگا کر کارل کو "منحوس" ثابت کرنے کے لیے تیار تھی۔ بلکہ اس کام کے لیے پارٹ ٹائم کرنے کے لیے بھی تیار تھی۔۔۔ ساری یونیورسٹی امرحہ کے خاندان کی طرح جب اسے منحوس منحوس کہا کرے گی تو امرحہ کے اندر ٹھنڈک ہی ٹھنڈک پھیل جائے گی۔۔۔ آہ۔۔۔ کاش یہ دن دیکھنا امرحہ کے نصیب میں ہو۔۔۔ کاش یہ دن جلد ہی آجائے۔۔۔ بلکہ آنے ہی والا ہو۔

"کارل دی منحوس مارا۔"

☆ ☆ ☆

میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ آج تو میرا پہلا پیپر ہے۔۔۔ گھڑی اور کھڑکی دونوں کی طرف دیکھا اوہ گوش شام کے پانچ بج گئے۔۔۔ خدایا۔۔۔ میرا تو پہلا پیپر تھا۔۔۔ میں تو رات بھر پڑھتا رہا تھا۔۔۔ پھر کیا ہوا۔۔۔ پھر کیا ہوا آخر۔۔۔ یعنی میرا پیپر گیا۔۔۔ یعنی اب یونیورسٹی کا ڈین بھی مجھے فیل ہونے سے نہیں بچا سکے گا۔ میں اتنا وقت سوتا کیسے رہ گیا؟

کیا میں ساری رات پارٹی کرتا رہا۔ سارا دن سوتا رہا' ۔۔۔ نہیں میں تو علی کامنز میں تھا۔۔۔ نہیں شاید میں تو لائبریری میں تھا۔۔۔ اوہ گوش میں کہاں تھا۔۔۔ آخر کوئی مجھے بتائے گا کہ میں کہاں تھا۔

میں نچلے فلور پر واقع شاہ ویز کے کمرے کی طرف بھاگا۔ اس کا دروازہ دھڑ دھڑایا۔

"شاہ ویز! میں کل رات کہاں تھا' بڑی جلدی بتا۔۔۔"

اف شاہ ویز بھی سو رہا تھا۔۔۔ میری طرح اس کا امتحان بھی گیا۔۔۔ وہ بھی فیل۔۔۔

"مجھے کیا پتا تم کل رات کہاں تھے۔۔۔ سونے دو مجھے۔" شاہ ویز اندر سے ہی چلایا۔

"تمہارا ابھی پیپر گیا یا دے کر آئے ہو؟" میں اس کے کمرے کے بند دروازے کے پار چلایا۔

"پیپر۔۔۔ وہ تو صبح ہے۔۔۔ اب دفعان ہو جاؤ۔"

"صبح تو گزر گئی۔۔۔ شام کے پانچ بج رہے ہیں۔"

"تم ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں کیوں نہیں لگاتے' صبح کے پانچ بجے ہیں شام کے نہیں۔"

"اوہ اچھا۔۔۔ سچ میں۔۔۔ آہ گوش میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔"

یہ کیل تھا' ایگزامز کے بے جا دباؤ کا شکار بے چارہ اسٹوڈنٹ۔۔۔ یعنی مانچسٹر یونیورسٹی میں اس دیو کا نزول ہو چکا تھا جسے "ایگزامز" کے نام سے یاد کیا جاتا بھی پسند نہیں کیا جاتا۔۔۔ تو ایگزامز کے دنوں کی ایک کیل ہی ایسی کاپی نہیں ہے اور بھی مختلف کاپیاں ہیں۔

"میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟" اپنے فیشن اور ملبوسات کے لیے مشہور لنڈا۔

"تم چار یا پانچ مہینے پہلے لائبریری آئی ہو گی۔"

"ہاں آئی تو تھی۔۔۔ ایک میگزین چاہیے تھا۔۔۔ پر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"سارا سمسٹر چھوڑ کر صرف امتحانات کے دنوں میں لائبریری آنے والے مجھ سے یہی کہتے ہیں "آپ کو کہیں دیکھا ہے۔" دوسرے سمسٹر کے امتحانات میں آکر بھی تم یہی کہو گی۔۔۔ میں تھک جاتا ہوں بار بار اس سوال کا جواب دے دے کر' اس لیے ابھی سے بتا رہا ہوں میں لائبریرین ہوں اور میں لائبریری میں دیکھا اور پایا جاتا ہوں۔"

آنکھ' کان' زبان' دماغ' خاص کر بالوں میں سے طوطے کیسے اڑتے ہیں' کبھی دیکھا ہے۔

"نہیں۔۔۔ مانچسٹر یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس سے امتحانات کے دنوں میں ملیں۔۔۔

"آئی لو یونی میوزیم۔" ایما۔۔۔ عام دن۔۔۔

"میوزیم۔۔۔ یونی میں میوزیم ہے؟" ایما۔۔۔ امتحانات کے دن۔۔۔

"اوہ۔۔۔ شیکسپیئر کو کیا ضرورت تھی اتنا کچھ لکھنے کی ۔۔۔ ایک آدھ ڈرامہ کافی نہیں تھا۔" جوناتھن 40% بمشکل لینے والوں میں سے۔۔۔

"کون شیکسپیئر؟" ڈینئل مانچسٹر کے ہر کلب اور بار کے بارے میں جاننے والوں اور 40% کے خواب دیکھنے والوں میں سے۔۔۔

"میرے چچا۔۔۔" جوناتھن غصے میں۔

"تمہارے چچا ڈرامے لکھتے ہیں۔۔۔؟ کس تھیٹر میں لگتے ہیں ان کے ڈرامے۔۔۔ دو ٹکٹیں مل جائیں گی؟"

ایک اور۔۔۔

"تم ڈبہ کیوں کھا رہے ہو؟" اوک ہاؤس ہال میٹ

"میں تو پزا کھا رہا ہوں۔" بے حد لائق فائق لمبا سا پتلا سا اسٹوڈنٹ کرس۔۔۔

"تم پزا۔۔۔ ڈبے سمیت کیوں کھا رہے ہو؟"

"نہیں! میں تو صرف پزا کھا رہا ہوں۔۔۔ یہ دیکھو ۔۔۔ اوہ۔۔۔ میری پلیٹ میں یہ ڈبہ کہاں سے آگیا۔۔۔؟"

گول گول چشمہ ملفوف آنکھیں باہر کو۔۔۔

"تمہارے منہ میں بھی ڈبے کا کچھ حصہ ہے۔۔۔ اور خدا کے لیے کرس اس کھڑکی کو بند کر لو تم اوک ہاؤس کے وہ واحد اسٹوڈنٹ ہو گے جو اتنی ٹھنڈ میں کھڑکی کھول کر پڑھ رہا ہے۔"

"کھڑکی۔۔۔ اوہ۔۔۔ تو یہ کھڑکی ہے۔۔۔ میں بھی سوچ رہا تھا' میرے سارے کپڑے کہاں گئے۔۔۔ اور میرے جوتے بھی۔"

لائبریری کی طرف جاتے ہوئے۔

"ہائے۔۔۔ جینا کیسی ہو؟" مائیکل کیمسٹری اسٹوڈنٹ

"میں ماریا ہوں۔۔۔" بائیو اسٹوڈنٹ۔

"جینا ماریہ نا۔۔۔؟" ہار نہ مانتے ہوئے' سر کھجاتے ہوئے۔۔۔

"ماریہ ایڈم!" دونوں ہونٹوں کو بگاڑتے ہوئے۔۔۔

"ہاں' ہاں وہی جو مک لارین P13 (بیش قیمت کار) میں آئی ہے۔۔۔"

"میری تیسری نسل میں سے شاید کوئی مک لارین خرید کر اسے ہاتھ لگا سکے' میں ایسی جرات فی الحال نہیں کر سکی' میری حیثیت فری بس سے آنے والی ہے ۔۔۔ اور تم؟"

"میں۔۔۔؟" سر کھجاتے ہوئے ہی۔

"ہاں تم۔۔۔"

"مطلب۔۔۔ میں کہاں جا رہا ہوں۔۔۔ میں پڑھنے لائبریری جا رہا ہوں سارہ۔۔۔"

"ماریہ۔۔۔ مطلب تم کون ہو۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

سر کھجانے کی باری اب ماریہ نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔

"میں اچھا بائے۔۔۔ میں لیٹ ہو رہا ہوں سوزین۔" چلا جاتا ہے۔

"میں کون ہوں۔۔۔ کیا نام ہے میرا؟" جاتے ہوئے۔

"تمہیں تو لائبریری جانا تھا نا؟" ماریہ پیچھے سے

چلاتی ہے۔

"تم یونیورسٹی سے باہر کی سمت جا رہے ہو۔۔۔"

"تو تعلیمی دور میں کم سے کم دس بار ہم یہ ضرور سوچتے پائے جاتے ہیں کہ امتحانات میں فیل ہونا اتنا آسان اور پاس ہونا اتنا مشکل کیوں ہے؟ اسی فیصد پرچے اسی ایک لیکچر' باب' سوال پر کیوں مشتمل ہوتے ہیں جو آپ مس کر چکے ہوتے ہیں۔۔۔؟"

"فیل ہونے کی بڑی وجہ کیا ہے؟"

"میرا خیال ہے یہ امتحانات ہیں۔۔۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"Night before enams is like a night before christmas, you can't sleep and yet hope for a miracle"

اسٹوڈنٹس اپنے تعلیمی دور میں معجزات پر بہت یقین رکھتے ہیں اور ان کے رونما ہونے کی بھی دعائیں کرتے ہیں۔۔۔ دوسرا اور تیسرا باب پڑھنے کے بعد وہ یہ دعا کرتے سو جاتے ہیں کہ چوتھے' پانچویں اور چھٹے باب میں سے کوئی سوال نہ آئے۔۔۔ اور سارا پرچہ دوسرے اور تیسرے باب پر مبنی ہو۔۔۔ چلو فرض کیا اگر چھٹے باب سے کچھ آ ہی گیا تو اسی فیصد دوسرے اور تیسرے ابواب سے جو آئے گا' وہ پاس کروا دے گا۔۔۔ چلو پچاس فیصد ہی سہی۔۔۔ چلو چالیس ہی سہی' اچھا چلو تیس ہی سہی۔۔۔ بس بہت ہے معجزاتی دعائیں۔۔۔ معجزاتی توقعات۔۔۔

امتحانات کے دوران سب سے زیادہ اسٹوڈنٹس خوش فہم ہوتے ہیں۔ امتحانات کے بعد سب سے زیادہ دنیا بھر میں دعائیں اسٹوڈنٹس کرتے ہیں۔

سب سے زیادہ خون امتحان نامی بلا چوستی ہے اور کودتی پھاندتی حقیقی موت رزلٹ کے دن سب سے زیادہ دکھائی دیتی ہے۔

جی ہاں۔۔۔ سچ ہے یہ۔۔۔

امتحان گاہ کے آخری پانچ منٹ میں ہر اسٹوڈنٹ مافوق الفطرت طاقت کا مالک بن جاتا ہے۔۔۔ وہ ساری کتاب لکھ ڈالنا چاہتا ہے۔۔۔ لیکن وقت ہی نہیں ہوتا۔۔۔ اور ایک بڑی دردناک حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ یاد بھی آخری منٹوں میں آتا ہے امتحانات ایک لمبی۔۔۔ آہ۔۔۔

"میں نے سارا سمسٹر ٹھیک سے کیوں نہ پڑھا؟"

ایک سوال' محاسبہ اور پچھتاوا جو امتحانات کے ختم ہوتے ہی اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔۔۔ ویسے اسے مر ہی جانا چاہیے ہمیشہ کے لیے۔۔۔ ایویں ذہن میں کلبلا کر احساس زیاں جاگتا ہے۔

"مجھے تھوڑی سی دیر کے لیے سو جانا چاہیے۔۔۔ میں پچھلے پچیس' تیس منٹ سے پڑھ رہا ہوں۔۔۔ آخر نیند پر بھی میرا حق ہے۔" ایک خواہش جس پر فوری عمل کیا جاتا ہے۔

تو سب اسٹوڈنٹس اس سوال کا جواب جاننے سے قاصر ہیں کہ امتحانات میں اتنی نیند کہاں سے آجاتی ہے۔۔۔ بھوک اتنی کیوں لگنے لگتی ہے۔۔۔ ٹی وی' فیس بک' یوٹیوب' ٹیوٹر پہلے سے زیادہ دلچسپ کیوں لگنے لگتے ہیں۔ کتابوں کی پہچان مشکل کیوں ہو جاتی ہے۔

ویسے امتحانات سے پہلے پوسٹ ایگزامز پارٹیز پلان کرلی گئی تھیں۔ جیسے کرسمس آنے سے پہلے کرسمس کے بعد دی اور لی جانے والی پارٹیز پلان کی گئی تھیں۔ کون کون آئے گا' پارٹی کہاں ہوگی' کیا کیا ہنگامہ برپا کرنا ہوگا۔۔۔ امتحانات کے ختم ہونے کی خوشی میں نہیں بلکہ امتحانات سے جان چھوٹ جانے کی خوشی میں۔۔۔ آس پاس کے سب ہی 'بارز' کلبس' ریسٹورنٹس اس انتظار میں تھے کہ جلدی سے امتحانات شروع ہو کر ختم ہوں اور بے چارے اسٹوڈنٹس کچھ پارٹی شارٹی' مزے شزے کریں۔۔۔ بے چارے اسٹوڈنٹس۔۔۔

تو یونیورسٹی میں کچھ اس قدر پڑھنے والے اسٹوڈنٹس بھی تھے۔۔۔

"یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے۔ شاید تم میں سے جم۔" تاک سیکرٹری جولی۔

"ہاں شاید۔۔۔ کئی دنوں سے میں ٹھیک سے منہ نہیں دھو سکا۔۔۔ کپڑے بھی۔۔۔ دانت برش کرنے کا تو بالکل وقت نہیں ملا۔۔۔ ایگزامز ہیں نا۔" پیلے دانت نکال کر مسکرا کر کہا جانے والا تاریخی جملہ۔۔۔ جی ہاں تاریخی ہی۔۔۔

"تمہاری شکل مارشل سے ملتی جلتی ہے۔"

"میں مارشل ہی ہوں۔۔۔ پڑھ پڑھ کر ایسا ہو گیا ہوں۔"

"اوہ shurrup (شٹ اپ کی جدید شکل) اس حالت میں گھر نہ چلے جانا۔۔۔ اپنی ڈی این اے رپورٹ بھی دکھائی تو بھی گھر والے گھر میں گھسنے نہیں دیں گے۔"

"آخر تم تیز تیز کیوں نہیں چل رہے۔۔۔ ہم یونیورسٹی سے لیٹ ہو رہے ہیں۔"

"مجھ پر بہت بوجھ ہے گراہم!"

"پر تمہارے ہاتھ تو خالی ہیں۔۔۔"

"میرے سر پر۔۔۔"

"تم نے تو آج ٹوپی بھی نہیں پہنی۔۔۔"

"میرے ذہن پر یار۔۔۔! پڑھائی کا بہت بوجھ ہے۔۔۔ میں نے کچھ غیر ضروری کتابیں بھی پڑھ ڈالیں۔"

"تمہیں یاد ہے نا تمہیں 100٪ میں سے مارکس لینے ہیں 1000٪ میں سے نہیں۔۔۔"

"ہاں پھر بھی۔۔۔ پھر بھی میں نے سوچا شاید۔۔۔ شاید۔"

یہ صرف کچھ جھلکیاں ہیں امتحانات کے دنوں کی۔۔۔ اور ظاہر ہے اسٹوڈنٹ دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھتا ہو۔۔۔ کم و بیش ایک سی حالت سے گزرتا ہے۔۔۔ ایک جیسے احساسات کا مالک ہوتا ہے کیونکہ وہ بے چارہ اسٹوڈنٹ ہوتا ہے نا۔۔۔ بے چارہ۔

یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس کی ایک خاص تعداد Modafinil اسٹڈی ڈوز بھی لیتی ہے۔ جسے کھا کر اسٹوڈنٹس کے بقول وہ بنا تھکے اور بنا سوئے کئی گھنٹے آرام سے پڑھ سکتے ہیں۔۔۔ بہت سے اسٹوڈنٹس وٹامن' ٹونگ بھی لیتے ہیں۔۔۔ دیواروں پر نوٹس چپکاتے ہیں پڑھنے سے متعلق اکثر۔ اسٹوڈنٹس کے کمرے کی دیواریں ان نوٹس سے بھری ہوتی ہیں پھر کہیں جا کر ان کے 40٪ مارکس آتے ہیں۔

Unicorn ہر اسٹوڈنٹ کے ٹیبل پر رکھا نظر آنے لگتا ہے۔ ایگزامز سے متعلق اقوال دیواروں پر چپکا دیے جاتے ہیں آئینے میں اپنی ہی شکل دیکھ کر ڈرا جاتا ہے۔۔۔ اور رات کو چنی منی سی نیند میں بھی کتابیں آ آ کر ڈراتی ہیں۔

تو وہ وقت آچکا تھا جو نیندیں تو بلاشبہ بھگائے گا ہی' ساتھ نانیاں' دادیاں اور پھوپھیاں بھی یاد کروا کر جائے گا یہ وہی دن ہوتے ہیں تا جب لگنے لگتا ہے کہ ایگزامز سیزن زندگی ہے کبھی جائے گا بھی۔۔۔؛ زندگی کبھی معمول پر بھی تھی۔۔۔ رات کو اپنی مرضی سے سونے والی' صبح آرام سے اٹھنے والی۔۔۔ گپیں ہانکنے والی ادھر ادھر گھوم پھر کر مستیاں کرنے والی۔ آکسفورڈ روڈ اور اس سے منسلک دوسری سڑکوں پر چہل قدمی کرنے والی۔۔۔ اف کبھی اتنے فارغ رہے ہیں ہم۔۔۔ پرنٹ ورک میں بڑی بڑی میزوں پر اسنوکر کھیلنے والے' اوک ہاؤس کے گراؤنڈ میں آگ جلا کر اس کے گرد رات رات بھر بیٹھے رہنے والے۔۔۔ اتنے فارغ۔۔۔ کیا یہ سب ہوتا رہا ہے۔۔۔ سچ؟

پروفیسرز اسٹوڈنٹس کو دیکھ کر زیر لب مسکرا دیتے' جیسے کہتے ہوں 'اب چڑھے گا اصل فلو۔۔۔ لائبریری اسٹاف جن بھوت بن جائے کہ اصل امتحان تو اسٹوڈنٹس ان کا لینے والے تھے۔۔۔ جو نہیں بھی موجود ہو گا وہ بھی مانگا جائے گا۔۔۔

لائبریری اور لرننگ کامنز (پڑھنے کی جگہ) رات دن کھلے تھے اور کچھ ایسا سماں پیدا کر رہے تھے جیسے وہاں عام انسان نہ ہوں' کسی سیارے سے اتری مشینی مخلوق ہو جو نہ کھاتی ہے نہ سوتی ہے' بس پڑھتی ہی رہتی ہے۔ اگر ساری مانچسٹر یونی کو ایک دلہن مان لیا جائے تو۔۔۔

"Commanrs alan gilbert tearning"

المعروف علی لرننگ کامنز اس دلہن کے ماتھے کا جھومر قرار پائے۔۔۔ چار اطراف شیشے سے سجی' شیشے سے بنی اور بلڈنگ کے اندر بیٹھے آپ باہر کی دنیا سے لا

تعلق نہیں رہتے۔ کسی ارب پتی کے ذاتی گھر کی طرح بے حد نفیس اور صاف ستھرا۔۔۔ فائیو اسٹار ہوٹل کی طرح چمکتی دمکتی گھر کے ماحول سے کہیں بڑھ کر آرام دہ اور پرسکون۔۔۔ نرم گرم علی کارنر۔"

اسٹوڈنٹس اپنی مرضی سے اپنی تعلیم کے مطابق کامن روم کا انتخاب کرسکتے تھے۔ ہال میں بھی پڑھا جا سکتا ہے جہاں کئی دوسرے اسٹوڈنٹس پڑھنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ گروپ میں بھی الگ سے گروپ رومز میں بھی ۔۔۔۔ دو دو چار چار کے گروپ میں بھی۔۔۔ یہاں ہر طرح کی سہولت موجود ہے' چارجنگ' ایل سی ڈی' کمپیوٹر' انٹرنیٹ' وائٹ بورڈ وغیرہ وغیرہ۔

پورے لرننگ کامن کی ڈیزائننگ اور سجاوٹ ایسی ہے کہ گمان ہوتا ہے پڑھنے نہیں آئے۔ تفریح کے لیے کسی ہوٹل میں آئے ہیں۔ ساتھ ہی کیفے ہے۔۔۔ اسٹوڈنٹس لرننگ کارنر میں آجائیں تو انہیں کسی دوسری ضرورت کے لیے باہر نہیں جانا پڑتا' وہاں سب کچھ مہیا کردیا گیا ہے۔

"تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے؟" عالیان ہاتھ میں دو عدد کافی مگ لیے اس کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔ وہ اوپن ہال میں اکیلی بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ اسے ضرورت پڑتی تھی تو وہ اپنی کسی کلاس فیلو سے مدد لینے چلی جاتی تھی۔

"تم بزنس کے اسٹوڈنٹ ہو اور میں انگلش لٹریچر کی ۔۔۔ تم میری مدد کیسے کرسکتے ہو۔" جی ایگزامز کے دنوں میں اسٹوڈنٹس چڑچڑے بھی ہو جاتے ہیں۔

"جانتا ہوں ۔۔۔ لیکن تمہارے سبجیکٹ میں ایک اسکول کا بچہ بھی تمہاری مدد کرسکتا ہے۔" عالیان جیسے اسٹوڈنٹس کا مزاج البتہ عروج پر ہوتا ہے۔

"تو وہ بچے اسکول کیوں جارہے ہیں۔ یہاں آکر ماسٹرز کیوں نہیں کرلیتے؟"

عالیان نے قہقہے کو بلند ہونے سے روکا ۔۔۔ کیا جواب دیا تھا امرحہ نے۔

"ان سب باتوں سے تمہارا مطلب کیا ہے؟"

امرحہ نے ہونٹ سکیڑے۔

"سیدھا اور صاف مطلب ہے' یہ بہت آسان سبجیکٹ ہے۔"

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔۔۔؟" مزاج بگڑنے لگا تھا امرحہ کو نیند کی ضرورت تھی۔

"تمہیں بتا رہا ہوں۔۔۔" عالیان بھرپور نیند لے کر آیا تھا' جم کر بیٹھ گیا۔

"تم طنز کررہے ہو۔۔۔"

"حقیقت کو تمہاری زبان میں طنز کیا جاتا ہے؟" اس نے ذرا آگے ہو کر اس کے سامنے رکھی کتاب کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا تو امرحہ نے فوراً" کتاب کو جھپٹ لیا۔

"اف ۔۔۔ اتنی بدتمیزی۔" اس نے ایسے طنز کیا جیسے اس نے برا مان لیا ہے' پھر بھی وہ مزید پھیل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"کافی پی لو۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔" ہنسی دبانے کے لیے اس نے ہونٹ کا کونا دانتوں میں لیا۔

"کس نے کہا تھا' میرے لیے کافی لانے کو؟"

اسٹوڈنٹس کے پیچھے بھاگ بھاگ کر نوٹ لینے والی یہ کہہ رہی تھی ۔۔۔ ٹھیک ہے آخرکار ہر انسان بدل ہی جاتا ہے۔

امرحہ کو یہ بات بری لگی تھی کہ اس نے اس کے مضمون کو لے کر ایسا کہا۔ دنیا میں ہر انسان نیوٹن' اسٹفین یا عبدالسلام نہیں بن سکتا' ذہانت کا معیار مشکل مضمون پڑھنا ہی نہیں ۔۔۔ اگر ہر لڑکی مادام کیوری جیسی نہیں بنتی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کند ذہن ہے۔۔۔ یا صفر ہے۔

وہ لاء پڑھ کر مارگریٹ تھیچر "آئرن لیڈی" بن سکتی ہے۔۔۔ ایم اے اردو کرکے بانو قدسیہ بن سکتی ہے۔ معمولی سمجھے جانے والے مضامین کو پڑھ کر بھی وہ کیا نہیں کرسکتی۔

"مجھے الہام ہوا تھا۔" وہ اس کے دبے دبے غصیلے انداز پر زیر لب مسکرا ہی دیا۔

باہر برف باری شروع ہو چکی تھی۔ دونوں قد آدم

کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے۔

"برف باری ہو رہی ہے امرحہ! دیکھو۔" اس کا مقصد صرف اس کا غصہ کم کرنا تھا۔ لیکن اگلی بات کرکے اس نے غلطی کی۔

"تم تو شاید پہلی بار دیکھ رہی ہو گی؟" اس نے کھڑکی سے باہر آسمان سے اترتے روئی کے گالوں سے برف کے گولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

امرحہ کا غصہ یک دم بڑھ گیا "کیوں میں کیوں پہلی بار دیکھ رہی ہوں گی؟"

"ہمارے پاکستان میں سب ہے ۔۔۔ سب۔" اس نے ایسے شانے لہرائے جیسے کہتی ہو یو انگریز ۔۔۔ او shurrup۔

"برف باری بھی؟" وہ ٹھوڑی کھجانے لگا پھر اس نے ہاتھ ٹھوڑی تلے ہی ٹکا لیا۔ کرسمس نائٹ پر لارڈ میئر اپنی پسندیدہ فلم دیکھتے ہوئے' اپنے قہقہے کا گلا دبائے ہوئے۔

"یونیورسٹی کی یادداشتیں ڈاٹ کام۔۔۔"

"ہاں بالکل۔" شانے پھر اچکائے۔

سندری امرحہ مزے سے سچ کا گلا دباتے ہوئے' لارڈ میئر کو کم عقل سمجھتے ہوئے دیسی انداز میں لمبی لمبی چھوڑتے ہوئے ایک جھوٹ سو کہانیاں ڈاٹ کام۔

"لاہور میں برف باری ہوتی ہے امرحہ۔۔۔ اچھا۔۔۔ کب کب؟"

"جب جب یہاں ہوتی ہے۔" امرحہ کے انداز کی نظر اتاری جانی چاہیے تھی۔

"اچھا۔۔۔ اور کیا کیا ہوتا ہے لاہور میں۔۔۔؟"

لارڈ میئر نے ریموٹ پھینک دیا ہے' انہیں صرف یہی فلم دیکھنی ہے۔

"سب ۔۔۔ سب ۔۔۔ جو یہاں بھی نہیں ہے سب ہے وہاں ۔۔۔ جی ہاں ۔۔۔ پھول' پودے' اسکول' کالج' یونیورسٹیاں' عجائب گھر' بڑے بڑے بازار' شاپنگ سنٹر' ہوٹلز' سپر جنرل اسٹورز' ٹرین' موٹروے' بڑی بڑی سڑکیں' سب ہے ہمارے پاس ۔۔۔ تم نے کیا سمجھ رکھا ہے ہمیں ۔۔۔؟"

وہ اتنی دلچسپی اور محویت سے اسے دیکھ رہا تھا جیسے چھوٹے بڑے سب ٹام اینڈ جیری دیکھتے ہیں ۔۔۔ اس کے مدلل انداز۔

"تم نے کیا سمجھ رکھا ہے ہمیں؟" انداز کچھ ایسا تھا جیسے عدالت میں جج کا ہوتا ہے۔

"بتاؤ جوزف تم نے قتل کیوں کیا ۔۔۔ کیوں کیا ۔۔۔ جواب دو ۔۔۔ ٹھہرو ۔۔۔ سزا کے لیے تیار ہو جاؤ ۔۔۔ الیکٹرک چیئر تمہارا مقدر ہے ۔۔۔ ہاں تمہارا مقدر۔"

"لاہور میں سب نہیں ہے امرحہ! سب کچھ تو مانچسٹر میں ہے۔" مسکراہٹوں میں سب سے پیاری مسکراہٹ سجا کر عالیان نے کہا۔

"ہاں تم تو یہی کہو گے۔" سندری امرحہ نے بروں میں سب سے بری طرح منہ بنا کر کہا۔

"میں ۔۔۔ ہاں میں ہی تو یہ کہوں گا ۔۔۔ لاہور خالی ہو چکا ہے ۔۔۔ اس کے پاس سب نہیں ہے ۔۔۔ تم تو یہاں بیٹھی ہو ۔۔۔ اس کے پاس سب کیسے ہو سکتا ہے ۔۔۔ اس کا سب تو مانچسٹر میں آچکا ہے۔"

کھڑکی کے باہر گرتے برف کے گالوں نے اتنی پیاری بات پر تالیاں بجائیں ۔۔۔ وہ سفید سے نیلے' پیلے' ہرے ہو گئے ۔۔۔ اور امرحہ خاموش ہو گئی اور کتاب پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ویسے یہ دیکھو۔" اس نے اپنا موبائل امرحہ کے آگے کیا جہاں لاہور کے موسم کی ساٹھ سالہ تاریخ موجود تھی۔

"لاہور میں برف باری نہیں ہوتی۔" کہہ کر اس نے بلند قہقہہ لگایا۔ اس بار اس نے آواز دھیمی رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ ادھر ادھر بیٹھے اسٹوڈنٹس نے اس کی طرف دیکھا کہ اتنے دباؤ میں بھی کون ایسے دل سے ہنس رہا ہے۔ عالیان ۔۔۔ اور کون ۔۔۔

"ہوتی ہے۔" وہ اپنی بات پر قائم رہی۔

"سندری امرحہ ۔۔۔ چچ چچ ۔۔۔ لاہور کی پتنگیں اور گلیوں کی نہ ختم ہونے والی ڈوریں ۔۔۔" لاہور کی تاریخ اور رنگیلے لوگوں سے اکتساب۔

عالیان نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔
"اور یہ سب؟" اس نے موبائل پر نظر آنے والے کالم کی طرف اشارہ کیا جو لاہور کے موسم کے بارے میں تھا۔
"یہ غلط ہے ۔۔۔ کسی جھوٹے انسان نے لکھا ہے۔" اس بار امرحہ نے شانے اور گردن ایک ساتھ اُچکائے اور اتنے یقین اور سنجیدگی سے کہا کہ عالیان کا جی چاہا کہ کہہ دے کہ ہاں ساری دنیا جھوٹی ہے 'غلط ہے۔ صرف تم سچی ہو۔۔۔ مجھے صرف تمہاری بات پر یقین ہے۔ لیڈی مہر کی طرح ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر وہ اپنی مزید مسکراہٹ دبائے اسے دیکھتا رہا۔
دونوں کے درمیان کچھ دیر خاموشی رہی۔
سندری امرحہ ایسے ہی جھوٹ بولتی جائیں اور لارڈ میئر ایسے ہی سنتے جائیں۔۔۔ وہاں کچھ ایسا ماحول تھا۔۔۔ علی رنگ کے اوپن ہال میں۔۔۔ کھڑکی کے پاس۔۔۔
"اگر میں لاہور جا کر رہوں اور برف باری نہ ہو تو تم مجھے کہو گی کہ اس سال ہی نہیں ہوئی۔ اگر میں اگلے سال تک کے لیے لاہور میں رک جاؤں تو تم کہو گی کہ موسم میں خطرناک حد تک تبدیلی آچکی ہے۔۔۔ اور اگر میں آس پاس کے لوگوں سے تصدیق کے لیے پوچھنا شروع کر دوں تو تم کہو گی کہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔ تمہاری بے عزتی کروانا چاہتے ہیں۔" اپنی ساری ہمت مجتمع کر کے اپنی ہنسی کو اندر ہی روک کر وہ بمشکل اتنا ہی کہہ پایا۔
"تو تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو کہ سب کچھ تمہارے پاس ہی ہے؟"
وہ ہنسا "تم دو شہروں کے سرسری جائزے میں بھی حاسد ہو امرحہ۔۔۔ میں نے یہ کب کہا کہ ہمارے پاس سب کچھ ہے۔۔۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ کیا تم پہلی بار برف باری دیکھ رہی ہو۔۔۔ بس تم برا مان گئیں۔"
"میں بہت بار دیکھ چکی ہوں۔۔۔ بس۔" امرحہ باز آنے والی نہیں تھی۔
"ٹھیک ہے پر کہاں۔۔۔؟"
"فلموں میں۔۔۔ ٹی وی پر۔۔۔ میگزینز میں۔" اس نے روانی سے کہا۔
عالیان نے سر کو اٹھایا۔ علی رنگ کی چھت کو دیکھا اور اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ ہال میں موجود ذرا فاصلے پر موجود اسٹوڈنٹس بھی سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگے اور قریب کی نشستوں پر ذرا دیر کو اونگھنے والے اسٹوڈنٹس ڈر کر 'جھرجھری بھر کر چونک کر آس پاس دیکھنے لگے۔
"عالیان!" ڈر کر اٹھ جانے والی میگن نے اسے گھورا۔
عالیان نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔۔۔ امرحہ خاموشی سے کتاب پڑھنے لگی کہ وہ چلا جائے لیکن اپنی ہنسی قابو میں کرنے کے بعد وہ اس کی ایک کتاب لے کر بیٹھ گیا اور اسے سرسری دیکھنے لگا۔۔۔ وہ کتاب کا ایک صفحہ الٹتا اور اسے دیکھتا۔۔۔ پھر اسے دیکھتا اور جلدی سے صفحہ الٹ دیتا۔ وہ غیر ارادی طور پر اس کے مزاج کو بگاڑ چکا تھا۔۔۔
"تمہاری آنکھیں۔۔۔"
"میری آنکھیں کیا۔۔۔؟" امرحہ کو یقین تھا اب وہ اس کی آنکھوں کو نشانہ بنائے گا۔ 'کالی۔۔۔ گہری'۔
"مجھے بھوری آنکھیں پسند نہیں۔" اس نے جلدی سے اسے ٹوک دیا۔
"میں نے تم سے اپنی آنکھوں کے بارے میں تو نہیں پوچھا۔"
"تم میری آنکھوں کو برا کہتے ہمیں نے پہلے ہی کہہ دیا۔" کیا حکمت عملی اپنائی تھی امرحہ نے۔۔۔ واہ۔
"میں نے تمہیں برا کب کہا؟"
"کہہ سکتے تھے۔۔۔ امکانات تھے۔" کافی ذہین تھی امرحہ ویسے۔۔۔ بادام کھاتی رہی تھی نا۔۔۔
"جب کہا ہی نہیں تو۔۔۔؟"
"کہہ دیتے تو۔۔۔؟"
"میں تو بس اتنا کہنے لگا تھا کہ تمہاری آنکھیں بہت گہری ہیں۔ جب تمہیں پہلی بار روتے ہوئے دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ بہت آنسو بہا چکی ہیں 'بہت روتی رہی ہیں۔"

نوٹس لکھتے امرحہ کے ہاتھ رک گئے۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اسے اس سے خوف محسوس ہوا۔ وہ اس کے بارے میں اور کس کس بات کا ایسے ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا چکا تھا۔۔۔؟ اس کی نحوست کا بھی۔۔۔ کیا اس کا بھی کہ لاہور میں وہ کتنی غیر اہم رہی ہے۔۔۔ گھر کا' خاندان کا حصہ ہو کر بھی حصہ نہیں سمجھی گئی۔ اس پر کیسے کیسے طنز کیے جاتے رہے ہیں۔ اس کا کیسے کیسے مذاق اڑایا جاتا رہا ہے۔
وہ امرحہ جو رات کے اس وقت بارہ بجے کے قریب مکمل اعتماد سے علی رنگ کامن میں بیٹھی پڑھ رہی ہے 'دادا کے کمرے میں خوف سے چھپ جایا کرتی تھی کہ گھر میں آنے والے مہمان اسے دیکھ نہ لیں۔۔۔ اگر وہ کسی تقریب میں چلی ہی جاتی تو کوئی ایسی جگہ تلاش کرتی جہاں کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ وہ اپنے ہم عمروں کو باتیں کرتے' قہقہے لگاتے ' اچھل کود کرتے دیکھتی لیکن اپنی جگہ سے نہ ہلتی۔۔۔ ان کے پاس جانے کی ہمت نہ کر پاتی۔۔۔
"کیوں روتی رہی ہو تم؟"
"میں کبھی نہیں روئی۔" کس قدر خوفناک سوال پوچھ لیا تھا عالیان نے۔۔۔ وہ اس سوال کا جواب کبھی نہیں دے گی۔
"یہ جھوٹ ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔
"میں کبھی نہیں روئی۔۔۔ کہا نا۔"
"جو کبھی نہیں روتا' وہ انسان نہیں ہوتا۔۔۔ تم انسان نہیں ہو کیا؟"
"تم انسان ہو۔ تم روتے ہو؟"
"ہاں! رویا ہوں 'بہت رویا ہوں۔" خاموشی کے بوجھل وقفے کے بعد وہ بولا۔ اس کی آواز اداس ہو گئی۔ وہ پہلی بار اتنا اداس نظر آیا۔
"کیوں؟" امرحہ کو اپنی غلطی کا فوری احساس ہوا۔ خاموشی سے وہ جیسے سر جھکا کر بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔
"دیکھا برا لگا ناں۔۔۔ اپنے رونے کی وجہ کوئی بھی بتانا پسند نہیں کرتا۔۔۔"
"میں چھ سال کا تھا جب رات بھر اپنے ہاتھ کو اپنی ماما کے ہاتھ میں دیے ان کے سرہانے بیٹھا رہا تھا۔۔۔ صبح ان کا ہاتھ سرد ہو چکا تھا اور سخت بھی۔۔۔ اور جب لوگوں نے میرے ہاتھ کو ان کے ہاتھ سے نکالنے کی کوشش کی تب میں رونے لگا۔۔۔ اور بعد میں بھی اس منظر کو یاد کر کے روتا رہا۔۔۔ یہ میرے اب تک کے رونے کی سب سے بڑی وجہ ہے۔"
امرحہ کو اپنے رویے پر شرمندگی ہوئی۔ "آئی ایم سوری۔"
وہ اٹھا اور چلا گیا۔۔۔ اس کی چال بتا رہی تھی کہ وہ خود کو کس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔۔۔ امرحہ نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کا اپنے بارے میں اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ کافی خود غرض ہوتی جا رہی تھی۔ غالباً "ٹھیک کہہ گیا تھا کہ جو روتا نہیں وہ تو انسان ہی نہیں ہے۔۔۔ اور سب انسان روتے ہیں۔۔۔ کبھی نہ کبھی۔۔۔ کسی نہ کسی وجہ کو لے کر۔۔۔
لیڈی مہر اپنے بچوں کے بارے میں صرف اس محبت کا ذکر کرتی تھیں جو ان سب کے درمیان تھی۔ وہ کبھی یہ نہیں بتاتی تھیں کہ کون کیا 'کیوں اور کیسے ہے۔۔۔ وہ اس کڈز سینٹر تک کیسے پہنچا۔۔۔ اس کا ماضی کیا ہے۔۔۔ وہ کہا کرتیں "ان کے بچوں کا ماضی کتنا بھی بھیانک رہا ہو' ان کا حال پُرعزم ہے اور مستقبل شاندار۔ وہ ان کے بچے تھے اور وہ ان کی تکلیفوں کو ان کے سوا کسی اور کے ساتھ زیر بحث نہیں لائی تھیں۔۔۔ کبھی مورگن' شارلٹ' ڈینس یا کوئی اور ان کے پاس پریشان صورت لیے آتا تو گھنٹوں کمرہ بند کیے اپنے اس بچے یا بچی کو لیے جانے کون کون سی باتیں کرتی رہتیں۔ امرحہ سمجھ سکتی تھی کہ آپ کتنے بھی مضبوط اور بہادر بننے کی کوشش کریں۔ ماضی سامنے آکر تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی پر دیوانہ سا ضرور کر دیتا ہے۔۔۔ آپ اپنے حواس کھونے لگتے ہیں۔۔۔ عالیان کے بارے میں اگر امرحہ نے کچھ جاننا چاہا تو انہوں نے صرف اتنا کہا۔
"وہ میرا بہت بہادر بیٹا ہے اور اپنی ماں مارگریٹ سے مثالی محبت کرتا ہے۔"

بس اس سے آگے انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ ایک سمجھ دار خاتون تھیں۔ انہیں معلوم تھا کس کے بارے میں کتنی بات کرنی ہے اور اپنے بچوں کے لیے تو وہ بہت سمجھ دار تھیں۔

امرحہ اپنے رونے کو لے کر بیٹھی تھی اور سمجھتی تھی۔ اس سے زیادہ دکھ کسی کو ملے ہی نہیں۔ اس سے زیادہ زیادتی زندگی نے کسی کے ساتھ کی ہی نہیں۔ قدرت نے سب غم کے پہاڑ اسی پر توڑ ڈالے ہیں... کسی خوشی کا حق دار اسے ٹھہرایا ہی نہیں گیا... ایک امرحہ ہی گیا... ہم سب یہی سوچتے اور اسی سوچ پر یقین رکھتے ہیں۔

انسان نے سب سے زیادہ علم جو خود کو سکھایا ہے وہ ناشکر گزاری اور شکوہ سرائی ہی تو ہے۔

☼ ☼ ☼

سرسبز مانچسٹر یونی برف سے اٹ چکی تھی۔ برف پڑی نظر آتی تھی' پہلی بار برف کے ایسے ڈھیروں کو دیکھنے والوں کا جی چاہتا تھا کہ وہ ان ڈھیروں پر پھسلیں' گولے بنا بنا ایک دوسرے کو ماریں... اور بہت سے اسٹوڈنٹس وقت نکال کر ایسا کر بھی لیتے تھے۔ مانچسٹر پر سفید پری کا راج تھا اور گرم خطوں سے تعلق رکھنے والے اس سفید پری پر فدا ہوئے جا رہے تھے جبکہ ٹھنڈے خطوں کے باشندے ایسے موسم سے بہت چڑتے ہیں۔ وہ بہار کے دلدادہ ہوتے ہیں کم نہیں منہ سے بھاپ نکالتے اس موسم سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ اتنے ڈھیر سارے گرم کپڑے پہننے سے انہیں کوفت ہوتی ہے... پاکستانیوں کی تو خیر جان ہوتی ہے سردیوں میں... اور وہ سردیوں کے مختصر دورانیے کو ایسے مناتے ہیں جیسے مغربی کرسمس کی چھٹیوں کو... دستانے' ٹوپی چڑھائے' کانوں کے گرد مفلر لپیٹے' گرم کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیے... سرخ ناک لیے... دھند کو اپنے اندر اتارتے دھند کو چیرتے چلتے امرحہ یونیورسٹی میں آتے ہی مبہوت سی ہو جاتی... دھند یونیورسٹی کی عمارتوں سے ہوتی زمین پر اتر رہی ہوتی... وہ تھوڑی دیر کو کھڑی کی کھڑی رہ جاتی۔

"کیا یہ کسی خواب کا منظر ہے... یا خواب ہی ہے؟"

اسٹوڈنٹس تیزی سے آ جا رہے ہوتے... نیلے' پیلے' سرمئی' کالے' سفید کوٹوں والے' ٹوپیوں والے' منہ سے بھاپ نکالتے... ہاتھوں کو رگڑتے یا جیبوں میں دیے کتنے پیارے مناظر تھے... ٹھنڈ تھی... برف تھی... دھند تھی... اور آزادی تھی۔

دوست تھے... ہلا گلا تھا... اور کوئی دکھ نہ تھا۔

دو دن بعد امرحہ تھوڑا سا وقت نکال سکی عالیان کے پاس جانے کے لیے' علی رنگ کامن کے گروپ اسٹڈی روم کے شیشے کے دروازے کے پار وہ اسے نظر آ گیا۔ کم سے کم گیارہ اور اسٹوڈنٹس بیٹھے تھے اور وہ وائٹ بورڈ کے پاس کھڑا لیکچر سا دے رہا تھا۔ پین سے وہ وائٹ پر کوئی سوال حل کر رہا تھا۔ امرحہ نے اس کے لیے کافی لی تھی اب اتنے اسٹوڈنٹس میں وہ ایک مگ کافی تو نہیں دے سکتی تھی' اس لیے پلٹ آئی۔ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہی تھی جب عالیان تقریباً" اس کے پیچھے بھاگتا ہوا آیا...

"یہ میرے لیے لائی ہو۔" اس نے مگ پکڑ کر گھونٹ بھرا۔

"ہاں!" وہ مگ ہاتھ میں لے چکا تھا۔ کافی پی رہا تھا اور پوچھ رہا تھا امرحہ نے اسے داد دی۔

"مفت!" وہ سیڑھیاں اترنے لگا اس کے ہال کی طرف بڑھنے لگا۔

"ظاہر ہے مفت... یہ ٹویٹ نہیں ہے..."

"اوہ شکر کہ یہ ٹویٹ نہیں ہے... ویسے ہی میرے سر پر دس بارہ ٹویٹس ہیں... چار تو کارل کی ہیں... اور وہ میری جان کو آیا ہوا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں آئی ہوں؟"

"دو دن سے انتظار کر رہا تھا تمہارا۔" چلتے چلتے اس نے گردن موڑ کر کہا۔

"پر میں نے کب کہا تھا۔ میں آؤں گی؟"

"آنا چاہیے تھا..."

"تم کہاں جا رہے ہو؟" امرحہ کو نیچے جانا تھا اسے تو نہیں نا...

"میں تمہارے ساتھ..."

"میرے ساتھ کیوں آ رہے ہو... تم پڑھو بلکہ شاید تم کوئی لیکچر دے رہے تھے۔"

"میں بریک لینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا۔"

"میں تو صرف معذرت کرنے آئی تھی تم سے۔"

دونوں سیکنڈ فلور پر آ کر رک چکے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ کرو۔"

امرحہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔

"کرو بھئی... میں سن رہا ہوں۔" کافی کی چسکی لے کر اس نے کہا۔

"معذرت کرنے آئی تھی... جب یہ کہہ دیا تو مطلب معذرت کر لی... اور کیا۔"

"آں... اچھا۔ اب آگے..."

"آگے کیا؟" امرحہ کو پھر سے غصہ آنے لگا۔

"تم اتنے پیارے سرد مانچسٹر میں رہ کر اتنی جلدی گرم کیوں ہو جاتی ہو؟" عالیان مسکرایا یعنی امرحہ سے ناراض ہونا وہ جانتا ہی نہیں تھا۔ اس کے غصے کو وہ پھول کی پتی کی مانند چھو کر اڑا دیتا تھا۔

"اچھا چلو' ایگزامز کے بعد ملتے ہیں... مشکل ہے لیکن میں کر لوں گا... ورنہ میرا تعلیمی ریکارڈ خراب ہو جائے گا..."

"مجھے تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں..."

"مجھے خود بھی میری باتیں سمجھ نہیں آتیں... اچھا تم جاؤ..."

"کیسے انسان ہو تم' کسے جانے کے لیے کہہ رہے ہو۔" کارل کی آواز ان کے قریب' لیکن پیچھے سے آئی اور اس نے بڑھ کر عالیان کی گردن دبوچ لی۔

امرحہ تو فوراً" وہاں سے غائب ہو گئی وہ امتحانات کے دنوں میں اس سے کوئی لڑائی مول لینا نہیں چاہتی تھی... لیکن اگلی رات کو وہ خود امرحہ کے پاس آیا...

کچھ فاصلے پر بیٹھی لیزا پڑھتے پڑھتے لڑھک کر سو چکی تھی اور صوفے اور کارپٹ کے درمیان جھولتی کافی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ پہلے تو اسے دیکھ دیکھ کر امرحہ اپنی ہنسی روکتی رہی پھر اس کے پاس آئی اسے دھکیل کر کارپٹ پر کیا تاکہ وہ ٹھیک سے کارپٹ پر ہی سو جائے... سامنے اس کا لیپ ٹاپ کھلا رکھا تھا۔ اکثر ایسی چیزیں غائب کر لیے جانے کے واقعات ہو جاتے تھے... امرحہ نے اس کی چیزیں سمیٹیں اور بیگ کو اس کے سر کے پیچھے رکھا... ابھی لیپ ٹاپ پر اس نے ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اسے محسوس ہوا کہ اس کی تصویر کھینچی گئی ہے... اس نے گردن موڑی تو کارل کھڑا تھا۔

"امرحہ The Lost Duck علی لرننگ کامن میں سوئے ہوئے اسٹوڈنٹس کی چیزیں چراتے ہوئے... اپنی نوعیت کا چالیسواں واقعہ..." فون ہاتھ میں لیے وہ مسکرا رہا تھا۔ "یہ گرما گرم خبر کچھ ہی دیر میں The Tab Manchester (اسٹوڈنٹس ویب سائٹ) میں آ جائے گی..."

امرحہ کا جی چاہا کہ لیزا کی ٹھنڈی ہو چکی کافی اس پر انڈیل دے' پر وہ باز رہی... وہ اپنی آنکھوں کی چنگاریاں دبائے اسے گھور رہی تھی اور کارل کو یہ نظر آ رہا تھا کہ اسے گھورا جا رہا ہے... وہ ہاتھ باندھ کر ایسے کھڑا ہو گیا جیسے سو دو سو پاپارازی اس کی تصویریں کھینچ رہے ہوں...

"تمہیں غصہ آ رہا ہے؟... ہاں تمہیں تو غصہ آ رہا ہے۔" وہ مسکرایا۔

"میں عالیان سے کہتی ہوں۔" امرحہ کو آگ ہی لگ گئی۔

وہ ہنسا "عالیان میرا باپ نہیں ہے' ویسے ہوتا تو بھی وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا یہ دھمکی چلنے والی نہیں تھی کہ میں تمہاری اماں سے تمہارے ابا سے تمہاری شکایت کر دوں گی یا ذرا رکو میں ابھی اپنے بھائی کو لے کر آئی' وہ تمہاری عقل ٹھکانے لگائے گا۔

"کچھ ہی دیر میں تم یونی میں مشہور ہو جاؤ گی' پھر ہر کوئی تم سے اپنی چوری شدہ چیزوں کا مطالبہ کرے گا

۔۔۔۔ وہ بھی جن کی کبھی ایک پن بھی چوری نہیں ہوئی ہوگی۔۔۔ تم سوچ سکتی ہو میرا کیا مطلب ہے۔" اف وہ پھر مسکرایا۔۔۔ گندا بچہ۔

امرحہ کارل کو وہیں چھوڑ کر ویرا کے پاس آئی۔ وہ اپنی کلاس فیلوز کے ساتھ گروپ اسٹڈی کر رہی تھی۔ ویرا کو ساری بات بتائی۔۔۔ ویرا ہنسنے لگی۔

"تم فکر نہ کرو۔ وہ تمہیں ڈرا رہا ہے۔۔۔ ویسے میں The Tab کے ایڈیٹر کو جانتی ہوں۔۔۔ بات کر لیتی ہوں اس سے۔۔۔ تم فکر نہ کرو۔"

"یاد سے کر لینا ورنہ کل تک میں چور مشہور ہو چکی ہوں گی۔"

ویرا نے قہقہہ لگایا "ویسے ایسا کر کے دیکھتے ہیں۔۔۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ چور کیسا محسوس کرتے ہیں۔"

"مجھے ایسے احساسات معلوم نہیں کرنے یعنی حد ہے۔۔۔ ایک چور کے احساسات ہی رہ گئے ہیں معلوم کرنے کے لیے۔"

ویرا ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگی "ایسی باتیں کرتی تم بڑی پیاری لگتی ہو۔ اگر اگلے جنم تم کی کوئی چیز ہے تو مجھے امرحہ بننا ہے۔۔۔ ینگ لیڈی آف پاکستان۔"

"اور مجھے ویرا۔۔۔ خونخوار لیڈی آف رشیا (روس)"

ویرا نے وہیں کھڑے کھڑے ایڈیٹر سے بات کی، کچھ دیر بعد ویرا نے ایم ایم ایس جو ایڈیٹر نے اسے بھیجا تھا۔ امرحہ کو دکھایا۔۔۔ وہ امرحہ کی تصویر تھی۔

"جادو سے ہپناٹائز کر کے اسٹوڈنٹس کی چیزیں چھپا دینے والی فریشر امرحہ (The Lost Duck) اپنی نوعیت کا چالیسواں واقعہ، یونیورسٹی انتظامیہ سے تحقیقات کی گزارش کی جاتی ہے۔"

"وہ تمہیں چور نہیں جادوگر ثابت کر رہا ہے۔۔۔ تم دیکھتیں، کل تک تمہارے پاس اسٹوڈنٹس کی لائن لگ جاتی ہپناٹیزم کے لیے۔۔۔" ہنستے ہنستے ویرا بے حال ہو گئی۔۔۔ امرحہ بھی ہنسنے لگی۔

"یہاں بڑی مانگ ہے ہپناٹزم کی۔۔۔ تم تو مزے سے ہزاروں پونڈ کما لیتیں۔۔۔ آج کل تو پروفیسرز کو ہپناٹائز کرنے کے لیے کہا جاتا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ منہ مانگے پونڈز ملتے تمہیں امتحانات کے دنوں میں۔"

لیکن یقیناً" کارل کو اپنی تیاری سے زیادہ امرحہ کی فکر تھی کہ وہ بے چاری یہ نہ سوچتی ہو کہ اسے کوئی تنگ نہیں کر رہا۔ آخر اس کے ساتھ یہ غیروں والا سلوک کیوں؟ تو وہ اس کے ساتھ اپنوں جیسا سلوک کرنے اگلی رات علی لرننگ میں موجود تھا۔۔۔

علی لرننگ میں امتحانات کے دوران پڑھنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ جو پورا سمسٹر آپ کو نظر نہیں آتے وہ نظر آتے آتے آپ کے دوست بن جاتے ہیں۔ پورا مہینہ علی لرننگ کامن میں "ہاؤس فل شو" ہوتے۔۔۔ جو راتوں کو اپنے بستروں پر سوتے ہیں وہ یہاں اونگھتے اور پڑھتے پائے جا سکتے ہیں۔۔۔ رات رات بھر ان کی شکلیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ علی کامن، لائبریری، کیفے چوبیس گھنٹے کھلے رہتے تھے۔۔۔ تو کارل اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔۔۔ امرحہ نے اس کے اٹھنے کا انتظار کیا اور مکمل توجہ سے پڑھنے کی کوشش کی، لیکن بے کار۔۔۔ کبھی نوٹس اس کے ہاتھ سے گر جاتے، کبھی پین اور پھر لیپ ٹاپ بھی گر گیا۔۔۔

اف اب وہ اتنا سامان سمیٹ کر دوسری جگہ جائے ۔۔۔ اب تو اسے فلور پر ہی بیٹھنا پڑے گا کیونکہ سب جگہیں پُر تھیں۔۔۔ اور اسے یقین تھا، وہ جہاں بھی جائے گی۔ کارل اس کے سامنے آ کر ایسے ہی بیٹھ جائے گا۔۔۔

کارل خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کے دماغ میں کچھ چل رہا ہے اور جو چل رہا ہے وہ ایسا کچھ اچھا ہرگز نہیں ہے ۔۔۔ کارل کے دماغ میں ایک ایسی ہسٹری فکس تھی جو کبھی ڈاؤن نہیں ہوتی تھی۔ سب امتحانات کے مارے ہوئے تھے اور وہ الٹی سیدھی حرکتوں میں غلطاں تھا۔۔۔ پھر بھی ہر سال وہ اسکالرشپ لے لیتا تھا۔۔۔ اگر وہ ایسی حرکتیں نہ کرے اور صرف پڑھے تو یقیناً" وہ یونی کا ڈین بن جائے۔ سارے کتابیں، نوٹس، کاغذ، لیپ ٹاپ، پین وغیرہ کو اپنی بانہوں میں عارضی طور پر سمیٹ کر وہ بمشکل اٹھی اور نئی جگہ کی تلاش کرنے لگی۔

وہ چند قدم ہی چلی ہو گی کہ اس کے ہاتھ پر بجلی گری ۔۔۔ جی بجلی ۔۔۔ آسمانی نہیں ۔۔۔ زمینی ۔۔۔ کارل نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پین کو اس کے ہاتھ پر لگایا تھا ایک دم سے پیچھے سے آ کر ۔۔۔ اور اس کے ہاتھوں میں پکڑی سب چیزیں زمین بوس ہو چکی تھیں ۔۔۔ لیپ ٹاپ بھی "ٹھاہ" کر کے گرا تھا۔ اب اللہ ہی جانتا تھا وہ چلے گا یا ستے داموں بکے گا بھی نہیں۔

"کیا بدتمیزی ہے یہ؟" امرحہ چلائی۔

"کیا ہوا؟" اف کارل کی معصومیت ۔۔۔

"تم نے کیا لگایا ہے میرے ہاتھ پر؟"

"میرے ہاتھ تو خالی ہیں ۔۔۔ صرف یہ ایک پین ہے میری ہاتھ میں ۔۔۔ میں پڑھ پڑھ کر تھک چکا تھا سو چا تم سے باتیں شاتیں کر لوں ۔۔۔"

"اس پین میں کچھ تھا ۔۔۔ ضرور کچھ تھا۔" امرحہ قسم کھا سکتی تھی اس میں کرنٹ تھا۔

"تمہیں میرے اس پین پر شک ہے؟" اس نے پین لہرایا ۔۔۔ "دیکھو یہ صرف ایک پین ہے۔ اس سے لکھا جاتا ہے ۔۔۔ لکھنا سمجھتی ہو نا ۔۔۔ ایسے ۔۔۔ ایسے لکھتے ہیں۔"

امرحہ نیچے بیٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹنے لگی وہ بھی نیچے بیٹھ کر اس کی چیزیں سمیٹنے لگا اور ایک بار پھر امرحہ کے ہاتھ پر کرنٹ کا ایک جھٹکا لگا ۔۔۔ امرحہ نے چیخ ماردی، کارل نے دونوں ہاتھ اٹھا لیے ۔۔۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے ۔۔۔ نہیں کرتا تمہاری مدد میں ۔۔۔ تم تو جنگلیوں کی طرح چلا رہی ہو ۔۔۔ میں یونیورسٹی انتظامیہ سے بات کرتا ہوں آخر وہ یونیورسٹی میں خلائی مخلوق کو داخلے کیوں دیتے ہیں ۔۔۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے نا ۔۔۔ اس طرح تو تم لوگ ہمیں پاگل کر دو گے، آخر ہم کیوں پاگل ہوں تمہارے لیے۔"

امرحہ نے لیپ ٹاپ اٹھا لیا ۔۔۔ "اگر تم یہاں سے نہیں گئے تو میں تمہارا سر پھوڑ دوں گی۔"

"اس طرح تمہارا لیپ ٹاپ بھی ٹوٹ جائے گا ۔۔۔ جہاں تک میرا خیال ہے ابھی تک میرے سر سے زیادہ تمہیں لیپ ٹاپ عزیز ہو گا۔"

"تم اس کی جان کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟" عالیان نے آ کر ایک زوردار گھونسا اس کی کمر میں جڑا ۔۔۔ اور اس کے ہاتھ سے پین جھپٹ لیا ۔۔۔

کارل نے قہقہہ لگایا "میں تو یہاں سے گزر رہا تھا امرحہ نے ہی مجھے روکا کہ آؤ باتیں کرتے ہیں۔ باتیں شاتیں۔"

عالیان نے امرحہ کی سب چیزیں سمیٹیں اور اس کے ہاتھ میں کارل کا پین دیا۔

"اس پین کا استعمال میں تمہیں سکھا دوں گا۔ اگلی بار یہ تمہارے پاس آئے تو اسی پین سے اسے کرنٹ دینا۔"

امرحہ نے تبرک کی طرح پین کو قبول کیا ۔۔۔ اور اپنی کلاس فیلو کی ٹیبل پر چلی گئی ۔۔۔

کارل کا قہقہہ اس کے پیچھے گونجتا رہا۔

کارل انسانی حلیے میں ایک غیر انسانی مخلوق ۔۔۔ بلاشبہ ۔۔۔

پین میں ایک ہیوی بیٹری فکس تھی، جو پین کے کیپ کو بائیں طرف حرکت دینے پر کام کرتی اور پین کی نب سے ہلکا سا کرنٹ نکلتا ۔۔۔ جو معمول کے اوقات میں کافی زوردار لگتا ۔۔۔ عام استعمال میں وہ پین ایک عام لکھنے والا پین تھا ۔۔۔ صرف اس کا مالک ہی اس کا استعمال جانتا تھا ۔۔۔ اور اس کا مالک کارل تھا ۔۔۔

یہ پین بھی کارل کا ٹریڈ مارک تھا ۔۔۔ اب تو کارل کے لیے پرانا ہو چکا تھا۔ لیکن امرحہ کے لیے بہرحال نیا ہی تھا ۔۔۔ امرحہ کے لیے ہی اس نے نکالا تھا۔

وہ اس پین کا استعمال یونی میں، اسٹوڈنٹس سے بھرے کوریڈورز، لان، کلاسز، گراؤنڈ، لائبریری، سب ویز، بس، ہوٹل، بارز، کلب، کیفے ہر جگہ کیا کرتا، خریداری کے دوران بھی، سڑک پر چلتے رش والی جگہ پر بھی ۔۔۔

کئی بار کلاس میں اس نے پروفیسرز کو بھی یہ جھٹکے دیے تھے ۔۔۔ جس دن اس کا یہ موڈ ہوتا وہ پہلی رو میں

بیٹھ جاتا اور بلاوجہ لیکچر کے دوران یہ ظاہر کرتا کہ اسے لیکچر میں فلاں فلاں پوائنٹ سمجھ میں نہیں آرہے۔۔۔ پروفیسر چلتے اس کے قریب آجاتے۔۔۔

کارل دونوں ہاتھوں کو کھڑا ہو کر لہراتا اور ایسے لہراتا جیسے اسے بات کے دوران ہاتھ چلانے کی عادت ہے۔۔۔ بہت سے لوگوں کو یہ عادت ہوتی ہے۔۔۔ خیر ہاتھ چلاتے چلاتے پین پروفیسر کی ٹھوڑی گردن کان کی لو اور کبھی ناک سے ٹکرا جاتا۔ ایسا ہو ہی جاتا ہے اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں۔۔۔ خیر۔۔۔ تو اور بے چارے پروفیسر۔۔۔ بھری کلاس میں چلا اٹھتے۔۔۔ ڈر کر۔۔۔ حواس باختہ سے ہو جاتے ایک دم سے اچھل پڑتے۔۔۔ بے چارے پروفیسر صاحب۔۔۔

ایسے موقعوں پر کلاس کے لیے اپنے قہقہوں کا گلا دبانا مشکل ہو جاتا۔۔۔ عالیان کہیں قریب ہی ہوتا تو اس کی کمر پر چٹکی بھرتا۔۔۔

"کسی کی جان جائے گی تیرے اس چھوٹے موٹے کرنٹ کے گولے سے۔"

"گئی تو نہیں نا۔۔۔ ویسے بھی سائنس کہتی ہے کہ ایک عام انسان کے جسم میں اچھے خاصے وولٹیج کے کرنٹ کو سہنے کی طاقت ہوتی ہے۔۔۔"

"سائنس کہتی ہے یا کارل کہتا ہے۔"

"کارل کسی سائنس سے کم ہے کیا۔۔۔؟" آنکھ مار کر۔

تو یہ ہے کارل۔۔۔ انسانی حلیے میں غیر انسانی مخلوق۔۔۔

ویلکم ویک پر اس نے فریشر کا کافی بھرتہ بنایا تھا۔ وہ تو سارا سال ویلکم ویک کا انتظار کرتا تھا' فریشر میں تو اس کی جان ہوا کرتی تھی۔ وہ اپنے سارے پرانے اوزار نکال لیا کرتا تھا۔

اکثر سینئرز فریشر کو گائیڈ کرتے ہوئے کاغذ پر یہ بھی لکھ دیتے "اور کارل سے بچ کر۔"

Have a safe welcome week

کارل ویلکم ویک کے پانچ دن نت نئے انداز اپناتا' تاکہ پہلے دن ملنے والے اسے دوسرے دن پہچان نہ سکیں' دوسرے دن ملنے والے اس کے ہاتھوں تیسرے دن بھی الو بن سکیں۔ وہ داڑھی اور بال بڑھا لیتا' دوسرے دن کٹوا لیتا' تیسرے دن ہرے رنگ کی وگ' چوتھے دن گنجا۔۔۔ ساتھ کان ناک' ٹھوڑی اور بھنوؤں میں بالیاں۔۔۔ پانچویں دن لمبے بال۔۔۔ کارل "Ask me"

جس نے اسٹوڈنٹ کارڈ بنوانے جانا ہے' اسے وہ بڑے آرام سے یونی سے باہر کسی بھی دوسری عمارت میں بھیج دیتا۔۔۔

کئی بے چارے معصوم ایشیائی جو ڈرے ڈرے سے تھے اور اپنی ماما اور پاپا کے ساتھ یونیورسٹی کے گیٹ تک آئے تھے ان کو اس نے باتھ روم میں لاک کر دیا۔

جی اس کے پاس اوزار تھے وہ دروازے کے ہینڈل میں ایک باریک سلاخ اڑا کر اسے جام کر دیتا تھا۔۔۔ ہو گیا لاک۔۔۔ اب یہ اندر والے کی طاقت پر ہے کہ وہ کس زور سے ہینڈل کے ساتھ زور آزمائی کرتا ہے اور کتنی جلدی باہر آتا ہے۔۔۔

اور ایسے کام وہ بہت احتیاط سے کرتا۔۔۔ اسے بھی یونی میں رہنا تھا۔۔۔

چند لڑکیوں کو اس نے سائنس لیب میں بند کر دیا تھا۔۔۔ امرحہ کی قسمت اچھی تھی کہ ویلکم ویک پر اس کا ٹکراؤ کارل سے نہیں ہوا تھا۔۔۔ ورنہ تو اس کی سائنس لیب میں ہی موت واقع ہو جاتی۔۔۔

اور فریشر ویک پر ایک فریشر امرحہ لیب سے مردہ نکلتی۔۔۔ اور مانچسٹر میں اپنی آمد کے چوتھے دن تابوت میں بند ہو کر پاکستان واپس جاتی۔۔۔ اور دادا یہ معلوم نہ کر سکتے کہ پاکستان میں تو سب اس بے چاری بچی کے پیچھے پڑے رہتے تھے' مانچسٹر میں کون اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

ہر فریشر رو رو کر سکایپ پر اپنے گھر والوں کو ہری وگ' گنجے سر' لمبے بالوں والے Ask me کا قصہ سنا رہا ہوتا۔۔۔

فریشر کے آتے ہی یونی میں کارل۔۔۔ کارل ہو رہی ہوتی۔

اسٹوڈنٹ یونین کے صدر اور باقی لوگ اسے سنجیدگی سے محتاط رہنے کے لیے کہتے تو وہ بڑی معصومیت سے کہتا۔

"پتا نہیں آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔ کیا میں نے کسی کی جان لے لی ہے۔ یا میں کلر ہوں۔"

یعنی وہ جان لے گا تو ہی کوئی چھوٹا موٹا جرم مانا جائے گا۔

☆ ☆ ☆

چینی کہتے ہیں۔

"اگر میں ایک سرسبز شاخ سے اپنے دل کو سجاؤں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک خوش گلو پرندہ اس پر آکر نہ بیٹھے۔"

اور ان کا کہنا ہے کہ

"محبت کرنے سے پہلے احترام کرنا سیکھیں۔" اور یہ بھی کہ۔

"ایک بوڑھے کا عشق میں مبتلا ہو جانا خزاں میں پھول کھلنے کے مترادف ہے۔"

اور خزاں میں محبت کا پھول ہی کھلنے کی جرات کرتا ہے۔ بدھا نے سب جانوروں سے کہا کہ نئے سال پر مجھ سے آکر ملو۔ صرف بارہ جانور بدھا سے ملنے آئے اور بدھا نے ان بارہ کے نام ایک ایک سال کر دیا بیل' مرغ' خرگوش' بکری' چیتا' خنزیر' سانپ' ڈریگن' چوہا' گھوڑا' بندر اور کتے کے چینی سالانہ کیلنڈرز ان جانوروں کے ناموں سے ترتیب پاتے ہیں اور چینی اپنے سال کے آغاز سے پہلے پورے جوش و خروش سے اپنے گھروں کو صاف کرکے سجاتے ہیں' نئے کپڑے خاص طور پر سرخ لباس بنواتے ہیں۔ سرخ کاغذوں اور سرخ پارچہ جات پر لکھی روایتی نظموں سے گھر کے دروازوں' دیواروں اور ایسی ہی دوسری جگہوں کو سجاتے ہیں۔

نئے سال کا آغاز ہو رہا ہے۔۔۔ پرانا وقت بیت چکا ہے۔

پرانے وقت کو الوداع کہا جائے گا۔۔۔ نئے وقت کے لیے جشن تیار ہے۔۔۔ بڑے بوڑھے بچوں کو سرخ لفافوں میں ملفوف "لکی منی" (خوش قسمتی کے سکے) دیتے ہیں۔ چینی روایات کہتی ہیں کہ سرخ رنگ آگ کی علامت ہے' جوان کے سیانوں کے بقول بدقسمتی اور بدی کو دور کرتی ہے۔ قدیم وقتوں میں لمبے بانسوں کو جلایا جاتا تھا تاکہ بدی اور بلائیں آگ کو دیکھ کر بھاگ جائیں' شر کو آگ سے دفعان کیا جاتا تھا۔

بدی اور بلائیں۔۔۔ دنیا کی ہر قوم انہیں دفعان کرنے کا چارہ کرتی ہے خیر اور اچھی قسمت۔۔۔ دنیا کی ہر قوم اس کے حصول کے لیے تگ و دو کرتی ہے۔

چینی نیا سال۔۔۔ خاندان کے ملاپ کا تہوار۔

پہلے چاند کی پندرہ کو سرخ چینی ساختہ لالٹینوں کا تہوار منایا جاتا ہے۔ لالٹینیں جن پر' پھول' پودے' پرندے' برجی جانور' تاریخ اور روایتی قدیم تاریخی شخصیات کندہ ہوتی ہیں سے عبادت گاہوں کو سجایا جاتا ہے اور ہاتھوں میں لے کر شام کو چاند کی روشنی میں پریڈ مارچ کیا جاتا ہے' چینی سال۔۔۔ بہار کا آغاز۔۔۔ دعاؤں کے ساتھ۔۔۔ خوشیوں کو لیے۔۔۔ بدی کو دور کرتے۔۔۔ روایات کو زندہ رکھتے۔۔۔

سرخ سرخ۔۔۔ روشن روشن۔۔۔ منظم اور پرجوش۔۔۔ سال کے آغاز پر اپنی میزوں کو Dumpling (روایتی چینی کھانا) سے سجاتے ہوئے۔۔۔ دعائیں دیتے ہوئے۔۔۔ چاولوں کے جاروں کو بھرتے ہوئے کہ نئے سال پر چینی چاول کے جار کا خالی رہ جانا بدقسمتی کی علامت سمجھتے ہیں۔

چینی کبھی دوسری اقوام کی مذہبی' روایتی' علاقائی تقریبات کو حقارت سے نہیں دیکھتے۔۔۔ اور اپنے لیے وہ دوسری اقوام سے بھی یہی توقع کرتے ہیں۔

انہیں ابتدائی اسباق میں ہر خاص و عام کے احترام کا سبق پہلے دیا جاتا ہے' اسی لیے یہ ہر ایک کے سامنے تعظیم سے جھکتے نظر آتے ہیں اور انہوں نے دنیا پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ احترام کرنا جانتے ہیں۔

مانچسٹر میں اس سال کی ڈریگن پریڈ (نئے سال کی پریڈ) کے لیے تیاریاں عروج پر تھیں۔ پریڈ اکتیس

جنوری نئے سال کے پہلے دن تھی' یہ سال گھوڑے کا سال تھا پچھلا سال سانپ کا سال تھا۔ امرحہ کی چینی کلاس فیلو جی سن (Jee sun) نے سب کلاس فیلوز کو رجسٹریشن کروانے کے لیے کہا تھا۔ وہ امرحہ کے پاس بھی آئی تھی۔

"میں تو جانتی بھی نہیں کہ یہ سب کیا ہوتا ہے میرے لیے تو کھڑے ہو کر دیکھ لینا ہی بہت بڑی دریافت ہوگی کہاں اس میں شرکت کرنا۔"

"پریڈ میں جاؤ گی تو سب جان جاؤ گی ۔۔۔ تمہیں زندگی میں کھڑے ہو کر پریڈ دیکھنے کے تو کئی بار مواقع مل جائیں گے شرکت کرنے کے نہیں ۔۔۔ اس سال تو نوے ہزار سے زیادہ لوگ شرکت کریں گے۔"

وہ ہنسنے لگی "نہیں! میں نے یہ سب کبھی نہیں کیا۔"

"جو کیا نہیں وہ کرو گی بھی نہیں ۔۔۔؛ چینی پاکستانی کو "ناں" نہیں کہتے ایک پاکستانی چینی کو "ناں" کیسے کہہ سکتا ہے۔ غیر چینی لوگ پریڈ میں شرکت کرتے ہیں تو ہمیں اچھا لگتا ہے' ہمیں یقین ہوتا ہے کہ نئے سال کا آغاز ہم نے سب اقوام کی دعاؤں اور محبت سے کیا ہے۔ ہم دونوں تو ایشیائی خطے کے دو اہم دوست بھی ہیں اور ہمسائے بھی ۔۔۔ قطار میں تین غیر ملکی کھڑے ہوں تو ہم پہلے پاکستانی کے آگے Bow کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔"

امرحہ متاثر ہو گئی ۔۔۔ جی سن ٹھیک کہہ رہی تھی امرحہ کبھی بھی کسی بھی طرح کی مدد کے لیے جی سن کے پاس جاتی وہ فوراً" اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتی تھی ۔۔۔ ابتدائی تعارف میں اس نے امرحہ کو گلے سے لگایا تھا اور دو بار اس کے آگے جھکی تھی ۔۔۔ اس نے اسے بتایا کہ اس کے دادا تجارتی غرض سے ایک بار پاکستان گئے تھے اور پہاڑی علاقے میں خوفناک حادثے کا شکار ہو گئے تھے' سردیوں کے دن تھے اتفاق سے دو پٹھان پہاڑی بچوں نے انہیں دیکھ لیا اور ایک بچہ کئی گھنٹے ان کے ساتھ برف میں ان کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو سہارا دیتے اور انہیں بے ہوش ہونے سے بچانے کی سعی کرتا رہا تاکہ وہ کومہ میں نہ چلے جائیں ۔۔۔ کئی گھنٹے بعد دوسرا بچہ مدد لا سکا اور پہاڑی لوگوں نے مل کر چھ مہینے تک ان کی تیمارداری کی ۔۔۔ میرے دادا ہر سال نئے سال کی دعاؤں میں ان سب پہاڑی پٹھانوں کو یاد رکھتے ہیں اور ان کے لیے خوشحالی اور خوش قسمتی کی دعائیں کرتے ہیں۔" وہ امرحہ کو پٹھان سمجھتی تھی اس کے نزدیک سب پاکستانی پٹھان ہی تھے ۔۔۔ امرحہ کو خوشی تھی کہ پہاڑی پٹھانوں نے اسے مانچسٹر اور اتنی بڑی یونی میں معتبر کر دیا ہے۔

کسی بھی قوم کے ایک فرد کی کی گئی نیکی بلاشبہ ساری قوم کا سر فخر سے بلند کروا دیتی ہے۔

"مجھے ہنسی آئے گی۔" امرحہ کو ابھی بھی تامل تھا۔

"تو ہنستی رہنا' بلکہ چھلانگیں لگانا ۔۔۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا ۔۔۔ روتے بسورتے لوگوں کا وہاں کیا کام ۔۔۔ ویسے تم کس جانور کا لباس پہننا پسند کرو گی؟

میں انتظام کر دوں گی ۔۔۔ چاہو تو کوئی ماسک نہ پہنتا ۔۔۔ تم ڈریگن کا بانس بھی پکڑ سکتی ہو لیکن اس کے لیے تمہیں مسلسل حرکت میں رہنا ہوگا' تم تھک جاؤ گی' میں روایتی چینی لباس کموتو پہنوں گی اور میرے ہاتھ میں بڑا سا چینی پنکھا ہوگا میرا میک اپ بہت گہرا ہوگا ۔۔۔ چاہو تو تم میرے ساتھ یہ بن سکتی ہو ۔۔۔ یا تم Percussion (دو بڑی گول دھاتی پلیٹوں پر مشتمل ساز' دونوں پلیٹوں کو آپس میں ٹکرایا جاتا ہے) بجا سکتی ہو ۔۔۔ یا ڈرم ۔۔۔ لیکن تمہیں ڈرم بجانے کی پریکٹس نہیں ہوگی۔"

"نہیں' میں کموتو نہیں پہن سکتی ۔۔۔ گہرا میک اپ تو ہرگز نہیں۔"

"اگر تم شرما رہی ہو تو میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ڈریگن کا لباس پہن لو ۔۔۔ اسے پہن کر قطعاً" یہ معلوم نہیں ہوگا کہ تم کون ہو لڑکی یا لڑکا ۔۔۔ تمہاری مخصوص مشرقی جھجک بھی قائم رہے گی ۔۔۔ بھلے سے ماسک کے اندر شرماتی گھبراتی رہنا ۔۔۔ ہنستی ۔۔۔ قہقہے لگاتی رہنا ۔۔۔"

امرحہ دل کھول کر ہنسی "ٹھیک ہے ۔۔۔ میں ڈریگن بن جاتی ہوں۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں یہ تمہاری زندگی کا یادگار لمحہ ہوگا ۔۔۔ تم پر قسمت مہربان ہوگی۔"

امرحہ اور زیادہ مسکرانے لگی ۔۔۔ "انتظار رہے گا پھر اس لمحے کا ۔۔۔"

☼ ☼ ☼

چینی نئے سال کی رات میں سب مل کر چائنا ٹاؤن گئے ۔۔۔ چائنا ٹاؤن کسی بھی ملک یا شہر میں آباد چینیوں کے علاقے کو کہا جاتا ہے جہاں سب چینی ایک مخصوص علاقے میں بڑی تعداد میں رہائش پذیر ہوتے ہیں ۔۔۔ چائنا ٹاؤن کی حدود کے آغاز پر سرخ' پیلے' سبز روایتی چینی رنگوں سے سجی بنی چینی طرز تعمیر کا بڑا پھاٹک آتا ہے ۔۔۔ جس کے دونوں اطراف جانوروں کے بڑے بڑے مجسمے رکھ دیے گئے تھے ۔۔۔ سب سے بڑا مجسمہ گھوڑے کا تھا۔ ایک بہت بڑے ڈریگن کو بانسوں کی مدد سے اونچائی پر ٹانگ دیا گیا تھا۔ جا بجا چینی اسٹالز لگے تھے جن پر چین کی روایتی چیزوں کی بھرمار تھی' مانچسٹر کے درختوں کی شاخیں تو پہلے سے ہی سرخ گول چینی ساختہ لالٹینوں سے سجا دی گئی تھیں۔

این' ویرا اور وہ مزے سے مفت چینی کھانے کھاتے رہے۔ تمام اسٹالز پر یا کھانے بہت کم قیمت پر دستیاب تھے یا مفت بانٹے جا رہے تھے۔ امرحہ ایک چینی تحفہ بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ ایک عدد چینی شادی شدہ جوڑا اپنی شادی کی سلور جوبلی پر تحائف تقسیم کر رہا تھا اور مانچسٹر یونی کے اسٹوڈنٹس کا وہاں اتنا رش تھا کہ لگتا تھا سب اسٹوڈنٹس آئندہ زندگی اس ایک تحفے پر گزارنے والے ہیں۔

تحفے میں ایک عدد روایتی سرخ پارچہ تھا جس پر چینی زبان میں نظم لکھی تھی۔ ایک ہاتھ میں پہننے کا چینی طرز کا کنگن تھا اور دو سرخ ربن تھے۔ امرحہ کو دو عدد سرخ ربنوں کی سمجھ نہیں آئی ۔۔۔ جب ان میاں بیوی کے اسٹال پر رش ذرا کم ہو گیا اور ان کے سب تحائف تقسیم ہو گئے تو امرحہ ان سے پوچھنے گئی۔

"ایک تمہارے لیے اور ایک تمہارے شوہر کے لیے' جب مجھے انہوں نے۔" چینی خاتون نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کیا "پرپوز کیا تھا تو یہ اتنے غریب تھے کہ ان کے پاس کوئی انگوٹھی نہیں تھی تو انہوں نے ایک اسکول جاتی بچی کے بالوں میں سے ربن کھول کر میری انگلی میں باندھ دیا کہ مجھے کوئی انگوٹھی والا نہ لے اڑے۔"

دونوں میاں بیوی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ امرحہ دیکھ سکتی تھی کہ دونوں نے کس محبت سے اپنی زندگی گزاری ہوگی۔

سرخ ربن امرحہ کی آنکھوں میں بس گئے ۔۔۔ آنکھوں کے پاس لا کر وہ انہیں دیکھنے لگی ۔۔۔ اسے ایک دم سے ڈر لگنے لگا کہ یہ ربن کہیں کھو نہ جائیں۔ اس نے انہیں اپنے کراس بیگ کی محفوظ جیب میں رکھا۔

پھر ہاتھ کو کراس بیگ پر مضبوطی سے ٹکا لیا اسے لگنے لگا کہ سارے چوروں کی نظر اس کے ان دو عدد ربن پر ہی لگی ہوگی۔

سرخ نظمیہ پارچہ ویرا نے اپنے بال کھول کر سر پر باندھ لیا ۔۔۔ اور کنگن این اون نے پہن لیا ۔۔۔ امرحہ نے یہ دو چیزیں انہیں خوشی سے دے دی تھیں۔

"لاؤ' وہ ربن بھی میری کلائی پر باندھ دو ۔۔۔ ایک تم باندھ لو۔" امرحہ نے ویرا کو نہیں بتایا تھا کہ ربن کے ساتھ کیا کہانی منسلک ہے۔ امرحہ کی جیسے جان ہی نکل گئی۔

"وہ میں پاکستان لے کر جانا چاہتی ہوں۔"

"ربن؟" ویرا حیران ہوئی۔

امرحہ نے سر ہلایا۔

"میں پہن کر تمہیں واپس کر دوں گی۔ اس پر جو ستارے لگے ہیں مجھے وہ اچھے لگے ہیں۔"

"میں نے ابھی ربن نہیں باندھا ۔۔۔ میں انہیں ان چھوا رکھنا چاہتی ہوں۔" امرحہ نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

"بعض معاملات میں تم بہت عجیب ہو امرحہ!"

"مجھے لگتا ہے میں پوری کی پوری ہی عجیب

ہوں۔" امرحہ کو اپنے عجیب ہونے پر اس رات کوئی شرمندگی نہیں ہوئی اور وہ رین کے معاملے میں اس قدر عجیب ہونے پر خود کو جانچ بھی نہ سکی۔۔۔ وہ خود کو بھی نہ بتا سکی کہ سرخ فیتے یکدم سے اس کے لیے اتنے اہم کیوں ہو گئے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے ہم خود سے بھی چھپا کر بہت کچھ کرتے ہیں۔۔۔ خود کو پاگل بناتے ہیں۔۔۔ اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب مستقل قریب میں آپ بہت رونے والے ہوتے ہیں۔۔۔ تب جب آپ کو خبر ہو جاتی ہے کہ آپ نے خود سے کیا چھپا کر کیا کیا۔۔۔

انسان اپنی طرف سے بڑی ترکیبیں بناتا ہے نا۔۔۔ پھر ایک دن سب ترکیبیں اسے ڈس لیتی ہیں۔۔۔ وہ صرف ایک ہی سوال کرتی ہیں "ہمیں کیا سمجھ کر اندھیرے میں رکھا۔"

تینوں ہاتھوں میں ہاتھ دیے چائنا ٹاؤن میں سجے میلے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔۔۔ سرخ لالٹینوں کے سائے میں کھڑے ہو کر تصویریں بنوا رہی تھیں۔۔۔ سجاوٹ قابل دید تھی۔۔۔ مسکراہٹیں اس سے زیادہ قابل دید تھیں۔

اسٹوڈنٹس کا ہجوم اس سے بڑھ کر۔۔۔

☼ ☼ ☼

"محبت رتن دیپ سے سجی رتھ ہے جس کا سوار ابدیت کی طرف اُڑان بھرتا ہے۔"

"محبت امرت دھارا ——— سے لبالب بھرا "جام محبوب" ہے جو کبھی پیندے سے نہیں لگتا۔"

سب سے زیادہ داستانیں محبت کی لکھی گئی ہیں۔

سب سے زیادہ گیت محبت کے گائے گئے ہیں۔

محبت وہ کمال ہے جو عرش کو فرش کرتا ہے اور فرش کو عرش تک لے جاتا ہے۔ اور زمین پر دو ہی چیزیں ایسی ہیں جن کے لیے جان دی جا سکتی ہے۔

"محبت اور پھر محبت۔۔۔"

محبت ابن عربی کا نظریہ اہلیت ہے جو نادیدہ کو دیدہ بنا سکتی ہے۔

ایسا اسم اعظم جو مجازی کو حقیقی کرتا ہے۔۔۔ حقیقی کو عشق۔۔۔ عشق۔۔۔ عشق۔۔۔ بلاشبہ وہ خط حق جو خود پر منکری حرام رکھتا ہے۔

قالین باف کے فن کا وہ عروج جس کے ریشے ریشے میں عقیدت سربسجود ہوتی ہے سربسجود ہی رہتی ہے۔۔۔ یہی شرط وفا ہے۔

قلندر کا مادیت سے خالی تن۔۔۔ اور عشق حقیقی سے سجا من۔۔۔ "محبت" محرابی پیشانیوں کے محرابی نور سی۔۔۔

توبہ کے آخری مندرجات۔۔۔ قبولیت کے اولین درجات سی۔۔۔ عرش معلیٰ ہلا ڈالنے والی محترم ہستی "ماں کی دعا سی۔۔۔ بنجر بنجر دھرتی پر پہلی کونپل سی۔۔۔

اور محبت خدا کے رحم سی۔۔۔ اور رحمت ہی۔

رات بھر چینی دعائیں مانگتے رہے ہوں گے۔۔۔ کھانے کی میزوں کے گرد خاندان کو اکٹھا کیے۔۔۔ ہاتھ جوڑے۔۔۔ خدا کو یاد کرتے۔۔۔ صحت و تندرستی کی دعائیں کرتے۔۔۔ محبت و احترام کی مدح سرائی کرتے۔۔۔ چینی رات پھر مسکراتے رہے ہوں گے۔۔۔ اگلے دن جشن ہو تو پچھلی رات نیند نہیں آیا کرتی۔۔۔ وہ بھی نہیں سوپائے ہوں گے۔۔۔

مانچسٹر شہر کی اگلے دن بڑی تقریبات میں شمار ہونے والی ڈریگن پریڈ کا آغاز البرٹ اسکوائر سے شام چار بجے ہو چکا تھا۔ پریڈ کا آغاز بڑے بڑے چینی روایتی سرخ اور پیلے ڈرموں اور Percussions (دو گول بڑی دھاتی پلیٹس) کو پُرزور انداز سے بجا کر اور بلند آواز سے نعرہ "بہار کو خوش آمدید۔۔۔ خوش بختی کے لیے تیار ہیں ہم" سے کیا گیا۔

پریڈ کے آگے درمیان اور آخر میں ڈرموں اور Percussions کو مسلسل بجایا جا رہا تھا اور جن کی آوازیں بلاشبہ سریلا سماع باندھ رہی تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے سب جلوس کی صورت نئی زندگی کے سفر پر رواں دواں ہوں۔

پریڈ میں شامل ہزاروں لوگوں نے ہزاروں طرح کے سوانگ رچا رکھے تھے۔ پریڈ میں آگے کئی سو میٹر

لمبے موٹے ڈریگن کو بانسوں پر اٹھا کر گھمایا، نچایا اور اچھالا جا رہا تھا۔ ڈریگن اتنا بڑا تھا کہ اسے کم سے کم ڈیڑھ سو افراد نے اپنے قد سے اونچا کر کے اٹھا رکھا تھا۔ وہ سب مسلسل اسے قدرتی حرکت میں رکھے ہوئے تھے۔ یوں گمان ہوتا تھا اصل ڈریگن ان کے سروں پر اڑ رہا ہے۔ ڈریگن کے پیچھے اور درمیان میں کئی سو چینی بچوں کا گروپ تھا جو گردن میں ڈرم لٹکائے انہیں ردھم سے بجاتے آہستہ روی سے چل رہے تھے۔ بچوں کے لباس سفید تھے جن پر انہوں نے سرخ رومالوں کو گردن میں ترچھا کر کے باندھ رکھا تھا۔ قریباً" انہی بچوں کی تعداد جتنا ایک اور گروپ ان لڑکیوں کا تھا جو چینی روایتی لباس کمونو پہنے ہوئے تھیں اور ہاتھ میں بہت بڑے سائز کے چینی روایتی پنکھے پکڑ رکھے تھے۔ ان لڑکیوں کا میک اپ بہت گہرا تھا۔ آنکھیں قدرتی آنکھوں سے بہت بڑی بنائی گئی تھیں۔ یہ سب یک زبان دھیمی آواز میں چینی روایتی گانا گا رہی تھیں، ساتھ ہی روایتی رقص پیش کر رہی تھیں۔

ایک گروپ سرخ لباس میں چینی مارشل آرٹ کی عکاسی کر رہا تھا۔ بہت سوں کے ہاتھوں میں چینی ساختہ بڑی بڑی پتنگیں تھیں، جو مختلف جانوروں کی اشکال پر مبنی تھیں اور جنہیں فضا میں چھوڑا گیا تھا اور ان کی ڈوروں کو اپنی کلائیوں میں باندھ رکھا تھا۔ بہت سے لوگ الگ الگ گیٹ اپ میں بھی تھے، وہ چین کی تاریخ سے منسلک مختلف شخصیات کا سوانگ رچائے ہوئے تھے۔ ان کے میک اپ اور لباس کمال کے تھے۔

دو، دو کے جوڑے بنے بہت سے کوئی ایک بڑا جانور بنے ہوئے تھے۔ یعنی ایک ہی لباس میں ایک سر تھا اور دوسرا دھڑ۔۔۔ اور یہ دو لوگ ڈریگن، یا گھوڑا یا چیتا بنے مسلسل بھاگتے، گھومتے اور ناچنے میں مصروف تھے۔

ہزاروں افراد کی ڈریگن پریڈ میں ہزاروں سوانگ تھے۔ کوئی خرگوش بنا اچھل رہا تھا، کوئی گھوڑا بنا دوڑ رہا تھا، کوئی بندر کے لباس میں تماشے دکھا رہا تھا اور کوئی چیتا بنا ڈرا رہا ہے۔

سب سوانگ چینی روایات، تاریخ، ان کی معاشرت کے عکاس تھے۔ مشرق میں اگا چین مغرب میں چل پھر دوڑ رہا تھا، حقیقی قوموں کی یہی نشانی ہے، وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہوں اسی درخت کی شاخیں، تنے اور پتے لگتے ہیں جس درخت کی جڑ ان کی دھرتی میں اگی ہوتی ہے۔"

چند ایک ایسے گروپس تھے جنہوں نے سرخ لباس پہنے تھے اور ہاتھوں میں بڑی بڑی دھاتی پلیٹیں پکڑ رکھی تھیں اور وہ انہیں بجاتے چلے آ رہے تھے۔ پریڈ میں بڑے بڑے جانوروں کے مجسمے تھے جنہیں بانسوں کے ذریعے اٹھایا گیا تھا۔ یہ سال گھوڑے کا سال تھا اس لیے گھوڑے کے مجسمے زیادہ تھے۔ ایک بڑا اور اونچا گھوڑا پریڈ کے آگے اور پیچھے چل رہا تھا۔

غرض ہر طرف سوانگ تھے۔۔۔ رنگ تھے۔۔۔ لوگ تھے۔۔۔ چین تھا۔۔۔ تاریخ تھی۔۔۔ بہار تھی۔۔۔ نیا سال تھا۔

سرخ اور پیلا رنگ چھایا ہوا تھا۔

ڈرموں کی تھاپ کمال کی تھی۔

سارا مانچسٹر امڈ آیا تھا پریڈ دیکھنے کے لیے۔۔۔ آس پاس کے شہروں سے بھی لوگ خاص پریڈ دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف کھڑے افراد کا شوق دیدنی تھا۔ وہ مانچسٹر کی تاریخ میں ہونے والی شاندار پریڈوں میں سے ایک کو دیکھ رہے تھے۔

امرحہ ڈریگن کے لباس میں تھی ویرا اور این اون بھی ساتھ تھیں۔ ان سب نے ڈریگن کا سوانگ رچایا تھا اور وہ گھوڑوں، مرغوں، خرگوشوں، سانپوں، بندروں اور باقی جانوروں کے ساتھ چل رہی تھیں۔

جب امرحہ ڈریگن بنی تو ہنستے ہنستے دہری ہو گئی اور اس نے پریڈ کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔۔۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ جی سن ٹھیک کہہ رہی تھی وہ اپنے بڑے اور چوڑے ڈریگن ماسک کے اندر جتنا بھی چاہے ہنس سکتی ہے۔۔۔ شرما سکتی ہے۔۔۔ جھینپ سکتی ہے۔۔۔ وہ سراپا یا ڈریگن کے موٹے لباس میں تھی۔۔۔ باہر سب کو ایک ڈریگن نظر آتا تھا امرحہ نہیں۔۔۔

جیساکہ اس نے ویرا کو دیکھا تو اسے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ وہ ویرا ہے۔۔۔ یقیناً" اس کے ڈریگن کو دیکھ کر بھی نہیں بوجھا جا سکتا تھا کہ اس کے اندر امرحہ ہے۔

سڑکوں سے ست روی سے گزرتے چائنا ٹاؤن کی طرف جاتے مختلف جگہوں پر ان پر چوکور رنگ برنگی جھنڈیاں برسائی گئیں۔ جنہیں مشین کے ذریعے فضا میں چھوڑا جاتا اور فضا کئی میٹر بلندی تک ایسے رنگ برنگی ہو جاتی جیسے تتلیوں کے قافلے ان پر ٹوٹ پڑے ہوں۔۔۔

امرحہ نے اب کھل کر مسکرانا شروع کر دیا تھا' وہ ڈریگن بنی ہاتھ ہلا ہلا کر بچوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اسے مزا آ رہا تھا۔۔۔ اسے سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جہاں جہاں ان پر رنگ برنگی جھنڈیاں برسائی گئی تھیں وہاں وہاں امرحہ کو لگا تھا یہ سب اس کے لیے کیا جا رہا ہے۔۔۔

لاہور میں چھپ چھپ کر رونے والی لڑکی کے لیے

ایک منحوس مان لیے گئے انسان کے لیے۔۔۔

امرحہ افسوس کر رہی تھی کہ وہ کیوں روتی رہی تھی۔۔۔ زندگی میں آپ نئے لوگوں' نئی خوشیوں' نئے جشنوں سے روشناس ہوتے ہیں تو ماضی کے دکھ بے معنی اور چھوٹے لگنے لگتے ہیں۔۔۔ اپنی بے وقوفی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کیا نادانی کرتے رہے ہیں۔۔۔ زندگی میں دکھ اور سکھ دونوں ہوتے ہیں۔۔۔ بس انہیں کشید کرنا پڑتا ہے۔۔۔

پاکستان سے جو لوگ' تعلیم' روزگار کے سلسلے میں یورپ آتے ہیں' وہ یہ ضرور سوچتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگیوں کو ایسا پُر رونق اور فعال کیوں نہ بنایا۔۔۔ شادی ہو کر جانے والی خواتین یہ ضرور سوچتی ہیں کہ اف کیا ٹی وی دیکھ دیکھ' خریداری کر کر کے اپنی زندگی برباد کرتے رہے پاکستان میں۔۔۔

تو نیا ماحول آپ کو نئے اسباق ضرور پڑھاتا ہے۔۔۔ کچھ اچھے کچھ بُرے۔۔۔ کچھ آپ کی مرضی سے۔۔۔ کچھ زبردستی۔

اسباق سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ یہ کتنے بھی تلخ ہوں حکیم لقمان کی حکمت لیے ہوتے ہیں۔۔۔ بلا معاوضہ حکمت دے کر جاتے ہیں۔

تو اب رنگ تھے۔۔۔ جشن تھا۔۔۔ لوگ تھے۔۔۔ اور قہقہے تھے' موسم نم نم تھا۔۔۔ جنوری کا آخری دن تھا اور چینیوں کے لیے سال کا پہلا دن۔۔۔ اس بات کی علامت کہ جہاں کچھ ختم ہو رہا ہوتا ہے ٹھیک وہیں سے کچھ اور شروع ہو رہا ہوتا ہے۔

نظام قدرت اس جنم مرگ۔۔۔ مرگ جنم کا نام ہے۔

شام گہری ہو چکی تھی۔۔۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے سے چل رہے تھے لیکن تھکن نے آج ان سے دوستی کر لی تھی' وہ پھولوں سے لدی دور سے ہی ہاتھ ہلا رہی تھی۔ وہ چائنا ٹاؤن کے قریب پہنچ رہے تھے۔۔۔ دور سے پریڈ کے استقبال کے لیے بجائے جانے والے ڈرموں اور دوسرے سازوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔۔۔

"امرحہ!" ڈرموں کی پُر زور تھاپ اور دھاتی پلیٹوں کی گونج میں یہ نام اس کے قریب میٹھے سُر سنگیت لیے گونجا۔

اس کے قریب ہی ایک اور ڈریگن کھڑا تھا۔۔۔ وہ قد میں اس سے اونچا تھا۔۔۔ ڈریگن نے ماسک اتارا۔۔۔ اور مسکرایا۔۔۔ وہ عالیان تھا۔

ایک لڑکی ہے امرحہ۔۔۔

شہر روشن۔۔۔

شہر قلم کار۔۔۔

شہر بے مثال لاہور سے۔۔۔

ایک لڑکا ہے عالیان۔۔۔

شہر جمال۔۔۔

شہر افکار۔۔۔

شہر لازوال مانچسٹر سے۔۔۔

نئے سال کے پہلے دن۔۔۔ بہار کے پہلے دن۔۔۔ شہر بے مثال۔۔۔ شہر لازوال کے پاس ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔۔۔

اور ایک محبت ہے

جہاں بے مثال۔۔۔

جہان لازوال۔۔۔

جہان جاوداں۔۔۔ جاوداں۔۔۔ جاوداں سے۔۔۔

امرحہ کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ بھی پریڈ میں شامل ہے۔ اتنے ہزاروں لوگوں میں وہ چاہتی بھی تو معلوم نہیں کر سکتی تھی۔ اسے صرف اپنے کلاس فیلوز کا ہی معلوم تھا۔ عالیان کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ جیسے وہ آخری وقت میں کسی طرح سے ڈریگن کا لباس حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا اور افراتفری میں پریڈ میں شامل ہوا اور اسے تلاش کرتا رہا ہے۔

"داد دو مجھے۔۔۔ میں نے تمہیں اتنے سارے جانوروں اور ماسکوں میں سے پہچان لیا۔"

"داد دیتی ہوں تمہیں۔" اتنے سارے ہزاروں لوگوں میں سے جو اپنی شکل اور وضع قطع چھپائے ہوئے تھے کسی ایک کو ڈھونڈ نکالنا قابل داد تھا۔ وہ ڈھائی سو کے قریب تو صرف امرحہ جیسے ڈریگن ہی تھے۔

"کتنی زبردست پریڈ ہے نا یہ امرحہ۔" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ڈریگن کا سر اتار کر اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا تاکہ اس کی آواز آسانی سے سنی جا سکے۔ امرحہ کو وہ معمول سے زیادہ خوش لگا۔

"امرحہ! مجھے ایسے جشن' ایسے تہوار' جب سب خوش ہوں' گا رہے ہوں' مسکرا رہے ہوں' بہت اچھے لگتے ہیں۔" اس نے سڑک کے کنارے کھڑے پریڈ کو دلچسپی' شوق' جوش و خوشی سے دیکھتے ایک چھوٹے بچے کے گال پر نرمی سے چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے اسی بچے کے ساتھ کھڑے دوسرے بچے کے بالوں میں محبت اور لگاوٹ سے ہاتھ پھیرا۔

اس کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ غیر معمولی پُر جوش اور خوش ہے۔

"تمہیں بھی پسند ہے یہ سب؟" اس نے اس کے سر کے پاس سر جھکا کر کہا۔

"ہاں! مسکراہٹیں کسے اچھی نہیں لگتیں؟" امرحہ کو چلا کر بتانا پڑا۔۔۔ عالیان نے کان کو اس کے ماسک کے قریب جھکا دیا۔۔۔ اس نے ایسا خوشی سے کیا۔۔۔ امرحہ شہرزادی اسے ہزاروں راتوں پر محیط الف لیلیٰ سناتی تو شاید وہ خوشی سے سر کو ایسے ہی جھکائے رکھتا۔۔۔ سر نہ اٹھاتا۔

"ہاں! لیکن کبھی کبھی تو ان سب کے ساتھ بھی مسکراہٹیں اچھی نہیں لگتیں۔" اس نے آس پاس کے سارے ماحول کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ تو کچھ ہو جانے سے سب اچھا اچھا لگتا ہے۔"

ایک بچہ جو اپنے باپ کے کندھوں پر سوار تھا اور تالیاں بجا رہا تھا کہ اس کے گال پر نرمی سے چٹکی بھر کر کہا۔ بچہ کھلکھلا اٹھا اور اپنے باپ کے بالوں کو شرارت سے مٹھیوں میں جکڑ لیا۔

امرحہ نے ماسک اتار دیا۔۔۔ اس سے ٹھیک سے عالیان کی آواز نہیں سنی جا رہی تھی۔

"کیا ہونے سے اچھا لگتا ہے؟" امرحہ اس کی بات ٹھیک سے سُن نہیں سکی تھی۔ ہجوم کے شور کی وجہ سے اسے چلا کر پوچھنا پڑا۔۔۔

عالیان نے ذرا رک کر اس کی طرف دیکھا۔۔۔ رک گیا۔۔۔ روک دیا گیا۔۔۔ شاید وہ فیصلہ کر رہا تھا۔

"محبت کے ہو جانے سے۔۔۔" اس نے بلاوجہ ہی چلا کر کہا جبکہ امرحہ اپنا ماسک اتار چکی تھی چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔۔۔ یقیناً" وہ ڈریگن پریڈ میں شامل ایک ایک انسان کو بھی سنانا چاہ رہا تھا۔۔۔ سڑک کے اطراف میں کھڑے' مردوں' عورتوں' بڑے' بوڑھوں اور بچوں کو بھی۔۔۔ سارے مانچسٹر کو۔۔۔ ساری دنیا کو اس کے ہونٹوں سے نکلے الفاظ کی گونج یقیناً" چائنا ٹاؤن کی محراب کے پاس تیس چالیس بڑے بڑے ڈرموں کو اپنے سامنے رکھے سرخ لباسوں میں ملبوس پیلی پٹیاں سر پر باندھے چینیوں تک بھی گئی ہو گی۔۔۔ انہوں نے لفظ "محبت" کی گونج کو پا کر۔۔۔ اسے اپنے اندر اتار کر بھرپور جوش سے۔۔۔ عقیدت و احترام سے۔۔۔ دونوں ہاتھوں میں پکڑی ڈرم اسٹکس کو سر سے اوپر اٹھا کر سرخ ڈرموں کی پیلی زمین پر دے مارا۔

محبت کے ساز کی پہلی گونج گونجی۔۔۔

مشرق نے مغرب میں آکر میلہ سجادیا۔

استقبال کا آغاز ہوا۔۔۔ خوش آمدید۔۔۔ بہار کو گلے لگانے کے لیے ہم بے تاب ہیں۔ بہار کی آمد آمد ہے — خزاں کو رخصت ہو جانا چاہیے۔

آؤ لفظ محبت سے ابتدا کریں۔۔۔ آؤ اس کی انتہا کریں۔۔۔ رجوم (شہاب ثاقب) کا ایک طویل قافلہ رقص کناں گہری ہو چکی شام میں رک ابر (بادل کی سیاہ دھاری) سے ہوتا ہوا عالیان اور امرحہ کے سامنے سے گزرا۔۔۔

وہ ایا ک (مبہوت) ابابیل تھی وہ جہاں کی تہاں کھڑی تھی۔

"میرا دل چاہتا ہے میری شادی ایسے ہی ہو۔" اس کی بھوری آنکھوں میں کئی خوش کن چمک دار رنگوں کی دھاریاں تلاطم مچانے لگیں۔

"جانوروں کی طرح۔۔۔" امرحہ نے دوبارہ غلطی نہیں کی عالیان کی طرف دیکھنے کی نہیں۔" وہ ہنسا۔

"ایسے پریڈ کی صورت۔۔۔ اتنے ہی لوگوں اور ایسے ہی سازوں کے ساتھ۔"

وہ برطانیہ کا شہری تھا نا۔۔۔ تو یہ خواہش کیوں نہ رکھتا کہ اس کی شادی بھی شاہی شادی جیسی ہو۔۔۔ پریڈ کی صورت بارات جائے۔۔۔ بگھی میں بٹھائے اور اپنی دلہن کو واپس لائے۔۔۔ اور آس پاس کھڑا ہجوم ان پر مسکراہٹوں اور دعاؤں کے ساتھ پھولوں کی بارش کر دے۔

وہ اور اس کی دلہن ہاتھ ہلا ہلا کر سب کی مسکراہٹوں کا جواب دیتے ہوں۔ دنیا بھر میں شاہی خاندان کی شادیاں دیکھنے والے زندگی میں کم سے کم ایک بار یہ خواب ضرور دیکھتے ہیں کہ ان کی شادی بھی پرنس چارلس، پرنس ولیم کی طرح ہو۔۔۔ وہ تو پھر برطانیہ کا شہری تھا۔ اس نے یہ خواب کم سے کم سو بار تو ضرور ہی دیکھا ہو گا۔

"اچھا خواب۔۔۔ دیکھ لینا چاہیے۔۔۔"

"اگلے سال چینی نئے سال پر تم اپنی یہ حسرت پوری کر لینا۔"

امرحہ نے اسے اچھا مشورہ دیا تھا۔۔۔ ہاں یہ اچھا مشورہ ہی تھا بے شک۔۔۔ رجوم کا ایک اور قافلہ اس بار صرف عالیان کی آنکھوں کے آگے سے گزرا اور اس بار وہ ان بھوری آنکھوں میں ہی ٹھہر گیا۔۔۔ وہ ایک لحظے کے لیے سوچ کا شکار ہوئیں پھر انہوں نے جھٹ قافلہ رجوم کی باگیں اپنے ہاتھوں میں تھام لیں

فیصلہ ہو چکا تھا۔

وہ امرحہ کو ساری روشنیاں اپنے اندر سموئے دیکھ رہا تھا۔

ایران میں زریور جھیل کا کنارا ہے۔

ایک خسرو کمالی ہے۔۔۔ ایک اس کا رباب ہے۔

اور اس کے ہونٹوں پر امیر خسرو کی رباعی کی صورت ہے۔

از آمدنت اگر خبری دانستم

(اگر تیرے آنے کی خبر مجھے ملے)

پیش قدمت کوچہ را گل می کنتم

(میں تیرے قدموں سے پہلے گلی میں پھول بچھاؤں)

گل می کنشم گل گلاب می کنتم

(پھول بچھاؤں گلاب کے پھول بچھاؤں)

خاک قدمت پدی دم وار دانستم

(تیرے قدموں کی خاک پر اپنا آپ واردوں)

یارم۔۔۔ یارم۔۔۔ یارم۔۔۔

(میرے دوست، میرے یار۔۔۔ میرے محبوب)

جھیل کی لہریں رقص کرنے لگی ہیں، وہ خسرو کمالی اور اس کے رباب پر فدا ہیں، وہ اس کے ہونٹوں سے نکلتے گیت پر نثار ہو ہو جاتی ہیں۔۔۔ پرندے خسرو کمالی کے سر پر گول گول گھومتے جاتے ہیں۔۔۔ وہ اس گیت پر قربان ہو ہو جاتے ہیں۔

خسرو کمالی پیشانی پر گلابی رومال باندھے اس کنارے کی طرف دیکھتا جاتا ہے جہاں سے زہرہ آفندی کو آنا ہے۔

وہ آئے گی، ضرور آئے گی، اس کا رباب دعا گو ہے،

اس کا گیت سر بسجود ہے

پیمانہ بدہ۔۔۔ پیمانہ بدہ

(جام دے۔۔۔ جام دے)

پیمانہ بدہ کہ خمارا ستم

(ایسا جام دے کہ مجھے خمار آجائے)

من عاشق چشم مست یار استم

(میں یار کی مست آنکھوں کا عاشق ہوں)

من عاشق مست یار استم

(میں یار کی مست آنکھوں کا عاشق ہوں)

بدہ بدہ۔۔۔

(دے۔۔۔ دے)

بدہ بدہ۔۔۔

(دے۔۔۔ دے)

وقت نے اپنے لبوں پر پریت بھری مسکراہٹ سجائی۔۔۔

رقص کناں لہروں نے خسرو کمالی کے سروں کو چوما۔

ہوا نے رک جانا ضروری جانا۔۔۔ خسرو کمالی کے لیے۔۔۔ اس کی زہرہ آفندی کے لیے۔

گل می کنشم گل گلاب می کنشم

یارم۔۔۔ یارم

خاک قدمت پدی دم وار دا ستم

یارم۔۔۔ یارم

پروالوں نے کوک دی۔

زریور جھیل نے پانی کی بوندوں کو تاروں کی مانند جگمگا لیا۔۔۔

رباب نے مناجات میں سوز و درد پیدا کیا۔

اور خسرو کمالی نے آواز کو نرمی سے بلند۔۔۔ بلند اور بلند کیا۔

"یارم۔۔۔ یارم۔۔۔ یارم۔" صدائیں ملک تک جا پہنچیں زہرہ آفندی کا دیا گلابی رومال جھوم جھوم لہرایا۔

"ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔۔۔ ہم اگلے سال اسی دن شادی کر لیں گے۔" ہاتھ میں پکڑا ڈریگن ماسک امرحہ کے ہاتھ سے پھسل کر گر گیا، جسے اٹھانے کے لیے وہ قطعاً "نہیں" جھکی۔۔۔ اسے اٹھانے کے لیے وہ پہلے سے ہی جھک چکا تھا۔

"ہم۔۔۔" رنگ ریز نے سارے رنگ اس پر اچھال دیے "خاص کر دیا" لیکن پھر بھی وہ بے رنگ ہی کھڑی رہی۔۔۔ وہ سفید دھرتی نہیں تھی جسے من پسند رنگوں سے رنگ دیا جاتا۔

"اس نے کہا ہم۔۔۔" کشمیری کلی افق نے دھاتی پلیٹیں بجاتے ہوئے فرزام کے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

"ہاں میں نے سنا۔۔۔ اس نے کہا ہم۔" فرزام نے ڈرم بجاتے ہوئے کہا۔

"اور وہ اس کے آگے ماسک اٹھانے کے بہانے جھک بھی گیا۔" افق شرارت سے مسکرائی۔

رنگ برنگی جھنڈیوں کی بوچھاڑ فضا میں چھوڑی گئی۔

خوش آمدیدی کا شور بلند ہوا۔

دھاتی پلیٹس ایک ساتھ کئی سو ہاتھوں میں گونجیں۔

ڈرموں پر سازندوں نے گول گول گھوم کر اات مچا دی۔

چینی رقاصاؤں نے سرخ لباسوں میں خود کو فضا میں اچھالا اور چینی رقص کی ابتدا کی۔

اس نے کہا "ہم" تو اب تو ابتدا ہو گئی۔

ہجوم نے پرجوش نعرے لگائے۔۔۔ بہار کی آمد کے جشن کو انہوں نے یادگار بنا دیا تھا۔۔۔ فضا مشکبار ہو چکی تھی محبت سے مشکبار پری یہاں بھی آچکی تھی۔۔۔ فرزام اور افق کے بلاوے پر۔۔۔ امرحہ اور عالیان کے لیے۔۔۔ اس کے پیروں میں گرے ماسک کو اٹھا کر وہ اسے واپس دے رہا تھا۔۔۔ پریڈ آگے جا رہی تھی۔۔۔ وہ دونوں ایک ہی جگہ کھڑے تھے۔

"تم نے سنا امرحہ! میں نے کیا کہا؟" اتنی پیاری بات پر اس کے لیے ایک مسکراہٹ تو بنتی تھی۔۔۔ وہ مسکراہٹ اسے نہیں دی گئی تھی۔۔۔

"مجھ سے شادی کرو گی امرحہ۔۔۔؟ لیکن اس سے

فرق نہیں پڑتا۔۔۔ میں تو تم سے ہی شادی کروں گا۔۔۔ تم سوچنے کے لیے وقت لے سکتی ہو لیکن اس سے بھی فرق نہیں پڑے گا۔۔۔ میں سارا مانچسٹر اکٹھا کر ڈالوں گا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی کے باہر جب تم سارے مانچسٹر کو کھڑا دیکھو گی تو تمہیں "ہاں" کا بورڈ اٹھا کر سب کو دکھانا ہی پڑے گا۔۔۔"

وہ اپنی رو میں بول رہا تھا۔۔۔ وہ عالیان تھا "ہاں" کے بل بورڈ پر اس کا حق تھا کیونکہ وہ سارے مانچسٹر کو اکٹھا کرلانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

"میں۔۔۔ میری منگنی ہو چکی ہے۔۔۔ پاکستان میں میری واپسی کا انتظار کیا جا رہا ہے۔۔۔ میری شادی ہوگی۔"

اٹک اٹک کر وہ اتنا ہی کہہ سکی ز جوم کے سب قافلوں نے اپنی باگیں عالیان کے ہاتھوں سے چھڑوالیں۔

"خسرو کمالی کے رباب کی تان ٹوٹی۔۔۔ اس کی مناجات سہم گئیں۔"

"رتن دیپ سے بجی رتھ اڑان بھرتی منہ کے بل پاتال کی طرف لپکی۔۔۔"

"قالین باف کے حقیقی پارچے میں آگ بھڑکی۔۔۔"

سڑک کے کنارے پریڈ دیکھتی خاتون کے گود کے بچے نے چلا کر رونا شروع کر دیا۔ چینیوں کا ماننا ہے کہ سال کے پہلے دن بچوں کا رونا نحس ہوتا ہے۔

چینی عورت سہم سی گئی اور اس نے شدومد سے بچے کو چپ کروانا شروع کر دیا۔۔۔ لیکن بچہ اور۔۔۔ اور رونے لگا۔۔۔ وہ روتا ہی جا رہا تھا۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ یہ کیسے۔۔۔ ابھی تو وہ قلقاریاں مار رہا تھا۔۔۔ اس نے تالی بھی بجائی ہوگی۔ بھانت بھانت کے جانوروں کو دیکھ کر وہ کیسے محظوظ ہوا ہوگا۔۔۔ چینی رقصاؤں کی طرح وہ بھی ناچنا چاہتا ہوگا۔۔۔ اس نے اپنی ماں سے ڈرم بجانے کی فرمائش بھی کی ہوگی۔

پھر۔۔۔ یہ سب کرکے بھی۔۔۔ اب وہ رونے لگا۔۔۔ وہ کیوں رونے لگا؟

اور ایک گیت تھا۔۔۔

خسرو کمالی کا۔۔۔

عالیان مارگریٹ کا۔۔۔

لفظ لفظ ترانہ۔۔۔ لفظ لفظ مرثیہ۔۔۔

اور ایک ساز رباب تھا۔۔۔

زریو جھیل کنارے بجتا ہوا۔۔۔

ڈریگن پریڈ میں گونجتا ہوا۔۔۔

پھر جھیل کے پیندے میں گونگا پڑا ہوا۔۔۔

"امرحہ!" بھوری آنکھیں سیاہ پڑنے لگیں۔ اس نے امرحہ کو ایسے دیکھا جیسے وہ اسے کوئی دھوکا دے رہی ہو اور وہ جانچ رہا ہو کہ اسے دھوکا کیوں دیا جا رہا ہے۔۔۔

"تم۔۔۔ یہ سب کیا؟" اسے سمجھ نہیں آئی کہ سوال کو کن الفاظ سے ترتیب دے کہ من پسند جواب پا سکے۔ "بھلا ایسا بھی ہوتا ہے کبھی؟"

"ہمارے یہاں ایسے ہی ہوتا ہے۔۔۔ میں بہت خوش ہوں۔۔۔ تم نے ایسا کیسے سوچ لیا۔۔۔ ہم تو دوست ہیں نا۔۔۔ لیکن پلیز تم دوبارہ ایسا کچھ نہ کہنا۔" جلدی سے کہہ کر اس نے ماسک پہن لیا اور پریڈ کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔۔۔

اور پھر ساری پریڈ آگے بڑھنے لگی۔ ساری دنیا۔ ساری کائنات۔۔۔ صرف ایک وجود کھڑا تھا۔۔۔ ساکت تھا۔

پتھر کا ہو چکا تھا۔

وہ عالیان مارگریٹ کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

جو سارے مانچسٹر کو اکٹھا کرکے اس کی کھڑکی تک لے جانے والا تھا وہ سارے مانچسٹر میں اب خود کو ڈھونڈ ڈھونڈ اکٹھا کرتا پھرے گا۔

چینی ماں روتے بچے کو چپ کروانے میں ناکام ہو چکی تھی۔۔۔ اس کی شکل گہرے سایوں کی زد میں تھی۔۔۔ وہ اپنے عقیدوں پر پختہ یقین رکھنے والی لگتی تھی۔۔۔ اور اسی لیے پریڈ میں اس کی ساری دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔ اور وہ زیرلب دعائیں کر رہی تھی کہ نئے سال میں نحوست اور بلائیں اس سے دور رہیں۔۔۔ لیکن بچہ چپ ہی نہیں ہو رہا تھا۔

پریڈ چائنا ٹاؤن کی محراب کے اندر داخل ہو رہی تھی۔

ڈرموں کی تھاپ اب کان کے پردے پھاڑ رہی تھی۔

عالیان کا دم گھٹ رہا تھا پھر بھی اس نے ڈریگن ماسک پہن لیا۔

اور پہلے آہستہ روی سے پھر تیزی سے پریڈ کو پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگا، عجیب انسان تھا وہ دو قدم پر محراب تھی اور وہ وہاں تک نہ جا سکا اور الٹی طرف بھاگنے لگا۔ اس کا ڈریگن ماسک بہت بدہیت لگنے لگا تھا اس بدہیت کو دیکھ کر ڈر قطعا" نہیں لگ رہا تھا بس دل مٹھی میں آیا لگتا تھا۔

امرحہ چینی ساختہ محراب کے پار ہو گئی اور پھر اس نے ہمت کرکے گردن موڑ کر دیکھا۔۔۔ کوئی بہت بے دردی سے پریڈ کو چیرتا بھاگ رہا تھا جیسے اس کے آس پاس آگ بھڑکتی ہو۔۔۔ نہیں جیسے اس کے اندر آگ لگی ہو۔

اس ڈریگن نے خود کو پریڈ سے الگ کیا۔۔۔ اور لوگوں کے ہجوم میں خود کو گم کرتے۔۔۔ اپنے ماسک کے اندر ہی خود کو بلک بلک کر رونے دیا۔

امرحہ نے خود کو لوگوں کی بھیڑ میں گم کر دیا۔ وہ ابھی ماسک اتارنے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔

دو لوگ خود کو بھیڑ میں گم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔۔۔ بھیڑ سے نکلنے کی بھی۔۔۔ الگ ہو جانے کی بھی اور مل جانے کی بھی۔۔۔ ایک وقت میں اتنی خواہشیں۔۔۔ مانچسٹر کی کشادہ سڑکوں پر پھیلی۔۔۔ ہزاروں لوگوں سے اٹی ڈریگن پریڈ ماتمی جلوس کی صورت اختیار کر گئی۔

کیونکہ کیونکہ ایک ماں کی گود میں بچہ حلق پھاڑ کر رو رہا تھا اور ماں کی ساری کوشش اسے چپ کروانے میں ناکام ہو چکی تھی۔ نئے سال کی آمد اس کے لیے نیک شگون نہیں لائی تھی۔ کیا اب سارا سال اسے رونا پڑے گا۔۔۔؟

خیر اور بھلائی اس سے دور رہے گی۔ بلائیں اور شر اس پر حملہ آور ہوں گے۔ کیا خوش قسمتی پر اس کا کوئی حق نہ ہوگا۔

اور کیا۔ اور کیا۔۔۔ اس کا دل خون کے آنسو روئے گا۔

خسرو کمالی نے رباب کو زریور میں پھینکا۔۔۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس طرف زہرہ آفندی کی جگہ ایک شیر کھڑا تھا۔

وہ جانتا تھا اس شیر کا نظر آنا نحس ہے۔۔۔ نحس ہے۔

چینی پریڈ کے اس اور اس کنارے بھی ایک شیر اپنا منہ صاف کر رہا تھا۔۔۔ کیونکہ وہ شکار کر چکا تھا۔

وہ مشرقی اکھاڑوں کا نگر نگر پایا جانے والا شیر ہے۔۔۔

☼ ☼ ☼

بانو قدسیہ کہتی ہیں "محبت مرگ سے پہلے جنم کا نام ہے۔"

اور مجھے ایسا لگتا ہے "محبت جنم سے پہلے مرگ کا نام بھی ہے۔"

یہ پہلے آپ کو مار ڈالتی ہے پھر جی میں آئے تو جنم دے دیتی ہے۔۔۔ یہ پہلے انگارہ بنتی ہے۔۔۔ جی میں آئے تو۔۔۔ تو گلزار۔۔۔

یہ "م" کا پرچار کرتی ماہی۔۔۔ محبت۔۔۔ ہے

یہ "م" سے بھینٹ لیتی۔۔۔ محبت۔۔۔ مرگ۔۔۔ ہے

یہ محال۔۔۔

یہ محرق (جلا دینے والی)۔۔۔

اور یہ محشر ہے۔۔۔

محبت "م" سے۔۔۔ یہ امر سے پہلے "مرن" ہے۔۔۔

محبت مطوق (قید کی گئی)

محبت مضطر۔۔۔

اور یہ محبت مشرک بھی ہے۔۔۔

وہ پاکستان ہی رہ چکی ہوتی اور اس پر ایسا برا وقت نہ آیا ہوتا۔ کاش پاکستان میں سب اس کے لیے ٹھیک ہوتا۔ اسے اپنے ماحول سے نکل بھاگنے کی تمنا نہ ہوتی،

۔۔۔ اسے یہاں آنے کی چاہ نہ ہوتی۔۔۔ وہ شخص جو اس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں، اندر باہر ہر طرف تھا۔۔۔ جو ہر طرف سے اسے اپنی طرف آتا نظر آتا تھا۔۔۔ وہ شخص اسے ساری زندگی نہ ملا ہوتا۔۔۔

لیکن وقت کی کمان میں اس کی اپنی مرضی کے تیر ہوتے ہیں اور وہ انہیں اپنی مرضی سے تاک کر چھوڑتا ہے۔ وہ ایک آنکھ میچے۔۔۔ سانس گم کیے۔۔۔ نشانہ باندھے بیٹھتا ہے۔۔۔ اپنے من پسند وقت۔۔۔ یہ چھوڑا ۔۔۔ اور شکار جیت۔۔۔

اب اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ خاموش رہے اور سب سے دور بھی۔۔۔ تعلیم مکمل کرے۔۔۔ اور گھر جائے۔۔۔ اور یہی سب ہونا تھا ۔۔۔ اداسی اور خاموشی کو لیے چند دن گزر گئے۔۔۔

اور بقول بانو قدسیہ "مسکراہٹ سمیت وہ غائب ہونے کا فن جانتا تھا۔"

عالیان فن کار اسے ان چند دنوں میں کہیں نظر نہیں آیا تھا۔۔۔ اس نے اسے ڈھونڈنا نہیں چاہا تھا۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ وہ غائب ہونے کا فن سیکھ چکا تھا۔

"تم بہت اداس رہتی ہو؟" ویرا پوچھ رہی تھی وہ سونے کی تیاری کرنے ہی والی تھی بس۔ وہ کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی۔۔۔ سونے کے لیے اٹھ ہی نہیں رہی تھی۔

"نہیں! میں ٹھیک ہوں۔"

"میں نے کب کہا تم ٹھیک نہیں ہو۔۔۔ ریڈ مین، عالیان آیا تھا تمہارے پاس۔۔۔ شاید اس نے کچھ کہا تھا تم سے۔۔۔" ویرا اس کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔

"کیا کہے گا وہ؟" امرحہ نے کتاب جو سامنے رکھی تھی اور پچھلے کئی گھنٹوں سے رکھی تھی کو پڑھنے کی کوشش کی۔

"کچھ بھی کہہ سکتا ہے وہ، بہت خوش لگ رہا تھا۔۔۔ بعد میں، میں نے اسے بہت اداس ہو کر جاتے دیکھا۔" ویرا واقعی موساد کی خفیہ ایجنٹ تھی کہ اتنے رش میں بھی اس نے یہ سب نوٹ کر لیا تھا۔

امرحہ ویرا کو دیکھنے لگی۔

"تم خاموش کیوں ہو امرحہ۔۔۔؟"

"اس نے کہا وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ اور تم نے کیا کہا؟" ویرا مسکرائی۔

"میں نے؟" سوال تھا یا اقرار۔

"ہاں ظاہر ہے تم نے۔۔۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔ مجھے لگا، وہ تمہارا اچھا دوست بننا چاہتا ہے لیکن اسے کچھ اور ہی بننا تھا نا۔۔۔" مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"میری منگنی پاکستان میں ہو چکی ہے۔۔۔ میرے جاتے ہی میری شادی ہو جائے گی۔"

"تمہاری منگنی۔۔۔ تمہاری منگنی ہو چکی ہے؟"

"نہیں۔" امرحہ نے اداسی سے کہا۔

"تو تم نے جھوٹ بولا عالیان سے۔۔۔ تم نے ایسا کیوں کیا امرحہ؟"

"جو مجھے مناسب لگا میں نے کہہ دیا۔۔۔ بس۔"

"بس؟" ویرا حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔۔۔

"تم عالیان کے لیے ایسے بات کر رہی ہو۔۔۔؟"

"کیسے بات کر رہی ہوں؟"

"اپنا انداز دیکھو امرحہ۔۔۔ اتنی بڑی یونیورسٹی میں وہ تمہارے پاس آتا ہے باتیں کرنے کے لیے۔۔۔ عالیان۔ اپنا انداز دیکھو۔۔۔ جانتی ہو کون ہے عالیان۔۔۔ پروفیسرز کے بعد یونی کی آنکھ کا تارا ہے۔۔۔ جس طرح صبح وہ یونیورسٹی کیمپس کے پاس کھڑا ہو کر تمہارا انتظار کرتا ہے کبھی دیکھا ہے۔۔۔؟"

"میں نے اسے کبھی نہیں کہا انتظار کرنے کے لیے۔"

"ایک صبح، صبح ہائے کہنے کے لیے وہ ہم سے دس پندرہ منٹ پہلے وہاں کھڑا ہوتا ہے۔"

"میں اسے ایسا کرنے کے لیے نہیں کہتی۔"

"تم کم عقل ہو۔۔۔"

"میں کم عقل ہوں۔۔۔"

"تم نا سمجھ ہو بہت۔۔۔"

"میں بہت نا سمجھ ہوں۔"

"شٹ اپ۔۔۔ تم نے اپنی منگنی کا جھوٹ کیوں بولا؟"

"میری مرضی۔۔۔"

ویرا نے تھوڑی دیر اس کی طرف دیکھا۔ "ایک شخص تمہیں پرپوز کر رہا ہے امرحہ! اور تم نے مناسب الفاظ میں اسے ٹال دیا۔۔۔" ویرا تالی مار کر طنزیہ ہنسی۔

امرحہ کے جیسے کسی نے گال پر تھپڑ دے مارا۔۔۔

"تم صاف انکار کر دیتیں اسے۔۔۔ ایسے بہانے سے اس کی انسلٹ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" اس روسی ویرا کو سمجھانا بہت مشکل تھا۔

"بہت عجیب ہو تم۔۔۔ بہت زیادہ۔۔۔ اتنے ذہین انسان کو کیسے تم نے جھوٹ بول کر انکار کر دیا۔"

ویرا تو عالیان کی ذہانت کی فین تھی۔

ویرا نے ایک بار اور تالی بجائی۔۔۔

"ینگ لیڈی آف پاکستان۔۔۔ دی گریٹ لیڈی۔۔۔ ہونہہ۔"

امرحہ کا منہ سرخ ہو گیا وہ رو دینے کو ہو گئی۔

"کیسے نہ کرتی میں انکار۔۔۔ پتا نہیں کون ہے وہ۔۔۔ عیسائی، مسلمان، یا یہودی۔۔۔ مارگریٹ اس کی ماں کا نام ہے تو باپ کا کیا ہو گا۔۔۔ آئزک۔۔۔ داؤد۔۔۔ کیا ہو گا۔"

امرحہ تیز آواز میں چلا اٹھی اسے ویرا کے انداز سے تکلیف پہنچی تھی۔

ویرا خاموش ہو کر اسے دیکھتی رہی۔

"اتنی معمولی سی وجہ کے لیے؟"

"معمولی وجہ نہیں ہے یہ ویرا۔۔۔ نہیں ہے یہ سب معمولی۔۔۔ اس کے باپ کا، خاندان کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔۔۔ وہ کون ہے۔۔۔ وہ خود بھی نہیں جانتا ہو گا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے؟" ویرا کی آواز تیز ہو گئی۔

"یورپ کے آزاد معاشرے کی دین۔۔۔ غیر مذہبی ۔۔۔ غیر اخلاقی اقدام کی پیداوار۔۔۔ معمولی باتیں نہیں ہیں یہ سب۔۔۔ میرے خاندان کے لیے طمانچے جیسی باتیں ہوں گی یہ سب۔۔۔"

"طمانچہ!" ویرا استہزائیہ ہنسی "خاندان۔۔۔ واؤ۔۔۔ تم تو سیدھے سیدھے عالیان کی بے عزتی کر رہی ہو۔"

"یہ سب اتنا آسان نہیں ہے جتنی آسانی سے تم مذاق اڑا رہی ہو۔" امرحہ نے بے بسی سے ویرا کو دیکھا۔

"تمہارے وہاں محبت سب حساب کتاب لگا کر کی جاتی ہے امرحہ؟" ویرا بے حد سنجیدہ ہو چکی تھی۔

امرحہ خاموش رہی، وہ اتنی ذہین کبھی نہیں رہی تھی کہ مدلل انداز سے اس سوال کا مقدمہ لڑ کر جیت سکتی۔

"کیسے تم نے اس کے خاندان، اس کے مذہبی، غیر مذہبی ہونے کا حساب کتاب لگایا اور اسے انکار کر دیا وہ بھی جھوٹ بول کر۔۔۔ بہت ذہین ہو تم۔۔۔ اپنے حاصل جمع کا فائدہ دیکھا۔۔۔ تم نے دیکھا کہ تم اس کے ساتھ نقصان میں رہ رہی ہو تو تم نے جھٹ جھوٹ بول دیا۔۔۔ اور ایسے جھوٹ بولا کہ وہ تمہارا دوست تو رہے لیکن کچھ اور نہ بنے۔۔۔ ایک بار تم نے مجھے کہا تھا کہ میں انسان کم مشین زیادہ ہوں، آج میں تمہیں کہتی ہوں تم انسان کم کیلکولیٹر زیادہ ہو۔۔۔ اس کی ذہانت، اس کی قابلیت گئی بھاڑ میں۔۔۔ وہ کتنا اچھا انسان ہے یہ سب بھی۔۔۔ بس اس کا باپ ہونا چاہیے۔۔۔ اس کا خاندان یورپ میں یہی سب ہے۔۔۔ تو سب کیا ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں۔۔۔ تمہارا مذہب ایسے لوگوں سے نفرت سکھاتا ہے۔۔۔ تم بہت مذہب مذہب کی باتیں کرتی ہو نا۔۔۔ تمہیں چھوٹے کپڑے پہننا پسند نہیں۔۔۔ تمہیں چھوٹا ظرف رکھنا، چھوٹا دل رکھنا پسند ہے۔۔۔ ایسے جھوٹ بولنا۔۔۔ بے عزتی کرنا۔۔۔؟" امرحہ خاموش ویرا کو دیکھ رہی تھی۔۔۔ خاموش۔۔۔

"مان لیا کہ وہ تمہارا ہم مذہب ہے۔۔۔ پھر۔"

"وہ۔۔۔ مسلمان ہی ہے۔" امرحہ کی کمزور آواز نکلی۔

"گڈ۔۔۔ پھر مسئلہ کیا ہے؟" امرحہ پھر سے خاموش ہو گئی۔

"اوہ۔۔۔ اچھا وہ اکیلا ہے۔ اس کے باپ کا پتا نہیں، وہ ناجائز ہو سکتا ہے اس لیے۔۔۔ اوہ۔۔۔ واؤ۔۔۔ اس کے

ناجائز ہونے سے مسئلہ ہے۔ اگر وہ ناجائز نہ ہوا امرحہ ۔۔۔ تو۔۔۔؟"

"تو بھی نہیں۔۔۔ نہیں' وہ مجھے نہیں پسند۔۔۔ میں نے انکار کر دیا۔" امرحہ کو یہ جواب سب سے زیادہ مناسب لگا۔

"شاید تم اسے پسند کرنے لگو؟"

"میں اسے پسند نہیں کر سکتی۔۔۔ وہ میرا اچھا دوست ہے۔۔۔ جیسے تم ہو۔"

"شاید تم اسے پسند کرنے لگو۔" ویرا سنجیدگی اور سختی سے اپنی بات دوہرا رہی تھی "یا شاید تم اسے پسند بھی کرتی ہو لیکن اپنے خاندان کے لیے۔۔۔ اپنے معاشرے' اپنی روایات کے لیے۔۔۔"

"میں اسے کیوں پسند کروں گی۔۔۔ کیوں کروں گی۔۔۔ کون سی خوبی ہے اس میں' اگر وہ قابل ہے تو یونی میں ہزاروں اور بھی ہیں۔۔۔ مجھے اسے ہاں کہنے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔"

"تم مجھے مطمئن کرو امرحہ۔۔۔ مجھے اس سب کی سمجھ نہیں آ رہی" ویرا جم کر کھڑی ہو گئی۔

"شاید تمہارا خیال ہے کہ اگر وہ مسلمان ہے بھی تو تم جتنا اچھا انسان نہیں ہے۔ وہ تمہاری طرح عبادت نہیں کرتا ہو گا۔۔۔ تمہاری طرح حلال فوڈ کا استعمال نہیں کرتا ہو گا۔۔۔ اسے بنیادی مذہبی تعلیمات کے بارے میں نہیں معلوم ہو گا۔۔۔ اور اگر وہ تمہارے خاندان کے پاس جاتا ہی ہے تمہارا ہاتھ مانگنے تو اسے ان سب باتوں کی وجہ سے رد کیا جا سکتا ہے۔۔۔ ہے نا امرحہ۔۔۔؟"

امرحہ خاموش رہی۔

"جواب دو امرحہ۔۔۔"

"ہاں!" امرحہ چلا اٹھی۔۔۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو ۔۔۔ اتنا آسان نہیں ہے یہ سب۔۔۔ بہت مشکل ہے یہ سب۔۔۔"

"تم لوگ یورپ میں رہنے والوں کے بارے میں یہی سب سوچتے ہو میں جانتی ہوں۔۔۔ تمہیں لگتا ہے اقدار صرف تمہارے مشرقی ملکوں میں ہی ہیں۔۔۔ روایات اور مذہب کی پاسداری بھی۔" ویرا اب باقاعدہ اسے ذلیل کر رہی تھی۔

"اور کیا سچ نہیں ہے یہ۔۔۔ کیا نام ہے عالیان کے فادر کا۔۔۔ اس کا سرنیم مارگریٹ کیوں ہے؟"

"تم اس سے پوچھ لو۔۔۔"

"میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔۔۔ اور تم جاؤ۔۔۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم عالیان کی اتنی بڑی حمایتی ہو۔" امرحہ بھڑک اٹھی۔

"اگر تم غور کرو تو میں تم دونوں کی حمایت کر رہی ہوں۔۔۔ لیکن تم لوگ بہت ناسمجھ ہوتے ہو۔۔۔"

"ہم کون؟" امرحہ کی تیوری چڑھ گئی۔

"تمہارے ملک پر طنز نہیں کر رہی امرحہ۔۔۔ تم لوگ یعنی تم جیسے کم عقل لوگ' سطحی لوگ۔۔۔ روایات' معاشرے کے علم بردار۔"

"بس بہت ہو گئی اب جاؤ۔۔۔ میں نے جو کرنا تھا کر لیا۔"

ویرا اسے دیکھ کر رہ گئی۔۔۔ اور چلی گئی۔

کھڑکی میں کھڑی وہ اندھیری رات کے گہرے اندھیروں کو دیکھتی رہی' ویرا سے اس نے جان چھڑا لی تھی اب خود سے کیسے چھڑائے گی۔۔۔ دنیا بھر سے چھپ کر بیٹھا جا سکتا ہے ایک اپنے آپ سے چھپ کر رہنے کی جگہ نہیں ملتی۔۔۔ دنیا بھر سے کیا کچھ نہیں کہہ دیا جاتا' ایک اپنے آپ سے کہنے کے لیے ہی کوئی لفظ نہیں ملتا۔۔۔

تو کیا محبت جنم سے پہلے مرگ نہیں۔۔۔؟

☆ ☆ ☆

ہفتے کی رات ہے۔۔۔ اور یہ ہارٹ راک کیفے کا ڈانس فلور ہے۔ ڈی جے اپنے میوزک کے ساتھ تجربات کرنے سے پہلے ایک خاص ڈسک کو پلے کرنا چاہ رہا ہے۔۔۔ یہ ڈسک اسے بار ٹینڈر کارل نے دی ہے۔ کیفے میں یونیورسٹی اسٹوڈنٹس کی بھرمار ہے۔۔۔ خاص کر بزنس اسکول کے اسٹوڈنٹس کی۔۔۔ ڈانس فلور پر ڈانس شروع ہوا ہی جاتا ہے کارل کاک ٹیل بنا رہا

ہے۔۔۔ عالیان ابھی ابھی اس کے سامنے رکھی اونچی کرسی پر نیم دلی سے آ کر بیٹھا ہے۔۔۔ اسے کارل نے کچن سے بلایا ہے ڈی جے نے ڈسک پلے کر دی ہے۔

"تمہاری منگنی ہو چکی ہے؟"

"نہیں۔۔۔"

"تم نے جھوٹ بولا عالیان سے۔۔۔؟"

"جو مجھے مناسب لگا میں نے کہہ دیا۔۔۔ کیسے نہ انکار کرتی' پتا نہیں کون ہے۔ وہ 'مارگریٹ اس کی ماں کا نام ہے تو باپ کا کیا ہو گا۔۔۔ آئزک۔۔۔ داؤد۔۔۔"

"اتنی معمولی سی وجہ کے لیے۔۔۔؟"

"معمولی وجہ نہیں ہے یہ۔۔۔ میں اسے پسند نہیں کرتی۔۔۔ کون سی خوبی ہے۔ اس میں۔۔۔ مجھے اسے ہاں کہنے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔۔۔"

"شاید تمہارا خیال ہے کہ وہ مسلمان ہے بھی تو تم جتنا اچھا مسلمان نہیں ہے۔"

"ہاں! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔۔۔ کیا نام ہے عالیان کے' فادر کا۔۔۔ اس کا سرنیم مارگریٹ کیوں ہے۔۔۔"

"وہ ناجائز۔۔۔ ہو سکتا ہے اس لیے بھی؟"

"ہاں! ہاں۔۔۔"

"تمہاری طرح' حلال فوڈ کا استعمال نہیں کرتا ہو گا اس لیے بھی۔۔۔؟"

"ہاں!۔۔۔"

وہاں موجود ایک ایک اسٹوڈنٹ عالیان مارگریٹ کی طرف گردن موڑے دیکھ رہا تھا۔ کارل نے ایک آنکھ دبائی اور منہ بنا کر بھیڑیے کی آواز نکالی' لیکن عالیان نہ وہاں موجود یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کو دیکھ رہا تھا نہ ہی کارل کو۔۔۔ وہ اپنے جوتوں کی نوک کو گھور رہا تھا' ۔۔۔ اسے آج معلوم ہوا تھا۔۔۔ ایک دم سے کیسے کرسی پر بیٹھے بیٹھے آپ جوتے کی نوک تلے آ جاتے ہیں۔

اس کے منہ پر کبھی کسی نے تھپڑ نہیں مارا تھا اس کے سرخ ہوتے منہ پر آج تھپڑوں کی بوچھاڑ کر دی گئی تھی۔

کاک ٹیل بناتے کارل کے ہاتھ رک گئے۔ عالیان کا ردعمل اس کی توقع کے برخلاف تھا۔۔۔ اس نے اٹھ کر اسے گھونسا نہیں مارا تھا۔ وہ مسلسل اپنے جوتوں کی نوک کو دیکھ رہا تھا۔

اس کھیل کے وہ پکے دشمن تھے۔۔۔ ویسے وہ دوست تھے؟

"عالیان۔۔۔!" کارل نے اسے آواز دی۔

عالیان نے جوتے کی نوک سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"شکریہ کارل۔۔۔ میں تمہارا یہ احسان تاعمر نہیں بھولوں گا۔" وہ اٹھا اور قدم گھسیٹنے لگا۔

"وہ ناجائز ہو سکتا ہے اس لیے بھی۔"

"ہاں!"

"نہیں' وہ مجھے نہیں پسند۔ کیا نام ہے عالیان کے فادر کا۔"

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔۔۔ لیکن پھر بھی وہ بہرا نہیں ہوا۔۔۔ محبت کی زبان اسی وقت تو بولتی ہے' جب اس کے گونگا ہو جانے کی دعا کی جاتی ہے۔ اور محبت کے کان اسی وقت تو سب سننے لگتے ہیں جب ان کے بہرے ہو جانے کی بددعا کی جاتی ہے۔

اور یہ محرق ہے۔۔۔ محبت۔

کیا نام ہے عالیان کے فادر کا۔۔۔؟ کیا نام ہے۔۔۔ فادر ۔۔۔ اس کا سرنیم مارگریٹ کیوں ہے؟ فادر۔۔۔ فادر۔۔۔

نخستیں لالہ صبح بہارم' پیاپے سوزم از داغے کہ دارم

(میں صبح بہار کا پہلا لالے کا پھول ہوں جو عشق کے داغ سے مسلسل تڑپ رہا ہوں)

محبت جگا جوت ہے جسے مٹھی میں کر کے آنکھوں کے سامنے رکھ لینا آسان نہیں۔۔۔ آنکھیں نہیں چندھیاتیں قسمت چندھیا جاتی ہے۔ وہ اتنی جلدی کہاں مہربان ہوتی ہے۔۔۔

انسان سب سے زیادہ خواب محبت کے دیکھتا ہے۔

انسان پر سب سے زیادہ خواب محبت کے بھاری پڑتے ہیں۔

انسان کسی بھی مزاج یا نسل سے تعلق رکھتا ہو' محبت کی اتنی سمجھ بوجھ ضرور رکھتا ہے کہ دعا کے لیے

باقاعدہ ہاتھ اٹھائے نہ اٹھائے' اندر ہی اندر اتنی آرزو ضرور کرتا ہے کہ کائنات میں چھپا کر رکھی گئی ساری محبت اس کی جھولی میں ڈال دی جائے۔۔۔ کہے نہ کہے پر اتنا ضرور سوچتا ہے کہ محبت کو وہ کچھ بھی کر کے چرا ہی لائے۔

ساری محبت چُرا لینے کا خواب عالیان مارگریٹ نے بھی دیکھا تھا۔۔۔ اور یہ خواب اس پر بہت بھاری گزرا تھا۔۔۔ کیونکہ محبت وہ شجر ممنوع بھی تو ہے جو جھولی پھیلوا کر مست ناچ نچواتی ہے اور پھر بھی دہن کھول کر دور شہوار کے درشن نہیں کرواتی۔

جھولی پھیلائے رقص یار کے رقاص اپنے پیر جلا بیٹھتے ہیں تب بھی نہیں۔۔۔ بس نہیں۔۔۔

وہ اپنا تن من بھسم کر ڈالتے ہیں تب بھی۔۔۔

"نہیں۔" وہ خود کو گھسیٹ رہا ہے۔ جس برف نے مانچسٹر کو اپنی ہتھیلیوں میں لے رکھا تھا' وہ اسے گرتا دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔۔۔ لیکن اسے دیکھنا تھا کہ چلتے چلتے کیسے گرا سا جاتا ہے۔

برف میں ایک قلندری خاصیت بہت کمال کی ہے۔۔۔ یہ گرتی ہے تو شور نہیں مچاتی۔۔۔ گر کر پگھل کر ختم ہو جاتی ہے تو بھی واویلا نہیں کرتی۔۔۔ برف اپنے سینے پر پڑتے گر گر جاتے اس کے قدموں میں یہ خاصیت منتقل کر دینا چاہتی تھی۔

مانچسٹر کی اتنے سالوں دیکھی بھالی سردی میں اب عالیان کا دم گھٹ رہا تھا۔۔۔ اس کی ناک بے حد سرخ ہو چکی تھی۔۔۔ اور آنکھیں بھی سردی سے نہیں صدمے سے۔۔۔ اس کی بھوری بچوں سی چمک لیے آنکھیں بھر آئی تھیں۔۔۔ انسان تھا نا۔۔۔ رونا تو بنتا تھا۔

محبت کا سنہرا خواب جو دیکھ لیا تھا۔۔۔ خواب کے ٹوٹ جانے پر ٹوٹنا تو بنتا تھا۔ آسمان کے سارے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر مانچسٹر کی شاہراہوں پر بکھر رہے تھے۔۔۔ کائناتی محبت پر۔۔۔ کائنات کا ٹوٹ پھوٹ جانا تو بنتا ہے۔

سڑک پر چلتے وہ ایک بند گلی کے کنارے رک گیا۔ جس کے اندر ایک بڑا کوڑا دان رکھا تھا۔ وہ اندھیرے میں کوڑے دان کے پیچھے جا کر دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔۔۔ اسے اپنی پہلی محبت یاد آ رہی تھی۔

"مارگریٹ جوزف۔۔۔ اس کی ماں' جو اس کی بھوری آنکھوں کو اپنی نیلی آنکھوں سے گھنٹوں دیکھا کرتی تھی' ۔۔۔ اور جیسے خاموشی کی زبان سے کہتی جاتی "مجھے کیا معلوم تھا یہ آنکھیں مجھے ایسے لے ڈوبیں گی۔۔۔ لیکن میں خوش ہوں کہ یہ مجھے لے ڈوبیں۔۔۔ میں شکر گزار ہوں کہ مجھے یہ آنکھیں عطا کی گئیں۔ میں ان میں اپنی صورت دیکھ سکتی ہوں۔ میں کیسے نہ شکر گزار ہوں۔"

اس کی آنکھیں اس کے لبنانی باپ جیسی تھیں۔۔۔ وہ مارگریٹ کے مردہ ہوتے وجود میں جان ڈال دینے والی آنکھیں تھیں۔۔۔ وہ انہیں گھنٹوں کیوں نہ دیکھا کرتی۔

وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک کمرے کے نسبتاً گندے سے فلیٹ میں رہتا تھا' جس کے ایک کونے میں کچن تھا اور دوسرے کونے میں واش روم۔ بیڈ کمرے کے دروازے کے عین سامنے تھا۔ ایک کھڑکی تھی' جس کے آگے ایک کرسی دھری رہتی تھی۔ اس کرسی پر کھڑے ہو کر عالیان کھڑکی سے سر ٹکا کر اپنی ماں کی راہ دیکھا کرتا تھا۔ مارگریٹ کے انتظار میں اس نے اپنی آنکھوں کو بہت تھکایا تھا۔

کمرے میں کچن اور واش روم کی بو ہمہ وقت رچی رہتی تھی لیکن یہ فلیٹ اس وقت مہک اٹھتا جب مارگریٹ آ کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیتی۔۔۔ مارگریٹ جو ایک ہسپتال میں صفائی پر مامور تھی' اس کے جسم سے کئی طرح کے کیمیکل کی بو آتی۔۔۔ مگر یہ بو عالیان کے لیے دنیا کی بہترین خوشبوؤں سے بڑھ کر تھی۔

مارگریٹ جوزف مسکرانے کی کوشش کیا کرتی تھی' لیکن وہ ایک بُری اداکارہ تھی۔ اس نے زندگی کو زندہ دلی' ہمت' جواں مردی سے گزارنے کے کچھ اقوال رٹ رکھے تھے۔۔۔ وہ انہیں ہر روز دہراتی اور مسکرانے کی بھدی اداکاری کرتی اپنے کام پر چلی جاتی۔ مسکرا کر گھر کا دروازہ بند کرتی۔۔۔ کھولتی۔۔۔ روز کی اداکاری۔۔۔ زندگی اقوال پر کامیاب ضرور کی جا سکتی ہے خوش طالع نہیں۔۔۔

ایسی زندگی کو سیاہی سے تو بچایا جا سکتا ہے لیکن ست رنگی نہیں رنگا جا سکتا۔ یہ دھنک جلی تو ہو سکتی ہے دھنک ڈھلی نہیں۔۔۔

یہ اس زمزمے کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو دل کے کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتی ہے۔ ایسی زندگی۔۔۔ زندگی تو نہیں ہوتی۔۔۔ کیونکہ وجود میں دھرا لوتھڑا چت ہو جاتا ہے۔۔۔ یہ لوتھڑا جو دل ہے۔۔۔ اور جس دھوکے باز بزدل کا کوئی علاج نہیں۔۔۔ یہ غداری کرتا ہے۔۔۔ اور اس غداری پر اسے موت کی سزا ملتی ہے۔ تو مارگریٹ اقوال پر زندگی گزارنے کی کوشش کرتی رہی اور لحاف میں منہ دے کر روتی رہی۔۔۔ اس نے زندگی کی ایک فاش غلطی کر ڈالی تھی۔ اس نے ایک مسلمان سے محبت کر لی تھی۔ ایک ایسا لبنانی مسلمان جو وہاں کام کے لیے آیا تھا۔ پونڈز کے لیے۔۔۔ محبت کے لیے نہیں۔۔۔ وہ اس روایت کا پاس دار تھا کہ سفر کے دوران گاڑی کے نئے اور انوکھے اسٹیشنوں پر رک جانے کو دل پر نہیں لینا چاہیے۔۔۔ سفر میں اسٹیشن تو آتے ہی رہتے ہیں۔۔۔ تو کیا سفر کو ہی روک دیا جائے۔ وہ سمجھ دار تھا۔ اس نے سفر کو نہیں روکا۔

نیلی آنکھوں' بُری چہروں سے تو دنیا بھری پڑی ہے۔ کس چیز کی کمی ہے اس جہان میں۔۔۔ پھر ایک انسان کے لیے زندگی تباہ کر لینا کہاں کی روایت ہے۔ اگر ہے بھی تو ہم نہیں مانتے ان روایات کو۔۔۔ سب قصے کہانیاں ہیں۔۔۔

اس کی چھ سالہ زندگی اپنی ماں کی دبی دبی سسکیاں سنتے گزری۔۔۔ وہ سمجھتی تھی وہ سو رہا ہے۔۔۔ پر ایسی آہوں کے سائے تلے سو جانا گناہ کے مترادف ہوتا۔۔۔ وہ دن بھر کام کرتی۔ رات بھر روتی۔۔۔ ایسی حالت میں وہ زیادہ دیر تک زندہ کیسے رہتی۔۔۔ کیونکر زندہ رہتی۔۔۔ جو انسان کچن میں کام کرتا۔۔۔ بیڈ پر لیٹا' کھڑکی میں کھڑا' دروازے پر نظریں رکھے خود کو پتھرا لے۔ وہ زندہ رہ کر زندہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔۔۔ ایسے انسان کو تو جلد مر جانا چاہیے۔۔۔ جس کا لوتھڑا دل خون بنانے کے بجائے خون اگلنے لگے' ایسے لوتھڑے کے مالک کو جلد ہی مر جانا چاہیے۔

جس پچھلی تکلیف دہ یاد کو عالیان مارگریٹ کو اپنے دماغ میں زندہ رکھتا تھا' وہ کچھ یوں تھی کہ کمرے کی واحد کھڑکی کے آگے رکھی کرسی پر کھڑا وہ نیچے جھانک کر اپنی ماں کو تلاش رہا تھا۔ نیچے ایک مصروف سڑک تھی جس پر چھوٹی چھوٹی کئی دوکانیں اور اسٹور زواقع تھے۔

مارگریٹ تھکی تھکی اس سڑک پر چلتی اسے نظر آ گئی۔۔۔ وہ اندر آئی اور بیڈ پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگی۔۔۔ پھر چل کر اس کے پاس آئی اور وہی اپنی اداکارانہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا جبکہ خود وہ کرسی کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ "تم بہادر ہو نا۔۔۔؟" مارگریٹ نے ایک اچھی مسکراہٹ سجا کر پوچھا۔

جب عالیان تھوڑا بڑا ہوا تو اس نے کئی سالوں تک خود کو ہڑبڑا کر اٹھتے اور کہتے سنا۔ "نہیں! میں بہادر نہیں ہوں۔"

دو تنہا لوگ جب ایک دوسرے سے یہ پوچھنے کی جرات کرتے ہیں تو حقیقتاً" وہ یہ کہنا چاہ رہے ہوتے ہیں کہ "اب تیار ہو جاؤ۔۔۔ تم بہادر ہو یا نہیں۔۔۔ تمہیں بہادری دکھانی ہو گی' تلخ حقیقتیں تمہاری رسیلی زندگی میں گھلنے کے لیے تیار ہیں۔۔۔ کیا تم بھی تیار ہو؟"

اپنی بھوری آنکھوں سے وہ مارگریٹ کو دیکھنے لگا۔ ہاں کی ناں۔

"ماما پاپا کے پاس جا رہی ہیں۔"

مارگریٹ نے اس کے گال پر پیار کیا اور کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔۔۔ دیکھا۔ وہ ایک بری اداکارہ تھی۔۔۔ زیادہ دیر تک مسکرا نہ سکی۔۔۔ پھر بہت دیر کے بعد وہ وہاں سے ہٹی اور ایک چھوٹے سے بیگ میں اس کے کپڑے رکھنے لگی۔ ایک دوسرے سفری بیگ میں اس نے اپنی ایک جینز اور دو شرٹس رکھیں۔ دونوں بیگ اٹھا کر اور اس کا ہاتھ تھام کر وہ اسے اپنی دوست کے پاس لے آئی اور اس کے گال چوم کر چلی گئی۔

مارگریٹ چلی گئی۔۔۔ اور کتنی ہی صدیوں بعد واپس آئی۔ اتنی صدیوں بعد کہ عالیان نے جان لیا کہ اس کی ماں سوتے، جاگتے، کام کرتے، خاموش بیٹھے، سسکتی کیوں رہتی تھی اور مسکرانے میں وہ اتنی بری اداکارہ کیوں تھی اور یہ بھی کہ اس کی نظریں کن ویرانوں میں بھٹکا کرتی تھیں اور اس کے وجود سے آہیں کیسے اور کیونکر نکلا کرتی تھیں۔ جب وہ آئی تو وہ سوسن آنٹی کے گھر کے پچھواڑے میں ایک طرف بیٹھا کھیلتے بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان بچوں نے کئی بار اسے کھلانے کی کوشش کی تھی۔۔۔ لیکن وہ اپنی ماں پر ہی گیا تھا۔۔۔ وہ ایک برا کھلاڑی تھا۔۔۔ وہ کھیل کو کھیل نہیں سکتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے جیسے اسے خبر سی ہو گئی کہ اس کی ماں کہیں اس کے قریب ہے۔ وہ گھر کے اندر آیا۔۔۔ دور سے ہی اس نے مارگریٹ جوزف کی ہچکیوں کو سن لیا۔ وہ ساری اداکاری کو بالائے طاق رکھ کر رو رہی تھی۔

"ہاں! وہ مجھے نظر آ گیا تھا۔۔۔ وہ مجھے مل گیا تھا۔ تین ہفتے میں اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈتی رہی۔ اس کے دوست نے کہا تھا۔ مجھے چند ماہ بھی رکنا پڑے تو میں وہیں رکوں۔ وہ وہیں ملے گا۔۔۔ اور وہ مل گیا۔۔۔ اور اس نے۔۔۔ اس نے جیسے مجھے دیکھ کر بھی نہیں دیکھا۔۔۔ وہ قیمتی کپڑے پہنے سڑک پر چل رہا تھا، مجھے ان دیکھا کر کے وہ تیزی سے وہاں سے غائب ہو گیا۔۔۔ میں اس کے پیچھے بھاگی۔۔۔ لیکن اتنی جلدی نجانے وہ کہاں گم ہو گیا تھا۔۔۔ سڑک پر ادھر ادھر بھاگتے میں چلا رہی تھی۔۔۔ اور سوسن! پھر بھاگتے بھاگتے میں نے خود کو گرا لیا۔۔۔ کہ شاید کسی کونے میں خود کو چھپا کر مجھے دیکھتے وہ مجھ پر ترس کھا کر ہی آ جائے۔۔۔ میں گری ہی رہی اور روتی ہی رہی لیکن وہ نہیں آیا۔۔۔ نہیں آیا وہ۔۔۔ اگلے دن وہ میرے ہوٹل آیا۔۔۔ دیکھو کتنا آسان تھا اس کے لیے مجھے ڈنمارک میں ڈھونڈ لینا۔۔۔ اور میں اتنے سالوں میں اسے دنیا بھر میں نہ ڈھونڈ سکی۔۔۔ میں بہت ناکارہ، بہت بے کار ہوں نا سوسن! جانتی ہو میرے دو گھنٹے رونے کے بعد اور یہ بتانے کے بعد کہ پچھلے چار سالوں میں میں نے کیسے کیسے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔۔۔ کس کس شخص کے پاس اس کا پوچھنے کے لیے گئی۔۔۔ خدا کے آگے کیسے کیسے گڑگڑائی اور اسے یاد کر کے کیسے کیسے روتی رہی؟ اس نے کیا کیا۔۔۔ اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور کہا۔

"یہ تمہاری طلاق کے کاغذ ہیں۔۔۔ میں نے اپنے مذہبی اسکالر سے اس کی تصدیق کروالی ہے۔۔۔ تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہو گی، لیکن مجھے ہے۔۔۔ تم دستخط کر دو۔" پھر اس نے ایک لفافہ میرے آگے کیا اور کہا۔

"یہ لو پیسے اور واپس جاؤ۔ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا لعنتی "کافر عورت!" اسے بے طرح یاد کرنے پر وہ مجھے طلاق دے رہا تھا۔

اس کے لیے میں خدا کے آگے کیسے کیسے گڑگڑائی۔۔۔ یہ سن کر وہ مجھے لعنتی کہہ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اس پر اللہ کا غضب نازل ہوا تھا۔۔۔ جو اس نے ایک کافر عورت سے شادی کر لی۔۔۔ وہ تعلق ایک لعنت تھا۔ میں۔۔۔ سوسن اس نے کہا میں ایک لعنت ہوں۔۔۔ میں۔۔۔ اللہ نے تو مجھے بھی بنایا ہے اور اسے بھی۔ کیا اللہ لعنتیں بناتا ہے۔ کیا اللہ ایسا ناانصاف ہے کہ ایک کو اس جیسا انسان بناتا ہے اور ایک کو مجھ جیسا۔۔۔ اس نے کہا میں ایک کافر عورت ہوں۔۔۔ وہ کافر کسے کہتا تھا۔۔۔ خدا کو نہ ماننے والے کو۔۔۔ خدا کو چھوڑ دینے والے کو۔۔۔ اور ایک انسان کو چھوڑ دینے والے کو۔۔۔ ایک انسان کو نہ ماننے والے کو کیا کہتا ہے وہ۔۔۔ میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے مجھے گالیاں دیں۔۔۔ میرے مرے ہوئے والدین پر الزام لگایا۔ کہ میں حرام کی پیداوار ہوں۔۔۔ میں سراپا حرام ہوں۔۔۔ میری رگوں میں ناجائز اور گندا خون ہے۔۔۔ میں اور میرے آباؤ اجداد شراب پیتے رہے ہیں اور میرے والدین کو شادی کی کیا ضرورت رہی ہو گی۔۔۔ میں ایک گندے غلیظ مغربی معاشرے کی پیداوار، کتنے کتنے گل کھلا چکی ہوں گی، وہ گالیاں دیتا رہا اور مجھے بتاتا رہا کہ میں کیا کیا ہوں۔۔۔ وہ مجھے جتا رہا تھا کہ مجھے چھوڑ آنے کی اصل وجوہات کیا تھیں، وہ میرا کافر

ہونا تھا۔۔۔ غیر مذہب ہونا تھا۔۔۔ پھر اس نے میرے خدا کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔۔۔ وہ مجھے بتانے لگا کہ دراصل کس کا مذہب سچا ہے۔۔۔ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے کہ میں ڈنمارک کی حکومت کو اپنے اور اس کے تعلق کو لے کر درمیان میں نہ لاؤں یا برطانیہ کو، وہ مجھ پر یہ ثابت کرنے لگا کہ اپنی بات میں وہ کس قدر سچا ہے۔۔۔ وہ ایک سچے مذہب کو ماننے والا ہے۔۔۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر اس کا مذہب اتنا ہی سچا ہے اچھا ہے تو اس کی وہ کس تعلیم کے تحت میرے ساتھ برا کر رہا ہے سوسن مذہب کس کا سچا ہے اس کے لیے تو آپ کو خود کو سچا ہونا پڑتا ہے نا۔۔۔ پہلے تو خود کو مکمل کرنا پڑتا ہے۔۔۔ ورنہ مذہب۔۔۔ کون سا مذہب ہے، جو یہ سب کرنے کی تعلیم دیتا تھا جو وہ میرے ساتھ کر رہا تھا۔" وہ سوسن کے ہاتھ پکڑ کر اس سے سوال کرنے لگی۔

"اس نے کہا وہ بھٹک گیا تھا۔۔۔ وہ میرے جال میں آ گیا تھا۔۔۔ میں نے اپنی خوب صورتی کا استعمال کیا۔۔۔ بھٹک تو میں گئی تھی۔ پھنس تو میں گئی تھی اس کی محبت کے جال میں۔۔۔ میں کتنی خوب صورت ہوں۔ اس کا احساس تو اس نے مجھے دلایا تھا۔ وہ تو کہا کرتا تھا اللہ اپنے شاہکاروں میں مجھے بھی شمار کرتا ہو گا۔۔۔ اور وہ کہا کرتا تھا۔ اللہ کی مہربانی اس نے زمین والوں کے نصیب میں اس شاہکار کی رونمائی کی۔۔۔ مجھے شاہکار تو اس نے بنایا تھا۔۔۔ پھر اس نے مجھے لعنت کیوں بنا ڈالا۔۔۔ سوسن! میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔۔۔ کوئی لعنت کے طوق کے ساتھ کیسے زندہ رہ سکتا ہے جبکہ اسے پہلے "شاہکار" کے رتبے پر فائز کر دیا گیا ہو۔۔۔

میرا تو سب چلا گیا نا۔۔۔ اس کا کیا گیا۔۔۔ وہ تو قیمتی لباس میں پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت میرے سامنے کھڑا تھا۔۔۔ جھکی ہوئی تو میں تھی اس کے آگے۔۔۔ گڑگڑا تو میں رہی تھی۔۔۔ بھلا بتاؤ سوسن! جو نفع میں رہتے ہیں وہ میری طرح جھک کر گڑگڑاتے ہیں۔۔۔ ایسے خوار ہوتے ہیں۔۔۔ خسارے میں کون رہا سوسن۔۔۔ وہ میرے ہاتھ پیر کاٹ ڈالتا۔۔۔ اس نے میرا دل میری روح کاٹ ڈالی۔۔۔ وہ اتنا ظالم ہو گا کاش! مجھے معلوم ہوتا۔۔۔ میں اس سے ایسی محبت کرنے لگوں گی کاش مجھے یہ بھی معلوم ہوتا۔۔۔ اور کاش وہ کھویا ہی رہتا۔۔۔ میں ساری عمر اسے ڈھونڈتی ہی رہتی۔ میری آنکھیں اس کے انتظار میں تھک کر مردہ ہو جاتیں لیکن ایسے ذلیل نہ ہوتیں۔ اس کی زبان سے نکلا زہر میرے کان میں نہ ٹپکا ہوتا۔۔۔ سوسن! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ ہاتھ کی پشت کو ہونٹوں سے لگانے والا جب ان ہی ہونٹوں سے تھوکتا ہے تو کرب کا کیسا لاوا وجود میں پھٹتا ہے۔۔۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں۔"

مارگریٹ نے اپنے وجود کو اپنے ہاتھوں میں لپیٹنا چاہا۔ وہ ایسے تڑپ رہی تھی جیسے اس پر بوند بوند تیزاب ٹپکایا جا رہا ہو اور اس کے پاس نکل بھاگنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔۔۔

دیوار کی اوٹ میں کھڑے اس بچے نے اس تیزاب کی بو اپنے ناک میں گھستے محسوس کی۔

"میں اس بھری دنیا میں جا کر کسے بتاؤں کہ اس نے مارگریٹ نامی شاہکار کی پردہ کشائی کیسے کی۔۔۔ کاش میں اسے کبھی نہ ڈھونڈ پاتی۔۔۔ میں نے اسے ڈھونڈ نکالنے کا گناہ کیوں کیا۔۔۔ میں نے گناہ ہی کیا۔۔۔ اگر اسے یہ سب کہنا ہی تھا تو وہ مجھے برطانیہ میں ہی کہہ کر چلا جاتا۔ وہ کاغذ جو وہ اپنے مذہبی اسکالر سے تصدیق کروا لایا تھا، مجھے وہیں دے کر چلا جاتا لیکن اس کو مجھے خوار کرنا تھا،۔۔۔ اسے میں پہلے لعنت کیوں نہیں لگی۔۔۔ اسے مجھ جیسی کافر عورت کے سر پر منڈلاتا خدائی قہر پہلے دکھائی کیوں نہیں دیا۔۔۔ ملک بدلتے ہی اسے اتنی عقل آ گئی۔ ایک امیر بیوہ کے ساتھ شادی کرنے کے بعد اسے میری اوقات یاد آ گئی؟

مجھے سب کہا کرتے تھے، یہ علی دس شادیاں کر لیں تو پلٹ کر کسی ایک کی طرف بھی نہیں دیکھتے۔ پر میں نے کسی کا اعتبار نہیں کیا۔ میں نے اس کا اعتبار کیا جس نے مجھے دھتکار دیا۔۔۔ اس نے تو مجھ سے پونڈز کے لیے، گرین کارڈ کے لیے بھی شادی نہیں کی تھی۔۔۔ اس نے تو مجھے زندہ درگور کرنے کے لیے سب کیا تھا۔ برطانیہ میں شادی کرنے والا ڈنمارک میں مجھے طلاق

دے رہا تھا۔ مجھے میری' میرے والدین کی' میرے مذہب کی غلاظت کے بارے میں بتا رہا تھا' اس نے ایک بار بھی میری آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کے سیلاب کو نہ دیکھا۔ اسے یہ پروا بھی نہیں تھی کہ میں اس کے قدموں میں گر گر جاتی ہوں۔۔۔ میں کیسے اس کے بغیر کرب میں مبتلا رہی جان کر بھی اس نے ہمدردی سے بھی میری طرف نہ دیکھا۔۔۔ میں نے اسے اس کے بیٹے کے بارے میں بتایا تو اس نے اس بات کو۔۔۔ اس بات کو ایسے سنا سو ن! جیسے میں اسے۔۔۔ میں اسے اپنے کسی بوائے فرینڈ کے بچے کے بارے میں بتا رہی ہوں۔"

وہ ایک طلاق کا دکھ لے کر نہیں پلٹی تھی۔ اسے اس طلاق کے ساتھ کئی اور تازیانے مارے گئے تھے' اور غلاظت کا ڈھیر ثابت کر دیا گیا تھا۔

محبت کا پیادہ زمین بوس ہوا۔۔۔ تپسیا تمام ہوئی۔۔۔

کیونکہ محبت وہ پھٹکار زدہ کنیا کماری بھی ہے جو کرلاتی ہے اور جوگ محبت کے شراپ کی مستحق پاتی ہے۔

وہ خاموشی سے اپنی ماں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ مارگریٹ نے آنسو پونچھ لیے۔۔۔ کتنی بدصورت ہو گئی تھی وہ اتنے سے دنوں میں۔ اس کے کپڑے گندے اور بدبودار تھے۔ اس کے وجود سے ایسی بساند اٹھتی تھی جیسے کچا گوشت دھیمی آنچ پر جل رہا ہو۔۔۔ مارگریٹ کے پیٹ کے ساتھ لگے اس کا دم گھٹنے لگا۔

امر جل کی دھارا زہر آب تھی۔۔۔

زہر زہاب (ہمہ وقت جاری رہنے والا زہریلا چشمہ) نے اپنا دہن اس کے وجود میں کھول دیا تھا۔۔۔

اس میں سے بساند کیوں نہ آتی۔

اور پھر اس دن کے بعد سے اس نے اسے یہ کہنا چھوڑ دیا

کرسمس کی ان چھٹیوں میں ہم ہلز جائیں گے۔۔۔

"سچ۔۔۔؟"

"ہاں! بس تمہارے پاپا آجائیں۔"

"وہ کب آئیں گے؟"

"شاید ابھی۔۔۔ آج رات۔۔۔ ورنہ کل صبح۔۔۔ میں نے انہیں خط لکھے ہیں فون بھی کیے ہیں۔"

"وہ گندے ہیں۔۔۔ وہ نہیں آتے۔"

"وہ اچھے ہیں۔۔۔ وہ آجائیں گے۔"

وہ اتنا اچھا تھا کہ ایک بار بھی نہیں آیا تھا اس نے اپنی اولاد کو بھی دیکھنے کی چاہ نہ کی۔ اس کو پتا ہی نہیں تھا کہ اس کے بیٹے کی آنکھیں اس جیسی ہیں۔ کچھ کچھ اس جیسے نقوش۔۔۔ گھنی بھنویں۔ گھنی پلکیں۔۔۔ سفید رنگت میں مبہم گندمی رنگت کی جھلک۔۔۔

مغرب میں عرب گھلتا ہوا۔

عرب پر مغرب چھاتا ہوا۔۔۔

وہ ایسا تھا۔ جس کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس کے باپ نے خود کو دنیا میں چھپا لیا تھا۔

اور مارگریٹ آخر تک یہ جان نہ سکی کہ جو گم ہو جاتے ہیں ڈھونڈا انہیں جاتا ہے۔۔۔ جو خود کو چھپا لیں۔۔۔ انہیں ڈھونڈ نکالنا تذلیل ہے۔۔۔ تذلیل۔۔۔ گناہ عظیم۔۔۔ ایسے گناہوں سے خود کو بچانا چاہیے۔

تو ایسے چھپ چکے مرد کی واپسی کی قصے کہانیاں اب بس ہوئی تھیں۔۔۔ دروازے پر ٹکی نگاہیں بند ہوئیں۔۔۔ اب وہ 'مارگریٹ نامی عورت صبح اٹھتی اپنی آنکھوں کی سرخی کو میک اپ کی تہہ میں چھپاتی۔۔۔ پھر بھی بدہیت ہی لگتی۔۔۔ دو گھونٹ کافی ہچکیوں کی مانند حلق سے اتارتی۔۔۔ جلتے کچے گوشت کی بو کی تہوں میں مدفون اداکارانہ مسکراہٹ کو نکالتی اور اسے اسکول کے لیے تیار کر کے اس کا ہاتھ پکڑ کے سڑک پر ایسے چلتی جیسے اپنا ہی تابوت اٹھائے اپنی قبر کی طرف جا رہی ہو۔

اپنی ماں کے زیر سایہ وہ بھی ایسے ہی چلا کرتا جیسے قبرستان جا رہا ہو۔۔۔ دو انسان خود کو تابوت میں لٹائے۔۔۔ خاموشی سے۔۔۔ طے شدگی سے۔۔۔ دو انسان اپنے ہی پیروں پر چل کر اپنی اپنی قبر کی طرف کیسے جایا کرتے ہیں۔ مارگریٹ اور اس کے بیٹے کو دیکھ کر جانا جا سکتا تھا۔

پھر وہ اسے اسکول سے گھر لاتی اسے ایک سینڈوچ

بنا کر دیتی' گھر کو لاک کر کے چلی جاتی اور رات کو آتی۔۔۔ اس وقت تک وہ کھڑکی میں کھڑا اس کا انتظار کرتا رہتا۔۔۔ سینڈوچ ویسے کا ویسا ہی رکھا ہوتا۔۔۔ کھانا بھوک لگنے پر کھایا جاتا ہے اور اس کی بھوک مارگریٹ کی صورت دیکھتے ہی مر جاتی۔۔۔ وہ دعا کرنا نہیں جانتا تھا اس لیے صرف سوچا کرتا تھا کہ کاش اس کی ماں سے ایسی گندی بدبو نہ آیا کرے۔۔۔ کاش۔۔۔ وہ اس بو سے چھٹکارا پالے۔۔۔

اس کے باپ کی واپسی کے قصے جو وہ اسے سنایا کرتی تھی۔ اب بند ہو چکے تھے' لیکن پرانی تصویروں کو دیکھنا اس نے بند نہیں کیا تھا' وہ ایک تصویر کو جس میں وہ جھیل کے پانی میں پیر ڈبوئے بیٹھا تھا اور گردن موڑے مسکرا رہا تھا اور جگمگ کرتی آنکھوں کو لیے عرب کا شہزادہ لگ رہا تھا اس کے چہرے کے ساتھ لگا کر دیکھا کرتی اور دیر تک دیکھا کرتی۔

"ہاں! تم میرے جیسے ہو" وہ خوش ہوتی اور گہرے سایوں میں گھر جاتی پتا نہیں وہ کس کس بات پر خوش ہو سکتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے وہ یہی سب کر کے کہا کرتی۔

"دیکھو تو۔۔۔ تم تو بالکل اپنے پاپا جیسے ہو۔" پھر وہ اپنی نم آنکھیں صاف کر لیتی۔ "تمہارے پاپا تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے' تم ان جیسے ہو' میں خوش ہوں اس پر۔"

"ہاں! تم میرے جیسے ہو" کا عمل وہ ہر رات کیا کرتی جیسے اسے ہر دن یہ ڈر ہو کہ کہیں وہ اس تصویر جیسا تو نہیں ہو رہا۔۔۔ اس شخص جیسا ہی۔۔۔

اسے اپنی زندگی کا آخری مرد اپنی زندگی کے پہلے مرد جیسا نہیں چاہیے تھا اب۔

"تم مجھے چھوڑ تو نہیں جاؤ گے نا۔" وہ اس سے پوچھتی نہیں تھی بس بڑبڑاتی تھی اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ چھوڑ جانا کسے کہتے ہیں۔۔۔ وہ ہاں کرتا تاتاں۔

جن دنوں اس کی طبیعت زیادہ خراب ہونے لگی تھی ان دنوں وہ رات رات بھر بڑبڑاتی رہتی' اس کی بڑبڑاہٹ عجیب ہوتی جیسے ہچکیاں لیتی ہو۔۔۔ مدفن ہچکیاں۔۔۔

"اگر میرے بس میں ہو تو میں تمہاری دائیں آنکھ کی کمان کے کنارے پر بنے اس تل کو اپنی مٹھی میں لے لوں۔۔۔ اور اسے کہیں چھپا دوں۔۔۔ ہاں چلو اپنے دل میں۔۔۔ تاکہ جب تم ہنسو تو کوئی اور اس تل کے رقص پر فدا نہ ہو جائے۔۔۔ میں کسی اور کو تم پر فدا ہوتے کیسے دیکھ سکتی ہوں۔ میں مر جاؤں گی۔"

"کل میں فرش صاف کرتے پھسل گئی۔۔۔ میری ناک سے خون بہنے لگا۔۔۔ میں رونے لگی' تم ہوتے تو اپنی آستین سے میرا خون صاف کرتے اور مجھے بانہوں میں بھر کر کہتے "مارگریٹ دی سپرو من۔۔۔ سپرو من بھی روتی ہے کبھی۔۔۔ اور تمہاری نیلی آنکھوں میں ایک ہی چیز بھلی نہیں لگتی "آنسو" تم وہ کام کیوں کرتی ہو مارگریٹ جو مجھے اچھے نہیں لگتے تم "آہ" کیوں کرتی ہو۔۔۔ اگر تمہیں کسی وجہ سے رونا ہی ہوا کرے تو تم خود کو کہیں چھپا لیا کرو۔۔۔ پھر اپنی روتی صورت کو میک اپ سے چمکا لیا کرو۔۔۔ مجھے معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم روتی رہی ہو۔"

"میں روتی رہی ہوں۔" مارگریٹ صبح تک یہی ایک فقرہ بڑبڑاتی رہتی۔۔۔ اس نے تھوک کر جلا دی گئی محبت کی پوشاک میں خود سے ہی پیوند کاری کر لی تھی۔۔۔ وہ ایک ایسی جذامی بڑھیا بن گئی جس کے زخم ہی اس کی دوا تھے۔۔۔ اسے کسی وید کے پاس جانے کی حاجت نہ تھی۔۔۔

کوئی ایسی محبت کو طوق زدہ' زنجیر پا کرے۔ جو گدھ بنی بوٹی بوٹی نوچتی ہے۔۔۔ ایسے مردار خوار کو کوئی رحم والا مردار کرے۔۔۔ کوئی رحم کرے۔۔۔

اور جب جب وہ بہت زیادہ بڑبڑانے لگتی اور اس کے کانوں میں مزید سکت نہ رہتی سننے کی تو وہ اپنے کانپتے ہاتھ سے ہولے سے مارگریٹ کے جسم کو چھوتا اور وہ جھرجھری لے کر بڑبڑانا بند کر دیتی۔۔۔ اور ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے وجود میں سمیٹ لیتی۔۔۔ نہیں اپنے بیٹے کو نہیں۔۔۔ عرب کے گم ہو چکے اپنے شہزادے کو۔۔۔ جس کی محبت کو مار کر بھی وہ نہیں مار پا رہی تھی۔۔۔ اور جو

خود کو زندگی کے کنارے پر گھسیٹ لائی تھی اور موت کی طرف ہاتھ ہلاتی تھی۔

اور کون کہتا ہے کہ موت سیاہ شب خون ہے... موت نے قطعاً" مارگریٹ کی زندگی پر شب خون مارنے کی کوشش نہیں کی تھی... یہ کام تو خود مارگریٹ کر رہی تھی وہ خود سے شناسا نہیں کر چکی تھی... ذرا سی تپش ملتے ہی وہ جل کر بھسم کیسے نہ ہو جاتی... ایسی حالت میں اسے کون بچا سکتا تھا... کوئی معجزہ ہی... اور وہ کوئی نبی پیغمبر تو نہ تھی وہ تو صنم گزیدہ تھی اور معجزے ایسے لوگوں پر اتنے مہربان نہیں ہوتے۔

ایک رات وہ مرگئی۔ اس رات اس نے اپنی زندگی کے آخری مرد کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ کو بار بار اپنے ہونٹوں ' اپنے گالوں ' اپنی آنکھوں سے لگاتی۔

اس کی زندگی کے اس آخری مرد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے... انسان بڑا حساس واقع ہوا ہے... موت کی آہٹ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں... نو مہینے زندگی نمو پاتی ہے تو ایسا واویلا مچاتی آتی ہے... موت تو سالوں... سالوں اور سالوں ہی نمو پاتی ہے ' اپنی آمد پر کس اہتمام کا واویلا نہیں مچاتی ہو گی... وہ رو رہا تھا... واویلے پر اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

اپنی طرف سے مارگریٹ اپنے ماں ' باپ اپنے گھر ' اپنے بچپنے ' اپنے اسکول کی باتیں کر رہی تھی اسے سنا رہی تھی لیکن دراصل وہ اسے ہر دوسری بات کے بعد اس پہلے شخص کے قصے سنانے لگتی تھی جو اس کی پائنتی موجود نہ تھا سرہانے... جو اس کے آخری وقت میں آنے والا تھا نہ ہی جنازے میں...

مارگریٹ کو کوئی خواہش نہ تھی اس شخص کو خدا کے حضور مورد الزام ٹھہرانے کی... وہ وہاں بھی یہی کرنے والی تھی... وہ اللہ سے اسے مانگنے والی تھی... وہ رحم دل خاتون تھی ' وہ جو اس کے لیے اللہ سے رحم مانگنے والی تھی۔

"قہوہ پینے کے بعد وہ ہمیشہ کپ کو اوندھا کر دیا کرتا تھا... یہ اس کی عادت تھی... مجھے اس کی یہ عادت بہت پسند تھی۔"

ہاں واقعی مارگریٹ کو اس کی یہ عادت پسند تھی۔

اس کی کافی کا مگ خالی ہوتے ہی اوندھا ہو جاتا۔ بڑے ہوتے ہوئے اس نے کئی اوندھے کپ پاؤں کی ٹھوکر سے توڑ ڈالے... اوندھے کپ دیکھ کر وہ پاگل سا ہو جاتا... اس کا بس نہ چلتا کہ کیسے وہ اس دنیا کو اس بھٹی میں جلا ڈالے ' جو اس کے ماں کے اندر بھڑکتی رہی تھی۔

"تمہاری آنکھ کی کمان کے کنارے بھی تل ہو۔ تمہارے دنیا میں آتے ہی میں نے سب سے پہلے اس تل کو ڈھونڈا... میں نے نو مہینے اس ایک تل کے لیے دعائیں کی تھیں۔" اور آخری بات جو کر کے وہ خاموش ہو گئی ' وہ بس اتنی سی تھی۔

"بس اب تم میرے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگا لو۔"

اس نے اس ہاتھ کو ہونٹوں سے لگا لیا... لگائے رکھا... لیکن وہ اس کا بیٹا تھا ' اس کا محبوب نہیں۔ صرف چھبیس سال کی جوان بوڑھی ہو چکی۔ نیلی آنکھوں اور کبھی کی گلابی رنگت والی مارگریٹ کو اس نے تابوت میں آنکھیں موندے سوتے دیکھا... اور تابوت کے کنارے وہ دیوانوں کی طرح رویا...

عالیان مارگریٹ... اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کس سے سب سے زیادہ نفرت کرنی ہے... اپنے باپ سے...

آنٹی سوسن نے اسے اوور کڈز سینٹر میں داخل کروا دیا تھا ' جو ایک پرائیویٹ ادارہ تھا اور بے سہارا بچوں کی دیکھ بھال میں ایوارڈ یافتہ تھا۔ کچھ عرصے بعد اسے بتایا گیا کہ ایک خاتون نے اسے گود لے لیا ہے اور وہ ان کے گھر ان سے ملنے جا سکتا ہے۔ اسے ایک رات اس خاتون کے گھر چھوڑ دیا گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ خاتون ماما مہر تھیں۔ انہوں نے اسے دیکھتے ہی اس کی دونوں ہتھیلیوں کو ہونٹوں سے لگا لیا اور اپنی

آنکھوں پر رکھ لیا۔

"مارگریٹ...!" انہوں نے ہولے سے سرگوشی کی۔

وہ ان کی گود میں رات بھر بیٹھا رہا اور وہیں سو گیا... یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔

وہ اپنی اب تک کی زندگی میں دوسری بار محبت کر رہا تھا... اور پھر سے ایک عورت سے... ایک سے پیدائشی ہوئی تھی... دوسری سے معجزاتی... کسی آسمانی تحفے کی طرح جس کے اترتے ہی بس آنکھوں سے لگا لیا جاتا ہے... سینے میں اتار لیا جاتا ہے... مقدس محبت... جس کی پرستش کرنے پر دل مائل رہتا ہے۔

ماما مہر سے جدائی اسے شاق گزرتی... وہ ان کے ساتھ رہنا چاہتا تھا اور ان کے لیے رویا کرتا تھا... وہ ایک نئی عورت سے مل رہا تھا جس کی آنکھیں گہرے پانیوں میں ڈوبی نہیں رہتی تھیں... جن میں آس تھی نہ انتظار... اور یہ خاتون بڑبڑایا بھی نہیں کرتی تھیں... رویا کرتی تھیں نہ ہی اس کی ٹھوڑی کو اٹھا کر اس کی آنکھوں کو گھنٹوں تکا کرتی تھیں... اور ان کے سینے سے لگے اسے انسانی گوشت کے جلنے کی بو بھی نہیں آیا کرتی تھی... کیسی خاتون تھیں وہ ' وہ بالکل مارگریٹ جیسی نہیں تھیں... جس رات وہ ان کے سینے سے لگ کر سوتا ' ساری رات جاگ کر انتظار کرتا کہ وہ کوئی سسکی بھریں گی... کسی کو پکاریں گی... لیکن ایسا کبھی نہ ہوتا۔

ہاں وہ بہت محبت سے اپنے شوہر... اپنے والدین کا ذکر کیا کرتیں... یا اسے کہانیاں سنایا کرتیں جن میں پریاں ہوتیں... ان کے کھیل تماشے ' شرارتیں ہوتیں لیکن کوئی اختتام نہ ہوتا... نہ دکھ نہ آہ... نہ رونا ' نہ رلانا...

وہ قصہ گو نہیں تھیں... کیونکہ وہ "محبت گو" تھیں۔

وہ کہانی نہ بن سکتیں کیونکہ وہ انسان "بننے" میں مصروف رہتیں۔

وہ کیمیاگر تھیں... انہیں تو تانبے کو سونا بنانا تھا...

"سونا۔"

وہ اس سے کہانی سننے کی فرمائش کرتیں... بہت دیر بعد وہ کہانی کی پہلی اور آخری سطر بیان کر پاتا۔

"ایک... ایک پری تھی۔"

پھر وہ خاموش ہو جاتا... دونوں خاموش ہو جاتے۔

کہانی کئی سالوں تک ایسے ہی اختتام پذیر ہوتی رہی... ماما مہر نے ہمت نہیں ہاری... انہیں معلوم تھا... انہیں انتظار تھا... کہانی آگے ضرور بڑھے گی... اور وہ محبت ہی کیا جو اختتام پر صابر ہو جائے... کہانی ایک دن آگے بڑھ گئی... کئی سال لگے لیکن ایسا ہو گیا۔

"ایک پری تھی... وہ جنگل میں پھول لینے نکلی اور دودموں والے ایک بندر کو دیکھ کر ڈر گئی اور جلدی سے ایک درخت کے پیچھے چھپ گئی... درخت نے اس سے کہا کہ وہ پانی میں چھلانگ لگا دے ' ورنہ بندر اس کے سارے بال کھا جائے گا... بندر اس کے سنہری بال نہ کھا جائے ' اس ڈر سے اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی... لیکن یہ کیا ماما... مچھلیوں نے اس کے سنہری بال کھا لیے۔ وہ باہر نکلی تو... سب درخت... سارے پھول... سارے بندر... سارے ہی بندر... ہاہاہا کرنے لگے... ایسے منہ کھول کر ہاہاہا... ہاہاہا ہی کرتے رہے۔"

ماما مہر کی طرح کہانی کہیں سے بھی شروع ہو ' اسے ہاہاہا پر ہی ختم ہونا چاہیے ہر صورت۔ بیٹے عالیان نے یہ کر آخر کار سیکھ ہی لیا تھا... اس رات ماں بیٹا نشست گاہ میں دیر تک لوٹ پوٹ ہوتے رہے... تو عالیان میں زندگی آخر کار نمو پانے لگی تھی... اور یہ محبت کا ہی کمال ہے... وہ مردے کو زندہ کر ڈالتی ہے۔ زوال کو کمال... کمال کو باکمال۔

ماما مہر میں اس کی جان آچکی تھی اور اس کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتا ان سے دور ' ان کے بغیر رہنا... ان ہی دنوں اس نے جانا کہ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں تکلیف ضرور ہوتی ہے... جو ہمیں چاہیے ہوتا ہے ' وہی ہم سے دور ضرور ہوتا ہے... جسے مٹھی میں کر لینے کو جی چاہے ' اس کے لیے دل مٹھی میں ضرور آجاتا۔

پندرہ سال کا ہو جانے کے بعد اسے وہ چیزیں دی گئیں جو اس کی ماں کی تھیں۔ جسے آنٹی سوسن نے سینٹر کے حوالے کیا تھا۔ اس نے وہ تصویر جسے وہ اس کے گال کے ساتھ لگا کر گھنٹوں دیکھا کرتی تھیں، سب سے پہلے پھاڑ کر پھینک دی۔۔۔ وہ خط جو غلط پتوں کی وجہ سے واپس آ چکے تھے انہیں بھی وہ پھاڑ ڈالتا اگر وہ مارگریٹ کے ہاتھوں سے نہ لکھے گئے ہوتے۔۔۔ کچھ وہ خطوط بھی تھے، جو مارگریٹ کی موت کے بعد واپس آئے تھے، یعنی اپنی موت سے پہلے بھی وہ اسے خط لکھتی رہی تھی۔۔۔ اس نے کبھی ان خطوط کو پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔۔۔ سوائے ایک بار کے۔

"آج سے چار سال پہلے جب تم اپنے گھر والوں سے ملنے کا کہہ کر مانچسٹر سے جا رہے تھے تو مجھے لگتا تھا میں تمہیں مانچسٹر میں آخری بار دیکھ رہی ہوں۔۔۔ یہ ایسا وہم تھا کہ کچن میں کام کرتے میں اپنا ہاتھ جلا بیٹھی ۔۔۔ ڈاکٹر کے پاس میں تمہاری دی رنگ بھول بیٹھی۔۔۔ اس رنگ کو ڈاکٹر کے کوڑا دان میں بہت مشکل سے تلاش کر پائی۔۔۔ کوڑے دان میں اگلے دن اس رنگ کے ملنے نے مجھے پاگل سا کر دیا تھا۔"

وہ فون کبھی نہ آیا۔۔۔ خط واپس آتے رہے۔۔۔ جس کی آنکھ کی کمان کے کنارے تل تھا اسے ڈھونڈنے مارگریٹ گاہے بگاہے نکلتی رہی یہاں تک کہ زندگی کی آخری سانسیں لینے لگی۔۔۔ اور پھر موت نے اسے اپنی سانسیں عطا کر دیں، اپنے سارے وہموں کے ساتھ وہ پوشیدہ ہو گی۔۔۔

وہ اس شخص کا جائز بیٹا تھا یا ناجائز۔ اسے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسکول میں اس کے نام کے آگے ولید البشر لگتا تھا جو بڑا ہونے پر اس نے بدل لیا۔ وہ کسی ولید البشر کو نہیں جانتا تھا۔۔۔ اگر دنیا میں کوئی ولید البشر تھا تو وہ اس کا باپ نہیں تھا۔ ایک بھیڑیا تھا جس نے اس کی ماں کو چیر پھاڑ ڈالا اور اسے لعنت قرار دیا۔۔۔ اس عورت کو اس نے لعنت قرار دیا، جس نے اس کے بعد دوستی کے نام پر بھی کسی مرد سے بات نہ کی۔۔۔ اگر وہ ایک لعنت ہی ہوتی تو پھول دار کپڑے پہنے، خود کو سجائے بنائے اب تک زندہ ہوتی ۔۔۔ وہ اب تک بڑی شان سے زندہ ہوتی۔۔۔ اس کے لحاف اس کے منہ سے نکلنے والے خون کے چھینٹوں سے سرخ نہ ہوئے ہوتے۔۔۔ اس کی راتیں سسک کر نہ گزرتیں۔۔۔ اس کے دن آنکھوں کی نمی چھپاتے نہ گزرتے۔۔۔ اسے زندگی گزارنے کے لیے اقوال یاد نہ کرنے پڑتے۔۔۔ اور ہر روز اسے خود کو بہادر بنا کر زندگی کے سامنے نہ کھڑا کرنا پڑتا۔۔۔

وہ اسے لمبے لمبے خط نہ لکھتی۔۔۔ پاگل ہوئی اسے ڈھونڈتی نہ پھرتی۔۔۔

بے وفا اور لعنتی عورتیں اتنے وبال پالتی ہیں بھلا ۔۔۔ اور کیا ایسی عورتیں اتنی جلدی مرجاتی ہیں۔۔۔ اور کیا اتنی ہی آسانی سے وہ موت کو خوش آمدید کہتی ہیں۔

پہلے وہ سوچا کرتا تھا کہ وہ اس شخص کو ڈھونڈ کر مار ڈالے گا۔۔۔ لیکن ماما مہر کہا کرتی تھیں کہ اپنے دل و دماغ کو خاموش رکھو۔۔۔ سارے وبال یہیں سے پھوٹتے ہیں۔

ولید البشر" کا خیال آتے ہی وہ اپنے دل و دماغ کو خاموش کروا دیتا۔۔۔ شروع شروع میں مشکل تھا۔۔۔ لیکن اس نے کر لیا۔۔۔ ماما مہر ٹھیک کہتی تھیں اسے وبال پالنے کی ضرورت نہیں تھی۔۔۔ اس کی زندگی میں مارگریٹ اور مہر موجود تھیں۔۔۔ اور اسے ان ہی کے سہارے زندگی مکمل کرنی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ خاسر وقت تھا۔ برفیلی ٹھنڈ میں مانچسٹر کی ایک بند گلی کے کنارے وہ خود کو دنیا سے چھپا کر کھڑا تھا۔

"مارگریٹ اس کی ماں کا نام ہو گا تو باپ کا کیا ہو گا۔۔۔ معمولی وجہ نہیں ہے یہ۔۔۔ نہیں ہے معمولی۔۔۔ اس کے باپ کا، خاندان کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔۔۔ وہ کون ہے وہ خود بھی نہیں جانتا ہو گا۔۔۔ یورپ کے آزاد معاشرے کی دین۔۔۔ غیر مذہبی۔۔۔ غیر اخلاقی اقدام کی پروان۔۔۔ میرے خاندان کے لیے طمانچے جیسے باتیں ہوں گی یہ سب۔۔۔"

عالیان نے جھرجھری لی۔۔۔ اسے بہت ٹھنڈ لگ رہی تھی۔۔۔ جس دیوار کے سہارے وہ کھڑا تھا وہ گیلی تھی اور اس میں سے بو آتی تھی۔۔۔ نہیں وہ غلط تھا۔۔۔ وہ بو تو اس کے اندر سے آ رہی تھی۔۔۔ انسانی گوشت کے جلنے کی۔

ہاں! اب اسے ٹھیک ٹھیک معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی نیلی وحشی ہوئی آنکھوں والی ماں نے کیا محسوس کیا تھا، جب اس شخص نے جس سے وہ دیوانوں کی طرح محبت کرتی تھی اسے لعنت قرار دیا تھا۔۔۔

اچھا تو کیا اس کا سانس بھی ایسے حلق میں اٹکا ہو گا کہ سینے پر ہتھوڑے مارنے کو جی چاہتا ہو گا؟

زمین دھسان (دلدل) ہے۔۔۔

آکاش اندھیار کا سیواک ہے۔۔۔

دھڑ۔۔۔ دھڑ۔۔۔ دھڑ، لاکھوں کروڑوں تاریکی، غبار سے اٹے پٹ وا ہوئے۔۔۔

زندگی اندھیار کی چاکر ہوئی۔

اور لو روشنیاں گل ہوئیں۔۔۔ اب بس گل ہوئیں۔

اس شخص کے دل کو تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے مارگریٹ کے بیٹے سے بھی بدلہ لیا تھا۔۔۔ اسے بھی چیر پھاڑ ڈالا تھا۔۔۔ اسی کی ذات کو لے کر اس پر سوال اٹھے تھے۔۔۔ اس شخص کی شناخت سے اس کی شناخت ہونی تھی۔۔۔ جس شخص کے نام کو وہ اپنی زبان سے ادا نہیں کرتا تھا۔ اس شخص کے نام کو اپنے نام کے ساتھ لگانے پر اسے تسلیم کیا جائے گا۔ اگر ایسا ہی تھا تو اسے کچھ نہیں چاہیے تھا۔۔۔ اسے کوئی پہچان۔۔۔ کوئی محبت نہیں چاہیے۔۔۔ اسے امرحہ واجد اب نہیں چاہیے۔ اس کی ماں پر غیر اخلاقی اقدام کی انگلی اٹھانے والی۔۔۔

امرحہ واجد۔۔۔

درد کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی۔ آخر اس نے اس لڑکی کو کیوں پسند کیا۔

اس کی بدقسمتی اسے اس اسٹوڈنٹ پارٹی میں لے گئی۔ اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔۔۔ اس فضول سے مذاق میں شرکت کرنے کا جو فریشرز (نئے آنے والوں) کے ساتھ کیے جاتے تھے۔ خاص کر امرحہ کے ساتھ کیے جانے والے مذاق میں تو اسے بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ جب جب وہ لڑکی اسے ملی تھی اس کا مزاج ہی بگاڑا تھا اس نے۔۔۔

وہ ایک طرف اندھیرے میں کاک ٹیل لیے بیٹھ گیا اور سارا تماشا دیکھنے لگا۔۔۔ اور جب وہ رو رو کر اردو میں چلانے لگی تو اسے برا لگا۔۔۔ اور جب گھٹنوں میں سر دے کر وہ باقاعدہ رونے لگی تو۔۔۔ تو۔

مارگریٹ کچن میں اس کے لیے کچھ پکانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اور کھڑکی سے اندر۔۔۔ کچن کی طرف سے آتی آوازیں سن رہا تھا۔۔۔ جب ان آوازوں کو سنتے سنتے وہ خود رونے جیسا ہو گیا تو کچن کی طرف آیا۔۔۔

"ماما!" اس نے روتی ہوئی مارگریٹ کو بلانے کی جرات کی۔ کچھ دیر بعد وہ چھری پھینک کر اس کی طرف پلٹی۔۔۔ اس کی انگلی سے خون نکل رہا تھا۔

"میرا ہاتھ کٹ گیا ہے۔۔۔ مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔"

اگر وہ براڈوے میں کام کرتی تو سارے براڈوے کو لے ڈوبتی۔۔۔ اتنے سے بچے کو الو بنانے میں وہ ناکام تھی، انگلی کاٹ کر رونے کی وجہ بتا رہی تھی۔

اس نے انگلی سے خون کو بہنے دیا۔۔۔ اور روتی رہی، "مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔۔۔ بہت درد۔۔۔" اور وہ خاموش کھڑا انگلی کو نہیں ان آنکھوں کو دیکھ رہا تھا جن سے خون ابل رہا تھا اور وہ خون فرش پر نہیں اس کے دل پر گر رہا تھا۔

امرحہ واجد سسک رہی تھی اور جب اس نے سیاہ مشرقی آنکھوں میں جھانکا تو اسے معلوم ہوا کہ مارگریٹ کی طرح لحاف میں منہ دے کر وہ بھی بہت روتی رہی ہیں۔۔۔ ان پر بھی کرب کے بہت سے پہاڑ ٹوٹے ہیں۔۔۔ وہ ان آنکھوں میں جکڑا گیا۔

مارگریٹ کو پھر سے کسی نے رلا دیا۔

اب وہ یہ نہیں ہونے دے گا۔

وہ رات اس نے جاگ کر گزاری۔۔۔ مشرق افق پر دو نین دھرے تھے وہ ان میں ڈوب ڈوب جاتا تھا۔۔۔

بھوری آنکھوں میں جو دیپ بجھے پڑے تھے' وہ جل اٹھے تھے۔۔۔

وہ تان سین کی شاگرد رہی ہوگی۔۔۔ اس نے اس کے اندر چراغاں کر دیا تھا۔۔۔

وہ حیات کا دہانہ تھی۔۔۔ وہ اسے زندہ کر رہی تھی۔۔۔ وہ مشرقی ساحرہ تھی۔۔۔ بس میں کر لینا وہ سیکھ چکی تھی۔

اور وہ ہنفشین تھی' وہ اس کے زخم مندمل کرنے آئی تھی۔۔۔ اسے لڑکیوں میں اتنی دلچسپی تھی جس سے کارل کو چڑ ہو سکے' وہ کارل کی ہر گرل فرینڈ کو لے اڑتا۔ کارل کے ساتھ یہ سب چلتا رہتا تھا۔ پھر اس نے ایک ایسی لڑکی میں دلچسپی کیوں لی' جس نے اتنی حقارت سے وہی سارے الفاظ اس کے منہ پر دے مارے تھے جو کبھی ڈنمارک میں اس کی ماں کے منہ پر مارے گئے تھے۔ وہ خود اپنے باپ کے لیے بھی اتنا ہی حقیر تھا۔۔۔ جتنا اب امرحہ واجد کے لیے۔۔۔

اس نے استہزائیہ ہنس کر سوچا۔ "ایک ہی نسل کے دو انسانوں کا ایک جیسا نصیب۔۔۔ دونوں کو محبت ہوئی۔۔۔ دونوں کو بدلے میں دھتکار ملی۔۔۔ دونوں کو لعنت قرار دے دیا گیا۔"

دو انسانوں کے نصیب میں اتنی مماثلت۔۔۔ وہ واقعی بہت بدنصیب تھا۔ اس کا ٹوٹ کر رونا بنتا تھا۔

امرحہ واجد کو اس کی ماں سے زیادہ اس کے باپ کی فکر تھی' جس کی غلیظ تصویر کو اس نے پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔۔۔ وہ انگلی اٹھا رہی تھی کہ وہ کون تھا۔۔۔ وہ عالیان مارگریٹ تھا۔۔۔ اور اسے کیا ہونا چاہیے تھا۔۔۔ اگر عالیان نام اسے اس کی ماں نے نہ دیا ہوتا تو وہ یہ بھی بدل لیتا۔

اسٹوڈنٹ پارٹی کے بعد اس نے خود کو اسے دیکھتے پایا۔۔۔ وہ اس کے ڈپارٹمنٹ تک جاتا۔۔۔ وہ اپنے لمبے دوپٹے کو سنبھالتی یونیورسٹی کے در و دیوار کو ایسے دیکھتی جیسے کسی نئے جہان آ چکی ہو۔۔۔ وہ اپنے آپ میں مسکراتی رہتی۔۔۔ خاص کر تب جب اس کے قریب سے کوئی عجیب و غریب لباس یا ہیئر اسٹائل والا اسٹوڈنٹ گزرتا۔ اسٹوڈنٹ پارٹی کے بعد اس نے دیکھا کہ ہنسی کو دبائے' زبردستی کا منہ پھلائے وہ سب کی معذرت سن رہی ہے۔ جیسے ان پر اس نے "سُو" کر رکھا تھا لیکن یہ اس کی انسان دوستی کی مثال ہے کہ وہ ایسا نہیں کر رہی' ڈیرک جیسے ہاتھ باندھے سزا کے انتظار میں کھڑا تھا اور وہ اعصاب تانے کسی خونخوار بادشاہ کی اکلوتی بیٹی بنی ایسے ظاہر کر رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔

"بس۔۔۔ اب تمہیں بھوکے شیروں کے آگے ضرور ڈالا جائے گا۔۔۔"

وہ اکثر آکسفورڈ روڈ پر اس کے پیچھے جاتا۔۔۔ اس کا دوپٹہ اس کے لیے ایک مسئلہ تھا۔ اسے اتنے بڑے بڑے دوپٹے لینے کا شوق بھی تھا اور انہیں سنبھالنا بھی نہیں آتا تھا۔۔۔ شاید وہ سارے مانچسٹر کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ صرف وہ اکیلی ہے "مشرق کی پہچان" جی ہاں۔۔۔ وہ اکیلی۔۔۔

ایک دن جب وہ آکسفورڈ روڈ پر اس کے پیچھے پیچھے آیا تو اس کا دوپٹا اس کے پیچھے والے کے پاؤں میں الجھ گیا۔ پیچھے والا معذرت کر کے آگے بڑھ گیا۔۔۔ اور وہ دوپٹے کے کنارے اور اس کنارے کو پیر تلے دبانے والے کو گھورتی رہی۔۔۔ کچھ آگے جا کر اتفاقاً" وہ بے چارہ الجھ کر گر گیا۔۔۔ اور وہ جو پیچھے کھڑی اسے گھور رہی تھی' منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے اس لڑکے کو کہہ رہی ہو۔۔۔

"اب آیا مزا۔۔۔ اگلی بار دھیان سے چلنا۔۔۔ یو ایڈیٹ۔"

اور اسی دوپٹے کو لے کر اگلا منظر کچھ یوں تھا کہ ایک ہندوستانی لڑکے نے زمین بوس ہوتے اس کے دوپٹے کو پیچھے سے اٹھا کر اسے دیا اور ساتھ کوئی استہزائیہ یا طنزیہ جملہ کہا اور ہنسنے لگا۔۔۔ اور پھر ایک دم سے اس کی ہنسی تھم گئی۔۔۔ امرحہ واجد ہاتھ لہرا لہرا کر اسے کچھ کہہ رہی تھی۔۔۔

"ہندوستان' پاکستان کی تاریخی ناچاقی کا ایک چھوٹا سا منظر۔"

بات شاید دوپٹے سے ہوتی' اسلام اور دہلی تک جا پہنچی تھی۔

اور اس سے اگلا منظر کچھ ایسے تھا کہ یونی کے باغ میں لگے ایک۔۔۔ پودے کے ساتھ اس کا دوپٹہ اٹک گیا وہ ذرا آگے چلی گئی' دوپٹے کے کھنچاؤ سے اسے پیچھے پلٹنا پڑا اور ایسا کرتے وہ اپنے پیچھے آنے والی لڑکی سے ٹکرا گئی۔۔۔ ٹکر سے اس بچاری کی عینک گرتے ہی ٹوٹ گئی جو اس نے کچھ دیر کے لیے سر پر لگائی ہوگی۔ ظاہر ہے وہ بے چاری صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئی' اگر امرحہ واجد ہوتی تو دھاڑیں مار مار کر روتی۔۔۔ اسٹوڈنٹس کی ہمہ وقت کی خالی جیبوں پر ایسے نقصانات کسی ہائیڈروجن بم کی طرح پھٹتے ہیں اور وہ تو پھر اس کا نظر کا چشمہ تھا کتابوں سے زیادہ اہم و ضروری۔۔۔ عالیان کو اس سے بات کرنے سے زیادہ اس کے پیچھے پیچھے رہنا دلچسپ اور حیرت انگیز لگتا تھا۔

ایک دن اس کے کلاس فیلوز نے اسے پروفیسر ڈرل کے آفس بھیج دیا۔۔۔ پروفیسر ڈرل صرف what ہی ایسے پوچھا کرتے جیسے کہہ رہے ہوں۔

"کیا۔۔۔ یعنی کہ کیا۔۔۔ ہیں۔۔۔ کیا؟ اب بولو نا۔۔۔ بولتے نہیں۔"

ایسے what کو سن کر سامنے پیش ہونے والا کتنا ہی ضروری کام کو لے کر آیا ہوتا' یہی سوچتا کہ "آخر کیا ضرورت تھی اتنے معمولی سے کام کے لیے پروفیسر کو تنگ کرنے کی۔۔۔"

وہ دونوں ہاتھوں کو میز پر رکھتے اور مریخ پر جانے جیسی سنجیدگی لیے ایسے دیکھتے جیسے کہتے ہوں۔

"تمہاری یہ جرات کہ تم یہاں تک آئے۔۔۔ لاؤ دکھاؤ' کیا مسئلہ ہے۔۔۔ آئے ہیں بڑے پڑھنے۔۔۔ نیوٹن بننے۔۔۔ باتوں سے فرصت نہیں اور آجاتے ہیں پروفیسرز کو تنگ کرنے۔۔۔ ہیں۔"

اور پھر وہ اس پیش ہونے والے نیوٹن سے وہ وہ سوال کرتے کہ اس بے چارے' بے چاری کو رندھے گلے کے ساتھ معذرت کر کے اٹھنا پڑتا۔

"نالائق!" اپنی پشت پر یہ سرگوشی بھی سننا پڑتی۔

رندھے گلے کے ساتھ اور نالائق کا لقب لے کر جب وہ پروفیسر ڈرل کے آفس سے باہر آئی تو اسے بھیجنے والے اس کے کلاس فیلوز کوریڈور میں لوٹ پوٹ ہونے لگے۔۔۔ انہوں نے نجانے کون کون سے جھوٹ سچ گھڑ کر اسے بھیجا ہوگا اور یہ بات اسے آفس سے باہر آنے کے بعد معلوم ہو گئی تھی۔۔۔ وہ خاموش کھڑی ان کے قہقہے سنتی رہی۔۔۔ پھر خود بھی ہنسنے لگی۔ اس بار اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل انہیں دے مارنے کی حرکت نہیں کی تھی۔

وہ مانچسٹر کے رنگ میں رنگ رہی تھی۔۔۔ پہلے کی نسبت وہ خوش نظر آ رہی تھی۔ عالیان کو لگنے لگا تھا کہ وہ کسی ونڈرلینڈ میں آ گیا ہے۔۔۔ یعنی صرف ایک لڑکی کے مانچسٹر میں آ جانے سے سارا مانچسٹر ہی ونڈرلینڈ میں بدل چکا تھا۔ وہ اب تک اپنی ماں کو یاد کر کے سوتا رہا تھا اور کئی کروٹیں بدلنے کے بعد اسے نیند آتی تھی۔۔۔ اب وہ اسے سوچتا۔۔۔ مسکراتا۔۔۔ اور سو بھی جاتا۔۔۔ اور کبھی سوچتے سوچتے لحاف کو جھٹک کر اٹھ کر بیٹھ جاتا اور قہقہے لگاتا۔۔۔ اچھا تو وہ یہی پری تھی۔۔۔ جس کی کہانی کہیں سے بھی شروع ہو' اختتام ہاہاہا پر ہوتا ہے۔

وہ اپنی کلاس فیلوز سے پوچھنے لگا۔

"Rotatouile دیکھی ہے۔۔۔ وہی چوہے والی۔۔۔؟"

"ناں۔۔۔ کون سی؟"

"جس میں چوہا کھانا پکاتا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ سو سویٹ۔۔۔ وقت ملتے ہی ضرور دیکھوں گی۔"

"ہاں! وہ کتنا کیوٹ لگتا ہے نا وہ کھانا پکاتے۔۔۔ لو اٹ۔۔۔"

کوئی بھی اس کی طرح آخ نہ کرتا۔۔۔ ناک نہ چڑھاتا۔۔۔ ہاں ٹھیک تھا۔۔۔ ٹھیک تھا کہ وہ مشرق سے آیا بھید تھا۔۔۔ جسے وہ کھول رہا تھا۔۔۔ ان کا ایک انگریز دوست کسی انوکھی بات پر اکثر سر ہلا کر بوڑھے جرنیلوں کی طرح تاسف سے کہا کرتا۔

"تم نے مشرق کے گھاٹ کا پانی پی لیا ہے... تمہاری سمجھ اب سمجھ سے بالاتر ہو چکی ہے۔"

امرحہ سے ملنے کے بعد اب اسے لاہور جانا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا وہاں سب اس جیسے ہیں... کیا سب لڑکیاں ایسے ہی دوپٹوں میں الجھتی ہیں... بری بات پر ناک چڑھا کر "آخ" کرتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر آنکھیں نم کر لیتی ہیں...

جب وہ فارغ ہوتا وہ "لاہور نامہ" پڑھتا رہتا۔ یعنی اپنے فارغ اوقات کار میں وہ "لاہور" میں رہتا۔ وہ اتنا لاہور میں رہنے لگا کہ صبح آنکھ کھلتے ہی اسے خود کو یاد کروانا پڑتا کہ وہ St-Anselm Hall میں ہے کینٹ یا مال میں نہیں... وہ روز پاکستانی اخبار بھی ضرور پڑھتا کہ لاہور میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ لاہور میں کچھ بدل تو نہیں گیا۔ اس نے لوڈشیڈنگ کے بارے میں اتنا پڑھا کہ اس نے امرحہ سے پوچھ ہی لیا۔

"کیا واقعی پاکستان بجلی کو لے کر اتنے بڑے کرائسز سے گزر رہا ہے۔"

اس کا رنگ فق سا ہو گیا۔ "نہیں... پر تم کیوں پوچھ رہے ہو...؟"

"نہیں۔" وہ اس کے نہیں پر دنگ تھا۔ ہر روز وہ بجلی کو لے کر خبریں پڑھتا تھا۔

"ایسے ہی... وہ میرا ہاسٹل فیلو بتا رہا تھا۔" اس نے بہانا بنایا۔

"کیا بتا رہا تھا... کوئی پاکستانی ہے یا ہندوستانی۔" اس نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔

عالیان کے لیے یہ حیران کن منظر تھا۔ "یہی کہ وہاں بجلی کا مسئلہ..."

"وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے بجلی کا... سب ٹھیک ہے... جیسے یہاں سب ٹھیک ہے... کیوں ہو گا وہاں کوئی مسئلہ؟" اسے یقیناً اس ہوسٹل فیلو پر غصہ آ رہا تھا۔ عالیان دنگ اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اپنے ملک کی عزت کو لے کر وہ اتنی حساس تھی کہ ایک غیر ملکی کے سامنے کسی بھی اندرونی مسئلے کو لے کر بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی، یعنی یہ ان کے گھر کا معاملہ تھا، غیر ملکی دور رہے اس سے۔

"میں نے خبریں سنی ہیں بی بی سی پر... احتجاج کیے ہیں۔"

"کبھی کبھار بجلی کا چھوٹا بڑا مسئلہ ہو جاتا ہے تو بس تھوڑے سے لوگ احتجاج کر لیتے ہیں... بس ایسے ہی" — امرحہ ایک باکمال پاکستانی تھی، سات سالوں کی خون کے آنسو رلانے والی لوڈشیڈنگ کو وہ چھوٹا بڑا کبھی کبھار کا مسئلہ کہہ رہی تھی...

"کبھی کبھار کے مسئلے پر لوگ ایسے احتجاج کرتے ہیں... انہوں نے حکومتی آفس کو آگ لگا دی تھی۔"

"تم نے کوئی غلط خبر دیکھ لی ہے... ایسا نہیں ہو گا... آگ کیوں لگائے گا بھلا کوئی... سب ٹھیک رہتا ہے لاہور میں... پاکستان میں... بہت پیارا ملک ہے ہمارا — ہمیں وہاں کوئی مسئلہ کوئی مشکل نہیں ہے۔"

ہاں یقیناً "بہت پیارا ملک ہو گا... جس ملک کی رہنے والی اس کی کسی خامی کو زیر بحث نہیں لا رہی، جس کے خلاف وہ ایک بات نہیں سننا چاہتی، وہ ملک کتنا پیارا ہو گا... وہ امرحہ سے زیادہ پیارا ہو گا نا...

عالیان کو اس کی یہ حساسیت اتنی اچھی لگی کہ اس نے پاکستان کو لے کر وہ خبریں ہی پڑھنی بند کر دیں جن میں کسی مسئلے کی نشاندہی ہوتی... لاہور میں سب ٹھیک ہے... جیسے مانچسٹر میں سب ٹھیک ہے۔

تو امرحہ کا لاہور اس کا ہو گیا تھا... جیسے عالیان کا مانچسٹر امرحہ کا ہو چکا تھا۔ ایسے ہی فاصلے کم ہو جاتے ہیں۔

محبت ہی میں ہم اپنی ساری قیمتی چیزیں ہتھیلی پر رکھ کر پیش کر دیتے ہیں کہ لو یہ آج سے تمہاری ہوئیں۔

کارل سے امرحہ کو چھپائے رکھنا کسی مہم کو سر کرنے کے برابر تھا۔ بظاہر کارل ایسے ظاہر کیا کرتا جیسے وہ بالکل انجان ہے اور اس کے پاس تو اتنا وقت ہے ہی نہیں کہ عالیان کی نگرانی میں ضائع کرتا پھرے... لیکن حقیقت میں وہ ان لوگوں میں سے تھا جو چوبیس گھنٹے کو چوبیس دن بنا لیتے ہیں...

ایک رات جب دونوں سڑک پر شرط لگا کر دوڑ رہے تھے اور کارل جیت چکا تھا تو اس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

"تم آج کل مسلسل مجھ سے ہار رہے ہو۔"

"ایک دوڑ میں ہرا کر تم مجھے لوزر نہیں کہہ سکتے۔"

وہ ہنسا "ایک دوڑ میں... کم آن عالیان... اس ہفتے میں یہ تیسری بار ہے۔"

"میری صحت کچھ خراب ہو گئی ہے... میں فٹ نہیں ہوں۔"

وہ اور ہنسا "تم ہار رہے ہو... مطلب تم کہیں اور جیت رہے ہو... مجھ سے ہار کو تم اہمیت نہیں دیتے — میرے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے... میں نے تم سے کہا کہ مارٹن کو اسٹور روم میں لاک کرتا ہے تو تم نے کہا کہ وہ بے چارہ ڈر جائے گا... اس سے پہلے تو تمہیں کبھی کسی کے ڈرنے کی پروا نہیں ہوئی تھی۔"

"اگر وہ انتظامیہ سے ہماری شکایت کر دیتا...؟"

کارل منہ کھولے اسے دیکھتا رہا۔ "اس سے پہلے ہم ڈیوڈ کے ساتھ یہ کر چکے ہیں اور اسے تو ہم نے کوڑے دان میں کیا تھا... اور بے چارہ بے ہوش ہو گیا تھا... تم اب بدل رہے ہو... میں تمہیں اکیلا بدلنے نہیں دوں گا۔" گھونسا دکھا کر کہا۔

"میں اب بڑا ہو رہا ہوں۔"

"نہیں۔ بڑے ہونے کی نشانیاں نہیں ہیں یہ... مجھے تشویش ہے... بلکہ خوف ہے میں اپنا بہترین دشمن کھو دوں گا۔ یو نو! سر کارل کہتے ہیں دوست ہو نہ ہو دشمن ضرور ہو اور تم جانتے ہو، پوری یونیورسٹی میں میری ٹکر کے صرف تم ہو۔" کارل نے انگلی اٹھا کر کہا۔

"تم انتظار کر لو... فریشرز میں بہت سے بھیلیے تمہاری ٹکر کے آ چکے ہوں گے... جتنی چاہے ٹکریں انہیں مار لینا..."

"میرا خیال ہے وہ بل آ چکا ہے۔" سر کارل نے پرسوچ سر ہلایا۔

عالیان زیر لب ہنسا... "امرحہ... بل... ہاہا۔"

امرحہ کے نام پر ہی وہ ایسے مسکرا دیا کرتا تھا... وہ اس کے ساتھ رہ کر کیسے کیسے نہیں مسکرایا کرے گا... ہر بار ایک نئی مسکراہٹ... اک نئی ادا...

پرانی امرحہ کی جگہ ایک نئی امرحہ... نئی امرحہ کی جگہ لیتی پھر سے پرانی امرحہ...

☼ ☼ ☼

رات کے آخری پہر وہ اپنے کمرے میں آیا۔ کمرے میں کارل موجود تھا، اسے کمرے میں آنے کے لیے۔ کسی کے بھی کمرے میں جانے کے لیے چابی کی ضرورت نہیں پڑا کرتی تھی۔ جس حساب سے وہ جاسوسی، ایکشن فلمیں دیکھتا اور ناول پڑھتا تھا اب تک جیمز بانڈ نہیں بن چکا تھا تو یہ اس کی کسر نفسی تھی۔

"میرے کمرے سے جاؤ کارل!" اس نے اپنا بورچا کوٹ اتار کر پھینکا۔

"تم کہاں تھے؟"

"تم اپنے کمرے میں جاؤ..."

"تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"تمہارا شکریہ میں ادا کر چکا ہوں... اب تم جاؤ۔"

"شکریہ... یہ لفظ پہلے کب ہم دونوں نے استعمال کیا ہے؟ ذرا بتاؤ... وہ لڑکی تمہیں پسند نہیں کرتی۔ بات ختم۔"

"ہاں بات ختم... اب جاؤ۔"

"نہیں... تم ٹھیک سے بات ختم کرو۔" کارل نے اس کی شرٹ کا گریبان پکڑ لیا۔

"میں بات ختم کر چکا ہوں کارل... تم سے بھی اور اس سے بھی۔" اس نے اپنا گریبان آزاد کروایا۔

"اس سے کرنا تو بنتا ہے... اس نے تمہاری بے عزتی کی... لیکن تم؟"

"میں سب سے ختم کر رہا ہوں۔" وہ چلایا۔

"کتنی لڑکیوں کے ساتھ تم نے میرے بریک اپ کروائے... میں نے کبھی ایسے ری ایکٹ نہیں کیا... چند ایک کے ساتھ تو میں سنجیدہ تھا... تم بہت برے

کھلاڑی بنتے جارہے ہو۔"

"ہاں! میں بہت برا کھلاڑی ہوں۔۔۔ بدترین انسان ہوں میں۔۔۔" اس نے کارل کو ہلکا سا دھکا دے کر خود سے دور کیا "تم جاؤ اب۔۔۔"

"تم یہ سب نہیں کرسکتے۔ ایسے خود کو نہیں بدل سکتے۔" کارل چلایا۔ "ہم دونوں نے بہت وقت ساتھ گزارا ہے۔۔۔ میرا حق ہے تم پر۔"

عالیان نے اپنے منہ کو اس سے چھپانے کی کوشش کی۔

"جاؤ کارل۔۔۔ خدا کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔۔۔"

کئی لمحے اسے دیکھتا رہا پھر وہ چلا گیا۔

✡ ✡ ✡

عالیان Hall St-Anselm کے کمرے کی کھڑکی سے برف پر گرتے اندھیرے کو دیکھنے لگا۔

ایک گھر جو اسے کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔۔۔ ایک گھر۔۔۔ ایک خاندان۔۔۔ کارل اور وہ چپکے چپکے اس کے خواب دیکھتے رہے تھے۔ ایک دوسرے کو وہ یہی بتاتے کہ انہیں بزنس ٹائیکون بننا ہے۔۔۔ اور ایک دوسرے سے چھپا کر وہ ہوم ڈیکور کے رسالے دیکھتے رہتے۔ کارل جو اتنی لڑکیاں بدل چکا تھا' صرف اس لیے کہ وہ جان چکا تھا کہ وہ گھر نہیں بنا سکتیں اور جب ان لڑکیوں سے اس کا چھٹکارہ حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا تو جیسے وہ خود عالیان کو دعوت دیتا کہ خدا کے لیے میرا بریک اپ کروا دو۔

ایک گھر۔۔۔ ایک خاندان۔۔۔ مل کر ایک ہو جانا۔۔۔ اس کی اہمیت وہی سمجھ سکتا ہے جو ان سے محروم رہا ہو۔ عالیان نے تو پھر بھی چند سال اپنی ماں کے ساتھ گزارے تھے' کارل نے تو ہوش ہی کڈز سینٹر میں سنبھالا تھا۔ اس کے والدین ٹرین کے حادثے میں مر چکے تھے۔ سوتیلے نانا اور نانی نے اسے اس کڈز سینٹر کے حوالے کر دیا تھا۔

ایک بار اس نے امرحہ سے پوچھا۔

"تمہارے وہاں گھر کیسے بنتے ہیں؟"

"مطلب تعمیرات؟"

"نہیں۔۔۔ مطلب کیا خواہش رکھی جاتی ہے ایک گھر کو لے کر کہ وہ ایسا ہو؟"

"اچھا یہ۔۔۔ اگر کوئی الہ دین کا چراغ پوچھ رہا ہے کہ گھر کیسا ہو تو سعودی شہزادے طلال کے محل جیسا یا پام سٹی میں میڈونا کے گھر جیسا۔۔۔"

وہ ہنسا۔۔۔ "الہ دین نہیں ایک عام انسان پوچھ رہا ہے۔۔۔ مجھ جیسا عام۔۔۔"

"اچھا!" اس کا منہ لٹک گیا۔ الہ دین کا خواب چکنا چور ہوا۔ اب اسے شہزادے طلال جیسا محل کون بنا کر دے گا۔۔۔ عالیان زیر لب ہنسا۔

"اگر میں بزنس ٹائیکون بن گیا تو اسے ایک محل بنا دوں گا۔۔۔ اور میں نے اپنے پیسے کا کرنا ہی کیا ہے لیکن اگر میں اس کے لیے الہ دین نہ بن سکا تو۔۔۔؟"

"ایک بڑا سا باغ ہو جس میں کئی سو پھول کھلے ہوں۔۔۔ اس باغ میں گھر کی بڑی بڑی کھڑکیاں کھلتی ہوں۔۔۔ پیچھے بھی کئی سو پھولوں والا ایک باغ ہو ایک چھوٹی سی آبشار کے ساتھ اور اس میں بھی بڑی بڑی کھڑکیاں کھلتی ہوں گھر کی۔۔۔ یہ ماسٹر بیڈ روم ہو اور لائبریری۔۔۔ گھر کی چھت بہت اونچی ہونی چاہیے۔۔۔ یعنی اتنی کہ چھ فٹ لمبا فانوس لگا ہو تو سر اٹھا کر دیکھنے پر وہ دور۔۔۔ بہت دور لگے۔"

"یہ ایک عام آدمی کا گھر ہی ہے نا امرحہ!" اسے ٹوکنا پڑا۔

وہ رک کر سوچنے لگی اور خاموش ہو گئی۔ یعنی خفا ہو گئی۔ مطلب ایک سیدھا سا جواب اس سے حاصل کرنا مشکل تھا۔ کہیں وہ اتنی ذہین تھی کہ فوراً" جواب گھڑ لیتی تھی۔

"نہیں کوئی ایشو نہیں ہے گیس کا۔۔۔ کس نے کہا۔ موبائل چھین لیے جاتے ہیں جھوٹ۔۔۔ یہ مغلی اخبارات نا۔۔۔ یہاں تو تم لوگ انگلی اٹھاتے ڈرتے ہو نا کہ پولیس کو نہ بلوا لے۔ ہم لوگ وہاں سیدھا سیدھا تھپڑ مار دیتے ہیں۔۔۔ تھپڑ اور کوئی پولیس نہیں آتی۔"

اور کچھ معاملات میں وہ ایسی تھی جیسے اونٹ بولتے

لوگ ہوا کرتے ہیں اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کس قدر بونگے ہیں اور ہاں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ان کا یہ بونگا پن کسی کو بہت اچھا لگتا ہے اتنا کہ اپنے چھ سات ہوسٹل میٹس کے ساتھ گپیں ہانکتے' سڑک پر چہل قدمی کرتے۔۔۔ اپنے بیڈ کی چادروں کو یونانی طرز پر جسم پر باندھے ایک کندھا عریاں رکھے۔۔۔ یونانی ہی تیز میوزک پر کوریڈور میں ٹھمکے لگاتے اور اپنے دیگر بندر لنگور کے کرتب کرتے کوئی اسے ہی سوچتے' اسی کے لیے زیر لب ہنستا ہے۔ کوئی ٹھٹھرتی راتوں میں لحاف پھینک کر اٹھ بیٹھتا ہے' وہ خود کو تلاش کرتا ہے۔

عالیان۔۔۔ ہاں عالیان۔۔۔ کہاں گیا وہ بے چارہ۔۔۔ ساتھ کے کمروں میں جب کوئی پاجامہ پارٹی' Do or Die (کرو یا مرو) یا اسٹوڈنٹس کا Opera چل رہا ہوتا تو وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کسی اور کو محسوس کر رہا ہوتا۔۔۔ کارل اسے گھسیٹ کر لے جانے کی کوششیں کرتا۔

"تم میاؤں میاؤں بلی بنتے جا رہے ہو۔۔۔ چلو شیر بنو اور ذرا دھاڑ کر دکھاؤ۔" وہی فارغ اوقات میں کی جانے والی ان کی کبھی ایکشن' کبھی مسٹری' کبھی ہارر اور کبھی مزاحیہ موویز جیسی حرکتیں اور شرارتیں' لیکن اب اس سب میں اس کا خاص دل نہیں لگتا تھا۔ وہ کر تو لیتا تھا لیکن بس خود کو پرانا والا عالیان ثابت کرنے کے لیے۔۔۔ اسے ڈر لگتا تھا کہ کوئی اس کے دل کا بھید نہ پا جائے۔۔۔

بھید جو بھوری آنکھوں نے کالی آنکھوں سے کشید کیا تھا۔

بھید جو محبت میں ملفوف دل پر کھلتا ہے۔۔۔ صرف محبت میں ملفوف دل پر۔۔۔

اسے یہ چونکا سا دینے والی لڑکی اس قدر اچھی لگی کہ اس کی کوئی بات اسے بری نہیں لگتی۔ اس کی کسی بات پر اسے غصہ نہیں آتا۔۔۔ اس کی کسی بات پر وہ بھڑکتا نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے وہ پری تھی جو دو دموں والے بندر سے خوف زدہ ہو جاتی ہے۔۔۔ سارا مانچسٹر ہی اس کے لیے دو دموں والا بندر تھا۔۔۔ وہ حیران ہو ہو کر ڈر ڈر جاتی۔ اس کا خیال تھا دنیا میں سب سے اہم محبت ہوتی ہے۔۔۔ امرحہ نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اور کیا کیا کچھ اہم ہوتا ہے۔۔۔

عالیان کھڑکی میں کھڑا تھا اور آج پہلی بار امرحہ کے بارے میں سوچتے وہ زیر لب مسکرا نہیں رہا تھا۔۔۔ اسے رات گزرنے کا غم نہیں تھا کہ اگر رات گزر گئی تو وہ کس وقت امرحہ کو سوچے گا۔

باہر فروری برف کی صورت برس رہا تھا۔۔۔

فروری جسے جدید دنیا نے سرخ۔۔۔ سرخ۔۔۔ سرخ رنگ ڈالا ہے یہ فروری آج اس سرخ۔۔۔ پر سفیدے کی صورت گر کے اس کا گلا دبا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

پیر کو وہ یونیورسٹی آئی تو جو پہلا شخص اس کے پاس آیا' وہ کارل تھا۔ چمڑے کی جیکٹ میں دونوں ہاتھ ڈالے' بنا ٹوپی اور مفلر کے وہ بہت غصے سے اسے گھور رہا تھا۔

"تم یونیورسٹی سے خود جاؤ گی یا میں تمہیں نکلواؤں؟"

یہ بات کہتے وہ انتہا کا سنجیدہ تھا۔ وہ جواب دیے بغیر آگے بڑھی ہی تھی کہ اس کے کراس بیگ کے اسٹریپ میں اس نے پین کو اڑس کر اسے بری طرح سے پیچھے کھینچا۔

"کیا بدتمیزی ہے یہ۔۔۔؟"

وہ ابھی بھی خاموشی سے اسے گھور رہا تھا۔

"میں تمہاری شکایت کر دوں گی۔۔۔ دو دن میں یونیورسٹی سے باہر ہو گے۔"

"تمہیں دو سیکنڈ بھی نہیں لگیں گے دنیا سے باہر ہونے میں۔۔۔ اگر عالیان واپس نہ آیا تو۔۔۔"

امرحہ نے چونک کر کارل کو غور سے دیکھا۔ "کیا مطلب۔۔۔؟"

"میں نے کہا اگر عالیان واپس نہ آیا تو۔۔۔" سختی سے وہ اسے دھمکا رہا تھا۔

"عالیان کہاں ہے؟"

"تم بتاؤ۔ عالیان کہاں ہے؟" الٹا اس نے پوچھا' اس انداز میں پوچھا کہ امرحہ ڈر گئی۔

"تم خود کو سمجھتی کیا ہو۔۔۔ عالیان کے مقابلے میں تم ہو کیا۔۔۔ تم جیسی لڑکی جو ایک ڈگری لینا پہاڑ سر کرنے کے برابر سمجھتی ہے' وہ آخر خود کو سمجھتی کیا ہے۔۔۔ کس دنیا سے آئی ہو تم' جانتی ہو نا۔۔۔ یا میں تمہیں یاد دلاؤں کہ تمہاری حقیقت کیا ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟" امرحہ بری طرح سے ڈر گئی۔

"کہنا نہیں بتانا۔۔۔ عالیان کا کوئی خاندان نہیں ہے' وہ ایک ناجائز بچہ ہے اور وہ تمہاری طرح اچھا مسلمان نہیں ہے۔۔۔ ایک تم ہی ہو اچھی والی مسلم نن۔۔۔ اس کی ماں ایک بری عورت تھی اور باپ۔۔۔ ہونہہ۔"

امرحہ یکدم سانس لینا بھول گئی۔۔۔ یونیورسٹی کی محراب موم بتی کی لو کی طرح تھرتھرانے لگی۔

"یہ سب تمہیں کس نے بتایا؟" امرحہ کی جان مٹھی میں آ گئی۔

"بتایا۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ میں نے خود سنا ہے۔۔۔ ان فیکٹ آدھی یونیورسٹی نے سنا ہے۔۔۔ وہ سب جو تمہاری سوچ ہے۔۔۔ جو حقیقت میں تم ہو۔۔۔ ویسے تم لوگ بہت پڑھے لکھے بنتے ہو۔ مانچسٹر جیسی یونیورسٹی میں پڑھنے آتے ہو۔۔۔ خود کو تعلیم یافتہ کہلواتے ہو اور اندر سے وہی گھسی پٹی گھٹیا سوچ رکھتے ہو جاہل لوگ۔۔۔ ہونہہ۔"

"مجھے بتاؤ کارل! تم کس سننے کی بات کر رہے ہو۔" تھرتھراتی محراب گرنے کو تھی۔۔۔ وہ گر جائے گی۔ نظر آ رہا تھا۔ وہ گر جائے گی۔

"جو تم نے عالیان کے لیے ویرا سے کہا' وہ سب ریکارڈنگ ہے میرے پاس۔۔۔ سنو گی۔"

محراب دھڑام سے زمین بوس ہوئی۔۔۔ افسوس۔۔۔ اس محراب کے عین نیچے ہی امرحہ کھڑی تھی۔۔۔ امرحہ کو پرشور جھکڑ نے آ لیا۔۔۔ اس کی نظر دھندلا گئی۔۔۔ اسے کارل ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔۔۔ نہیں۔۔۔ اسے تو دنیا میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔۔۔

بس اتنی سی دیر لگتی ہے اندھا ہونے میں۔۔۔ اتنی سی دیر میں روشنیاں گل ہو جاتی ہیں۔

"وہ سب کیا؟" وہ بمشکل پوچھ سکی۔

"جو جو تم نے ویرا سے کہا تھا وہ سب۔۔۔ امرحہ۔۔۔ دی مینڈکی۔۔۔ اب عالیان کو ڈھونڈ کر تم لاؤ گی۔۔۔ ورنہ اپنا سامان باندھ کر رکھنا۔۔۔ ٹرسٹ می! ملکہ الزبتھ بھی تمہیں برطانیہ میں نہیں رکھ سکے گی۔"

پین سے اس کے کراس بیگ کے اسٹریپ کو پوری شدت سے کھینچ کر وہ چلا گیا۔۔۔ وہ چلا گیا اور کیا کہہ گیا امرحہ نے نہیں سنا تھا۔۔۔ وہ اسے نہیں سن رہی تھی۔۔۔ وہ اسے کیسے سن سکتی تھی۔۔۔ وہ تو۔

پھر سے ایک تیز سیٹی کی آواز۔۔۔ چھک چھک۔۔۔ جیسے زنگ آلود وزنی انجن کی ریل سزائے موت کے قیدی کا پیچھا کرتی' اپنے اندر جلاد بٹھائے بھاگی چلی جاتی ہو۔۔۔ کتنی جلدی ہے۔ جلاد کو قیدی کا سر تن سے جدا کرنے کی۔ وہ اس حالت میں آ گئی جس میں کسی خونخوار درندے کے لیے لگائے گئے بڑی توڑ لوہے کے وزنی شکنجے میں انسانی پیر آ جاتا ہے۔

اف۔۔۔ موت بھی اور تکلیف بھی۔۔۔ آہ۔

وہ ایک ایابیل تھی۔۔۔ اس پر "آہ" فرض نہ تھی'۔۔۔ وہ بزنس اسکول کی طرف بھاگی۔۔۔ عالیان کو ڈھونڈنا چاہا۔۔۔ وہ نہیں ملا۔۔۔ اس کے چند دوستوں سے پوچھا۔۔۔ انہیں معلوم نہیں تھا۔۔۔ اس کا فون بند تھا۔

وہ تو کہا کرتا تھا' وہ خود کو مار ڈالے گا' کلاس نہیں چھوڑے گا۔۔۔ مر جائے گا پر۔۔۔ تو کیا اس نے خود کو مار ڈالا تھا۔۔۔؟

تو کیا وہ مر چکا تھا۔۔۔ کیا واقعی۔۔۔ عالیان مارگریٹ مر چکا تھا۔ چند دن پہلے بچوں کے گالوں پر چٹکی بھرنے والا'۔۔۔ اس سے بھی پہلے اس کے لیے کراسنگ پر قلابازیاں لگانے والا۔۔۔ اور۔۔۔ بھوری آنکھوں والا لارڈ میئر۔۔۔ مر چکا تھا۔۔۔ اتنی جلدی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

صدف ریحان گیلانی

ناولٹ

نظامانی ہاؤس کا گیٹ ویسا ہی سنہرا اور چمکتا دمکتا تھا۔ دونوں اطراف اونچے لمبے سرو کے درخت ہوا سے دائیں بائیں ہلکورے لیتے اپنی ہی دھن میں تھے۔ ہار سنگھار کی بیل اک جانب کو خوب پھیلی ہوئی تھی اور اس کے گلابی اور سفید پھول دور تک یوں بکھرے تھے جیسے آنے والوں کا استقبال کر رہے ہوں۔ ڈھلتی شام جس کے فسوں پر کئی پرندوں کی مسلسل چہکار ضرب لگا رہی تھی۔ جبکہ گیٹ پار گہری چپ چھائی ہوئی تھی اس وقت۔ وہ حیران ہوا۔

نظامانی ہاؤس کا لان تو اس وقت خوب آوازوں سے بھرا ہوتا ہے۔ آج کیا ہوا اور وہ خاص اسی وقت یہاں کیوں آیا تھا۔ عارب سے بھی ایسا کوئی ضروری کام نہ تھا۔

وہ سر جھٹکا کر مسکرا دیا۔ اب دل اتنا بھی نادان نہ تھا کہ یہ بات نہ سمجھتا۔

کیا کوئی چہرہ یوں بھی حواسوں پر چھا جاتا ہے کہ پھر ہر منظر پر اسی کی چھاپ محسوس ہونے لگے۔ ہر نظارہ اسی کا رنگ چرایا ہوا لگے صبح کی سپیدی اور شام کی سرخی میں اسی کے پیراہن کی جھلک ہو۔ پہلے اسے یہ سب تشبیہات افسانوی لگتی تھیں مگر جب سے صحن دل پر

نئے موسم اُترے تھے۔ تب سے ہر استعارہ حقیقت لگنے لگا تھا۔ وہ اسی مسرور سی کیفیت میں گھر آیا بائیک سے اتر آیا اور ارادی نظر گیٹ کی چوڑی جالی کے پار ڈالی۔

سرخ روش پر چمکتی دمکتی پراڈو کھڑی تھی۔ اس سے آگے عارب کی نسان۔ دائیں طرف نیٹ کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ اس کی روشن آنکھیں ماند پڑ گئیں۔ دل یک لخت بجھ سا گیا۔ اکثر وہ یہیں نظر آتی تھی عارب یا موول کے ساتھ پریکٹس کرتے ہوئے۔ بہترین بیڈمنٹن کھیلتی تھی۔ مجال ہے جو کوئی اس سے جیت جائے اور وہ بھی ہار گیا تھا بن کھیلے ہی' یہ دلوں کا کھیل بھی کتنا عجب ہوتا ہے نال ہارنے والے کو بھی پتا نہیں جیتنے والا بھی بے خبر۔

وہ مایوس سا پلٹنے ہی لگا تھا کہ اندرونی حصے کا داخلی دروازہ کھلا اور خوب نئی نکور چمچماتی فٹ بال کو کک لگاتی پرہ باہر آئی۔ فٹ بال کھجور کے نوکیلے پتوں سے ٹکرا کر واپس سبز گھاس پر جا گری۔ پرہ بائیں جانب آم کے گھنے درختوں تلے گئی' جہاں کین کی کرسیوں میں سے ایک پر سفید بے داغ لباس میں کوئی بیٹھا تھا' پیروں میں قیمتی مردانہ لیدر کے چپل' اخبار چہرے کے آگے۔

"اوہ۔" اس نے اب غور کیا تھا۔ وہ شاید عارب کے بابا تھے یا پھر اس کے تایا سائیں۔ اسے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا "نظامانی ہاؤس" آتے جاتے اور وہ تاحال ان دونوں ہستیوں سے نہیں مل پایا تھا۔ عارب کے بابا ٹوگوٹھ میں اپنی آبائی زمینوں کی دیکھ ریکھ کرتے تھے اور تایا سائیں کی کراچی میں دو گلاس فیکٹریاں تھیں۔ وہ زیادہ تر وہیں ہوتے تھے۔ کبھی کبھار حیدر آباد آتے سو وہ اندازہ نہ کر پایا۔ پرہ ان کے گلے کا ہار بن گئی۔ انہوں نے بھی اخبار رکھ کر اس کے گرد بازو پھیلا دیے۔ وہ اس سے کچھ کہہ رہے تھے اور وہ ان کے سینے میں سر گھسائے جا رہی تھی۔ شاید کوئی فرمائش کر رہی تھی اور اگلے ہی پل دونوں ہنس رہے تھے۔ انہوں نے لاڈلی پرہ کی پیشانی چوم لی۔ جواباً اس نے بھی ان کے چہرے پر پیار کیا اور پھر سے اپنی فٹ بال کی جانب دوڑ گئی اس کی زوردار کک سے گیند اڑتی ہوئی گیٹ کے پار اس کے سر سے کوئی دو انچ کے فاصلے پر سڑک پر جا گری۔ بے اختیار ہی نیچے ہوا تھا اگرچہ یہ ذرا سا ہی نیچے ہوتی تو اف۔۔۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔

اگلے پل وہ اچھلتی پھاندتی دور جاتی بال کے پیچھے دوڑ پڑا۔

"تھینک یو سوچ اوا شاہو!" وہ فٹ بال لے کر واپس آیا تو پرہ گیٹ سے باہر کھڑی تھی۔ جھٹ اپنی گیند پکڑی۔ دو سنہری پونیوں کے درمیان اس کا گلابی سا چہرہ دمک رہا تھا۔

"آپ کب آئے۔"

"ابھی۔۔۔ جب آپ نے بال کو کک لگائی۔" اس نے پرہ کے سر پر پیار بھری چپت رسید کی۔ یہ ننھی سی گڑیا عارب کے تایا سائیں کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی' جس سے کچھ ہی عرصہ میں اس کی بھی خوب دوستی ہو چکی تھی۔

"شکر ہے آپ نے پکڑ لی ورنہ میری اتنی پیاری بال کا کسی گاڑی کے نیچے کچومر ہی نکل جاتا۔ آپ کو پتا ہے بابا جان یہ میرے لیے دبئی سے لائے ہیں۔"

"ارے واہ آپ کی تو موج ہو گئی۔ اچھا یہ بتاؤ عارب کہاں ہے اور باقی سب' آج تو کوئی بھی نظر نہیں آ رہا۔" اس کی بے قرار نظروں نے ایک بار پھر لان کا جائزہ لیا تھا۔ جہاں ہر سو خزاں چھائی لگ رہی تھی۔

"سب اندر ہیں اوا عارب بھی۔ آپ آئیں ناں میں آپ کو بابا سے ملواؤں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔

"پرہ۔" معاً اس کے بابا کی آواز آئی۔ وہ اسے بلا رہے تھے۔

"آئی بابا۔ میں اوا عارب کو بتاتی ہوں۔" پرہ نے پہلے آواز کا جواب دیا پھر اس سے کہتی اندر دوڑ گئی۔ اور اندر بابا نے اس سے فٹ بال پکڑ لی تھی۔ اب وہ اسے کک لگا رہے تھے۔ اک پیار بھرا نظارہ اک باپ کی محبت۔ وہ بیٹی کے ساتھ بچہ بن گئے۔ اس کی خوشی میں خوش انتہائی باوقار سے اس کے بابا کھیل رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ پرہ تالیاں پیٹ رہی تھی۔ وہ اپنی خوشی میں مگن عارب تک جانا فراموش کر گئی۔

اسے بھی بھول گیا۔ وہ پرہ کے بابا کو دیکھ رہا تھا۔ شفقت لٹاتے چاہت نچھاور کرتے وہ کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ یکدم اس کا دل ہر بات سے اچاٹ ہو گیا ہمیشہ سے ایسا کوئی بھی منظر اس کی روح پر بھاری بوجھ بن کر گرتا تھا۔ ساری حسرتیں آنکھوں کے سامنے لہرانے لگتیں۔ اک کونے میں دبکی پڑی تمام محرومیاں پھر سے جاگ اٹھتیں۔ اذیت سی اذیت۔۔۔ اس کی پلکوں پر مرچیں سی چبھنے لگیں۔ وہ تیزی سے پلٹا۔ بائیک کو زوردار کک لگائی۔ اگلے پل وہ ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
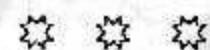
صبح سویرے کی مخصوص گہما گہمی ہر گھر کی طرح یہاں بھی جاگ اٹھی تھی۔ نگہت مامی کی للکاریں' بچوں کی پکاریں اسے اپنے کمرے تک سنائی دے رہی تھیں اور اسی ہنگامہ آرائی کی وجہ سے ہر روز وہ اپنے کمرے میں ہی ناشتا کر لیا کرتا یا پھر بچوں کے جانے کے بعد چھوٹے سے ڈائننگ ہال میں۔

آج پہلا لیکچر ہی سر اطہر کا تھا اور وہ وقت کے بے انتہا پابند تھے۔ شاگردوں کی ذرا سی غلطی پر وہ سب ہی کو جھاڑ کر رکھ دیا کرتے۔ سو وہ جی کڑا کر کے اٹھ آیا۔ فرحین نہایت احسن طریقے سے ناشتا بنانے میں مگن تھیں۔ برسوں گزر گئے تھے انہیں یہ ذمہ داری اپنے سر لیے مجال ہے جو کوئی اپنی منزل پر دیر سے پہنچنے کی شکایت کر جائے۔ لپک جھپک وہ سب کی فرمائشیں پوری کیے جاتیں۔ چپ چاپ سر جھکائے ہاتھ چلتے جاتے اردگرد کیا ہو رہا ہے' وہ توجہ نہ دیتیں اب بھی پوری تندہی سے مصروف عمل تھیں۔ اس کی آمد پر چونک کر سر اٹھایا۔ وہ کف کے بٹن بند کرتا تیزی سے آ رہا تھا۔ بے اختیار وہ پریشان ہوئیں۔ اس وقت کی ہنگامہ خیزی سے اسے کتنی چڑ ہے' وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔

"تم کیوں چلے آئے۔ دس منٹ ٹھہر جاؤ تمہارا ناشتا کمرے میں ہی لے آتی ہوں۔"

"دس منٹ تک تو لیٹ ہو جاؤں گا جو بھی ہے آپ مجھے یہیں دے دیں۔" وہ توے پر پراٹھا ڈال رہی تھیں۔ شاہ داد نے خود ہی اسٹینڈ سے پلیٹ اٹھائی' سالن ڈالا "ہاٹ پاٹ سے پراٹھا گھسیٹا اور کھڑے کھڑے کھانے لگا۔" آرام سے بیٹھ کر کھاؤ۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے؟" فرحین نے چائے مگ میں انڈیلی ساتھ ٹوکا بھی۔ وہ بنا جواب دیے اپنے کام میں مصروف رہا۔

تب ہی مامی اندر آئیں۔ اسے دیکھ کر حیران ہوئیں اور عادت سے مجبور بولے بنا بھی نہ رہ سکیں۔

"ارے تم آج بڑی جلدی اٹھ گئے خیر تو ہے۔۔۔ اور ذرا ٹھہر جاتے۔ بچوں کو تو ناشتا کر لینے دیتے ان کی وین بس آنے ہی والی ہے۔ آپا! جلدی سے دو پراٹھے اور ڈال دیں بچوں کو لنچ بکس بھی دینے ہیں۔" وہ ہدایت دے کر کچن سے نکل گئیں۔ شاہ داد نے بچ جانے والا آدھا پراٹھا واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

"پورا کھاؤ اور یہ چائے بھی پیو۔" فرحین نے دیکھا تو گھرک کر بولیں۔ نگہت بھابھی کی تو عادت تھی بنا سوچے بولنا۔ اب کیا ہر بات دل پر لے لی جائے۔ وہ خود تو بے حس ہو چکی تھیں' پر اسے کیسے کرتیں جسے بے حد نازوں سے پالا تھا اور وہ حساس بھی بہت تھا۔

"میں کھا چکا۔" شاہ داد کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر صرف ماں کا خیال کرتے ہوئے کپ اٹھا لیا۔

"ماموں آ گئے ہیں تمہارے۔ جاتے ہوئے مل لینا۔" مطمئن ہوتے ہوئے وہ اگلا پراٹھا بیلنے لگیں ساتھ اسے مطلع کیا۔

"اچھا کب۔" چائے بے حد گرم تھی۔ ایک چسکی لیتے ہی اس نے جھٹ سے مگ رکھ دیا پھر دوسرا خالی

مگ پکڑا اور چائے ٹھنڈی کرنے لگا۔ جیسے بچپن میں ماں کر کے دیا کرتی تھیں۔

"رات کو تم سو گئے تھے۔ میں نے تو کہا تھا جگا دیتی ہوں۔ پر اس نے منع کر دیا۔ اب تم مل لو اور اپنی فیس کی یاد دہانی بھی کروا دینا۔ ویسے تو میں نے بھی ہفتہ بھر پہلے کہہ دیا تھا اسے لیکن میرے خیال میں بھول گیا ہو گا۔ دو دن رہ گئے ہیں پھر تم خود بھی پریشان ہو گے اور اسے بھی کرو گے پتا ہے ناں اتنی رقم نکالنا ایک دم سے کتنا مشکل ہوتا ہے ایک کاروباری آدمی کے لیے۔"

اگلوں کا موڈ دیکھ کر بات کرنا پڑتی ہے انہوں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے سمجھایا۔

"ہوں۔" اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ کہا کچھ نہیں۔ کچن سے نکل کر وہ ان کے کمرے کی جانب چلا آیا۔

"آجاؤ بھئی۔" دستک کے جواب میں ماما کی آواز آئی تھی۔ شاہ داد دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا۔ وہ بیڈ پر نیم دراز اخبار دیکھ رہے تھے۔

"کیسے ہو بھئی! پڑھائی کیسی جا رہی ہے تمہاری؟" اس کے سلام کے جواب میں انہوں نے پوچھا۔

"بہت اچھی اور وہ ماما جی! امی نے آپ سے کہا تھا میری فیس کے لیے۔" وہ اچھا بھلا با اعتماد انسان اتنی سی بات کہتے ہوئے ہکلا سا گیا۔ رجب ماما نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔ گویا یاد کر رہے ہوں پھر سر ہلایا۔

"ہاں ہاں یاد آیا۔ آپا نے کہا تو تھا۔ کب ہے آخری تاریخ؟" انہوں نے اخبار آگے کر لیا۔

"پرسوں۔" اس نے بتاتے ہوئے بغور ان کا انداز دیکھا۔ وہ کیسا سرسری سا پوچھ رہے تھے۔

"اوہو! اتنا کم وقت۔ ابھی تو میرا کراچی میں ہی اتنا خرچا ہو گیا۔ اچھا چلو پھر کرتا ہوں کچھ کل شام مجھے پھر یاد کروانا میں ادھر ادھر سے کروں گا بندوبست۔ کیا بتاؤں کاروبار میں آئے دن اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ ایک تو ہمارے یہ ملک کے حالات۔" وہ اپنے رونے شروع کر چکے تھے۔ وہ اک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

یعنی کل شام ایک بار پھر جان کنی کا عالم۔ نگہت مامی کھلے دروازے سے اندر آئیں۔

"کیا کہہ رہا تھا یہ۔" اس کے کمرے سے نکلتے ہی ان کی تفتیش شروع ہوئی۔ ماما اخبار میں گم۔ جواب دینا غیر ضروری سمجھا پر مامی بھی ایک کائیاں تھیں۔

"چھوٹے کی یونیفارم بہت خراب ہو گئی ہے۔ کل بھی اس کی ٹیچر نے کہلوایا ہے کہ بچے کو نئی یونیفارم دلائیں۔ گڑیا کا بیگ کلاس میں کسی بچے نے بلیڈ سے کاٹ دیا وہ روتی گئی ہے بمشکل بھیجا ہے اس وعدے کے ساتھ کہ شام کو ہی نیا دلوا دوں گی۔ سب کی فیس بھی جمع کروانی ہے۔ نوٹس آیا رکھا ہے۔ ٹیسٹ بھی ہونے ہیں پیپر فیس الگ اور ہاں۔ چاچی سعیدہ کے بیٹے کی شادی ہے اسی ہفتے۔ وہاں کیا دینا دلانا ہے۔ بچوں کے کپڑے بھی چاہیے ہوں گے۔ میں نے شاپنگ پر جانا ہے مجھے کچھ پیسے۔"

"اوف۔ خدا کا واسطہ ہے چپ بھی کر جاؤ۔ تم ایک دفعہ منہ کھول لیتی ہو تو بند ہی نہیں کرتیں۔ میرے کھانے پینے کی کوئی فکر نہیں۔ صبح صبح خرچے سنا ؤ بس۔ حد ہو گئی۔" انہوں نے اخبار دیوار پر دے مارا۔ بھناتے ہوئے باتھ روم چلے گئے۔

"ہونہہ! دوسروں کے خرچے چپ چاپ سن لیتے ہیں۔ میں کچھ کہوں تو آگ لگ جاتی ہے۔ ان کی کمائی تو بس اوروں کے لیے ہے۔ میرا اور میرے بچوں کا تو مانو کوئی حق ہی نہیں۔ سارے جان بچا کر نکل گئے۔ ہم ہی پھنس گئے ثواب کمانے کو۔"

ان کی بڑبڑاہٹیں جاری تھیں۔ بھائی کے لیے ناشتا لے کر آئی فرحین نے سب سنا۔ شاہ داد کو تو جھڑک کر فوراً اس کے دل سے کسی بھی ایسی بات کا اثر زائل کرنے کی کوشش کر لیتی تھیں۔ مگر اپنے دل کا کیا کرتیں۔ ان کی اذیت کون کم کرتا۔ وہ الٹے پیروں واپس ہو لیں۔

☆ ☆ ☆

سرخ روش پر کھڑی مما نے دوپٹہ سر پر جمایا۔ قرآنی

آیات کا ورد کر کے گیٹ سے نکلتی پراڈو پر پھونک ماری۔ مومل پلٹ کر کین کی کرسیوں کی جانب چلی گئی۔ ٹیبل پر اس کی کتابیں اور نوٹ بک رکھی تھیں۔ اسے اپنی اسائنمنٹ مکمل کرنا تھی۔ عنایہ نے ریکٹ سنبھال لیا۔ مقابل سوہا تھی۔ اریع اور کاملہ جو صرف بابا جان کو سی آف کرنے کے لیے مارے باندھے کھڑی تھیں جھٹ سے ٹی وی لاؤنج کی جانب دوڑ گئیں۔ پرہ نے سب کو بے فکری سے اپنی اپنی سابقہ مصروفیت کی طرف پلٹتے دیکھا۔ گویا کسی کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ مگر اسے تو بہت زیادہ پڑتا تھا۔

اس کے پیارے بابا جا چکے تھے پھر سے بہت سارے دنوں کے لیے۔ اب جانے وہ کب آئیں گے۔ وہ اسی پل اداسی میں گھرنے لگی۔ سب ہی اس سے پیار کرتے تھے۔ وہ سب کی لاڈلی تھی۔ مما بھی خیال رکھتی تھیں مگر بابا سے اسے بے پناہ محبت تھی۔ وہ جب بھی چند ایک روز کے لیے آتے وہ ایک ایک لمحہ ان کے ساتھ بتاتی۔ وہ بھی اسے سینے سے لگا کر رکھتے یہ کچھ دن اس کے لیے عید بن جاتے۔ ان کے جانے پر وہ پہروں اداس رہتی۔ اب بھی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ وہ بڑی سست روی سے چلتی آ رہی تھی۔

"پرہ دھی! ادھر آؤ۔" جیجی نے ہاتھ میں پکڑی تسبیح گود میں رکھ لی اور اسے آواز دی۔ انہوں نے اس کی آنکھیں پونچھیں ماتھا چوما سر تھپتھپایا اور اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

"بابا کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ روتے نہیں۔ آج سے میری بٹی میرے ساتھ کھانا کھائے گی اور میرے ساتھ سوئے گی ٹھیک؟" اسے بہلایا۔

"ٹھیک۔" پرہ نے پہلے تو جوش سے سر ہلا دیا پھر یکدم کچھ یاد آنے پر گردن گھما کر کوریڈور کے مشرقی سرے پر لگے جھولے کو دیکھا۔ جہاں بیٹھی بڑی پھوپھی ایک ہی سمت گھور گھور کر دیکھے جا رہی تھیں۔ گول گول تھرکتے ڈیلے تنے نقوش اکڑے اعضا۔

اس نے بے اختیار ان کی نظروں کا مرکز جانچا۔ سانولی و صحت مندی عام سے نقوش والے چہرے پر بے فکری اور خوشحالی کی گہری چھاپ لیے نیلے سوٹ میں ملبوس مما تھیں۔ اس نے پھر جھولے کی جانب نگاہ کی۔ وہاں انداز کچھ ایسا تھا جیسے کوئی چالاک بلی اپنے شکار پر جھپٹ پڑنے کو تیار ہو۔ وہ کچھ سہم کر جیجی کے بازو میں گھس گئی۔ بابا جب بھی آتے گوٹھ کا ایک چکر بھی ضرور لگاتے زمینوں کے حساب کتاب اور کئی معاملات ان کی توجہ کے منتظر ہوتے تھے اور وہ ہر جگہ ساتھ جانے کو تیار رہتی تھی مگر گوٹھ کے نام پر بدک جاتی کیونکہ وہاں اکثر راتوں کو بڑی پھوپھی کی چیخوں سے پوری حویلی گونج رہی ہوتی۔ اسے ان سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ اس حالت میں کسی بھی سامنے آنے والے کو نوچ لیتیں۔

مہینے میں ایک دو بار جیجی انہیں چیک اپ کے لیے شہر لے کر آتیں۔ اس بڑھاپے میں انہیں کس عذاب سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ ان کے جھریوں بھرے چہرے پر زمانوں کی تھکن ڈیرہ ڈالے رہتی تھی۔

"جیجی وڈی پھوپھی ایسی کیوں ہیں؟" وہ سہمی سہمی سی سوال کر گئی تھی۔

"بس بچے کچھ نہ پوچھو۔ کبھی کبھار انسان ہوش

مندی میں بھی وہ کچھ کر جاتا ہے، جو آنے والے کل میں اس کے لیے سخت آزار کا باعث بن جاتے ہیں۔ کرنی کا پھل ہے سارا۔" ان کے لہجے میں ہزاروں دکھ تھے۔

"کیسی کرنی۔" وہ الجھی۔ جیجی کی توجہ اس پر نہیں تھی۔ جھولے کی زنگ آلود زنجیر کی چرچراہٹ سماعتوں کو چیرے دے رہی تھی۔ تیز اور تیز گول گول گھومتے ڈیلے والے کھنچے چہرے پر جیسے کسی نے گندھک مل دیا تھا۔ شدید اضطراب سے مغلوب ہو کر وہ اپنا ہی ہاتھ چبا رہی تھیں۔ انہوں نے گھبرا کر ملازمہ کو آواز دے ڈالی ۔ اب ان بوڑھی ہڈیوں کے ساتھ اکیلے انہیں قابو کرنا ان کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ مما بھی متوجہ ہوئیں اور صورت حال بھانپ کر ان کی آنکھوں میں ڈھیروں تاسف کے ساتھ ملال بھی اتر آیا، پھر یکدم خیال آنے پر انہوں نے سب سے پہلے مالی چاچا کو لان سے چلتا کیا۔ انہیں علم تھا کبھی کبھی جوش جنوں میں وہ اپنے تن کے کپڑے تک پھاڑ ڈالتی تھیں۔ اس کے بعد لڑکیوں کو ڈپٹا۔

"جاؤ سب یہاں سے۔ اندر کوئی کام نہیں ہے تم لوگوں کو۔ سوہا! جاؤ اپنی کتابیں کھولو۔ پرہ! تم کیا کر رہی ہو وہاں؟" آنکھیں پھاڑے یک ٹک بن جل مچھلی کی مانند تڑپتی مچلتی پھوپھی کو دیکھتی پرہ پر ان کی نظر گئی تو چیخ کر بولیں۔ وہ اس کی حساسیت سے بھی خوب واقف تھیں۔ اس نظارے کے بعد اس نے کئی راتوں ڈرتے رہنا تھا۔

☆ ☆ ☆

شاندار سجے سجائے چھوٹے سے اپارٹمنٹ کی طرز پر بنی یہ انیکسی تایا سائیں کی خوش ذوقی کی اعلیٰ مثال تھی۔ وہ جب بھی آتے زیادہ وقت یہیں گزارتے اور عارب تو رہتا ہی ادھر تھا۔ بقول اس کے اسے اپنی ٹف پڑھائی کے لیے ذہنی سکون اور ایک آرام دہ گوشے کی ضرورت تھی اور یہ جگہ اس لحاظ سے بالکل موزوں تھی۔

جب وہ دونوں، بہن بھائی مزید تعلیم کے لیے گوٹھ سے نظامانی ہاؤس آتے تو عارب اکثر ایسے ہی ہلے گلے کرتا۔ تب تایا سائیں نے اسے سب سے علیحدہ یہاں رہنے کی اجازت دے دی تاکہ وہ مکمل ذہنی آسودگی کے ساتھ اپنی پڑھائی کر سکے۔ اس نے سوچا ذرا عارب کے کمرے کا جائزہ لے۔ ایک بیڈ روم بالکل صاف ستھرا تھا۔ تایا سائیں کے مخصوص کلون کی مہک ہر جگہ پھیلی تھی۔ وہ آہستگی سے دروازہ بند کر کے دوسرے دروازے کی جانب چلی آئی۔

"اف۔" ایک لمحے کو تو وہ چکرا کر رہ گئی۔ کمرا کیا وہ تو ٹھیک ٹھاک کباڑ خانہ معلوم ہو رہا تھا۔ ہر طرف افراتفری کا عالم، کوئی شے اپنی اصل جگہ پر نہ تھی۔ واقعی یہ عارب کا ہی کمرا ہو سکتا تھا۔ وہ کمر کس کر شروع ہو گئی۔ پہلے تو یہاں وہاں ٹنگے سارے کپڑے اکٹھے کر کے ٹوکری میں ڈالے۔ پھر جگہ جگہ پڑی تمام کتابیں رائٹنگ ٹیبل تک پہنچائیں۔ ساری ترتیب درست کی۔ ٹرالی کے پاس کارپٹ پر بے شمار سی ڈیز بکھری پڑی تھیں، انہیں سمیٹ کر دراز میں ڈالا۔ بیڈ شیٹ جھاڑ کر بچھائی۔ صوفوں کے کشن ٹھیک کیے اور دو زانو بیٹھ کر سینٹرل ٹیبل صاف کرنے لگی تھی کہ اس کی نظر نیچے پڑ گئی۔

"اوہ تو یہ کرتوت ہیں صاحب بہادر کے۔ اس لیے الگ جگہ چاہیے تھی انہیں۔" وہ جی بھر کر کلسی اور ہاتھ بڑھا کر سگریٹ کے ادھ جلے ٹوٹوں اور راکھ سے بھری ایش ٹرے اٹھالی۔

"اب یہ ثبوت بابا جان تک پہنچے تو کیا درگت بنے گی جناب کی۔" اسے سوچ کر ہی مزا آگیا۔

وہ نظامانی خاندان کا اکلوتا چشم و چراغ تھا۔ صرف بابا ہی کیا تایا سائیں کی بھی اسے بھرپور محبت اور توجہ میسر تھی۔ ہر طرف سے مکمل و آسودہ حال تھا وہ، اس کے باوجود یہ حرکتیں۔ اسے سزا ضرور ملنی چاہیے۔ اس نے مصمم ارادہ کیا۔ سگریٹ کی ناگوار بو اسے پورے کمرے میں محسوس ہونے لگی۔ اٹھ کر پردے ہٹائے کھڑکی کھولی۔ ہرا بھرا لان نگاہوں کے سامنے آگیا۔ آم کی ایک شاخ پر اٹکی شٹل کاک اور یہ کھڑکی۔ ہاں یہی

کھڑکی تھی۔ یک لخت ساری کلفت اڑنچھو ہو گئی۔ کھڑکی کیا کھلی کہ اک اور کواڑ بھی کھل گیا۔ عنایہ کے یاقوتی لبوں پر دلاویز مسکان بکھر گئی۔ آنکھوں میں اک یاد کے دیپ جل اٹھے۔

☆ ☆ ☆

وہ اک بڑی خوب صورت سی شام تھی۔ ہوا خوب جھومتی اودھم مچاتی ہوئی سارے درخت پودے بھی سرشار سے اس کے سنگ جھول رہے تھے۔ بیڈ منٹن اس کا جنون اسکول کالج کے علاوہ بین الصوبائی سطح پر بھی وہ کئی مرتبہ جیت چکی تھی۔ جتنا فارغ وقت بچتا وہ سب اپنے شوق کی نذر کر دیتی۔ وہ کھیل کھیل کے تھکتی نہ تھی۔ اس دن مومل کا بھی موڈ نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے عارب کے ساتھ اس کی جھڑپ ہوئی تھی مگر کسی بھی طرح منا کر وہ اسے نیٹ تک لے ہی آئی۔

ابھی پہلی سروس کروائی ہی تھی کہ ہوا کے بھرپور جھونکے کی شرارت سے شٹل کاک اڑتی سیدھی اندر سے چائے اور لوازمات سے بھری ٹرے لیے نکلتے عارب کے سر سے ٹکرا کر غڑاپ سے ایک کپ میں جا گری۔ چائے اچھلی تو بسکٹ اور پکوڑے بھی نہا گئے۔ یعنی پورے دو گھنٹے کی مشقت سے تیار ہوئی فرمائشی ٹرے کا ستیاناس۔ عارب کا تو مارے غصے کے برا حال ہو گیا۔ آج کتنے ترلوں سے وہ شاہ داد کو قابو کر کے لایا تھا۔ کل ان کی پریزنٹیشن تھی اور اس کی تیاری حسب سابق زیرو کہ وہ شہراسد اکا پڑھائی چور۔ ڈاکٹر انجینئر بننا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ شاہ داد سے دوستی کی وجہ یہ تھی کہ وہ حد درجے بیبا اور پڑھاکو بچہ تھا۔ ہر کام آسان۔ نوٹس تیار۔ بنا ٹینشن بس کاپی کر لیتا۔ وہ بھی مومل سے کرواتا پھر ہر ماہ تایا سائیں رپورٹ لیتے تو کمر پر تھپکیاں الگ سے ملتیں۔ موجیں ہی موجیں بدلے میں وہ ان کی کوئی فرمائش پوری کر دیا کرتا تھا۔ مومل کی فرمائشیں تو اتنا ساتھ دینے کے بعد جیولری کپڑے سے کم نہ ہوتی تھیں جبکہ بے چارے شاہ داد کی فرمائشیں بس چائے، پکوڑے اور کباب تھے اور آج یہی فرمائش بڑے اہتمام سے سجا کر وہ اس کی خدمت میں لے جا رہا تھا کہ یہ سانحہ ہو گیا۔ ٹرے گھاس پر پٹخ کر وہ عنایہ کے پیچھے لپکا، جو اس کے تیور دیکھ کر پہلے ہی دوڑ لگا چکی تھی۔

"دیکھ لوں گا تمہیں۔" وہ گھاس پر گرا لمبے لمبے سانس لیتا دھمکا رہا تھا وہ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوتی یونہی ہنستے ہنستے منہ اوپر اٹھایا تو یک لخت ہنسی کو بریک لگ گئے۔ سامنے ہی کھڑکی کے فریم میں ایستادہ وہ خوبرو چہرے والا جس کی پرشوق نگاہیں جانے کب سے اس پر ٹکی تھیں۔ وہ بری طرح گڑبڑائی۔ سٹپٹا تو وہ بھی گیا تھا اسی لیے تو اس کے سنبھلنے تک وہ بھی پڑے ہٹ گیا۔ کئی دن وہ نگاہیں اسے ڈسٹرب کرتی رہیں۔

پھر اک دن عقدہ کھلا۔

"ادا شاہو! کیسے ہیں۔" مومل نے اسے دیکھتے ہی گرمجوشی سے ہاتھ ہلایا۔ وہ اسے دیکھتا پرے ہو گیا۔

"یہ ہے کون بدتمیز؟" عنایہ کو اس کی نگاہ سے الجھن ہوئی۔

"اے، اے تمیز سے۔ تم نے کسے بدتمیز کہا۔ ادا شاہو کو بہت بری بات۔ اتنے اچھے اور ڈیسنٹ ہیں وہ ۔ عارب کے سب دوستوں سے مختلف۔ میں تو شکر کرتی ہوں اس نے بھی کسی ڈھنگ کے انسان سے دوستی کی۔ مومل نے اسے گھرکا۔

آہستہ آہستہ وہ کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ جانے والی نگاہیں اسے اپنا اسیر کرنے لگیں۔ اب عالم یہ تھا کہ اگر چار دن وہ نظر نہ آتا تو وہ بے چین ہو جاتی۔

"کیا کر رہی ہیں آپا!" پرہ اسے ڈھونڈتی ہوئی ادھر آئی تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ دلفریب رنگوں سے جگمگا رہا تھا۔

"کچھ نہیں صفائی کر رہی تھی۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ کام کروں۔" وہ آگے بڑھ آئی۔

باقی کی جھاڑ پونچھ دونوں نے مل کر کی۔

دونوں واش روم میں گرد سے اٹے ہاتھ منہ دھو رہی تھیں، جب کمرے کا دروازہ کھلا، عارب اپنے ہی

دھیان میں کسی سے بات کرتا آرہا تھا۔

"اس۔" اندر کی حالت دیکھ کر وہ گڑبڑا ہی گیا۔ کہیں غلطی سے تایا سائیں کے کمرے میں تو نہیں آگیا۔ مگر نہیں یہ اس کا ہی کمرا تھا۔ ہر چیز جانی پہچانی لیکن نکھری ستھری تھی ماسی کو تو وہ کمرے میں گھسنے نہیں دیتا تھا۔ یہ آج کس نے جرات و ہمت کا مظاہرہ کرڈالا تھا۔ وہ حیران تھا۔ اسی دوران وہ دونوں واش روم سے نکلیں۔

"ادھر کیا کررہی ہو تم لوگ؟" اس کی حیرت دور ہوئی۔

"میری بد قسمتی کہ ادھر آنکلی۔ معاذ اللہ آپ کا کمرا تھا کہ گھوڑوں کا اصطبل ہکس طرح رہ لیتے ہیں اس اسٹور روم میں۔"

"چپ کرو اور نکلو یہاں سے۔" اس کی باتوں نے عارب کو تپادیا۔

"جارہی ہوں۔" عنایہ نے لپک کر ٹیبل پر رکھی ایش ٹرے قابو کی اسے بھلا کیسے چھوڑ جاتی۔

"یہ' یہ کیوں لے کر جارہی ہو۔ رکھو ادھر۔" عارب بری طرح سٹپٹایا۔ خود کو سایہ کیسے بھول گیا وہ۔

"یہ کیا ہے پتا ہے آپ کو اور یہ میں چچی اور بابا کی خدمت میں پیش کروں گی۔ پھر پتا لگے گا آپ کو۔" وہ اسے دھمکا رہی تھی۔ عارب دانت کچکچا تا رہا۔

"عنایہ کی بچی! میں جان لے لوں گا تمہاری۔ واپس کرو مجھے۔"

"ارے واہ اتنی آسانی سے۔" وہ چمک کر کہتی پیچھے ہٹی۔ "کیسے دوستوں کی صحبت میں رہنے لگے ہیں۔ بالکل ہی بگڑ گئے ہیں۔ اب بابا اور اماں تک رپورٹ جائے گی ناں۔ ایکسی میں آپ کے سارے لفنگے دوستوں کی آوت جاوت بھی بند کرواتی ہوں۔" وہ بولنے پر آئی تو جو منہ میں آیا بولتی چلی گئی۔

عارب نے بوکھلا کر ایک نظر دروازے پر ڈالی۔

"بار بار کہہ رہا ہوں آہستہ بکو مگر سنتی ہی نہیں ہو۔ کروادی ناں میری انسلٹ۔ اتنا اچھا دوست ہے وہ میرا۔ سب سن لیا ہوگا اس نے کیا سوچتا ہوگا وہ۔" عارب کا بس نہیں چلا اس کی گردن دبوچ لیتا۔

"ارے اداشاہو آپ!" پرہ اپنی ہی دھن میں بہت تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلی تھی۔ سامنے اسے دیکھ کر رک گئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اسے دیکھ کر مسکرا بھی نہ سکا۔

"کیسے ہیں آپ۔" وہ پوچھ رہی تھی۔ شاہ داد نے بڑی دقتوں سے خود کو کمپوز کیا۔ فقط سر ہلا دیا۔

"یہ دیکھیں! ادا عارب کے کمرے میں سے کیا نکلا ہے۔ وہ سگریٹ پیتے ہیں۔ یہ زہر ہوتا ہے ناں؟" وہ رازدارانہ انداز میں بولی۔

"کیا آپ بھی سگریٹ پیتے ہیں؟" پرہ آنکھوں میں استفسار لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیا بات ہے' آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟" وہ اب تک اک لفظ نہیں بولا تھا۔ اس لیے پرہ کو تشویش ہوئی۔ اب بھی شاہ داد نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

تب ہی وہ اندر سے نکلی۔ شاہ داد نے نظر پھیرلی۔ اب اتنی خفگی کا حق تو رکھتا تھا وہ۔

"آپا! اداشاہو سگریٹ نہیں پیتے۔ آپ نے خوامخواہ اتنی باتیں سنا دیں۔" وہ جو یونہی چپ چاپ کھسکنے کا ارادہ کیے ہوئے تھی اس کی بات پر بے اختیار رک کر صفائی دے گئی۔

"مم میں نے انہیں تو کچھ نہیں کہا۔"

"لیکن ادا ناراض ہوگئے ہیں۔ کوئی بات ہی نہیں کررہے۔" پرہ بے شک بچی تھی مگر کم عقل ہرگز نہیں تھی۔

"سس۔۔۔ سوری۔" جب وہ رک ہی گئی تھی تو پھر معذرت کرلینے میں بھی کوئی عار نہیں تھا۔ کم از کم دل سے بوجھ تو ہٹ جاتا۔ شاہ داد کی ناراض نظریں بے ساختہ اس کی جانب اٹھی تھیں۔ انگلیاں موڑتی' پلکیں جھپکتی' نزل سی وہ بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی اور عنایہ کا یہ مختلف سا روپ اس کا دل بھی بدل گیا تھا۔ ساری کلفت چھٹ گئی۔ اس کے اک سوری نے

روح پر پڑی ساری گرد اڑادی۔ سارے منظر نکھر گئے۔

"آ۔۔۔ آپ ادا عارب کو سمجھاتے کیوں نہیں۔ آپ خود تو اتنے اچھے ہیں ان پر آپ کی صحبت کا اثر کیوں نہیں آیا۔ پلیز! انہیں سمجھایا کریں۔" مزید اس کے الفاظ اندر تک ٹھنڈ ڈال گئے۔ وہ اس کی تعریف کر رہی تھی۔

"چلو پرہ۔" وہ آگے بڑھی۔ اس نے جھپٹ کر ایش ٹرے کھینچ لی۔ "میں عارب کو سمجھاؤں گا۔ ڈونٹ وری۔" اب ایسا بھی کیا خوشی سے ہونٹ سی لیتا۔ اسے تسلی دینے کو وہ آخر کار بول اٹھا۔

"تھینک یو۔" وہ مطمئن سی پرہ کو لیے جا چکی تھی اور بے اختیار اس کا دل مچلا "یاہو" کا نعرہ مارنے کو۔ مگر عارب کتاب لے آرہا تھا سر نیچا کیے۔ یقیناً وہ شرمندہ ہو رہا تھا۔ مگر وہ بہت خوش تھا۔ عارب کو ساتھ بٹھالیا۔ ایش ٹرے اس کی گود میں پٹخی اور آئندہ نہ پینے کا وعدہ لے کر ہی اٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

نوٹ بک سنبھالتا وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا آرہا تھا۔ دفعتاً نگاہ سامنے اٹھ گئی۔ راہداری کے اختتام پر گول ستون کے ساتھ ٹیک لگائے تنگ پاجامے' اونچی سی شرٹ دوپٹے کے نام پر گلے میں ڈوری سی لٹکائے وہ یقیناً راحیلہ سومرو تھی۔ لڑکی کی اس جانب پشت ہونے کی وجہ سے وہ اس کی ڈریسنگ سے اندازہ ہی کرپایا جبکہ اس کے سامنے سینے پر ہاتھ باندھے بڑے مؤدبانہ انداز میں کھڑے لڑکے پر اسے گمان ہی نہیں یقین تھا۔ عارب نظامانی۔۔۔ ہر دوسرے روز ایک آدھ کلاس بنک کرکے ان چکروں میں پڑا رہتا ہے۔ پھر اسے ڈبل اسائنمنٹ بنانا پڑتی اپنی بھی اور اس لفنگے کی بھی۔

"نہیں سدھرے گا۔" دانت کچکچاتا سر جھٹک کر وہ پارکنگ میں چلا آیا ابھی وہ گاڑی گیٹ کی جانب موڑ رہا تھا کہ عارب کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

"بڑی جلدی میں ہو۔ کہیں خاص پہنچنا ہے کیا؟"

"میں نے تو واقعی پہنچنا ہے لیکن میٹنگ تو تمہاری بھی بہت خاص لگ رہی تھی۔ میں تو سمجھا اب لنچ بھی ہوگا۔" وہ اس کی حرکتوں پر جلا بھنا تلملا کر بولا۔

عارب نے بلند قہقہہ لگایا۔

"جلنے والے کا منہ کالا۔"

"جلتا ہے میرا جوتا۔" شاہ داد نے پاؤں پٹخا۔ چابی گھما کر کک لگائی۔ مگر یہ کیا۔ بائیک نے چوں بھی نہ کی۔ وہ پریشان ہو کر نیچے اتر آیا۔

"کیا ہوا تیری لاڈو پھر دغا دے گئی تجھے؟ آ تو میں تجھے ڈراپ کردوں۔"

"شکریہ جا کر انہی کو ڈراپ کرو جن کے ساتھ وقت برباد کررہے تھے۔" وہ بہت غصے میں تھا۔

"یار! میں نے کون سا ڈگری لے کر نوکری ڈھونڈنی ہے۔ اپنی تو موجیں ہی موجیں ہیں۔ بابا سائیں اور تایا سائیں کا تمام کاروبار میرا ہی تو ہے۔" وہ ہر طرف سے بے فکر تھا۔

"بابا سائیں کے کاروبار کی سمجھ تو آتی ہے مگر یہ تایا سائیں کا کاروبار کیوں۔" شاہ داد کو اچنبھا ہوا۔

"ارے یار! سمجھا کرو ناں۔ تایا سائیں کی پانچ بیٹیاں ہیں بیٹا تو کوئی ہے نہیں پھر میں ان کا بڑا داماد بنوں گا تو قانونی اور شرعی طور پر حق دار اور وارث میں ہی ہوا ناں۔" اسے اپنے مطلب کی ساری باتیں آتی تھیں۔

"اچھا چل چھوڑ آجا۔ میں تجھے ڈراپ کردیتا ہوں۔"

"مہربانی' میں ٹیکسی کرلیتا ہوں۔ زبیدہ کالج تک جانا ہے مجھے۔" اس نے بائیک کو لاک کرکے چابی نکالی۔

"زبیدہ کالج اور تم اللہ رے۔۔۔ یہ کب سے ہونے لگا۔" عارب نے چھیڑا۔

"بکواس نہ کر۔ دوں گا ایک الٹے ہاتھ کا۔ مینا آنی کو پک کرنا ہے وہاں سے۔"

"اوہ سو سویٹ! مینا آنی۔۔۔ وہ کب آئیں کراچی سے سچ میں تو حیران ہوتا ہوں تم نے ان سے کوئی ایک بات بھی نہیں لی۔ کم از کم تھوڑا سا مسکرانا ہی سیکھ لیتے۔"

"زیادہ باتیں نہ کر۔ چلنا ہے تو ٹھیک نہیں تو میں

چلا۔"

"ہاں' ہاں چل اسی بہانے آنی سے بھی ملاقات ہو جائے گی اتفاق سے میں بھی کالج تک ہی جا رہا تھا۔ عارب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آگے دھکیلا۔

"یہاں سے دل نہیں بھرا کہ اب وہاں بھی جا رہے ہو۔" شاہ داد نے چوٹ کی۔ وہ ہنس دیا۔

☼ ☼ ☼

اور کس قدر حیران کن اور خوش کن ہوتے ہیں وہ لمحات جب اچانک ہی دل کی کوئی مراد بر آئے۔ تب سمجھ میں نہیں آتا کہ پہلے حیران ہوا جائے یا خوش ۔۔۔ اور ایسی کیفیت آپ کے چہرے پر کیسے رنگ اور ہونق پن بکھیر دیتی ہے ضرور علم ہو جائے اگر آئینہ دیکھ لیا جائے۔ تب سوائے ہنسی کے اور کچھ نہ سوجھے وہ بھی ہنس رہا تھا مگر یہ کی آڑ لے کر' جو اسے جانے کیا کیا چٹکلے سنانے میں مگن تھی۔ باقی اس سمیت سب مینا آنی سے یوں خوش گپیوں میں مگن تھیں گویا ان سے پرانی جان پہچان ہو۔ وہ کسی بات پر ہنس رہی تھی اور شاید وہ جانتی تھی کہ ہنستے ہوئے وہ کس قدر دلکش لگتی ہے۔ سفید یونیفارم میں سرمئی اسکارف کے ہالے میں مقید اس کا سرخ پڑتا چہرہ نہایت دلاویز لگ رہا تھا۔ مگر ہائے افسوس کہ وہ چند پل ہی دیکھ سکا۔ وہ عارب کی بہن تھی اور اتنا احترام لحاظ تو اس میں تھا ہی اور پھر وہ چند پل ہی تمام دن اس کے حواسوں پر چھائے رہے۔

"شاہ داد! ذرا اپنا سیل دینا' ہمدان سے بات کر رہی تھی کہ میرے فون کی بیٹری ختم ہو گئی۔" مینا آنی بولتی ہوئی آئیں وہ ہتھیلی ٹھوڑی تلے رکھے اپنے ہی خیال میں کھویا چونک کر سیدھا ہوا۔

"خیر تو ہے لڑکے کدھر ہو تم؟" انہوں نے جانچتی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ ہنس پڑا۔

"کہیں نہیں۔ آپ کہیں کیا کہہ رہی تھیں۔"

"کہیں نہ کہیں تو تھے صاحبزادے! اب بتانا نہ چاہو تو اور بات ہے۔ تمہارے چہرے پر یہ رنگ میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ کیا کوئی خزانہ مل گیا ہے؟" وہ بڑے اطمینان سے بیڈ کی پائنتی پر ٹک گئیں۔ یعنی پوری تفصیل جانے بغیر چھوڑیں گی نہیں۔ وہ خوب واقف تھا ان کے انداز سے۔

"ملا تو نہیں دعا کریں مل جائے۔" اس نے بھی ریوالونگ چیئر ان کی طرف گھمالی۔

وہ ہمیشہ سے اپنے دل کی ہر بات ان ہی سے شیئر کرتا آیا تھا بچپن سے ہی وہ ان کے قریب رہا تھا۔ ماں کی گود پہلی درس گاہ ہوتی ہے۔ اس کی پہلی درس گاہ خالہ کی گود بنی۔ ماں سے اسے بہت پیار تھا مگر ماں کے گم چپ انداز وہ بیٹھے بیٹھے کھو جاتیں۔ انہیں اکثر اپنا ہوش نہ ہوتا تھا۔ اس کا کیا خیال رکھتیں۔ اس کی ماں بہت خوب صورت تھیں۔ مگر سادہ کپڑے' بکھرے الجھے بال' بے رونق چہرہ۔ اسے مینا آنی زیادہ پیاری لگتیں۔ نت نئے ڈیزائن لیے ان کے لباس' ہر چھ ماہ نیا ہیر اسٹائل' چمکتا دمکتا چہرہ ہر وقت ہنستی مسکراتی۔ وہ بچہ تھا ماں اور آنی میں موازنہ کرتا۔

جب وہ آٹھویں میں تھا تو ان کی شادی ہو گئی۔ وہ خوب رویا۔ مگر وہ چلی گئیں۔ میجر اللہ یار بلوچ کے ہمراہ۔

اور ان پر یہ بھید ایک ہفتے ہی میں کھل گیا تھا کہ میجر صاحب پہلے بھی خیر سے شادی شدہ اور تین بچوں کے والد محترم ہیں۔

نانا اور نانی تک یہ خبر کسی کے توسط سے چھ ماہ بعد پہنچی۔ نانا نے تو دل ہی پکڑ لیا۔ نانی سر پر ہاتھ مار مار کر رو رہی تھیں۔

وہ بے چاری چپ چاپ سہ گئیں کہ فرحین کا دکھ ہی کیا کم ہے کہ میں بھی بھاری سل بن جاؤں۔

میجر صاحب جیسے بھی تھے ان کے حق میں اچھے ہی تھے۔ قدرت نے اولاد کی نعمت سے نواز دیا تو وہ ہر دکھ بھول گئیں۔ ان کا لاڈلا پیارا ہمدان اس سے ان کی ہر خوشی وابستہ تھی۔ سو زندگی اب بہت سہل گزر رہی تھی اور یہی زندگی کسی کے لیے کس طرح تنگ تھی اس کا بھی انہیں خوب احساس تھا۔ ماں باپ کے بعد

فرحین اور شاہ داد کے بے ضرر سے وجود بھائی کس دل سے برداشت کر رہا ہے انہیں اچھی طرح علم تھا' سو خود ہی بن کہے ان کے کئی بوجھ بانٹ رکھے تھے۔

شاہ داد کو وہ اپنا پہلا بیٹا کہتیں ہی نہیں مانتی بھی تھیں۔ وہ ہمیشہ سے اس کے بن کہے دل کا حال جانتی آئی تھیں۔ اب بھی جان گئیں۔ مسکرا کر کہنے لگیں۔

ہاں' ہاں ضرور دعا کروں گی۔ لیکن اس خزانے کا نام تو بتاؤ۔" اور اک پل کو تو شاہ داد کا منہ کھلا' پھر وہ جی جان سے ہنس دیا۔

"آپ بھی ناں خوب کمال ہیں آنی۔ آپ کو کیسے خبر ہوئی؟"

"ارے بھئی میں تو اڑتی چڑیا کے پر گن لوں۔ آخر فوجی کی بیوی ہوں۔ کوئی مذاق ہے بھلا۔ چلو اب سیدھی طرح بتاؤ کیا نام ہے۔ کہاں رہتی ہے۔ کیا کرتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ؟"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھا اور پھر وہ ان سے کچھ بھی نہ چھپا پایا۔ تمام حکایت دل کہتا چلا گیا۔

"ہوں تو یہ ہے ۔۔۔ معاملہ' بہت پیاری لڑکی ہے۔ ویری انوسنٹ اینڈ سمپل۔ اچھی لگی مجھے۔ تمہاری پسند تو لاجواب ہے۔"

"سچ آنی!" وہ بے انتہا خوش ہو گیا۔

"ہاں بھئی' اس میں کوئی شک نہیں۔ تم تو بہت تیز نکلے۔ ماں کی جوتیاں بچالیں۔ اسے تو بیٹھے بٹھائے بہو مل جائے گی۔ ٹھہو ذرا اسے بھی خوشخبری سناتی ہوں۔" وہ اٹھنے لگیں۔ شاہ داد نے جھٹ کندھوں سے تھام کر دوبارہ بٹھایا۔

"اُفوہ آنی! آپ بھی ناں ہمیشہ بہت فاسٹ رہتی ہیں تھوڑا دم تو لیں۔ آپ کو پتا ہے ابھی میرے بہت سے پلان زیر تکمیل ہیں۔ شادی کا تو ابھی دور دور تک نام و نشان نہیں' پہلے میں امی کے خواب پورے کروں گا پھر اپنے بارے میں سوچوں گا۔" اس کا پرعزم چہرہ عجب لو دے رہا تھا۔

زرمین نے بے اختیار اس کی روشن پیشانی چوم لی۔

"تم تو بہت سمجھ دار ہو گئے ہو۔ واقعی تمہاری ماں کا بہت حق ہے تم پر۔ تمہیں تو علم بھی نہ ہو گا کیسے کیسے دکھ اٹھائے ہیں تمہارے سنہرے مستقبل کی خاطر اس نے چپ چاپ اس گھر کی خادمہ بننا بھی منظور کر لیا ۔ اب تمہارے اولین فرائض میں شامل ہے کہ تم پوری توجہ سے اپنا سی ایم اے مکمل کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں شاندار کامیابی عطا کرے پھر اچھی جاب کوئی مسئلہ نہیں ان شاء اللہ۔" انہوں نے اس کا شانہ تھپکا ۔ وہ اپنے ہی کسی دھیان میں تھا گم صم کھویا کھویا۔

اول تو اس کے باپ کا تذکرہ کوئی کرتا ہی نہ تھا اور اگر کبھی کہیں ذکر چھڑ ہی جاتا تو اس کے لیے کبھی اچھے الفاظ استعمال نہیں ہوئے تھے۔ بہت سے باپ دیکھے تھے اس نے۔ سب ہی بے حد اچھے تھے۔ اپنے بچوں سے پیار کرنے والے ان کے لاڈ اٹھانے والے ۔۔۔ تو کیا صرف اس کا باپ کیوں اچھا انسان نہیں نکلا۔ ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک یہ سوئی اس کے سینے میں گڑی تھی اور اکثر بے اندازہ درد دیتی تھی۔ اب بھی یہ تکلیف بہت شدت سے پورے جسم میں پھیلی تھی۔

"آنی! کیا واقعی میرے بابا بہت برے تھے؟"

"بہتر ہو گا تم یہ سوال اپنی ماں سے کرو۔ سارا سچ تو وہی تمہیں بتا سکے گی۔" زرمین نے ہمیشہ کی طرح گریز کی راہ اختیار کی۔

"ان سے تو پوچھ پوچھ کر تھک گیا ہوں میں۔ ایک لفظ نہیں کہتیں۔ نہ اچھا نہ برا۔ میں اب بچہ نہیں رہا۔ بڑا ہو گیا ہوں۔ میرا حق ہے کہ میں اپنے باپ کے متعلق جان سکوں۔" وہ جیسے پھٹ پڑا۔

"تو یہ تمہاری ماں کی اعلیٰ ظرفی ہے بیٹا! اگر وہ ہزاروں زخم کھا کر بھی اس شخص کی اولاد کو اس کی بابت سچ نہ بتا سکے تو پھر وہ یہی چاہتی ہے کہ تمہاری نظروں میں تمہارے باپ کا تراشا ہوا پیکر ویسے ہی چمکتا دمکتا رہے جیسا تم نے اسے پالش کیا ہے۔ مت پوچھا کرو ۔ کیوں آزماتے ہو اس بے چاری کا ضبط۔ خود کو بھی فضول سوچوں میں مت الجھاؤ اپنی اسٹڈیز پر پوری توجہ

دو اور اب چلو اچھے بچوں کی طرح پڑھو۔ لولائٹ بھی آ گئی۔ میں سیل چارجنگ پہ لگاؤں۔ جانے ہمدان کے کتنے ٹیکسٹ آچکے ہوں گے۔ میجر صاحب کو الگ چین نہ ہو گا۔" وہ کمرے سے نکل گئیں۔ وہ یونہی سر نیہوڑائے بیٹھا رہا۔

☆ ☆ ☆

پریکٹیکل کے لیے ان کا گروپ اکثر کیفے ٹیریا کا رخ کرتا تھا۔ چونکہ آج موسم بہت زبردست ہو رہا تھا۔ دوپہر ڈھلنے کو تھی۔ وہ سب باہم مشورے سے انسٹیٹوٹ کی کھلی چھت پر چلے آئے۔ سب اپنی اپنی فائل کھولے پڑھ رہے تھے۔ شاہ داد بھی اک طرف کھڑا پورے دھیان سے پڑھ رہا تھا جبکہ عارب دیوار پر جھکا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ تب ہی اس نے تیزی سے چلتی موِل کو دیکھا۔

"کیا ہوا ہے۔ اس کا یہ انداز۔" عارب کا دل گھبرا گیا۔ کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔ وہ فوراً" پلٹا۔

"یار! یہ میری فائل سنبھال، میں ابھی آیا۔" اس نے فائل شاہ داد کی طرف اچھالی۔ جو پکڑتے پکڑتے بھی نیچے گر پڑی۔

عارب کو اس طرح بھاگتے دیکھ کر شاہ داد نے دیوار سے نیچے جھانکا۔ موِل لان میں ایک ایک کو پکڑ کر کچھ پوچھ رہی تھی۔ گھبرائی ہوئی حواس باختہ۔ لگتا تھا گر پڑے گی۔ چند لمحوں میں عارب اس تک پہنچا تھا اور اس کا بازو پکڑ کر کچھ پوچھا۔ وہ روتے ہوئے کچھ بتانے لگی۔

"یا اللہ خیر!" وہ بھی پوری رفتار سے سیڑھیاں اتر گیا۔

"کیا ہوا ہے سب خیر تو ہے۔" موِل کا تر بتر چہرہ۔ دونوں ہاتھ منہ پر رکھے وہ اپنی سسکیاں روک رہی تھی۔

"سب ٹھیک ہو گا۔ پلیز کنٹرول یور سیلف میں ابھی پتا کرتا ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔" عارب اسے تسلی دے کر چند قدم دور ہٹ گیا۔ تمام اسٹوڈنٹس پر سیل فون رکھنے پر پابندی تھی مگر وہ عارب ہی کیا جو کسی اصول کو مان جائے۔ اس وقت سیل فون کا ہونا اسے بہت بڑی نعمت لگا۔ وہ تیزی سے کوئی نمبر ملا رہا تھا۔

عارب اس کی طرف گھوما۔

"رات تایا سائیں کا فون آیا تھا۔ تائی اماں کو انہوں نے بتایا تھا آج وہ اسلام آباد جائیں گے اور ابھی پتا چلا ہے کہ کچھ دیر پہلے کراچی ٹو اسلام آباد پلین کریش ہو گیا ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ!" اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

"کک کیا تایا سائیں اس فلائٹ میں تھے۔" وہ بولتے ہوئے لڑکھڑا گیا۔ عارب نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

"یہ ابھی صرف خدشہ ہے۔ موِل کو فلائٹ نمبر یاد نہیں۔ تائی اماں کو معلوم ہے اور گھر کا نمبر مل نہیں رہا۔"

"تم پھر ٹرائی کرو۔ فلائٹ نمبر پوچھو۔ رجب ماما کے دوست نیوز ایجنسی میں ہیں میں ان سے پوچھتا ہوں۔ اللہ کرے تایا سائیں اس فلائٹ میں نہ ہوں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔" شاہ داد دل سے دعا گو ہوا۔ گو کہ وہ کبھی ان سے نہیں مل پایا تھا۔ مگر عارب کی باتوں میں ان کا اتنا تذکرہ ہوتا تھا کہ وہ بھی انہیں تایا سائیں ہی کہنے لگا تھا۔

"اللہ کرے۔" عارب اس کے الفاظ کی تائید کرتا بے تابی سے دوبارہ نمبر ملا رہا تھا مگر کیا ہوتا ہے کہ بعض دعائیں اکثر کہیں راہ میں رہ جاتی ہیں دور آسمانوں کے درمیان معلق۔۔۔ سب دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ قدرت اپنا فیصلہ کر چکی ہوتی ہے۔ پھر وہ دعا شاید کسی اور وقت کے لیے اٹھا دی جاتی ہے۔ شاید اس وقت کے لیے جب ہم کہہ رہے ہوتے ہیں کہ کوئی نیکی کام آ گئی۔

☆ ☆ ☆

عارب کی مخدوش حالت اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ پورے چار دن سے اس کے ساتھ تھا۔ چوتھے دن وہ اک تابوت میں تایا سائیں کی سربریدہ

کٹی پھٹی، کئی حصوں میں بٹی لاش، ٹوٹی عینک اک مسخ شدہ بریف کیس لے کر ان کے آبائی گوٹھ پہنچے تو۔۔۔

اف! قیامت سی قیامت تھی۔ کہرام بپا ہو گیا۔ وسیع و عریض شاندار حویلی میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی ہر آنکھ اشکبار تھی۔ صرف عورتیں ہی نہیں شاہ داد نے دیکھا اپنے ہر دلعزیز سائیں کی اس قدر اذیت ناک موت پر مرد بھی دھاڑیں مار مار کے رو رہے تھے۔ علاقے کا بچہ بچہ حویلی والوں کے دکھ میں برابر کا شریک تھا۔

نماز جنازہ میں ہزاروں لوگ شامل ہوئے۔۔۔ انہیں آخری آرام گاہ تک پہنچانے والوں میں وہ بھی تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے مٹی ڈالی۔

عارب دل سے ممنون تھا۔ ہر لحہ وہ اس کے ساتھ رہا تھا کاندھے سے کاندھا ملائے مضبوط سہارے جیسا اور وہ خود جتنا تھک چکا تھا۔ اتنے ہی آرام کی ضرورت اسے بھی تھی۔ اسی لیے وہ اسے اوطاق یا حویلی کے مہمان خانے میں ٹھہرانے کے بجائے سیدھا اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ عارب کے کپڑے لے کر وہ واش روم میں گھس گیا۔ دونوں ہی ایک بھرپور نیند کے طلبگار تھے۔ نہا دھو کر کھانا کھاتے ہی جو بستر پر لیٹے تو کب آنکھ لگی خبر ہی نہ ہوئی۔

جانے رات کا کون سا پہر تھا جب کہیں شور و غل مچ گیا۔ کچھ آوازیں تھیں کوئی چیخ رہا تھا۔ چلا رہا تھا۔ شاہ داد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ عارب بے خبر سو رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ زور زور سے دھڑدھڑایا جا رہا تھا۔ وہ اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ لپک کر اندر آنے والی عنایہ تھی۔ شدت گریہ سے سوجی آنکھیں، بکھرے بال، بنا دوپٹے کے۔ وہ بے دھیانی میں اسے ہی عارب سمجھی۔ وہ اس کا سوٹ پہنے کھڑا تھا اور اس کے کمرے میں بھی۔ وہ جلدی جلدی بولے گئی۔ اس نے فوراً" عارب کو جگا دیا۔ عنایہ منہ پر ہاتھ رکھے کھڑی رہ گئی۔ کبھی اسے دیکھتی کبھی عارب کو۔

بیجی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ ذرا سی بھی دیر کیے بنا انہیں لیے شہر بھاگے۔

☆ ☆ ☆

"بھئی کمال ہو گیا۔ جوانی ہم پر بھی آئی۔ دوستیاں ہم نے بھی پالیں مگر ایسے سودائی نہ ہوئے۔ تم نے تو حد ہی کر دی۔ بابا اس کا چلا گیا اور غم تم منا رہے ہو۔ کتنے دن ہو گئے کچھ اپنی پڑھائی کی فکر بھی ہے کہ نہیں۔ کتنا نقصان ہو گیا ہو گا اتنے دنوں میں۔ اتنی مہنگی تعلیم تمہیں یونہی نہیں دلوا رہا۔ میرے پلے کچھ نہ بھی ہو مگر کہیں سے بھی کر کے تمہاری بھاری فیسیں بھرتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ تم جو جی میں آئے کرتے پھرو۔ تم سے بازپرس کا پورا حق رکھتا ہوں میں۔ کچھ خبر بھی ہے کتنے دنوں بعد گھر آئے ہو تم۔" سرِشام ملگجے حلیے میں بڑھی شیو، پژمردہ چہرے ساتھ نڈھال سے وہ گھر میں داخل ہوا تھا کہ رجب ماما نے آڑے ہاتھوں لے لیا۔ وہ چپ چاپ سنے گیا۔ انہیں کوئی بھی وضاحت دینا بے کار تھا۔

"تو اور کیا۔۔۔ ہم جانے کیسے اپنے بچوں کے منہ سے نوالے چھین چھین کر تم پر پیسہ لگا رہے ہیں کہ چلو تمہارا مستقبل بہتر ہو جائے۔ ماں کا آسرا ہی بن جاؤ۔ مگر تمہیں تو کوئی فکر ہی نہیں۔ خواہ مخواہ کی یاریاں لگا رکھی ہیں۔"

نگہت مامی مسالا نہ چھڑکیں ایسا تو کبھی ہوا ہی نہ تھا۔ فرحین آوازیں سن کر باہر آئیں۔

"تم کب آئے؟" ممتا بھری بے تابی سے چہرے کو چھوتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔ نہ گلہ نہ غصہ، ماں تھیں ناں۔ اس کا گرد آلود چہرہ تمام کہانی سنا تو رہا تھا۔ وہ اس سے اور کیا پوچھتیں۔

"ابھی۔" شاہ داد نے یک لفظی جواب دیا۔

"تم نہا لو۔ میں کھانا لے کر آتی ہوں۔"

وہ سر ہلا کر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

"سنبھالو آپا اس لڑکے کو، مجھے تو اس کی صحبت ٹھیک نہیں لگتی۔ کل کلاں کو تمہارے لیے کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے۔ اسے اپنی پڑھائی کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ میری کسی بات کا کوئی جواب ہی نہیں اس کے

پاس میں۔ حد ہوگئی اتنی اکڑ ہے اس لڑکے میں۔ آخر ہے ناں ایک بد قماش باپ کا بیٹا۔ خون کا اثر تو آئے گا ہی۔"

وہ جانے کس بات پر خار کھائے بیٹھے تھے۔ فرحین نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔ وہ آدمی دوسروں کی نظر میں چاہے کتنا بھی برا سہی مگر ایسا طعنہ کبھی بھی برداشت نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ انہوں نے کبھی اسے قصوروار جانا ہی نہیں تھا۔ ان کی بیرن تو ان کی تقدیر رہی تھی ۔ سارے جرم تو نصیبوں کے نکلتے تھے پھر دفعہ اس پر کیوں لگتی تھی۔ مگر مصیبت یہ تھی وہ کبھی کسی کو سمجھا نہیں سکتی تھیں۔ وہ خاموشی سے کچن کی جانب چل دیں۔

"یہ لیں۔ آپ یونہی اپنا خون جلاتے رہتے ہیں۔ ان ماں بیٹے پر تو کوئی اثر ہی نہیں۔ اگلے کو پاگل ہی سمجھتے ہیں اللہ جانے کس مٹی سے بنے ہیں۔" فرحین نے سب سنا اور چولہے کی آنچ تیز کردی۔ ایسی ہی آنچ ان کے دل کو بھی گھیر رہی تھی۔ چپکے سے دو آنسو دوپٹے میں جذب ہوگئے۔

☼ ☼ ☼

جیجی کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ وہ ہوش میں تو تھیں مگر بے ہوشوں جیسی۔ چند دنوں میں ہی ان کا چہرہ برسوں کا بیمار دکھنے لگا تھا۔

بے حد لاڈلے اور پیارے بیٹے کی اچانک موت نے انہیں آدھا مار دیا تھا۔ ان کا زخم خوردہ دل اس بوجھ تلے بمشکل سانسیں لے رہا تھا ان کی حالت کے پیش نظر عارب نے گوٹھ سے موحل اور عنایہ کو بلوالیا۔ وہ دونوں بڑی پوتیاں جیجی کی لاڈلی اور ان سے زیادہ قریب تھیں اس وقت انہیں بے حد دلجوئی کی ضرورت تھی۔

اتنے دنوں سے اسپتال میں عارب ہی تھا ان کے آنے سے کچھ بے فکری ہوئی تو اپنی شدید تھکن کا احساس بھی جاگا۔ مسلسل بیداری اور پریشانی سے آنکھوں کے گرد حلقے نمایاں ہوگئے تھے۔ وہ کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے گھر جانے کے لیے نکلا تھا کہ سامنے سے آتے شاہ داد کو دیکھ کر رک گیا۔

"جیجی کیسی ہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"پہلے سے بہتر ہیں۔" اس نے دیکھا۔ شاہ داد کے عقب میں سیاہ چادر سے یقیناً" فرحین تھیں اور وہ جانتا تھا وہ گھر سے بہت کم نکلتی ہیں۔ اب اگر وہ ان کا دکھ بانٹنے آئی تھیں تو بڑی بات تھی۔ اس نے دوبارہ کمرے کا رخ کیا۔

فرحین نے دونوں کو گلے لگا کر پیار کیا۔

"جیجی! دیکھیں تو آپ سے ملنے کون آیا ہے۔" وہ یونہی گم صم لیٹی تھیں۔ عارب کے پکارنے پر آنکھیں وا کیں۔ تب تک فرحین بھی انہیں دیکھ چکی تھیں او خدا۔

گویا ساتوں آسمان گھوم گئے۔ زمین واقعی گول ہے اور کبھی تو اتنی چھوٹی ہو جاتی ہے کہ فقط ایک نقطے میں سما جائے۔ یہاں آتے ہوئے ان کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ جن کی عیادت کے لیے جارہی ہیں وہ ہستی کون ہوگی۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے کو تھیں۔ اگر شاہ داد بروقت انہیں تھام نہ لیتا۔ ان سے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا محال ہوگیا۔

"فر۔۔۔ فرحین۔" جیجی کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔

بے اختیار انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ عارب نے لپک کر سہارا دیا۔ ان کا ناتواں جسم رعشہ زدہ تھا وہ یک ٹک دیکھے جارہی تھیں۔ اس کے پیچھے ہی وہ کھڑا تھا۔ وہی شہد رنگ بال، چوڑی پیشانی، ویسی ہی دل موہ لینے والی آنکھیں، وہی پر غرور کھڑی ناک ویسے ہی کٹاؤ والے ہونٹ۔۔۔ وہ بے قراری سے پکاریں۔

"کرم داد۔۔۔ کرم داد! میرے بچے، میرے شہزادے، ادھر آؤ میرے پاس۔"

"کیا ہوگیا ہے جیجی! ہوش کریں۔ یہ میرا دوست ہے شاہو۔" عارب کو ان کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔ موحل اور عنایہ بھی پریشان سی دیکھ رہی تھیں۔

"نہیں، نہیں یہ کرم داد ہے۔ دیکھو اسے پہچانو۔ غور سے دیکھو۔ یہ تو بنا بنایا میرا کرم داد ہے۔ اس کی

تصویر۔۔۔ اس کا بیٹا۔۔۔ ان کے کیے گئے انکشاف نے جہاں ان تینوں کو گنگ کردیا وہیں شاہ داد کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ وہ تو جیسے زلزلے کے جھٹکوں میں تھا۔

"فرحین۔۔۔ فرحین! دیکھو میرا بیٹا چلا گیا۔ اسے اپنے بیٹے کو دیکھنے کی بڑی آس تھی۔ اسے ایک نظر دیکھنے کو ترستا چلا گیا۔ وہ کسی سے اپنا دکھ نہیں کہتا تھا مگر میں جانتی ہوں اسے وچھوڑے نے اندر ہی اندر مار دیا تھا۔ ہم نے تمہارا دل دکھایا۔ بڑی سزا کاٹی ہے ہم نے۔ میری زیب کئی سالوں سے بھگت رہی ہے۔ فرحین! ہمیں معاف کردو، میری بیٹی کو معاف کردو۔ میرے کرم داد کو معاف کردو، ہمیں معاف کردو۔" وہ ہاتھ جوڑے زاروقطار رو رہی تھیں۔

"سب نے اپنے اپنے جرم کی سزا پالی۔ مجھے کس جرم کی سزا ملی؟ خسارہ کس کے حصے میں زیادہ آیا۔ فیصلہ کون کرے گا؟" حلق سے نکلتی چیخوں کو منہ پر ہاتھ رکھے روکتی فرحین تیزی سے کمرے سے نکل گئیں۔ شاہ داد میں ہلنے کی سکت نہ تھی۔ جیجی ہوش و خرد سے بے گانہ عارب کے بازوؤں میں جھول گئیں۔

☼ ☼ ☼

وہ اماں بابا کی بڑی نازوں پلی بیٹی تھیں۔ قدرت نے فیاضی سے حسن عطا کیا تھا۔ خاندان بھر میں کئی طلب گار ہوگئے۔

"ہونہہ! یہ خاندان والے فقطے سارے کے سارے۔ چند ہزار کی نوکریاں کرنے والے۔ میں تو اپنی بیٹی کو بہت اونچے گھرانے میں بیاہوں گی۔" اماں ہر رشتے سے انکار کردیتیں۔ ساتھ یہ اعلان بھی۔

بابا بے چارے سدا کے سیدھے سادے شروع سے ہی اماں کی ذہانت اور ان کے فیصلوں پر لبیک کہتے آئے تھے۔ اب بھی ان کے ہمنوا تھے۔ حالانکہ ان کا خاندان اب ایسا بھی فقطا نہ تھا۔

اور آخر کار اماں کی دعائیں رنگ لائی تھیں۔ ایک وچولن کے توسط سے جاگیردار گھرانے سے رشتہ آیا تھا۔ بیگم رحیم داد بھی ان کی طرح اپنے خاندان سے اکتائی ہوئی خاتون تھیں۔ جبکہ انہیں خاندان کے کئی لوگ اپنی بیٹی دینے کو تیار تھے۔ وہ ایک بہت سمجھ دار اور دور اندیش خاتون تھیں۔ ان کے اپنے کچھ تحفظات تھے۔ کرم داد پانچ بیٹیوں کے بعد بے تحاشا منتوں مرادوں سے پیدا ہونے والا وہ لاڈلا بیٹا تھا جس سے انہیں عام ماؤں کی طرح صرف پیار نہیں بلکہ عشق کی حدوں کو چھوتی محبت تھی۔ یہی وہ محبت تھی جس نے انہیں خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے پر مجبور کیا اور وہ من پسند بہو کی تلاش میں جوتیاں چٹخانے لگیں۔

ان کی ڈیمانڈ مڈل کلاس گھرانے کی ایک سیدھی سادہ لڑکی تھی فرحین کی صورت میں وہ لڑکی انہیں باآسانی مل گئی تھی۔ البتہ اس کی بے تحاشا خوب صورتی اس کا پلس پوائنٹ تھی۔ بس پھر انہوں نے کچھ نہ سوچا، پہلے ہی پھیرے میں رشتہ پکا کر آئیں۔

اماں بیٹی کی بلائیں لیتے نہ تھک رہی تھیں۔

تین ماہ کی منگنی کے بعد شادی ہوئی تھی اور تین مہینوں میں اس نے کرم داد کو اتنا سوچا تھا کہ آنکھیں بند کرکے بھی اسے پہچان سکتی تھی اور کاش کہ آنکھیں بند ہی رہتیں کیونکہ کھلی آنکھوں سے پھر جو منظر نظر آئے وہ بے حد اذیت رساں تھے۔

اس کے نصیب اونچی و شاندار حویلی میں لکھے گئے تھے۔

اس کی خوش نصیبی پر کسی کو شک نہ رہا تھا۔ وہ بھی ہزار ہا خوش گمانیوں کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی مگر۔۔۔ پہلی ہی رات اس کے سپنوں کے سنہرے کانچ سے محل کو پہلی ٹھیس لگی جب۔۔۔

اس پر بہت روپ آیا تھا۔ دیکھنے والی ہر آنکھ نے اسے بتایا تھا لیکن وہ صرف اس آنکھ میں اپنا عکس دیکھنے کی خواہاں تھی جس کے لیے اسے پور پور سجایا گیا تھا۔ وہ ارمانوں بھری دلہن تھی۔ ڈھیروں آرزوئیں تھیں۔ صحن دل میں غل مچاتی دھڑکنوں کا اتنا شور تھا کہ

اور کوئی آواز سنائی نہ پڑی تھی۔ وہ قیمتی سازو سامان سے سجے کمرے میں تنہا تھی۔

اس کے پرشوق جذبے۔ وہ سراپا انتظار تھی۔ پلک بھی نہ جھپکی اور پھر یہ انتظار طویل ہو کر سپیدی تک پھیل گیا۔ بیٹھے بیٹھے کمر اکڑ گئی تھی۔ جب دروازے پر کھٹکا ہوا وہ فوراً" سنبھلی۔ کھلے دروازے سے چار ہاتھوں نے ایک لڑکھڑاتے وجود کو اندر دھکیلا تھا اور ٹھا سے دروازہ بند۔

وہ حیران سی منہ اٹھائے دیکھ رہی تھی۔ وہ ادھر ادھر ٹکرایا لڑکھڑایا ڈگمگایا اور آخر کار بیڈ تک پہنچ کر اس کے پاس ڈھیر ہو گیا۔

وہ دراز قامت انتہائی شفاف رنگت، قیمتی سوٹ میں ملبوس شہزادوں کی سی آن بان والا بے حد خوب صورت مرد اور اس کی یہ حالت۔ اس کی حیرانی حد درجے کی پریشانی میں ڈھل گئی۔ اس سے چند انچ کے فاصلے پر پڑے مدہوش وجود میں جنبش ہوئی۔ اس حالت میں بھی وہ اپنے قریب پڑی سرخ گٹھڑی سے غافل نہ تھا۔ یہ رنگوں بھری پوٹلی صرف اس کی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف کھینچ چکا تھا اور اس کے منہ سے آتی وہ غلیظ بو۔ فرحین کا تمناؤں بھرا دل نوچ کر کسی نے تیزاب کی منہ بند بوتل میں ڈال دیا۔ اتنی جلن اتنی اذیت کہ وہ اک پل میں بے حال ہو گئی۔ نہ میٹھی نظریں، نہ اس کے سجے سنورے روپ کی مدح سرائی۔ بس اک جنون بھرا استحقاق۔ پہلی رات اور ایسا سواگت۔ کیا واقعی وہ خوش نصیب تھی؟

☼ ☼ ☼

ایک وقت تھا رحیم داد نظامانی کی حکومت تھی۔ وہ اپنی جاگیر کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ایک خالص وڈیرے والی تمام خصوصیات تھیں ان میں بڑا جاہ و جلال تھا کس کی مجال کہ اس کے آگے پر بھی مار سکے۔ جیجی جیسی خاتون کی بھی ہمت نہ پڑی تھی کہ چوں بھی کر سکیں۔ پھر یکے بعد دیگرے بیٹیوں کی پیدائش نے انہیں اپنے ہی گھر میں کمزور کر ڈالا تھا۔ سسرال اور شوہر کے آگے سر جھکا کر رہتیں۔ دل میں حسرت ہی رہتی کہ اپنی مرضی سے سانس لے سکیں۔ حسرتیں ناسور بننے لگیں۔ قدرت نے ترس کھایا کرم داد ان کی گود میں آ گیا۔ پھر امداد۔ یوں وہ سر اٹھانے جوگی ہوئیں۔ مگر جو کچھ سہہ چکی تھیں، وہ بھلائے نہ بھولتا۔

بیٹوں پر انہوں نے تمام توجہ اور محبت نچھاور کر دی۔ کوئی خواہش ناتمام نہ رہنے دی جاتی۔ جو کہتے لمحے کے ہزارویں حصے میں پورا کیا جاتا۔ ہر نعمت ہر آسائش۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ وہ باپ کا پرتو بننے لگے۔

کرم داد تو بچپن سے ہی حویلی کے تمام ملازموں پر یوں رعب ڈالتا گویا وہ سب زر خرید غلام ہوں۔ ذرا کسی بات پر موڈ بگڑتا تو اگلے کو اٹھا کر حویلی سے باہر پھینکنے سے بھی دریغ نہ کرتا پانچوں بڑی بہنوں پر بھی وہ حکم چلاتا۔ وہ بس اک جیجی تھیں جن کی وہ عزت کر لیتا۔ ماں کا ہر لفظ حرف آخر کا درجہ رکھتا تھا آخر کو ان کی مظلومیت کے قصے اپنی پیدائش کے دن سے سن رہا تھا۔

قدرت کی کرنی چند سال پہلے فالج کے شدید حملے نے رحیم داد نظامانی کو معذور و مجبور کر کے ان کے رحم و کرم پر ڈال دیا۔ جیجی تو پہلے ہی ظلم سہہ سہہ کر پتھر دل ہو چکی تھیں۔ اب دو جوان بازو ان کے ساتھ تھے۔ باقی کی کیا پروا، کرم داد کو تو یوں بھی باپ سے کوئی خاص الفت نہ تھی۔ اب کسی کا دل چاہتا تو ان کا حال احوال لے لیتا ورنہ انہیں سنبھالنے کے لیے حویلی کے پرانے خادم بجل چاچا تو تھے ہی۔ اتنی بڑی جاگیر اور حویلی کے سب انتظام آپ و آپ کرم داد کی ذمہ داری بن گئے۔ مگر درون خانہ جیجی کی ناتمام خواہشیں مکمل ہونے لگیں۔ سب معاملات ان کی مرضی و منشا سے طے ہوتے۔ کرم داد کے سر پر ایسا کوئی بوجھ نہ تھا۔ ماں تھی سب سنبھالنے کے لیے۔ اسے بے فکری ہی بے فکری تھی اور یہی بے فکری رنگ لانے لگی۔ باپ معذور، ماں محبت میں ڈوبی۔ آئے دن اوطاق میں محفلیں سجنے لگیں۔ دوست آتے کھاتے پیتے موج

اڑاتے۔

آپا سب سے بڑی تھیں اور دوسری بہنوں کی طرح کرم داد کے رعب میں بھی نہ تھیں۔ آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے اس کے کانوں میں انڈیلتی رہتیں "بھاگی سے شادی کر لو بڑے فائدے میں رہو گے اچھی لڑکی ہے پھر اتنی بنیاں (زمینیں) ہیں اس کے نام۔ بڑا کچھ لے کر آئے گی حویلی بھر جائے گی۔"

اتنی تفصیل سن کر کرم داد کا بھی اک دن دل للچا گیا۔ بوٹے سے قد گندمی رنگت، چھوٹی آنکھوں اور چپٹی ناک کے ساتھ وہ کوئی اتنی بری بھی نہ لگتی تھیں۔ ہمیشہ بڑے اچھے طریقے سے ملتی تھی۔ آپا کے ہی بے پناہ اصرار پر وہ اک دن جیجی سے بات کر بیٹھا۔

"چریا ہو گیا ہے کیا؟" انہوں نے اس کی پوری بات بھی نہ سنی ڈپٹ کر بولیں۔

"زیب انسا کا تو دماغ چل گیا ہے۔ چری ہو گئی ہے بالکل، وہ تیرے نہیں اپنے فائدے کا سوچ رہی ہے۔ تو کس لالچ میں آ رہا ہے۔ اللہ سائیں کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ مرد مجبور ہو جائے تو سمجھو تا مرد برابر ہو جاتا ہے۔ وٹے کی شادی گلے کا پھندا بن جاتی ہے زیب النسا کے اولاد نہیں ہے۔ اس جھلی کو ڈر ہے احمد سراج اس پر سوتن نہ لے آئے۔ بھاگی کو تیرے پلے باندھ کہ وہ اپنا کلا مضبوط رکھنا چاہتی ہے۔ ارے احمد اسے اولاد نہیں دے سکا۔ بھاگی اسی کی بہن ہے کل کلاں کو وہ بھی اولاد پیدا نہ کر سکی تو پھر ہم تو پھنس گئے ناں۔ نہ تو اسے چھوڑ سکے نہ دوسری شادی کر سکے۔ آنکھوں دیکھی مکھی نگل لوں۔ میں سٹھیائی نہیں ابھی۔ تو دیکھتا رہ میں تیرے لیے پڑھی لکھی کیسی خوب صورت کنوار لے کے آتی ہوں۔ سارا زمانہ دیکھے گا۔" اور انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا مگر ساتھ ہی اس سے بھی اک وعدہ لیا۔

"دیکھ کرم داد! میں نے اپنی بات پوری کی۔ اب یہ نہ ہو کہ تجھے اب صرف گھر والی ہی نظر آئے۔ جانتا ہے ناں تیری ماں نے کیسی زندگی گزاری ہے۔ تیرے باپ کا کیسا رویہ تھا میرے ساتھ۔" اپنی بات کا وزن بڑھانے کو آنسو بھی نکال لیے "اور دیکھ لے میں نے پھر بھی نبھائی ہے۔ کبھی جو کوئی شکوہ کیا ہو۔ اچھی عورتوں کے یہی گن ہوتے ہیں۔ جوتے کھا کر بھی کبھی اف نہ کریں اور جب اوپر والے نے ہی عورت کو مرد کے ماتحت پیدا کیا ہے تو وہ اس کی برابری کیسے کرے میری بات یاد رکھنا اپنی زال کو سر نہ چڑھانا اسے اسی جگہ رکھنا جس کے لائق وہ ہے مرد مرد ہی اچھا لگتا ہے۔"

اسے اپنے پڑھائے گئے تمام اسباق اچھی طرح ازبر تھے۔

فرحین کو نہیں یاد پڑتا کبھی کرم داد نے اس سے ہنس کر بات کی ہو۔ کبھی نظر بھر کر دیکھا ہو۔ کاش کبھی وہ اس کی آنکھوں میں جھانک لیتا تو اس کے دل میں چھپے بے تحاشا محبتوں کے خزانے کا راستہ پا لیتا۔

اور وہ بے چاری عورت۔ وفا اور چاہتوں کی ماری اس کے آگے بچھ بچھ جاتی۔ بھاگ بھاگ کر اس کی خدمت کرتی۔ جہاں وہ پاؤں رکھتا ہتھیلیاں بچھا دیتی۔ چپکے چپکے اپنے ہی مال کو چوروں کی طرح دیکھا کرتی کہ اگر کبھی دن کے اجالے میں کرم داد حویلی میں ہوتا تو اسے اس کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا جاتا۔

جیجی خود کیا کم تھیں کہ آئے دن ایک آدھ نند بھی آئی رہتی۔ آنے بہانے اسے گھر کے مختلف کاموں میں مصروف رکھتیں اور فرحین بے چاری کی مجال کہ انکار کر جائے۔ یوں اس کا دن کچن کی نذر ہو جاتا۔

رات کو تھکن سے بے حال وہ کرم داد کو بری لگتی۔ وہ پینے کا عادی تھا اور جب اپنے حواسوں میں نہ ہوتا تو انتہائی بے رحم ہو جاتا اور فرحین کو اسے جھیلنا محال۔ ایک بار ہمت کر کے اسے گناہ و ثواب بتانے کی غلطی کر ڈالی اور بس طوفان آ گیا۔

لمحوں میں وہ دو ٹکے کی ہو کر رہ گئی اور اسی پر بس نہیں۔ کرم داد نے سزا بڑھا دی۔ اوطاق پھر سے آباد ہونے لگی۔

رات کے ٹھہرے سناٹے میں گھنگھروؤں کی کھنک وہاں تک آتی۔

"اے ہائے تجھ سے اب تک اپنا شوہر ہی قابو

نہیں ہوسکا۔ مرد تو اڑیل گھوڑا ہوتا ہے اسے سدھانا پڑتا ہے پیار سے محبت سے۔ تم کیسی زال ہو اس کی بری عادتیں ہی نہیں چھڑا سکیں؟"

آپا زیب آئیں تو انہوں نے اس کے زخموں پر خوب خوب نمک پاشی کی۔

جیجی بھی بڑے اطمینان سے سارا الزام اس کے سر تھوپ دیتیں۔ اگر وہ کچھ کہتی اپنی صفائی میں تو وہ آگے ایک کی چار لگا کر کرم داد کو بتاتیں۔

اس کی حالت کچھ دنوں سے خراب تھی۔ جیجی کو بیٹیوں کے چاؤ چونچلوں سے ہی فرصت نہ ملتی تھی اس کی بدلی رنگت کیا خاک پہچانتیں۔

اسی دوران چاول کی فصل کی کٹائی مکمل ہو گئی۔ اسے سکھانا، چھٹانا، پھر سنبھالنا بڑا محنت طلب کام ہوتا تھا۔ جسے جیجی گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر کیا کرتی تھیں۔ اس بار یہ ذمہ داری اس کے سر ڈالی گئی۔

حویلی کی بڑی ساری چھت پر صبح سویرے کپڑے بچھا کر ان پر بوریاں الٹ دی جاتیں۔ شام ڈھلنے سے پہلے انہیں سمیٹنا۔ اچھے بھلے آدمی کی کمر تختہ ہو جائے وہ تو پھر دوسرے حال سے تھی۔ اماں نصیبن اس سے صرف نگرانی کرواتیں۔ اسے کرسی بچھا کر دے دیتیں۔ سرما کی نرم گرم دھوپ۔ اس روز بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ گئی۔ شامت اعمال جیجی اور آپا زیب النسا ادھر آنکلیں اور یوں دن دہاڑے کمی عورتوں کے سامنے اسے سوتے دیکھ کر انہوں نے وہ لتے لیے کہ خدا کی پناہ۔ کام چور، ہڈ حرام، لاپروا جانے کیا کیا خطابات سے نوازا۔ اماں نصیبن بے چاری وضاحتیں دیتی رہیں اور آخر کار انہیں بتانا ہی پڑا اور وہ اچھل پڑیں۔

"واہ اتنی بڑی اور اہم خبر ہم سے چھپائی تم نے اور دو ٹکے کی ملازمہ کو بتا دیا۔ ہم اس قابل بھی نہیں دیکھو اس لڑکی کی جرات۔" وہ سینہ کوبی کرتیں نیچے اتریں۔ کرم داد ابھی حویلی سے ہی تھا۔ جیجی اور آپا نے رو رو کر تماشا لگایا۔

پھر کرم داد نے اسے خوب ذلیل کیا اور وہ جو سوچتی تھی کہ جب کرم داد کو یہ خبر ملے گی تو کتنا خوش ہوگا۔ ویسا نہ ہو سکا۔ اس کی زندگی کی دوسری بڑی خوشی بھی اس کی توقع کے خلاف ہی ہوئی۔

"بیٹیاں بہت ہمارے خاندان میں، حویلی کو وارث چاہیے۔" اٹھتے بیٹھتے اب جیجی کا ایک ہی نعرہ ہوتا۔ انہوں نے کرم داد کو بھی خوب سبق پڑھا دیا وہ بھی اکثر ماں کی زبان بول دیتا گو کہ اس کے رویے میں وہ پہلی سی سختی نہ ہوتی تھی۔ اپنے بچے کی وجہ سے ہی سہی وہ کچھ تو اس سے نرمی برتنے پر آمادہ ہوا۔ فرحین کے لیے یہی بہت بڑی خوشی تھی۔

نو ماہ اس نے آس و نراس کی سولی پر ٹنگے گزارے اور جب ننھا منا پیارا سا گول گوتھنا سا بچہ گود میں آیا تو اسے لگا تھا کہ کسی طویل قید سے رہائی مل گئی ہو۔ سات روز تک حویلی میں جشن کا سماں رہا۔ خوب جی کھول کر صدقہ خیرات کیا گیا۔ کرم داد بے انتہا مسرور تھا۔ بچے کا نام اس نے ہی شاہ داد تجویز کیا تھا۔ بیٹے کی محبت میں کھو کر وہ اپنے دیرینہ مشغلے بھولا ہوا تھا۔ حویلی سے باہر کا راستہ تو جیسے اسے یاد ہی نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

شاہ داد دو ماہ کا ہو چکا تھا۔ سب کا لاڈلا سب کا راج دلارا۔ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک۔ جیجی کو بھی اپنے پوتے سے بے پناہ پیار تھا۔ سارا دن وہ انہی کے کمرے میں ہوتا۔ بس صرف دودھ پینے کے لیے اس کے پاس آتا۔ ان کا پوتے سے یہ پیار بھی اسے اذیت دینے کا ایک انداز تھا۔ اسے تو یہی لگتا وہ سارا دن بچے کے لیے ترستی۔ ہاں رات کو وہ اس کے بغیر نہیں سو سکتی تھی۔ نہ ہی کرم داد کو نیند آتی۔ وہ کرم داد جس کا ذرا ذرا سی بات پر مزاج برہم ہو جاتا تھا اب چاہے بیٹا ساری رات شور کیے رکھتا وہ ذرا ماتھے پر بل نہ لاتا۔ بچے کا رونا، مسکرانا ہاتھ پاؤں ہلانا، قلقاریاں مارنا اک اک ادا پر نثار ہوتا۔ دن میں تو اسے باہر کے کاموں سے فرصت نہ ہوتی۔ رات کو سارا وقت بیٹے کے ساتھ گزرتا۔ ان لمحوں میں فرحین کو لگتا صحرا کا سفر کٹ گیا ہے اب ہر طرف نخلستان ہی نخلستان ہے۔

اس روز کرم داد صبح سویرے کا گیا شام ڈھلے حویلی آیا تھا اور آتے ہی بیٹے کو دیکھنے کی فرمائش کی تھی جو حسب معمول جیجی کے پاس تھا۔

فرحین ان کے کمرے میں گئی تو وہ آپا زیب النسا کے ساتھ باتوں میں مشغول تھیں۔ شاہ داد کو گھنٹہ بھر پہلے انہوں نے پنگھوڑے میں لٹایا تھا۔ فرحین نے جب اسے اٹھایا تو احساس ہوا کہ اسے تو بخار ہے۔ وہ بے اختیار گھبرائی۔

"ارے خیر ہے کچھ نہیں ہوا۔ بچے بیمار بھی ہو جاتے ہیں۔ تم تو خوامخواہ پریشان ہوئے جا رہی ہو۔ لے جاؤ اسے اپنے کمرے میں۔ آج تو بہت ہی تنگ کیا ہے اس نے۔" انہوں نے ہاتھ لگانا بھی گوارا نہ کیا۔ زیب النسا بھی گپ چپ سی بغور اسے دیکھتی (اس فرحین کو بھی کبھی ان کی نظروں سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ وہ سخت پریشان سی کمرے سے نکل گئی۔ آپا کی حسرت بھری نظریں پیچھے تک گئیں۔

فرحین بہت تیزی سے کمرے میں آئی تھی۔ کف کے بٹن بند کرتے کرم داد نے اسے آتے دیکھا تو بے تابی سے بیٹے کو لینے کے لیے بڑھا۔

"سائیں دیکھیں اسے کتنا بخار ہے۔" فرحین نے بچے کو اس کے ہاتھوں میں دیتے نہایت پریشانی سے بتایا۔ کرم داد نے بیٹے کے ماتھے پر ہونٹ رکھے تو اسے بھی اندازہ ہوا۔

"کیسے ہوا اسے بخار۔ اتنا سا بچہ تم سے سنبھالا نہیں جاتا۔ کتنی دفعہ کہا ہے لعنت بھیجو سب کاموں پر، بس اس کا خیال کرو۔" وہ الٹا اس پر چڑھ دوڑا۔

"مم، مجھے کیا پتا، صبح سے جیجی کے پاس تھا۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے کیا میری ماں نے اسے کچھ کھلا پلا دیا۔" وہ مزید تپا ہوا۔

"نہیں سائیں! میرا یہ مطلب نہیں میں تو۔۔۔" ایک تو بچہ کو بخار اس پر کرم داد کا غصہ۔ وہ بے اختیار رو پڑی۔

"اچھا اب زیادہ ڈراما مت کرو میرے سامنے اور کان کھول کر سن لو۔ اسے ایک منٹ کے لیے بھی اکیلا مت چھوڑنا، میں ڈاکٹر سے دوا لے کر مراد کے ہاتھ بھیج دیتا ہوں۔" شاہ داد کو اسے پکڑاتے وہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف گیا اور برش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگا۔ فرحین نے اب غور کیا وہ نہایا دھویا نئے نکور کپڑے پہنے تیار ہوا کھڑا تھا۔

"کک، کہاں جا رہے ہیں آپ؟" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"اوطاق پر شہر سے کچھ دوست آئے ہیں۔" وہ پرفیوم اٹھا کر خود پر اسپرے کرنے لگا۔ کتنی دیر وہ گنگ سی اسے دیکھتی رہی۔ پھر ہمت یکجا کی۔

"شاہ داد کی طبیعت خراب ہے۔ میرا دل گھبرا رہا ہے آپ نہ جائیں۔"

آجاؤں گا ایک ڈیڑھ گھنٹے میں تم اسے لٹاؤ اور ہاں جا کر دیکھو ذرا اماں نصیبن نے اوطاق پر کھانا بھجوایا ہے کہ نہیں اور تم نے کھانا کھایا؟" اسے خیال آیا تھا۔

فرحین کو اب کسی بات کا ہوش نہ تھا بس ایک ہی فکر، ایک ہی خیال کہ وہ کہیں نہ جائے۔ پہلی بار پیش قدمی کرتے ہوئے تمام حیا بالائے طاق رکھتی وہ اس کے چوڑے سینے سے جا لگی۔

"سائیں! اللہ کے واسطے! آج میری بات مان لیں مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ ڈر لگ رہا ہے۔"

"یہ کیا پاگل پن ہے۔" کرم داد نے اک جھٹکے سے خود سے علیحدہ کیا۔ مگر جب نگاہ بھیگے گلابی چہرے اور جل تھل آنکھوں پر پڑی تو دل آپ ہی آپ موم ہو گیا۔

"دیگی۔" اک نرم سی مسکان اس کے ہونٹوں کو چھو گئی۔

"تم تو بہت ڈرپوک ہو۔ میں تو سمجھتا رہا میری بیوی بہت بہادر ہے۔ پر تم نے تو آج میرے خیال کو جھٹلا دیا۔ فکر نہ کرو میں دوا بھیج دیتا ہوں ایک آدھ گھنٹے میں بخار اتر جائے گا تم کھانا بھی کھا لینا۔" کرم داد اسے بازو کے گھیرے میں لیے بیڈ تک لے آیا۔ اسے بٹھا کر بچے کو پیار کیا۔ وہ ابھی اس کے نرم لہجے پر ہی حیران سی

دیکھ رہی تھی کہ کرم داد نے اس کی پیشانی بھی چوم لی۔

اف۔۔۔ وہ جیسے کسی ٹھنڈے چشمے میں نہا گئی۔ وہ تو اس کا خصوصی التفات ہی خاص خزانے کی طرح دامن میں سمیٹا کرتی تھی۔ یہ آج کیا ہوا تھا۔ عمومی طور پر ایسی عنایت؟

وہ پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔ یکدم وہ پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ وہ اسی لمحے کے حصار میں تھی۔ فرط مسرت سے اس نے بچے کو ہی سینے میں بھینچ لیا۔ جو اتنی شدت پر چیخ کر رو پڑا۔ وہ ہنستی چلی گئی۔ وہ کہاں گیا ہے یہ فکر بھی نہ رہی اور بچے کو جھلاتے جھلاتے جانے کب وہ بھی نیند کی وادی میں اتر گئی۔

اک انگارہ سا پہلو کو چھو گیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر جاگی۔ شاہ داد کسمساتا ہوا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ گلابی چہرہ انتہائی سرخ اس نے بے اختیار پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

"یا اللہ۔" گویا جلتے توے پر ہاتھ پڑ گیا۔ وہ جھٹکے سے اٹھی۔ اماں نصیبن کو جگایا۔

"اماں! دیکھیں کیسے بخار میں تپ رہا ہے۔ سائیں نہیں آئے ابھی تک۔ وہ تو کہہ رہے تھے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آ جائیں گے اور نہ دوا بھجوائی انہوں نے۔" وہ مارے پریشانی کے روہانسی ہو گئی۔

"اللہ سائیں سے خیر مانگ۔ وہ سب ٹھیک کرے گا۔ میں جا کر مراد سے پوچھتی ہوں۔"

وہ باہر کو لپکیں۔ کچھ دیر بعد ہانپتی کانپتی واپس آئیں۔

"مراد کہتا ہے ڈاکٹر رات کو اگلے گوٹھ گیا ہوا تھا دوا نہیں ملی۔ وہ پوچھ رہا ہے اگر خدانخواستہ زیادہ پریشانی کی بات ہے تو ڈاکٹر کو ادھر لے آئے۔"

"ہاں ہاں۔ اسے کہیں جلدی سے ڈاکٹر کو بلا لائے۔" اسے اب صرف اپنے بچے کی فکر تھی۔

آپا زیب انسا انسومنیا کا شکار تھیں اکثر راتوں کو اٹھ اٹھ کر ٹہلا کرتیں۔ اب ان کی نیند روٹھی ہوئی تھی۔ کمرے میں دل گھبرایا وہ چھت پر جانے کے ارادے سے نکلی تھیں کہ رات کے اس پہر خاموش حویلی میں انہوں نے اک اجنبی کو آتے دیکھا۔ پیچھے مراد تھا جس کے ہاتھ میں ننھے چھوٹے سے بیگ کو دیکھ کر وہ سمجھ گئیں کہ آنے والا کون ہے۔ پھر انہیں یہ بھی یاد آ گیا کہ کل شام فرحین بچے کو لینے آئی تو اسے بخار تھا۔

شومئی قسمت کہ اسی وقت کرم داد کی جیپ بھی حویلی کے داخلی گیٹ سے اندر آئی۔ انہوں نے ہارن سن لیا اور بس جھٹ پٹ ان کے شاطر ذہن نے ایک پلان ترتیب دے ڈالا۔

اماں نصیبن کو انہوں نے کچن میں جاتے دیکھا تھا۔ مراد بھی واپس جا چکا تھا اور اندر آتا کرم داد حسب سابق، نشے میں جھومتا جھامتا بمشکل خود کو سنبھالے چل رہا تھا۔ زیب انسا کی چیخوں نے حویلی کے در و دیوار ہلا ڈالے۔

"ہم لٹ گئے۔ برباد ہو گئے۔ ارے یہ دن دیکھنے سے پہلے مر کیوں نہ گئی میں۔ آنکھیں کیوں نہ اندھی ہو گئیں میری۔ ہائے! ہمارے پرکھوں کی اونچی پگ رل گئی "ہائے۔۔۔ حویلی کے ماتھے پر کالک مل دی اس ڈائن نے۔ ارے اتنی بے غیرتی۔ ایسی ذلالت۔۔۔ دیکھ کرم داد! تیرے پیچھے کیا رنگ رلیاں مناتی ہے تیری زال۔" وہ سر پیٹتی اس تک پہنچیں۔

"ہائے، ہائے سائیں! کچھ تو خدا کا خوف کرو۔" اماں نصیبن کے ہاتھوں سے ٹھنڈے پانی کا پیالہ گر کر چکنا چور ہو گیا۔

"چپ کر بڑھیا! ملی ہوئی ہے اس کے ساتھ تو ہی ہے ہماری دشمن۔" وہ چیل کی طرح جھپٹیں اور انہیں دھکیل کر کچن میں بند کر دیا۔ وہ دروازہ پیٹنے لگیں۔ مراد بھی بھاگا آیا تھا۔ فرحین حواس باختہ سی باہر آئی اور پیچھے ہی وہ ڈاکٹر ادریس۔ جو منظر وہ بھائی کو دکھانا چاہ رہی تھیں وہ اس نے دیکھ لیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر جلتی پر تیل ڈال رہی تھیں۔ مراد نے گواہی دینا چاہی۔ انہوں نے اسے بھی مار مار کر بھگا دیا۔ کرم داد بپھرے شیر کی طرح ڈاکٹر پر جھپٹا مگر وہ باہوش نوجوان تھا۔ جلد ہی اسے پچھاڑ کر حویلی سے نکل گیا۔ آپا زیب النسا کو یقین تھا وہ سویر

ہوتے ہی گاؤں سے بھی نکل جائے گا اور پیچھے تمام عتاب سہنے کو فرحین بچی تھی جسے کرم داد نے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ وہ لاکھ چیخی چلائی مگر وہ حواسوں میں ہوتا تو سنتا۔ جب تک بیجی آ کر صورت حال سمجھتیں زیب انسا کے دل کی مراد پوری ہو چکی تھی۔

"میں نے تمہیں طلاق دی۔" ہرے بھرے چمن پر چنگاری آ گری۔ کرم داد نے تین مرتبہ یہ لفظ دہرایا۔

"نہیں، نہیں سائیں! اللہ کا واسطہ چپ کر جائیں۔ میری بات سنیں۔" نیم جان سی فرحین قدموں میں آ گری۔ مگر وہ فریاد پر کیسے کان دھرتا۔ شیطان مکمل رقص میں تھا۔

ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ سب جل کر خاکستر ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ اتنی سخت جان تھی کہ اس سب کے بعد بھی زندہ تھی۔

تین دن سے اماں بابا اس کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے۔ ان کی لاڈلی نازوں پلی جسے انہوں نے بڑے ارمانوں 'بڑے چاؤ کے ساتھ بیاہا تھا' وہ اجڑ کر آ گئی تھی۔ خالی دامن 'خالی ہاتھ 'کچھ بھی تو نہ بچا تھا' ظالموں نے سب چھین کر صرف انگارے بھر دیے تھے۔ اماں دامن پھیلا پھیلا کر کوسنے دے رہی تھیں۔ بابا کے ہونٹوں پر بھاری قفل لگ گئے تھے۔ اس غم نے تو انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔

"میرا بچہ" اماں! میرا بچہ کہاں ہے۔ اماں وہ بھوکا ہے۔ اماں وہ بیمار ہے کہاں ہے وہ؟ مجھے دو اسے مجھے دو۔ میں اپنا بچہ نہیں دوں گی تم لوگوں کو۔" وہ ادھر ادھر ہاتھ مارتی پہلو خالی ملتا تو پھر وہی دلدوز چیخیں ان بے رحموں نے اس سے ننھا سا داد بھی چھین لیا تھا۔

اور جب کرم داد کا نشہ اترا حواس ٹھکانے آئے تو علم ہوا کہ وہ مدہوشی میں کیا کر چکا تھا۔ اماں نصیبن اور مراد کی گواہیاں اور اپنا دل۔۔۔ وہ اتنے عرصے سے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ اسے خوب جان گیا تھا وہ کتنی شفاف اور پاکیزہ تھی۔ بے شک وہ اکثر اسے ماں کی آنکھوں سے دیکھتا اور ماں کے ہی کانوں سے سننے کا عادی تھا مگر وہ سب سمجھتا تھا مگر اپنی جھوٹی انا اور مردانگی کے زعم میں جھکنا مشکل تھا لیکن اب وہ اندر سے بالکل ٹوٹ گیا تھا۔

"وہ کیسے رہے گی اپنے بچے کے بنا۔ مجھ سے جو کچھ ہوا 'بھول میں ہوا۔ کوئی تو راہ ہو گی ناں کوئی تو کفارہ۔ پھر شاہ داد معصوم سا بچہ جسے پہلے ہی بخار نے نڈھال کر رکھا تھا۔ ڈائریا بھی ہو گیا۔ ننھی سی جان کے لالے پڑ گئے۔ جو سزا ان کے مقدروں میں درج تھی وہ تو انہیں جھیلنی تھی۔ اس معصوم سی جان کا کیا قصور۔ بیجی تو بالکل اس حق میں نہ تھیں بچہ ہے بچے بیمار بھی ہوتے ہیں پل جائے گا ماں کے بغیر مگر کرم داد کو وہ بچہ اپنی جان سے زیادہ پیارا تھا۔ وہ اسے تکلیف میں کیسے دیکھتا وہ خود اسے لے آیا۔

ہمیشہ صاف ستھرا رہنے والا کرم داد انتہائی ملگجے حلیے میں تھا۔ بکھرے بال' بڑھی شیو' سرخ انگارہ آنکھیں فرحین نے نظر بھی نہ ڈالی۔ بچے کو جھپٹ لیا۔

وہ اسے دیوانہ وار چوم رہی تھی۔

شاہ داد کو کرم داد نے اسے سونپ دیا تھا اپنی رضا سے۔ پھر وہ کبھی بیٹے سے ملنے کے لیے پلٹ کر نہ آیا۔ جرم اس نے کیا تھا تو سزا بھی اسے ہی کاٹنی چاہیے تھی اور اس نے کاٹی بھی یہاں تک کہ عمر کی نقدی تمام ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

آپا زیب انسا ہر مقام پر جیت گئی تھیں۔ اسے حویلی سے نکلوا کر بھائی کو اس کی جگہ لانے میں کامیاب ہو گئیں۔ ان کا گھر بچ گیا تھا۔ ان کے مہرے ختم ہو گئے تھے اب آگے تقدیر کے مہرے تھے جو ختم نہیں ہوتے اور پٹتے بھی نہیں۔

بھاگی نے کرم داد کو چار بیٹیوں کا تحفہ دیا۔ وہ حویلی کو وارث نہیں دے سکی تھی۔ کرم داد کا نام لیوا کون ہو گا یہ دکھ جیجی کو اندر ہی اندر کھائے جاتا اور تب انہیں شدت سے اپنی پہلی بہو اور پوتا یاد آتے۔ جن کا ذکر بھی انہوں نے اپنی زندگیوں میں ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ جبکہ کرم داد کی آنکھوں سے اس کی شبیہہ ہٹتی ہی نہ تھی۔ بظاہر وہ اپنی زندگی میں بہت مگن و مسرور نظر آتا تھا۔ وہ سارے زمانے سے چھپ سکتا تھا بیوی کو دھوکا دے لیتا لیکن ماں کی آنکھیں کیسے دھوکا کھاتیں' وہ جانتی تھیں فرحین سے جدائی اور بیٹے سے دوری کا دکھ اسے گھن کی طرح لگا ہوا ہے۔ جیجی نے کئی بار کہا "بیٹے کو واپس لے آؤ اور جواباً" کرم داد کے لبوں پر زخم خوردہ مسکان ٹھہر جاتی۔

سبھاگی اسے بیٹا نہ دے سکی تھی اور کرم داد نے کبھی اس سے اس کمی کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اس کی ذات کا طنطنہ' وہ غرور' وہ اکڑ سب کے سب فرحین کے ساتھ ہی رخصت ہو چکے تھے۔

سبھاگی بھی ایک عورت تھی۔ وہ بھی ادراک رکھتی تھی کہ اس کا مرد اس پہلی عورت کو بالکل نہیں بھولا اور وہ خود بھی اسے خوشی نہ دے سکی تھی۔ اسی لیے تو اس نے کرم داد کو دوسری شادی کی اجازت بخوشی دے دی۔ کرم داد تو کسی طور راضی نہ تھا مگر جیجی۔۔۔

سبھاگی پر سوگن آ گئی۔ احمد سراج اور اس کی ماں نے اک طوفان اٹھا دیا۔ زیب النسا کو بدلے میں میکے بھجوا دیا گیا۔

اگر بیٹے کی چاہ میں کرم داد شادی کر سکتا تھا تو احمد سراج کو بھی پورا حق تھا کہ وہ اولاد کے لیے دوسری شادی کر سکے۔ زیب النسا کی اپنی راجدھانی بچانے کی ساری کوششیں اکارت گئیں۔ اس کی حاکمانہ اور حاسدانہ فطرت اپنے گھر کو دو حصوں میں بٹا نہ دیکھ سکی اور سال بھر میں ہی بے پناہ ذہنی دباؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پاگل ہو گئی۔

کرم داد کی دوسری بیوی بھی اسے بیٹا نہ دے سکی۔ ایک بیٹی جھولی میں ڈال کر وہ خالق حقیقی سے جا ملی۔ سبھاگی اور جیجی کی تدبیر بھی ناکام رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ آنکھیں موندے آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ پاس ہی ٹیبل پر رکھا فون وقفے وقفے سے بج رہا تھا۔ زرمین سمجھیں وہ سو رہا ہے مگر ان کی آہٹ پر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ حیران ہو گئیں۔

"فون اٹھا کیوں نہیں رہے۔ کس بے چارے کا ضبط آزما رہے ہو۔" چائے کا کپ انہوں نے ٹیبل پر رکھ دیا۔ شاہ داد پاؤں سمیٹ کر سیدھا ہو بیٹھا۔

"مما نے کچھ کھایا؟" سوال کا جواب دیے بغیر شاہ داد پوچھ رہا تھا۔

"ہاں' کھانا کھا لیا ہے کچھ دیر تک دودھ اور دوا دے دوں گی۔ تم بے فکر رہو۔ اب میں ہوں ناں۔" انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ان چند دنوں میں۔ پے در پے ہونے والے دکھ بھرے انکشافات نے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

دفعتاً" پھر اس کا سیل بول اٹھا۔ کپ لبوں تک لے جاتے اس نے بھنویں اچکا کر روشن اسکرین پر نظر ڈالی پھر اعصاب ڈھیلے چھوڑتے ہوئے پیچھے ہو گیا۔ زرمین کے دل میں جانے کیا آئی انہوں نے کال ریسیو کر لی۔

"ادا سائیں۔۔۔ ادا سائیں! پلیز ایک بار آ جائیں۔ جیجی کی طبیعت بے حد خراب ہے' وہ آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔ میری مما چلی گئیں۔ میرے بابا بھی چلے گئے۔ اب جیجی کو کچھ ہوا تو میں بھی مر جاؤں گی ادا سائیں! آپ کو اللہ کا واسطہ پلیز ادا سائیں پلیز۔"

"او گاڈ!" زرمین جھرجھری لے کر رہ گئیں۔ بے ساختہ انہوں نے اسپیکر آن کر دیا۔

پرہ۔۔۔ روتی ہوئی اس کی منتیں کر رہی تھی۔ اس نے اپنا سیل آف کر دیا۔ چہرے پر پتھروں کی سی ویرانی تھی۔

"یہ سب کیا ہے شاہ داد! تم اور یہ رویہ آئی کانٹ بلیو اٹ' تمہاری ماں نے یہ تربیت تو نہیں کی۔ وہ بوڑھی عورت تمہاری دادی ہے۔" زرمین کو حقیقتاً" شاک لگا تھا۔ شاہ داد کے اس رویے پر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

"آئی ڈونٹ کیئر میرے لیے صرف میری ماں اہم ہے اور کوئی دوسرا رشتہ نہیں۔ میں کسی کو نہیں جانتا۔" وہ شدید اضطراب میں تھا۔ آنکھوں میں تنفر بھرا تھا۔

"تمہارے لیے اپنی ماں اہم ہے۔ ٹھیک ہے لیکن یہ تو سوچو' وہ تمہارے باپ کی ماں ہے۔ وہ زندگی اور موت کے دوراہے پر ہے' میں تمہارا دکھ بھی سمجھتی ہوں لیکن کیا ضروری ہے کہ تم اس وقت ان سے اپنا رشتہ یاد رکھو۔ اور وہ چھوٹی سی گڑیا پرہ۔۔۔ جس بے چاری نے ماں نہیں دیکھی۔ اب باپ بھی نہیں رہا اور اگر اس کی دادی بھی اف۔۔۔ شاہ داد! بے رحم مت بنو بیٹا!" نرمی سے سمجھاتے سمجھاتے زرمین کے لہجے میں لجاجت اتر آئی وہ بالکل ٹھس ہوا بیٹھا تھا۔

زرمین نے اسے بھینچ کر ہی دم لیا۔

☼ ☼ ☼

نظامانی ہاؤس کا گیٹ ویسا ہی سنہرا اور چمکتا دمکتا ہوا تھا۔ وہی جھومتے سرو کے درخت' وہی ہار سنگھار کے دور تک بکھرے خوش آمدید کہتے پھول' ویسی ہی لش پش سرخ روش' جس پر کھڑی پراڈو پر ڈالے گئے پیرا شوٹ کور پر جمی دھول بتاتی تھی کہ اس کے مالک نے کئی روز سے اسے استعمال نہیں کیا۔

یہی لان تھا جہاں اس نے گیٹ کے پار سے انہیں پہلی اور آخری بار دیکھا تھا۔ وہ پرہ کے بابا تھے۔ اس کے ساتھ کھیلتے' بے حد باوقار' بہت پیارے۔ اس کی خوشی میں خوش۔ اس پر محبت لٹاتے۔ اسے کیا پتا تھا وہ اس کے بھی بابا تھے۔ وہ تب ہی ان کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ اپنے اندر مچلتے اودھم مچاتے سوالوں کے جواب لے لیتا۔ ساری تشنگی مٹا لیتا۔ تمام حسرتوں کو قرار دے لیتا۔ وہ کیسا بدنصیب تھا۔ وہ کئی بار یہاں آیا مگر کبھی ان سے مل ہی نہ سکا۔ نہ ہی وہ اسے دیکھ سکے۔ وہ اسے دیکھتے تو ضرور پہچان لیتے۔ یہ گھر اس کے باپ کا تھا اور وہ مہمانوں کی طرح یہاں آتا رہا۔ وہ منصوبے ہی بناتا رہا سوچتا رہا اور اجل انہیں اپنے پروں میں چھپا کر لے گئی۔ وہ دیوانوں کی طرح اپنے ہاتھوں کو گھور رہا تھا۔ ان ہاتھوں سے اس نے ان کے تابوت پر مٹی ڈالی تھی۔ وہ بابا کی گود میں سر رکھ کر سارے دکھ سنانے کا آرزومند انہیں کہاں چھوڑ آیا تھا۔ وحشت سی وحشت۔ وہ اس جگہ سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ دور بہت دور مگر قدموں میں ہلنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ وہ پتھر بنا کھڑا تھا۔ پرہ کو اس کی آمد کی خبر ہوئی۔ وہ ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی اس تک پہنچی۔

"ادا سائیں' ادا سائیں!" کی تکرار کرتی وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹی۔ وہ ویسا ہی بت کا بت۔ وہ اسے کھینچتی ہوئی اندر لے گئی۔ جیجی اسے دیکھتے ہی پھر سے جی اٹھی تھیں۔ آنسو رکتے ہی نہ تھے۔ وہ اس کے اک اک نقش کو چوم رہی تھیں۔ بار بار بازوؤں میں بھینچ لیتیں۔ ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر دیکھے گئیں۔ اور اتنی نرم گرم سی پُرجوش محبت بھی اس کے اندر ہلچل نہ مچا سکی۔ اک گہری دھند احساسات پر جم چکی تھی۔

پرہ بازو سے چمٹی ہوئی تھی۔ بابا کی لاڈلی بیٹی' اس کا دکھ سب سے سوا تھا۔ اس کا ایک بڑا بھائی ہے۔ بابا اسے بتایا کرتے تھے اور یہ کہ وہ ایک دن ضرور آئے گا اور وہ کب آیا' جب بابا چلے گئے۔ وہ اس کے وجود میں بابا کو ڈھونڈ رہی تھی اور اس کے اندر گہری نیند اتری تھی۔ ہر جذبہ سو رہا تھا۔

عارب اس سے یوں ملا جیسے کسی اجنبی سے ملا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت کو ایک دم قبول کرنے میں شاید وہ متامل تھا اور امداد نظامانی جو اس کے سگے چچا تھے' اسے دیکھ کر ان کے چہرے پر بھی کوئی گرم جوشی کوئی خوشی کی رمق نہ جاگی' روکھے سے انداز میں اسے گلے لگا کر وہ پیچھے ہٹ گئے۔ جیجی بغور دیکھ رہی تھیں۔

"جب ایک شیر جنگل میں اکیلا ہو اور سمجھ رہا ہو کہ اب ہر طرف اس کا راج ہو گا اور تب اچانک کہیں

سے دوسرا توانا شیر جنگل میں نکل آئے تو پہلے شیر کو بے چینی تو ہو گی۔" ان کے جانے کے بعد وہ اس کا کاندھا سہلاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ وہ مہر بہ لب انہیں دیکھ رہا تھا۔

"مگر میں ابھی زندہ ہوں۔ کرم داد کی ماں' اس کے بچوں کی وارث۔ میں تمہاری حق تلفی نہیں ہونے دوں گی۔ تمہاری ماں بہت نیک عورت ہے۔ اللہ اسے اجر دے' بہت خوب تربیت کی ہے اس نے تمہاری۔ بس ہم ہی بد قسمت تھے۔ جو قدر نہ کر سکے۔

اللہ پاک ہمیں معاف کرے۔ بچے! تم بھی اپنا دل صاف کر لو۔ ہمیں معاف کر دو۔ اپنے بابا کی بھی ہر خطا بھلا دو۔ وہ تمہارے لیے ہزاروں حسرتیں لے کر گیا ہے اور اپنی بیٹیوں کے متعلق بھی اس کے بہت سے خواب تھے۔ اب تم ہی ان کے بڑے بھائی ہو اور بڑا بھائی باپ برابر ہوتا ہے۔ میں چاہوں گی تم ان کے سر پر ہاتھ رکھو۔ اس طرح ان نمانیوں کا دکھ بھی کم ہو گا اور تمہارے باپ کی روح بھی راضی ہو گی اس کے بوجھ کم ہوں گے' کرم داد کا سب کچھ اب تمہارا ہے اور اس پر

تمہارے جتنے قرض تھے میں اب سب اتاروں گی تم کوئی فکر نہ کرنا۔ میں ہوں تمہارے ساتھ۔"

شاہ داد کا ایک ہاتھ جیجی کے کپکپاتے ہاتھوں میں تھا اور دوسرا پرہ دبوچے بیٹھی تھی۔

موتل اور سوہا ٹرالی سجا کر لے آئیں اور ہر چیز اصرار سے پیش کرنے لگیں۔

ان کے انداز میں — پیار بھری اپنائیت تھی۔ ان کے رویے سے یوں محسوس ہو رہا تھا برسوں دیار غیر میں رہنے والا بھائی لوٹ آیا ہو۔ وہ اس کی خدمت میں بچھ بچھ جا رہی تھیں۔ جیجی نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ان سے روز ملنے آئے گا اور اس نے ہامی نہیں بھری تھی تو انہیں انکار بھی نہیں کر سکا تھا۔ وہ دوبارہ یہاں آئے گا بھی یا نہیں وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا یہ جگہ جہاں قدم قدم پر بابا کی پرچھائیاں تھیں وہ کن آنکھوں سے دیکھے گا' اس دکھ کے گہرے سیاہ

اندھیارے سے وہ کیسے نکلے گا کچھ پتا نہ تھا وہ واپسی کے لیے قدم بڑھا چکا تھا جب کوریڈور کے پہلے قدمچے پر بیٹھی عنایہ کا سوال راہ میں حائل ہوا۔

"جا رہے ہیں۔" وہ جا ہی رہا تھا۔ انتہائی بے تکے سوال کا کیا جواب ہوتا۔ وہ چپ ہی رہا۔

"پھر کب آئیں گے؟" ہاں اس سوال کا جواب ضرور تھا مگر وہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ کتنا قریبی تعلق تھا ان کا آپس میں اور وہ کتنے انجان رہے۔

"جیجی آپ کے آنے سے کتنی خوش ہوئی ہیں اور پرہ اسے تو جیسے پھر سے تایا سائیں مل گئے ہیں۔ وہ ان سے بہت قریب تھی اور ان کے بعد صرف وہ ہی کیا ہم سب ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں اور ایسے موقع پر آپ کا ملنا بالکل ایسا ہے کہ ہمارے زخم سل گئے ہیں بے شک ہمیں یہ دکھ بھی ہے کہ تایا سائیں آپ سے نہ مل سکے اور نہ آپ ان سے۔ اس بات کی آپ کو یقیناً" بے حد تکلیف ہو گی مگر۔۔۔"

"میں چلتا ہوں۔" وہ ابھی کچھ اور بھی کہتی کہ وہ بول اٹھا۔

"پھر کب آئیں گے۔" اس کا سوال ہنوز تھا۔ شاہ داد کی نظریں اس کے چہرے پر جا ٹکیں۔ سبز اور زرد رنگوں کے سوٹ میں ملبوس۔ اجلی رنگت اور دلکش نقوش والی یہ لڑکی جس کی آنکھوں میں آس کے دیے ٹمٹما رہے تھے وہ دل سے کتنے قریب تھی مگر اس پل دل انتہائی بے حس ہو رہا تھا۔ اس لیے ذرا سا بھی مروت اور لحاظ برتے بغیر وہ کندھے جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ پیچھے مڑ کر اس پیاری لڑکی کے چہرے پر پھیلا سناٹا بھی نہ دیکھا۔ آس کے دیوں پر اس کے قدموں سے اٹھتی دھول پڑتی جا رہی تھی۔ جانے والے کے انداز بتاتے تھے۔ مشکل ہے وہ پلٹ کر آئے۔

اور اس رات جب اس نے کھانا بھی نہ کھایا۔ نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ کھلی کتاب سامنے رکھے دیکھ کہیں اور رہی تھی اور جب جیجی نے پانی مانگا تو وہ یونہی ہونق سی ادھر ادھر نادیدہ شے تلاش کرنے لگی۔ تپائی پر رکھا جگ اور گلاس اسے دکھائی نہ پڑ رہے تھے' وہ تو ان کی بہت حاضر دماغ اور خوش اطوار پوتی تھی' یہ آج اسے کیا ہوا تھا اس کے بدلے انداز انہیں چونکا رہے تھے' انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیا۔

"عنایہ! کیا بات ہے بچے کیوں پریشان ہو' مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟" ان کے پوچھنے کی دیر تھی اس کے نین کٹورے تیزی سے بھرتے چلے گئے اور جب جیجی نے سینے سے لگایا تو وہ زار و قطار رو رہی تھی اور روتے روتے بے خودی میں وہ ان سے راز دل کہہ گئی تھی اور اب رگوں سے جان کھینچتا خدشہ جس نے اسے شام سے اس لمحے تک ادھ موا کر ڈالا تھا۔

"نہیں آئیں گے جیجی' وہ اب کبھی نہیں آئیں گے۔" روتے روتے ایک ہی تکرار جیجی نے راز داں سہیلی کی طرح اشک پونچھے۔ تسلی دی۔

"آئے گا ضرور آئے گا' اگر نہ آیا تو میرا تم سے وعدہ ہے اسے لے کر آؤں گی میں۔ تم دل چھوٹا مت کرو' جیسے ہم سب غم سے نڈھال ہیں ویسے وہ بھی بکھر گیا ہے۔ اسے تھوڑا وقت دو' خود کو سمیٹ لینے دو۔ اس دکھ پر صبر آئے گا تو وہ ہمارے پاس ہی آئے گا۔ وہ ہمارا ہے۔ ہم سے دور نہیں جائے گا۔ فرحین کا بیٹا ہے۔ کبھی بے وفائی نہیں کرے گا بس یہ بات یاد رکھنا۔" ان کے لبوں پر آسودہ مسکان بکھری تھی۔ آج عارب اور امداد نظامانی کے انداز دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی تھیں۔ وہ عارب جو ہر وقت شاہو' شاہو کرتا رہتا تھا اس سے کتنا کھنچا کھنچا سا تھا۔ واقعی سب مایا ہے اور آج کے مادی دور میں کیسے اس مایا کے پیچھے خونی رشتے بھی ایک دوسرے سے بد ظن ہو جاتے ہیں۔ عنایہ کے آنسو انہیں نئی راہ دکھا گئے تھے۔

دل ہلکا ہوا تو حواس بھی جاگے۔ وہ جھینپی جھینپی سی دوپٹے سے چہرہ پونچھ رہی تھی۔ جیجی سے شرم آنے لگی۔ وہ کتنی بے حیا بن کر سب کچھ کہہ گئی تھی وہ کیا سوچتی ہوں گی اک نئی فکر دامن گیر ہوئی۔

☼ ☼ ☼

"کہاں سے آ رہے ہو؟" وہ جھک کر جوگرز کے تسمے کھول رہا تھا۔ جب فرحین کمرے میں داخل ہوئیں اور ابھی وہ کوئی بہانہ گھڑنے ہی لگا تھا کہ ان کے پیچھے ہی اندر آتی زرمین بول اٹھیں۔

"نظامانی ہاؤس گیا ہو گا اور کہاں جانا ہے اس نے۔"

"کک' کیوں۔۔۔ و۔۔۔ وہاں کیوں گئے تھے۔"

فرحین کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"جیجی بہت بیمار ہیں ناں۔ ان ہی کی عیادت کو گیا ہو گا۔ میرے خیال میں تو بڑی نیکی کی بات ہے۔ پھر اس کا خون کا رشتہ بھی ہے ان سے۔" زرمین یوں بتا رہی تھیں گویا نظامانی ہاؤس کے مکینوں سے خوب مثالی تعلقات ہوں۔

"یہ گیا ہے وہاں' تمہیں علم تھا اور مجھے بتایا تک نہیں اور' اور تم کیا جانتے نہیں ہو کیا سلوک رہا ہے ان لوگوں کا میرے ساتھ۔ پروں میں سمیٹ کر پالا ہے تمہیں۔ کیا صرف اس دن کے لیے کہ تم پھر ان لوگوں سے جا ملو۔" وہ زرمین پر برس کر اس پر الٹ پڑیں۔

"ظالم' بے حس لوگ ہیں۔ چھین لیں گے تمہیں مجھ سے دور کر دیں گے۔" خوابیدہ خوف پھر سے جاگ اٹھے۔

"ارے جانے بھی دو' یہ کوئی دودھ پیتا بچہ ہے کہ چھین لیں گے۔ ماشاء اللہ سے عاقل و بالغ ہے۔ اپنا اچھا برا سب جانتا ہے پھر جس سے ڈر تھا وہ تو دنیا میں رہا نہیں۔ وہ بے چارا جیتے جی نہ لینے آیا تو اب کس بات کی فکر۔ ایک نہ ایک دن تو اپنوں سے ملنا ہی تھا اس نے تو یوں مل لیا بس۔ بھلا جڑ کے بغیر بھی کوئی پودا ہوا ہے کبھی۔" زرمین حد درجے لاپرواہ تھیں۔ جبکہ فرحین کا دم حلق میں آن اٹکا۔ انہوں نے انتہائی پریشان کن نظروں سے اسے دیکھا وہ بوکھلا کر نگاہ پھیر گیا۔

"افوہ آپا۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ اس کا اپنا خاندان ہے' وہ سب لوگ اس کے اپنے ہیں۔ تو پھر اس کے وہاں جانے میں کیا قباحت ہے۔"

"قباحت؟ کیسا خاندان کیسے اپنے ان لوگوں نے جو کچھ کیا پھر اس کے بعد کبھی مڑ کر اسے پوچھا اس کی خبر لی کیسے جی رہا ہے یہ۔" فرحین اپنی جگہ سچ پر تھیں۔

"کیسے لیتے خبر جب ہاتھ ہی بندھ گئے تھے۔ کس منہ سے آتے پوچھنے پھر جب کرم داد ہی اسے آپ کو سونپ گیا تھا تو وہ کیا کرتے۔ اب وہ خود بھی نہیں رہا مگر یہ تو نہیں ناں کہ اس کا باپ سے اور ان لوگوں سے رشتہ ختم ہو گیا۔ وہ تو تاقیامت برقرار رہے گا اور اس کے باپ کا اور کون سا بیٹا ہے یہی اکلوتا وارث ہے اس کا۔ اپنے خاندان سے ملنا اس کے اپنے حق میں بھی اچھا ہے۔ ساری زندگی ترس ترس کر گزاری۔ اب بھی جن حالوں سے تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ وہ بھی سب آپ کے سامنے ہے پھر ڈگری ملتے ہی یہ بھی نہیں کہ جھٹ سے کوئی ٹاپ کلاس جاب مل جائے گی

اسے کیا کرے گا یہ بے چارا ساری زندگی محنت۔ اپنے اور آپ کے خوابوں میں رنگ بھرتے بھرتے بال ختم ہو جائیں گے اس کے۔ کیا چاہتی ہیں آپ گھٹ گھٹ کر جیسے یہ۔" زرمین نے انہیں قائل کرنے کو بے دردی سے سفاک حقیقت کا پردہ بھی چاک کر ڈالا وہ اور بپھر گئیں۔

"تو کیا چاہتی ہو اس کے باپ کی دولت کے پیچھے اسے ان لوگوں میں دھکیل دوں۔ ہرگز نہیں۔ کیا ملا ہے مجھے اس دولت سے اور کیا مل گیا تمہیں۔ دولت خوشیوں کی ضامن نہیں ہوتی۔ سب کچھ جانتے بوجھتے اسے سبق پڑھا رہی ہو۔ اور تم۔" وہ اس کی طرف گھومیں۔

"تمہیں پتا ہے ناں تم کیا ہو میرے لیے۔ میری کل کائنات۔ میری قیمتی متاع۔ میری کل زندگی کا سرمایہ۔ میں یونہی تمہیں کسی کے حوالے کر دوں۔ ہاں تمہارا باپ زندہ ہوتا تو اور بات تھی۔ مگر اب نہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے تم نہیں ملو گے ان لوگوں سے۔ سنا تم نے۔"

"بے شک دولت خوشیوں کی ضامن نہیں ہوتی مگر زندگی میں اور بھی بہت سی باتیں وجہ خوشی بن سکتی ہیں۔ یہ نہ ہو انجانے میں خود اپنے ہاتھوں کسی خوشی کا گلا گھونٹ دو۔" لگتا تھا آج زرمین سارے پردے اٹھا کر رہیں گی شاہ داد نے ملتجیانہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ کھٹ کھٹ کرتی کمرے سے نکل گئیں۔ فرحین ناسمجھی سے اس کا چہرہ تک رہی تھیں۔

وہ "ایکسکیوز می" کہتا واش روم میں جا گھسا کہ فی الحال اس سے بہتر چھپنے کی اور کوئی جگہ نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کی پہلے بھی کسی سے خاص دوستی نہیں تھی اب تو بالکل ہی سب سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ عارب سے کلاس میں آتے جاتے ہیلو ہائے ہو جاتی۔ دونوں کے بیچ اک ان دیکھی دیوار حائل ہو گئی تھی تکلف کی گریز کی۔ وہ تو جان بوجھ کر اس سے بچتا پھرتا مگر عارب کیوں بدل گیا تھا اس بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ سب سے الگ تھلگ کتابوں میں سر دیے رہتا۔ کلاس کے بعد فارغ ٹائم ملتا تو لائبریری میں جا گھستا۔ اس وقت بھی وہ پورے انہماک سے آڈٹ کے اسرار و رموز سمجھنے میں گم تھا جب کوئی آہستگی سے برابر والی کرسی پر آبیٹھا۔ شاہ داد نے چونک کر نظر اٹھائی۔ اپنے مخصوص سیاہ گاؤن میں چھپی گرے اسکارف سلیقے سے ماتھے تک لیے وہ مومل تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں حزن و ملال کی آمیزش لیے۔ چہرے پر غم کی پرچھائیاں۔ وہ باپ کے سائے میں نہیں رہا تھا اس کا دکھ اپنی جگہ، مگر وہ باپ کی گود میں پلی تھی اس کا دکھ اس سے بھی سوا تھا۔ اس نے پھر کتاب پر نظر نکالی چند ثانیے دبیز خاموشی کی تہہ میں دبتے چلے گئے۔

وہ ایک دم سے اٹھ کر جانا بھی نہیں چاہ رہا تھا اور اس کے متوقع سوالوں سے خائف تھا۔

"آپ ہم سے خفا کیوں ہیں؟" آخر کار مومل نے لب کشا کیے تھے۔ وہ کیا کہتا کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس۔ وہ اس سے تو خفا نہ تھا جس سے خفا ہونے کا حق رکھتا تھا وہ تو منائے بغیر ہی ملک عدم سدھار گیا۔

اب کیسے گلے اور کہاں کے شکوے سب منوں مٹی تلے دفن ہو گئے تھے۔

"جیجی کی آنکھیں ہر وقت دہلیز پر لگی رہتی ہیں۔ آپ کا ذکر آپ کا انتظار بس یہی کام ہے انہیں، جھوٹی تسلیاں دے دے کر انہیں غذا اور دوا کھلانا پڑتی ہے پھر مزید بے شمار جھوٹ بول کر بہلانا پڑتا ہے کہ آپ مصروف ہیں اس لیے نہیں آسکے۔ آپ کا ٹیسٹ ہے۔ آج پریکٹیکل ہے، اگلے دن پھر نئے بہانے۔۔۔ بتائیں مجھے ان سے اور کتنے جھوٹ بولوں میرہ الگ رو رو کر ہلکان ہوتی ہے ہم کیا کریں کہ ہمارے دلوں میں آپ کے لیے محبت بہت بچپن میں ہی ڈال دی گئی تھی۔ ایک بڑا بھائی ہے۔ شہزادوں جیسا اور اک دن وہ ضرور آئے گا۔ ہر روز صبح اٹھتے میرا سوال آپ کے بارے میں ہوتا کہ آپ کب آئیں گے۔

اب سوچتی ہوں میرے ان سوالوں نے بابا کو کتنی اذیت ہوتی ہو گی۔ میں ہر روز ان کے زخم ادھیڑ ڈالتی تھی۔ آپ مانیں یا نہ مانیں وہ آپ سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور ان کی آپ سے محبت کے وہ سارے ثبوت انیکسی میں ان کے بیڈ روم کی ایک الماری میں موجود ہیں۔ اس الماری کو ان کی زندگی میں کسی کو کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ تو اب ان کے جانے کے بعد ہم پر بھید کھلا جب میں نے اس کا تالا توڑا۔ آپ کو پتا ہے اس الماری میں کیا تھا۔" وہ اسے دیکھتی پل بھر کو رکی۔ شاہ داد بے دھیانی سے سنتا بے اختیار اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اس الماری سے مجھے جگمگ کرتے شیشوں جڑی ایک ننھی سی ٹوپی ملی۔ ننھے منے کڑھائیوں والے کرتے اونی موزے دو چھوٹے تکیے چھوٹی چھوٹی رلیاں جھنجھنے، چند چابی والے کھلونے، اور کچھ تصویریں اور جانتے ہیں وہ چیزیں اور تصویریں کس کی تھیں۔۔۔ سب آپ کی تھیں جنہیں بابا نے اپنی جان سے بڑھ کر سنبھال رکھا تھا۔ وہ جب بھی گھر آتے اپنا زیادہ وقت انیکسی میں ہی گزارتے تھے۔ کیوں یہ راز تو اب کھلا انہوں نے آپ سے دوری اختیار کیے رکھی تو ضرور اس کے پیچھے کوئی سولڈ ریزن ہو گا۔ وہ آپ تک پہنچ سکتے تھے مگر انہوں نے کیوں خود پر اتنے پہرے بٹھائے رکھے، یہ میں نہیں جانتی لیکن اتنا مجھے علم ہے، وہ آپ کو بے اندازہ چاہتے تھے۔ اگر آپ کے دل میں ہمارے لیے ذرا سی بھی گنجائش ہو تو پلیز ایسے کٹھور نہ بنیں۔ ہمارے بڑوں کی غلطیوں کی سزا خود کو اور ہمیں نہ دیں۔ اور جانے والوں کی خطائیں تو یوں بھی یاد نہیں رکھتے۔ کیا آپ ان کی خطا کو معاف نہیں کر سکتے کیا آپ ہمیں معاف نہیں کر سکتے۔ آپ کو نہ سہی لیکن ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ ہم آپ میں اپنے بابا کو دیکھ لیا کریں گے۔ پلیز ہر روز نہیں تو کبھی کبھار اپنے قیمتی وقت میں سے چند لمحے ہی ہمیں خیرات کر دیا کریں اداسائیں۔"

وہ اس کی منت کر رہی تھی اس کا دل بھی رو رہا تھا۔ اس کے تو سوگ ہی کم نہ ہو رہے تھے وہ کس کس غم پر نوحہ کرتا بابا تو چلے گئے تھے، یہ اس کے بابا کی پیاری بیٹی تھی اس کی بہن جس سے اپنے رشتے کو وہ چند دن پہلے ہی جان پایا تھا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ مومل کے سر پہ ٹک گیا۔

"بڑا بھائی" وہ ایک دم سے کتنے خوب صورت احساس سے دوچار ہوا تھا۔ مومل روتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ شاہ داد نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

"تھینک یو اداسائیں، تھینک یو سو مچ۔ وہ خوش ہو گئی اور اس کے چہرے پر کھلتے رنگوں کو دیکھ کر۔ وہ ماں کی تاکید بھی بھول گیا۔"

مومل بڑی دیر اس سے ادھر ادھر کی کہتی رہی۔ وہ بھی پوری دلچسپی سے سنے گیا پھر یک لخت وہ جانے کے لیے اٹھی۔

"اب میں چلتی ہوں۔ اگر آنے کا وقت نہ ملے تو پلیز جیجی کو فون کال ہی کر لیجیے گا۔ خوش ہو جائیں گی، چاہے کوئی جھوٹا دلاسا ہی سہی۔ کم از کم مجھے تو انہیں

کھانے اور دوا کے لیے منانے کے جتن نہیں کرنا پڑیں گے۔ پہلے تو عنایہ ۔۔۔ میرا ساتھ دیتی تھی۔ اب مجھ اکیلی کو کھپنا پڑتا ہے' چار دن ہوئے وہ تو خود بستر نشین ہو کر رہ گئی ہے۔"

"عنایہ! کیوں کیا ہوا اسے۔" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا جب سے ماں کے تیور دیکھے تھے۔ وہ تب سے دل کو سمجھا رہا تھا مگر دل جیسا ڈھیٹ بھی دنیا میں دوسرا کوئی ہوا ہے۔

"جانے کس حکیم نے مشورہ دیا تھا صبح صبح ننگے پاؤں گھاس پر چلنے کا۔ بس کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔ اس دن سے بیر پکڑے بیٹھی ہے۔ پڑھائیاں' کھیل سب بند' جیجی کی فکر کیا کم تھی کہ اوپر سے وہ بھی میری لاڈ اچھی خاصی پریڈ ہو جاتی ہے بیچ میں۔" موہل پریشان تھی۔

"اوہ گاڈ! ڈاکٹر کو دکھایا؟" وہ حد درجے پریشان ہو اٹھا۔

"ہوں روز بینڈیج بھی کروا رہے ہیں دعا کریں جلدی سے ٹھیک ہو جائے' کم از کم وقت بے وقت اسے سہارا دینے سے تو میری جان بچے۔ اچھا ادا سائیں بھولیے گا مت او کے ٹیک کیئر۔" وہ جا چکی تھی اسے ایک نئی فکر میں غلطاں کر کے پھر اس کا دل کتابوں میں کیسے لگتا وہ جلد ہی گھر آ گیا سوچا تھا تھکے اعصاب کو کچھ ریسٹ ملے گا ایسی قسمت کہاں۔"

مامی نگہت اپنی کسی سہیلی کے ہاں جانے کو تیار بیٹھی تھیں۔ اسے آتے دیکھ کر رجب ماما ان کی "شوفری" کا ذمہ اس کے سر ڈال گئے' جسے نا چاہتے ہوئے بھی اسے انجام دینا پڑا۔

رات جب تھکے ماندے جسم و جاں کو گھسیٹتا وہ بیڈ پر آیا تو نظر سائڈ ٹیبل پر رکھے سیل فون پر پڑی۔ بے اختیار اٹھا کر آن کیا اور اسی بے اختیاری میں انگلیاں ایک نمبر پریس کر گئیں۔ دوسری طرف سے آتی آواز پر وہ ہوش میں آیا۔

"جیجی تو سو گئی ہیں۔ آپ نے بہت لیٹ کال کی۔"

یہ رکی رکی سہمی آواز موہل کی تو ہرگز نہیں تھی جبکہ نمبر اسی کا تھا۔ شاہ داد نے سیل آنکھوں کے سامنے کیا پھر کان سے لگایا۔

"موہل!" جانے کیوں تصدیق چاہی حالانکہ پہچان تو آ گیا تھا۔

"وہ نماز پڑھ رہی ہے۔ میں عنایہ۔" ادھر سے گمان پر یقین کی مہر لگی تو تنتے ہوئے اعصاب یکدم پرسکون سے ہو گئے۔ گہری سانس بھرتے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی۔

"کیسی ہیں۔" مختصر سوال مگر تفکرات سے پُر۔

"ٹھیک ہوں۔" ادھر بھی اختصار مگر سرشاریت سے مزین جواب۔

"پاؤں کا درد کیسا ہے۔" تصور کی آنکھ سے اسے چلتے دیکھا تو از حد تکلیف محسوس کی۔

"پہلے سے قدرے بہتر۔۔۔ آ۔۔۔ آپ کو کس نے بتایا۔" وہ یک لخت چونکی۔

"موہل نے بتایا تھا' آئندہ ایسی بد احتیاطی مت کرنا پلیز۔" وہ التجا کر رہا تھا اور عنایہ کا دل میٹھی سی تال پر ہلکورے لینے لگا۔ شاہ داد پھر یوں چپ ہوا جیسے کرنے کو کوئی بات ہی نہ رہ گئی ہو اور بعض باتیں ہوتی ہی ایسی ہیں جو نہ بھی کہو وہ پھر بھی دل میں اترتی ہیں اور اثر کرتی ہیں۔

"آپ آئے کیوں نہیں' جیجی روز انتظار کرتی ہیں۔" ہمتیں مجتمع کرتی وہ پوچھ رہی تھی' شاہ داد کا جی چاہا پوچھے اور تم؟ مگر کہا تو اتنا۔

"وقت نہیں ملتا۔ کوشش کروں گا۔"

پھر شاہ داد نے الوداعیہ کلمات کہہ کر فون بند کر دیا۔ وہ تادیر بے خیالی میں سیل ہونٹوں پر رکھے گزشتہ لمحوں کے فسوں میں گم رہی۔ اس کا ایک ایک لفظ ذہن کی ٹیپ میں بار بار گونجتا رہا اور ہر بار خوشی اور سرشاری کا ایک نیا سکہ دامن میں آ گرتا۔

"وہ فرحین کا بیٹا ہے۔ بے وفائی نہیں کرے گا۔" جیجی نے کہا تھا۔ اسے یقین ہونے لگا وہ یونہی بدگمان ہوتی رہی۔

"کس کی کال تھی۔" موہل چہرے کے گرد بندھا دوپٹا کھولتی پاس آ بیٹھی۔ عنایہ کو اپنی آنکھوں سے جگر جگر پھوٹتے ان رنگوں کو چھپانے کا موقع بھی نہ ملا۔ جو کچے چور کی طرح سارے بھید کھولنے پر تیار تھے۔ بنا لب کھولے فون اس کی جانب بڑھا دیا اور چادر سر تک تان لی۔ مبادا وہ کوئی سوال ہی نہ کر دے۔ موہل نے حیرانی سے اس کا انداز دیکھا پھر موبائل کی اسکرین کو۔

ادا سائیں کی کال۔" اور عنایہ کی جھینپی جھینپی سی مسکان۔ "راز کیا ہے۔" بغور چادر کو تکتی موہل نے قیاس کے گھوڑے دوڑائے اور پھر جو انکشاف ہوا تو بے اختیار اس نے چادر جھپٹ لی۔ عنایہ سنبھل بھی نہ سکی۔ دونوں رات گئے تک راز و نیاز کرتی رہیں۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے اسے نظامانی ہاؤس جانے سے منع کیا تھا اور وہ نہیں گیا تھا۔ ہر رشتے ہر جذبے سے افضل و مقدم اس کے لیے اپنی ماں تھی۔ چاہے اس کوشش میں اسے اپنے ہی دل پر پتھر رکھنا پڑے تھے اس نے پروا نہیں کی۔ مگر تب کیا کرتا کہ جب جیجی خود ہی چلی آئیں ۔۔۔ فرحین اب ایسی بھی بدلحاظ و بے مروت نہ تھیں کہ گھر آئے مہمان کو نکال باہر کرتیں۔ پھر مہمان بھی کون جن سے ان کا کوئی رشتہ نہ سہی مگر بیٹے کا تو خون کا رشتہ تھا انہوں نے اسے ملنے سے نہیں روکا۔ یہی ان کی اعلا ظرفی تھی۔ جیجی تو دل سے ممنون و قدر دان تھیں گو کہ انہوں نے جیجی سے زیادہ بات نہ کی فرحین نے زیب النسا کو دیکھا۔

وہ حسن' وہ کروفر' وہ نخوت' یہ وہ زیب النسا تو نہ تھیں۔ ہڈیاں ہی ہڈیاں جن پر سلوٹ زدہ کھال کا مہین پردہ' ان کے پُرہیبت چہرے پر وحشت زدہ کرتی دو آنکھیں۔ فرحین حق دق سی ان کا اجاڑ وجود دیکھ رہی تھیں۔ فرحین کو دیکھتے ہی جیجی کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔

"دیکھو فرحین۔ دیکھو! ہماری حالت یہ سب اس کرنی کا پھل ہے۔ جس نے تمہیں اجاڑ دیا مگر پھر خود بھی نہ بس سکی۔ سب تدبیریں الٹ گئیں۔ اپنے ہی گلے کا پھندا بن گئیں۔ دیکھ لو قدرت کا فیصلہ۔ کیا اب بھی ہمیں معاف نہ کرو گی۔"

وہ اپنی جگہ ساکت و صامت تھیں۔ ایسی دل دہلا دینے والی حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ان میں ہلنے کی سکت نہ تھی۔ کبھی دکھ کے بیکراں بوجھ تلے دب کر کرلاتی ہوئی روح نے چاہا ضرور ہو گا مگر ایسا انتقام ۔۔۔ یہ تو گمان کے ہزارویں حصے میں بھی نہ تھا۔ واقعی کسی انسان کی کیا مجال کہ درست میزان رکھ سکے وہ خود تو اس قابل تھیں ہی نہیں کہ اپنے ساتھ کی گئی برائی کا بدلہ لے سکتیں مگر وہ جو مالک کون و مکان ہے۔ وہ تو سب جانتا ہے نا' ظالم اور ظلم سے بے خبر نہیں اور وہی سب سے بہتر منتقم ہے۔

"تم چاہو تو نظامانی ہاؤس جا سکتے ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ وہ تمہارے اپنے ہیں پھر تم سے

چاہت بھی رکھتے ہیں۔ سچ کہتی ہے زرمین بھلا جڑ کے بغیر بھی کوئی پودا ہوا ہے۔ بھی اور میں اتنی ظالم بھی نہیں کہ اپنے ہاتھوں اپنی خوشی کا گلا گھونٹ دوں۔ تمہاری خوشی میں ہی تو میری خوشی ہے۔" فرحین نے ان کے جانے کے بعد شاہ داد سے کہا تھا۔ وہ حیران سا دیکھ رہا تھا۔

"اچھی لڑکی ہے عنایہ۔۔۔ زرمین بتا رہی تھی مجھے۔ سچ کہوں اس دن میں نے غور سے دیکھا ہی نہ تھا۔ تم پہلے بتا دیتے میں ذرا دھیان سے دیکھ لیتی۔"

"تو اب دیکھ لیں۔" حیرت پر خوشی نے غلبہ پایا تو وہ فٹ بولا پھر ماں کی کھلی آنکھوں پر نظر گئی تو اپنی تیزی کھٹکی۔

"وہ۔۔۔ وہ میرا مطلب ہے کہ۔" مارے بوکھلاہٹ کے بات بھی نہ بنائی گئی۔ فرحین ہنسنے لگیں اور جانے کتنے عرصے بعد ماں کے ہونٹوں پر کھلی ہنسی نے شاہ داد کی روح تک کو شادمان کر دیا۔ ان کی گود میں سر رکھ کر وہ بھی ہنس رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

نظامانی ہاؤس کا گیٹ ویسا ہی چمکتا دمکتا تھا۔ وہی جھومتے سرو کے درخت' وہی ہار سنگھار کی بیل جو گلابی سفید پھولوں سے اٹی پڑی تھی۔ مگر یہ کیا آج تو آنے والوں کا استقبال کرنے کے لیے صرف یہ پھول ہی نہیں بلکہ سرخ روش پر سرخ ہی خوشبودار پتیاں دور تک بکھری تھیں۔ بڑا دلکش نظارہ تھا! معطر فضا سرسبز لان میں خوب گہما گہمی اور رونق تھی۔

نیبر وزی گھیر دار فراک میں سنہرے بالوں کو خوب صورت سی پونی ٹیل بنائے خوش باش چہرے والی پرہ ادھر سے ادھر اڑتی پھر رہی تھی۔ آج کا دن اس کے لیے تو عید جیسا تھا۔ قیمتی سوٹ میں ملبوس جیجی کے چہرے پر بھی آج سکون آمیز کیفیت ثبت تھی۔ ان کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں تیزی سے تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں اور ہر دانے کے ساتھ دل اپنے بچوں کی دائمی خوشیوں کے لیے ہزار بار دعائیں کر رہا تھا۔ ان کے بچے ان کی دولت۔۔۔ جنہیں آج وہ ایک ہی لڑی میں موتیوں کی طرح پرونے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔

عارب اور موحل کی زندگی کا فیصلہ تو وہ ان کے بچپن میں ہی کر چکی تھیں۔

اب شاہ داد اور عنایہ کا نصیب ایک ہو جائے۔ ان کے لب دن رات اپنے رب کے حضور گڑگڑاتے رہے تھے اور بے شک وہ سننے والا ہے۔ وہ اپنے پروردگار کی بے حد شکر گزار تھیں جس نے ان کی چاہت کو حقیقی روپ دیا تھا۔ کرم داد کے بعد یہ ان کے گھر کی پہلی خوشی تھی۔ بے حد قیمتی خوشی۔ ایک ہی جیسے میرون کلر کے برائیڈل ڈریس میں دونوں دلہنیں انتہائی حسین لگ رہی تھیں۔ بھاری زیورات خوشنما میک اپ اور اندرونی احساسات نے انہیں اسیر بنا ڈالا تھا۔ تو بلیک ٹو پیس میں دولہا بھی شہزادوں سے کسی طور کم نہ دکھ رہے تھے۔ جیجی کی نظریں بار بار اپنے بچوں کی بلائیں لے رہی تھیں۔

عارب کی انگلیاں تیزی سے موبائل کے بٹن پش کر رہی تھیں ایسی دلربا ساعتوں میں بھی اس کی سوئی کہیں اور اٹکی تھی۔ ساتھ ہی بیٹھی موحل کے خوب صورت چہرے پر شرم و حیا کے بجائے جھلاہٹ چھا رہی تھی۔ بس نہ چلتا تھا کوئی چیز اٹھا کر اسے دے مارتی۔

"نہیں سدھرو گے۔ شرافت سے خود ہی بک دو۔ کیا علاج کیا جائے تمہارا۔" شاہ داد کو بھی تاؤ آگیا پاس ہی تو بیٹھا تھا۔ دبے لہجے میں غرایا۔

"ایں! میں نے کیا کیا ہے؟" عارب نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ پہلے دائیں دیکھا پھر بائیں۔ چار آنکھوں سے اس کے لیے شرارے نکل رہے تھے۔ وجہ اس کے ہاتھ میں تھی۔

"اوہو! خود ہی دیکھ لو یار! عدیل سے بات کر رہا ہوں وہ گدھا ابھی تک نہیں پہنچا۔ اسے گالیاں سینڈ کی ہیں ایمان سے۔" اس نے بوکھلا کر اپنی صفائی پیش کی ساتھ ہی ثبوت کو شاہ داد کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے مگر تمہارے حق میں بہتر ہو گا کہ آج کے دن اپنی ساری خرمستیاں کسی ڈسٹ بن میں ڈال دو' تمہاری بونگیوں کی وجہ سے موحل کی آنکھ میں کبھی ایک آنسو بھی آیا تو پھر اپنا انجام سوچ لینا۔"

شاہ داد کے لہجے کی غراہٹ پہلے سے بھی بڑھ کر تھی۔ عارب نے ڈرنے کی بھرپور ایکٹنگ کی۔ موحل کے لیے بھائی کی طرف سے ملنے والا اتنا سامان ہی بہت تھا۔ دل ہی دل میں اس کی درگت پر مسرور ہوتی وہ خود بھی اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔ عارب نے انتہائی مسکینیت کا مظاہرہ کرتے سیل اس کی گود میں ڈال دیا جسے اک لمحے کی تاخیر کیے بغیر وہ جھپٹ کر اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال گئی۔ وہ بے اختیار گہری سانس لیتا بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

شاہ داد نے اپنی بے ساختہ امڈ آنے والی مسکراہٹ کو اس سے چھپانے کے لیے دوسری جانب رخ پھیر لیا۔

شرمائی لجائی سی عنایہ کا دلفریب روپ ہوش اڑا رہا تھا۔ وہ پہلے ہی گھبراہٹ کا شکار تھی۔ اس پر شاہ داد کی مخمور نگاہیں۔ وہ مزید خود میں سمٹنے لگی۔ اس کی نظروں کی لو بڑھتی ہی جا رہی تھی اور وہ صورت شمع گھلتی ہوئی۔

"پلیز! ایسے مت دیکھیں مجھے۔" بری طرح پزل ہوتی آخر کار وہ کہہ ہی گئی مگر اگلے ہی لمحے سخت پچھتائی۔

"کیوں میری نظر لگ جائے گی۔" شاہ داد نے خاصا برا مانا۔ ماتھے پر بل پڑ گئے۔ عنایہ کی تو جان پر بن گئی۔ اپنے سابقہ الفاظ کا اثر زائل کرنے کو بڑی متانت اور جذب سے بولی۔

"جو پیار کرتے ہیں۔ ان کی نظر نہیں لگتی۔"

"یعنی میں آپ سے پیار کرتا ہوں؟" وہ حد درجے حیران ہوا اور اس کی حیرت زدہ صورت دیکھ کر وہ اس سے کہیں بڑھ کر حواس باختہ۔ بمشکل حلق سے آواز نکلی۔

"کیا مطلب؟"

"قریب آؤ پھر مطلب سمجھاتا ہوں۔" اس کی پوری کھلی آنکھوں میں دھڑلے سے جھانکتا وہ کہہ رہا تھا۔ باوجود کوشش کے ہونٹوں کے کناروں سے چھلکتی مسکراہٹ چھپائے نہ چھپی۔ عنایہ اسی حواس باختگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ وہی شاہ داد تھا جو ہمیشہ سنجیدگی کا تنبو تانے رکھتا تھا۔ اب یہ انداز اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"اب کیا مجھے نظر لگانے کا ارادہ ہے؟" وہ سہم رہا تھا

"میری نظر نہیں لگے گی۔"

"کیوں آپ مجھ سے پیار کرتی ہیں؟" وہ انتہائی معصومیت سے استفسار کر رہا تھا۔

"اف!" عنایہ نے بوکھلا کر سر جھکا لیا۔

شاہ داد خوش دلی سے ہنس رہا تھا اور اس کے چمکتے چہرے پر بارش کی طرح اتری خوشیاں فرحین کو بھی سرشار کر رہی تھیں۔ نہایت مطمئن ہو کر انہوں نے گلے میں بانہیں ڈالے کھڑی پرہ کو سینے سے لگا لیا۔

"آپ ادا سائیں کی مما ہیں تو میں آپ کی بیٹی ہوئی ناں۔"

اس نے خود ہی ان سے رشتہ جوڑ لیا تھا اور انہیں اس پیارے رشتے پر کیا اعتراض ہوتا۔ وفا کے سارے وعدے نبھانے پر وہ تو انہیں اک انعام کی صورت لگی تھی۔ باقی کی زندگی بہت سہل اور خوب صورت ہو گی۔ اس کی پیشانی چومتے ہوئے انہیں پختہ یقین تھا۔

نبیلہ عزیز

ماورا مرتضیٰ' عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔ فارہ کی والدہ منزہ رحیم اپنی بہن ثمینہ یزدانی سے ملنے کراچی جاتی ہیں۔ آفاق انہیں ایئر پورٹ لینے نہیں جاتا۔ مجبوراً "ساشا" کو جانا پڑتا ہے۔ وہ آفاق کی بدتہذیبی پر خفا ہو کر واپس چلی جاتی ہیں۔

منزہ' ثمینہ اور نیرہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شان دار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیرہ کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اُسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ لیتی ہے۔ عزت بھی ولید کے بارے میں سوچنے لگتی ہے اور ڈھکے چھپے لفظوں میں ولید سے اپنی کیفیت کا اظہار بھی کردیتی ہے مگر ولید انجان بن جاتا ہے۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کردیتا ہے۔ فارہ بہت روتی ہے۔ ثمینہ اور اشتیاق یزدانی کو علم ہوتا ہے تو انہیں سخت صدمہ ہوتا ہے۔ ثمینہ کی طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔

اشتیاق یزدانی' آفاق سے حد درجہ خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کردیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ عزت' تیمور کے موبائل سے ولید کا نمبر لے کر اسے فون کرتی ہے مگر ولید اس

کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ رضا حیدر' تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو بصد اصرار مدعو کرتی ہے۔ ماورا' عافیہ بیگم کی ناراضی کے باوجود چلی جاتی ہے۔ وہاں تیمور اور ماورا کی ملاقات ہوجاتی ہے۔ عزت اپنے دل کی کیفیات ساشا سے بیان کردیتی ہے۔ ماورا بی گل کو بتاتی ہے کہ وہ رضا حیدر کے بیٹے تیمور حیدر سے ملی ہے۔ بی گل دم بخود رہ جاتی ہیں۔

شادی میں تیمور حیدر' ماورا کے قریب آنے کی کافی کوشش کرتا ہے مگر ماورا کا سخت اور کھردرا رویہ ہر بار اسے ناکام کردیتا۔ تیمور' ماورا سے رضا حیدر کو ملواتا ہے۔ رضا حیدر اسے دیکھ کر چونک جاتے ہیں مگر باوجود کوشش کے وہ سمجھ نہیں پاتے۔ فارہ کی ہی شادی میں عزت کی ملاقات تیام مرزا کے بیٹے مونس مرزا سے ہوتی ہے۔ وہ سخت بیزار ہوتی ہے جبکہ مونس خوب دلچسپی لیتا ہے۔

آفاق آدھی رات کو غائب ہوجاتا ہے۔ فارہ پریشان ہوتی ہے۔ وہ صبح آکر بتاتا ہے کہ اس کے دوست کے ساتھ کوئی ایمرجنسی ہوگئی تھی۔ اس لیے اس کے آرام کا خیال کرتے ہوئے وہ بغیر بتائے چلا گیا تھا۔ مگر فارہ اس کی بات پہ یقین نہیں کرتی۔ تیمور' فارہ کے ذریعے ماورا کو اپنے آفس میں ایک شاندار پیکج پر جاب کی پیشکش کرتا ہے جسے ماورا کافی حیل حجت کرنے کے بعد قبول کرلیتی ہے۔

—۱۴—

چودہویں قسط

"کس لڑکی کو....؟"

وہ ان کے اس قدر اچانک حملے اور اتنے غصے کی وجہ سے فوری طور پر سمجھ ہی نہ سکا کہ وہ کس کی بات کررہے ہیں۔

"اس لڑکی کو...." انہوں نے یکدم پلٹ کر گلاس وال سے پار نظر آتے اس کیبن کی طرف اشارہ کیا تھا' جہاں ماورا مرتضیٰ ٹیبل پہ جھکی اپنے کام میں مصروف نظر آرہی تھی۔

تیمور ان کا اشارہ ماورا کی سمت دیکھ کر بُری طرح چونک گیا۔

"آپ ماورا کی بات کررہے ہیں....؟" تیمور کو اک عجیب سا دھچکا محسوس ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمارے اس آفس میں کوئی اور ایسی لڑکی نہیں ہے جسے فیصل آباد سے یہاں لایا گیا ہو؟" انہوں نے طنزیہ جواب دیا۔

"لیکن بابا! اسے یہاں اس سیٹ پہ اس کے ٹیلنٹ کی بیس پہ بلایا گیا ہے۔ وہ یہاں کام کررہی ہے' جھک نہیں ماررہی۔"

تیمور نے بے ساختہ اس کا دفاع کیا تھا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اپنے شہر سے ٹیلنٹ ختم ہوچکا ہے....؟" رضا حیدر کا جواب طنز اور تمسخر لیے ہوئے تھا اور تیمور کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔

"اگر ہم نے دوسرے شہر سے کسی لڑکی کو اپائنٹ کرلیا ہے تو اس میں کیا قباحت ہے؟" وہ ابھی بھی حیرت اور الجھن کا شکار تھا۔

"قباحت دوسرے شہر سے کسی لڑکی کو اپائنٹ کرنے میں نہیں ہے۔ بلکہ قباحت...."

رضا حیدر اچانک ماورا کا نام لیتے لیتے رک گئے تھے۔ یوں کھلے عام اس لڑکی کے خلاف بولنا انہیں خود ہی اپنی

غلطی کا احساس دلا گیا تھا۔ وہ فوراً ہی چپ ہوگئے تھے۔

"کیا ہوا... کیا کہنا چاہ رہے ہیں آپ....؟

قباحت کہاں ہے؟" تیمور ان کا بولتے بولتے یوں اچانک رک جانا نوٹ کرچکا تھا' مگر ان کی مخالفت کا مقصد نہیں سمجھ سکا تھا۔

اور رضا حیدر اس کے سوال پہ ٹھٹک کر رہ گئے۔

"بابا.... !کہیے نا' کیا قباحت ہے اس میں؟" تیمور انہیں بولنے پہ اُکسا رہا تھا۔

"نہیں کچھ نہیں.... بعد میں بات کریں گے.... فی الحال ہم گھر جارہے ہیں...." رضا حیدر نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہیں سے پلٹے اور تیزی سے دروازہ عبور کرگئے اور تیمور اپنی جگہ پہ کھڑا جوں کا توں ان کو دور تک دیکھتا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بس ایک ہی سوچ کلبلا رہی تھی۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ بابا کو ماورا سے کوئی اختلاف ہے۔ یا پھر وہ انہیں پسند نہیں آئی... مگر کیوں؟ کیا کمی ہے اس میں.... شی از پرفیکٹ گرل۔" وہ خود ہی اپنے آپ کو تسلیاں دے رہا تھا اور خود ہی سوال جواب کررہا تھا۔

"مے آئی کم ان سر!" ذرا سے توقف کے بعد دروازے پہ دستک ہوئی اور ساتھ ہی ماورا کی آواز ابھری۔ تیمور چونک کر متوجہ ہوا۔

"مے آئی کم ان سر....!" اس نے تیمور کی طرف سے کوئی جواب نہ پاکر دوبارہ استفسار کیا تھا۔

"یس کم ان....!" اس نے جواب دیا۔

ماورا نے اندر آتے ہی اس پہ ایک تنقیدی سی نگاہ ڈالی تھی اور وہ اسے اسی کیفیت میں نظر آیا تھا' جس کی اسے توقع تھی۔

"میری فائل تیار ہے۔" اس نے اسے اطلاع دی۔
"ہوں!ہاں... اوکے... میں تھوڑی دیر میں چیک کرلیتا ہوں۔"
تیمور ذہنی طور پر غیر حاضر تھا اور ماورا اس چیز کو اچھی طرح محسوس کرچکی تھی۔
"پلیز ذرا جلدی چیک کرلیجیے گا کیونکہ مجھے پھر نیکسٹ فائل پہ کام کرنا ہے۔"
"اوکے... کرلوں گا... لیکن فی الحال نہیں..." تیمور نے کہتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔
"اینی پرابلم سر...!" ماورا نے جان بوجھ کر اس کی غائب دماغی میں دلچسپی لی تھی ورنہ اسے اندازہ تو تھا کہ دونوں باپ بیٹے میں کوئی بات ضرور ہوئی ہے کیونکہ رضا حیدر اسے دیکھتے ہی بھڑک سے گئے تھے۔
اور پھر اس بھڑک کا نشانہ یقیناً انہوں نے تیمور حیدر کو ہی بنایا ہو گا۔
"نو... نو... اٹس آل رائٹ..." تیمور نے فوراً نفی میں گردن ہلائی۔ ماورا نے لاپروائی سے کندھے اُچکادیے۔
"اوکے! مے آئی گوناؤ؟" اس نے اجازت طلب کی۔
"ہوں۔ یس...!" وہ آہستگی سے کہہ کر اپنی سیٹ پہ جا بیٹھا۔
کوئی اور وقت ہوتا تو اس کی یہی کوشش ہوتی کہ ماورا کچھ دیر اور ٹھہر جاتی... مگر اس وقت اس نے یہ کوشش بھی نہیں کی تھی۔

☼ ☼ ☼

مونس مرزا کی گاڑی سڑکوں پہ بہت سبک رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔
یوں جیسے وہ لوگ گھر سے لانگ ڈرائیو کے لیے نکلے ہوں اور واپسی کی فی الحال کوئی جلدی نہ ہو۔ کیونکہ گاڑی کے اندر کے ماحول میں بھی بہت خاموشی اور بہت سکون تھا۔ لیکن عزت حیدر یہ خاموشی اور یہ سکون زیادہ دیر برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ اسی لیے اس خاموشی کا حصار اس نے خود ہی توڑ ڈالا۔
"کوئی خاص بات...؟" اس نے گردن موڑ کر مونس مرزا کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"شاید ہاں..." اس نے اثبات میں جواب دیا۔
"تو بات کریں۔ انتظار کس چیز کا ہے...؟" اس نے کندھے اُچکائے۔
"میں آپ کے گھر پروپوزل بھیجنا چاہتا ہوں۔" مونس مرزا بات کو زیادہ دیر ڈھکا چھپا نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ یہ اس کی عادت نہیں تھی۔
"میں آپ کو اس بات کا جواب پہلے ہی دے چکی ہوں۔" عزت نے بھی کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی تھی۔
"وہ ایک سرسری سی بات تھی اور اس وقت ہم راستے میں کھڑے تھے' نہ میں ٹھیک سے بات کرسکا اور نہ آپ..." آج وہ پہلے سے کچھ سنجیدہ نظر آرہا تھا مگر عزت کو کیا فرق پڑتا تھا بھلا...!
"یہ بھی ایک سرسری سی بات ہے' کیونکہ اس وقت بھی ہم راستے میں ہی ہیں۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ آپ بے شک ٹھیک سے بات نہ کرسکیں' لیکن میں ضرور ٹھیک سے بات کرسکتی ہوں۔" وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ اسے مونس مرزا کے ساتھ تنہا سفر کرتے ہوئے بھی کوئی ڈر خوف نہیں محسوس ہو رہا تھا۔
"عزت...! میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں اور نہ ہی یہ بات مذاق ہے کہ آپ اتنی غیر سنجیدگی سے لے رہی ہیں۔" مونس مرزا کی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ وہ کتنا سنجیدہ ہے۔

"میں آپ کے ساتھ آگئی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کی باتوں میں بھی آجاؤں گی۔" اس کی لاپروائی کا وہی عالم تھا اور مونس مرزا نے زچ ہو کر گاڑی اک طرف روک دی تھی۔
"دیکھیے مس عزت حیدر...! آپ ٹھنڈے دل سے میری پیشکش پر غور کریں۔ آپ میں کچھ ایسی بات ہے کہ میں نے آپ کا انتخاب کیا ہے' ورنہ میں شادی کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی آج کل شادی کے جھنجھٹ میں پڑنے کی سوچتا کون ہے۔"
مونس مرزا نے ڈیش بورڈ سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر بہت مزے سے ایک سگریٹ سلگالیا تھا جبکہ عزت اس کی بات سن کر اندر سے کھول اٹھی تھی۔
"او تو یہ اصلیت ہے آپ کی...؟" اس کا لہجہ طنزیہ ہوچکا تھا مونس مرزا اس کی بات پہ مسکرادیا۔
"کہتے ہیں کہ سب سے اپنی اصلیت چھپالو' مگر اس سے اپنا آپ مت چھپاؤ جس سے تم محبت کرتے ہو۔" اس نے سگریٹ کا کش لے کر کہتے ہوئے دھواں گاڑی کی فضا میں ہی چھوڑ دیا تھا' البتہ اب کی بار عزت اس کی بات پہ مسکرادی تھی۔
"ہونہہ محبت... جانتے ہیں محبت کسے کہتے ہیں؟" عزت نے بڑی دلچسپی سے اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔
"فی الحال میری نظر میں تو عزت کو ہی محبت کہتے ہیں۔" اس نے عزت سے بھی زیادہ دلچسپ انداز میں کہتے ہوئے براہ راست عزت کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔
"جو بات فی الحال ہوتی ہے' وہ عارضی ہوتی ہے' یعنی وقتی ہوتی ہے... اور وقتی چیزیں کبھی پائیدار نہیں ہوتیں۔ اس لیے آپ کا یہ فی الحال میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا..." عزت کی لاپروائی اور انداز میں رتی برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔
"مائی ڈیر...! آپ نے غور نہیں کیا... میں اس فی الحال کو ہی تو پائیدار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں... اپنے اور آپ کے بیچ رشتہ استوار کرنا چاہ رہا ہوں... ایک پائیدار رشتہ... اور میری اس چاہ پہ تو آپ کو فخر کرنا چاہیے کہ میں نے یہ رشتہ آپ سے استوار کرنا چاہا ہے' ورنہ ہزاروں ایسی لڑکیاں پڑی ہیں جو میری صرف اک نظر کی منتظر ہیں... اور یہاں معاملہ یہ ہے کہ میں آپ کی اک نظر کا منتظر ہوں۔"
مونس مرزا کا لہجہ اور انداز بدل گیا تھا۔ وہ بڑے دلبرانہ انداز میں آچکا تھا۔
"اور میں کسی اور کی نظر کی منتظر ہوں۔" عزت کا لہجہ بھی دوٹوک لہجے میں بدل گیا تھا۔
"ہاہاہا... جو دنیا کی نظروں سے ڈرتا ہے۔" مونس مرزا نے مذاق اڑایا تھا اور عزت اس کے مذاق پہ بری طرح چونک گئی تھی۔
"کیا مطلب... کس کی بات کر رہے ہیں آپ...؟" اس نے فوراً استفسار کیا۔
"یہ آپ کو بہتر پتا ہو گا کہ دنیا کی نظروں سے کون ڈرتا ہے؟" اب وہ لاپروائی دکھا رہا تھا۔
"آپ سیدھی طرح بات کریں... پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہیں؟" وہ جھنجلائی۔
"سیدھی طرح ہی تو بات کر رہا ہوں' مگر آپ سمجھ ہی نہیں رہیں... آپ کو اب بھی ولید رحمان کے ہی پروپوزل کا انتظار ہے' حالانکہ وہ یہ پروپوزل کبھی بھی نہیں بھیجے گا۔" مونس مرزا نے بالآخر اس کی یہ الجھن بھی دور کردی تھی۔
عزت اس کی اس قدر جاسوسی پہ دانت کچکچا کے رہ گئی تھی۔ اسے اس کی بات ذرا اچھی نہیں لگی تھی۔
"وہ پروپوزل بھیجے گا یا نہیں... یہ میرا اور اس کا مسئلہ ہے۔ آپ کو اس کے لیے پریشان نہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" عزت نے اس کو اپنی حد میں رہنے کا اشارہ دیا تھا۔

"یہ آپ کا اور اس کا مسئلہ نہیں ہے… یہ میرا اور آپ کا بھی مسئلہ ہے اس قصے میں، میں بھی انوالو ہوں۔ اس لیے میری پریشانی ایک لازمی امر ہے۔"

مونس مرزا بھی ڈھیٹ ابن ڈھیٹ تھا۔ اس کی سوئی بھی بس آج کل عزت کے نام پہ ہی اٹکی ہوئی تھی۔ شاید اس لیے کہ عزت کی ذات میں اسے اپنے لیے انکار کی جھلک نظر آئی تھی اور انکار کو اقرار میں بدل دینے کی ضد تو مرد کی فطرت میں ازل سے ہی چلی آ رہی تھی۔ مونس مرزا کی یہ ضد کوئی نئی یا انوکھی ضد تو نہیں تھی۔

"لیکن میں آپ میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔" اس نے سختی سے کہا۔

"جس میں آپ انٹرسٹڈ ہیں، وہ آپ میں انٹرسٹڈ نہیں۔" وہ ہنسا۔

"میں نے کہا ناں یہ میرا اور اس کا مسئلہ ہے۔" عزت نے پھر زور دے کر کہا۔

"تو آپ اپنے اس مسئلے میں مجھے کیوں بھول رہی ہیں… میں صبر اور تحمل سے کام لے رہا ہوں، ورنہ میں آپ سے زیادہ جنونی اور جذباتی ہوں۔" مونس مرزا نے یکدم تیور بدل کر بات کی تھی۔

"آپ دھمکی دے رہے ہیں مجھے…؟" عزت نے اس کی سمت دیکھا۔ وہ بڑے سکون میں تھا۔

"یہی سمجھ لیں… اور یاد رکھیں! دھمکی وہی لوگ دیتے ہیں، جو کچھ کر جانے کی طاقت رکھتے ہیں…"

وہ اسے ایک بار پھر باتوں باتوں میں بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

"ہوں… تھینک یو… مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ مجھے یہاں کیوں لائے تھے؟" عزت نے کہتے ہوئے دروازے کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھ کے دروازہ کھولنا چاہا۔

"ابھی تو آپ کو صرف اندازہ ہوا ہے… اگر سچ مچ کچھ ہو گیا تو…؟"

مونس مرزا کی اگلی بات پہ عزت دروازہ کھولتے کھولتے رک گئی تھی۔

"تو حاصل آپ کو بھی کچھ نہیں ہو گا۔" عزت کا لہجہ سرد تھا۔

"جنون میں نفع و نقصان کا احساس پس پشت چلا جاتا ہے۔" وہ اپنی طرف کا شیشہ نیچے کر کے سگریٹ کا ٹکڑا باہر اچھال چکا تھا۔

"ہوں… اچھی بات ہے۔" عزت کہہ کر دروازہ کھول کے نیچے اتر آئی۔

"رکیے مس عزت حیدر… لنچ تو آپ نے کیا ہی نہیں۔" مونس مرزا بھی گاڑی سے اتر آیا۔

"لنچ ولید رحمان کے ساتھ نہیں کر سکی تو آپ کے ساتھ بھی نہیں کروں گی… میں آپ کے ساتھ لنچ کرنے کی نیت سے نہیں آئی تھی۔"

عزت نے استہزائیہ سے لہجے میں کہا اور ٹیکسی کو اشارہ کیا۔

"مگر میں اپنا پروپوزل ضرور بھیجوں گا۔" اس نے پیچھے سے آواز دی مگر عزت سنی ان سنی کرتے ہوئے، ٹیکسی میں بیٹھی اور ہوا ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

شام ڈھل رہی تھی اور فضا میں اک جمود سا طاری تھا۔

قیام مرزا ماحول کی بیزاریت سے خائف ہو کر رضا حیدر کو لے کر گالف کلب چلے آئے تھے لیکن وہاں آ کر انہیں پتا چلا کہ ویسی ہی بیزاری رضا حیدر کے مزاج پہ بھی طاری ہے۔ ان کا موڈ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ جس پہ انہیں خاصی تشویش ہوئی تھی کیونکہ رضا حیدر مسلسل چپ تھے… اور انداز حد درجہ پُر سوچ ہو رہا تھا…

"مجھے لگتا ہے رضا! کہ میں نے تمہیں ساتھ لا کر غلطی کی ہے۔"

قیام مرزا نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں… اظہار خیال کیا تھا اور صد افسوس کہ رضا حیدر ان کا یہ اظہار خیال بھی نہیں سن سکے تھے، بلکہ ان کے سر کے اوپر سے گزر گیا تھا، جس پہ قیام مرزا نے ایک بار پھر گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

"رضا حیدر…!" اب کی بار انہوں نے ان کے کندھے کو ہاتھ سے تھپکا تھا۔

"ہوں… !کہو۔" وہ چونک کر متوجہ ہوئے۔

"میں کہہ رہا ہوں کہ میں نے تمہیں بلا کر غلطی کی ہے۔" انہوں نے اپنی بات دہرائی۔

"ہاں… کہہ سکتے ہو…" رضا حیدر نے ان کی بات کی تردید کرنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔

"کوئی ٹینشن ہے کیا؟" قیام مرزا نے ایک دوست ہونے کے ناتے ان کی اس کیفیت اور… پریشانی کی وجہ جاننا چاہی تھی۔

"ٹینشن… بس اچانک ہی بن گئی ہے اور بنانے والا میرا بیٹا ہے۔" رضا حیدر بہت ہی ضبط سے کام لے رہے تھے۔

"کیوں کیا ہو گیا ہے… بیٹے نے ایسا کیا کر دیا ہے…؟" قیام مرزا بڑے سکون میں تھے۔

"ایک مڈل کلاس لڑکی سے دل لگانے کا شوشا چھوڑ رکھا ہے اس نے…؟" رضا حیدر کی تلملاہٹ عود کر آئی تھی۔

"ارے… !تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے… اس عمر میں ایسے شوشے تو ہر کوئی چھوڑتا ہے، کبھی تم نے بھی چھوڑا ہو گا۔" قیام مرزا نے مذاق اڑایا۔

"صرف شوشا چھوڑتا تو مجھے کوئی پریشانی نہ ہوتی، مگر یہاں یہ مسئلہ ہے کہ وہ اس لڑکی سے شادی کرنے پہ تل گیا ہے… اور اسے اپنے آفس میں سیٹ بھی دے دی ہے۔ وہ اس کے پاس، اس کی نظروں کے سامنے جاب کر رہی ہے۔ جبکہ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا… تیمور میری عمر بھر کی جمع پونجی ہے اور میں اپنی عمر بھر کی جمع پونجی کسی ایری غیری لڑکی کے دامن میں نہیں ڈال سکتا… میں اس کی دلہن اس کے شایان شان لانا چاہتا ہوں۔"

رضا حیدر کہتے کہتے حد درجہ جذباتی ہو گئے تھے اور قیام مرزا نے ان کے جذبات سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہوں… !کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو، مگر اسے اس کی چاہت سے کیسے ہٹاؤ گے؟ وہ اگر اسے اتنا پسند کرتا ہے تو پھر آسانی سے اسے چھوڑے گا بھی نہیں۔" قیام مرزا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ معاملہ کچھ گمبھیر ہے۔

"یہی چیز تو مجھے سوچنے پہ مجبور کر رہی ہے کہ میں نے اب اس کا حل کیا نکالنا ہے…؟" رضا حیدر چلتے چلتے رک گئے تھے اور ایک گہری اور طویل سانس خارج کی تھی۔

"اس کا آسان حل یہ ہے کہ اس کے سامنے ایک اور لڑکی کا آپشن رکھ دو… اس کی شادی کا بکھیڑا ڈال دو…"

"لیکن اس کام کے لیے کوئی لڑکی بھی تو ہو ناں…؟" رضا حیدر کو پہلا خیال یہی آیا تھا…

"رضا حیدر! مجھے لگتا ہے کہ پریشانی اور ٹینشن نے تمہارے دماغ کا خانہ خالی کر دیا ہے… تیمور حیدر کو لڑکیوں کی کمی ہے کیا… میں نے یہاں آ کر دیکھا ہے تمہارے بیٹے کا نام کئی محفلوں میں بڑی حسرت سے لیا جاتا ہے۔"

قیام مرزا نے جو بات نوٹ کی تھی، وہ کہہ دی تھی۔

"مجھے پتا ہے… اور بہت اچھی طرح پتا ہے کہ ہائی سوسائٹی میں میرے بیٹے کی کیا ویلیو ہے… لیکن سوچ یہ رہا ہوں کہ لڑکی کون ہو… کیسی ہو… اور کس کی بیٹی ہو… کیونکہ یہاں تو ایک سے بڑھ کر ایک چہرہ ہے… اور ایک سے بڑھ کر ایک فیملی ہے… اس کام کے لیے بھی ذرا سوچ بچار سے کام لینا ہو گا۔" رضا حیدر اپنی اگلی سوچ کا

اظہار کررہے تھے۔

"ہاں۔۔! یہ تو ہے۔۔ مگر میرا خیال ہے کہ تمہارے حلقہ احباب میں تمام ہی فیملیز بہت اچھی ہیں۔۔ کسی بھی ایک فیملی کا انتخاب کرلو۔۔" ان کا مشورہ بڑا لاپرواسا تھا۔

"قیام۔۔۔! تم میری سوچ کو سمجھ نہیں سکو گے۔۔۔ میں دراصل یہ چاہتا ہوں کہ لڑکی اس کے ٹکر کی ہو۔۔ جیسی وہ چاہتا ہے' تاکہ اسے وہ پہلی والی یاد نہ رہے۔ وہ اس کا خیال بھی دل سے نکال دے۔۔"

رضا حیدر ماورا مرتضیٰ سے مل بھی چکے تھے۔ اسے دیکھ بھی چکے تھے اور اس سے بات بھی کرچکے تھے' اس لیے انہیں اندازہ تھا کہ وہ کیسی لڑکی ہے۔ اس لیے اس کی شخصیت کا اثر زائل کرنے کے لیے انہیں اس سے بھی بہترین لڑکی چاہیے تھی۔

"تو پھر۔۔۔ میرا کہا مانو گھر جاؤ۔۔ اور اپنے بیڈروم میں سکون سے بیٹھ کر اس کے لیے کوئی ایسی لڑکی سوچو جو پہلی والی سے بہتر ہو۔۔۔ اگر پھر بھی سوچ میں نہ آئے تو کل صبح مجھے کال کرو۔۔ پھر مل کر یہ مسئلہ حل کریں گے۔" قیام مرزا نے ان کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے مشورے سے نوازا۔

جس پر رضا حیدر محض سرہلا کررہ گئے تھے۔

"اور ہاں۔۔۔ تیمور حیدر کی زندگی سے اس پہلی والی کو ایک دم سے نکال دینے کی کوشش مت کرنا' ورنہ تمہارا اپنا بیٹا ہی تم سے بدظن اور متنفر ہوجائے گا اور تم اپنی جمع پونجی اپنے ہاتھوں لٹا بیٹھو گے۔" جاتے جاتے انہوں نے ایک اور بات سمجھا ڈالی تھی۔

"ہوں۔۔۔! جانتا ہوں۔۔۔ اسی لیے تو آفس سے چپ چاپ واپس چلا آیا۔۔۔ ورنہ اس لڑکی کو وہاں سے نکال کر ہی دم لیتا۔۔" رضا حیدر دانت پیس کر بولے تھے۔

"ہوں! ایسے معاملوں میں اسی طرح سیاست اور ذہانت سے کام لینا چاہیے۔" قیام مرزا نے انہیں سراہا تھا اور دونوں نے ایک ساتھ واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔

☼ ☼ ☼

ولید بڑے شکستہ انداز میں گھر پہنچا تھا اور کسی سے بھی بات کیے بغیر چھت پر آکر لیٹ گیا تھا۔ زبیدہ بیگم' وحید اور ککو کو خاصی تشویش ہوئی تھی کہ اسے آخر کیا ہوا ہے کہ وہ آج خلاف معمول ان سب سے بات کیے بغیر ہی چھت پہ چلا گیا ہے' یہاں تک کہ کپڑے بھی چینج نہیں کیے۔

"امی۔۔۔! سب خیر تو ہے نا؟" ککو برآمدے سے اٹھ کر ماں کے پاس صحن میں آبیٹھی تھی۔

"خیر ہوتی تو کیا اس طرح ہوتا۔۔۔؟" زبیدہ بیگم بھی دل ہی دل میں پریشان ہورہی تھیں۔

"تو آپ پوچھیں ناں۔۔؟" ککو ان سب سے چھوٹی تھی لیکن بھائی کو اس کیفیت میں دیکھ کر ان سب سے زیادہ فکرمند ہورہی تھی۔

"نہیں۔۔۔ فوری پوچھنا اور کریدنا ٹھیک نہیں ہوتا' فی الحال اسے تھوڑا ریلیکس ہونے دو۔" انہوں نے بیٹی کو سمجھایا۔

"امی۔۔! ریلیکس ہونے کے لیے آدھا گھنٹہ کافی ہوتا ہے۔۔۔ اور انہیں چھت پہ گئے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہوچکا ہے۔" وہ الٹا انہیں سمجھا رہی تھی۔

"ہوں۔۔۔ یہ تو ہے۔۔۔ خیر' تم ایسا کرو چھت پہ جاؤ اور اس سے پوچھو کہ کھانا کھائے گا یا چائے چاہیے۔۔۔؟ اور یہ بھی کہو کہ شاور لے کر فریش ہوجائے۔۔۔ پھر بجلی چلی گئی تو تازہ پانی بھی نہیں ملے گا۔" وہ اسے ولید کے پاس جانے

اور بات کرنے کے بہانے سمجھا رہی تھیں۔
"لیکن امی۔۔۔! یہ سب کرنے سے اور کہنے سے کیا ہوگا۔۔۔؟" ککو نے سوال اٹھایا۔
"اف ککو۔۔۔ مجھے مزید تنگ مت کرو۔۔۔ یہ سب کہنے اور کرنے سے یہ ہوگا کہ اس کے موڈ کا پتہ چل جائے گا۔۔۔ کم از کم یہ اندازہ تو ہوگا ناں کہ وہ غصے میں ہے۔ اداس ہے یا ویسے ہی پریشان ہے؟"
زبیدہ بیگم نے ککو کے سوال سے عاجز آکر جیسے سر پیٹ لیا تھا اور ککو ان کے موڈ سے گھبرا کے بے ساختہ کھڑی ہوگئی تھی۔
"اگر بھائی نے مجھے ڈانٹا ناں تو اچھا نہیں ہوگا۔۔۔ میں جا رہی ہوں اوپر۔"
وہ خفگی سے ماں کو دھمکی دیتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی حالانکہ جانتی بھی تھی کہ ولید نے اسے آج تک نہیں ڈانٹا تھا۔
ولید سامنے چارپائی پہ چاروں شانے چت لیٹا آنکھوں پہ بازو رکھے نجانے سو رہا تھا یا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہرحال ککو پھر بھی اس کے قریب چلی آئی تھی۔
"بھائی۔۔۔!" اس نے قریب آکر آہستگی سے پکارا۔
لیکن اپنی شکستگی کے شکنجے میں جکڑا ولید اس کی یہ آواز نہیں سن سکا تھا۔
"بھائی۔۔۔!" اب کی بار اس نے ولید کا پاؤں ہلایا تھا اور ولید نے یکدم چونکتے ہوئے چہرے سے بازو ہٹا دیا۔
"کیا بات ہے۔۔۔؟" ولید کا لہجہ بہت دھیما اور بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔
"بات تو کچھ نہیں ہے۔ بس آپ سے پوچھنے آئی تھی کہ کھانا کھائیں گے یا چائے لیں گے؟" اس نے بڑی معصومیت سے بڑا سیدھا سا سوال کیا تھا۔
"کچھ نہیں لوں گا۔۔۔ کسی چیز کو دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
"تو جس چیز کو دل چاہ رہا ہے' وہ بتا دیں۔۔۔" ککو نے بنا سوچے سمجھے ہی اتنا بڑا سوال کر دیا تھا۔
"میرا خود کو گولی مار دینے کو دل چاہ رہا ہے۔۔۔ تو ایسی کیفیت میں کیا کروں۔۔۔؟" ولید انتہائی تلخی سے بولا۔۔۔ اور ککو نے یکدم تڑپ کر اپنے منہ پہ ہاتھ رکھ لیے تھے۔
"ہائے اللہ نہ کرے۔۔۔! آپ ایسا کیوں بول رہے ہیں۔۔۔؟ اللہ آپ کو ہماری بھی زندگی دے دے۔۔۔ آپ کے سوا ہمارا کون ہے بھلا؟" کہتے ہوئے ککو کا لہجہ روہانسا سا ہو گیا تھا اور ولید اس کی بھرائی ہوئی آواز اور بھری ہوئی آنکھیں دیکھ کر پگھل گیا تھا اور اسے بھی فوراً ہی اپنے الفاظ کی سختی کا احساس ہو گیا تھا۔
"سوری۔ میری گڑیا۔۔۔!"
وہ بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر اسے ہاتھ کے اشارے سے قریب آنے کو کہا تھا۔۔۔
"ادھر آؤ۔۔۔ میرے پاس بیٹھو۔" اس نے ککو کو چارپائی پہ اپنے قریب بیٹھنے کو کہا۔
"میں نہیں آؤں گی۔۔۔ آپ نے اتنی دل دکھانے والی بات کیوں کہی ہے۔۔۔ آپ کو پتا ہے ناں اگر امی نے سن لیا تو سن کر ہی مر جائیں گی۔" ککو کے آنسو بہہ نکلے تھے۔
"اف ککو۔۔۔! کیا کہہ رہا ہوں میں۔۔۔؟ ادھر آؤ۔۔۔ میرے پاس بیٹھو۔" ولید نے جان بوجھ کر مصنوعی خفگی کا اظہار کیا اور ککو اس کی خفگی سے خائف ہوتی اس کے قریب آکر بیٹھ گئی تھی۔
"پہلی بات تو یہ کہ تم سے کتنی بار کہا ہے کہ پاؤں پکڑ کر مت جگایا کرو۔۔۔ اس طرح اچھا نہیں لگتا۔۔۔ بازو یا کندھا ہلا دیا کرو۔۔۔" ولید کو ککو کی اس عادت پہ ہمیشہ یہی خفگی ہوتی تھی' وہ جب بھی کبھی جگانے کے لیے آتی تھی اس کا پاؤں ہلا کر ہی جگاتی تھی اور ولید اس کی اس حرکت پہ ہمیشہ ہی اسے ٹوکے بغیر نہیں رہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا

تھا کہ اس کی چھوٹی بہن اس کے پیروں کو ہاتھ لگائے۔
"سوری۔۔۔! عادت ہو گئی ہے۔" اس نے معصومیت سے منہ پھلا کر معذرت کی۔
"عادت کنٹرول کرنے کے لیے ہی تو کہتا ہوں۔۔۔" اس نے ککو کے سر پہ ہاتھ رکھ کے اس کے سر کو جان بوجھ کر جھنجھوڑنے والے انداز میں ہلایا تھا۔
"تو آپ بھی تو اپنی عادت کو کنٹرول کریں ناں۔۔۔؟ کیوں اس طرح چہرے پہ بازو رکھ کے پریشان سے انداز میں لیٹ جاتے ہیں۔۔۔؟ آپ کو دیکھ کر ہم تینوں کو طرح طرح کی فکریں ستانے لگتی ہیں۔" اس نے برملا شکوہ داغا۔
"کوئی وجہ ہوتی ہے تب ہی ایسا کرتا ہوں ناں۔۔۔؟ بے وجہ پریشان ہونے' اور بے وجہ چہرے پہ بازو رکھ کے لیٹنے کو تو کسی کا بھی دل نہیں چاہتا ناں۔۔۔؟ خیر ان باتوں کو چھوڑو۔۔۔ اچھی سی چائے پلاؤ' سر میں درد ہو رہا ہے۔"
"آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے تو آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔۔۔؟ میں پہلے ہی چائے لے آتی۔" ککو کہہ کر فوراً" اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"تم کون سا پہلے پوچھنے کے لیے آئی ہو۔" ولید بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔۔۔ وہ تو امی نے مجھے بہانے سے بھیجا ہے۔" وہ کہتے کہتے آخر سچ بھی کہہ ہی گئی تھی اور ولید ایک زبردستی کی مسکراہٹ مسکراتا ہوا اس کے ساتھ ہی نیچے اتر آیا تھا۔۔۔ کیونکہ وہ اپنی وجہ سے اپنی ماں۔۔۔ اور اپنے بہن بھائیوں کو پریشان ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔۔۔ آخر اس قصے میں ان کا کیا قصور تھا بھلا؟
جو بھی ہوا تھا بس دل کی غلطی تھی۔
اپنی اوقات سے بڑھ کے پاؤں پھیلا بیٹھا تھا۔
بڑے لوگ تھے۔۔۔ بڑی باتیں تھیں اور بڑا غصہ تھا۔
ذرا سی بے رخی پہ کایا ہی پلٹ کے رکھ دیتے تھے۔ ایسے لوگوں سے دل لگانا تو اوکھلی میں سر دینے کے برابر تھا۔۔۔ لیکن افسوس کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اب وہ اس اوکھلی میں سر دے چکا تھا۔

✡ ✡ ✡

"ہاں' اب بتاؤ' کیا ارادہ ہے تمہارا؟ آج تو سنڈے ہی ہے ناں۔۔۔؟" ماورا ابھی سو کر اٹھی بھی نہیں تھی کہ فارہ نے صبح صبح ہی فون کھڑکا دیا تھا۔
"اف فارا۔۔۔ تم ہوش میں تو ہو ناں۔۔۔؟ ابھی تو میں بستر سے بھی نہیں اٹھی۔" ماورا نے منہ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے جمائی کو روکا تھا۔
"ہاں"۔۔۔! میں ہوش میں ہوں۔۔۔ کیونکہ میں بستر سے کافی دیر ہوئی اٹھ چکی ہوں۔۔۔ اس لیے بہتر ہے کہ اب تم بھی ہوش و حواس میں آجاؤ اور بستر سے اٹھ جاؤ۔۔۔" فارہ تنک کر چمک کر بولی تھی۔
"اوہو۔۔۔ آج تو بڑی سینہ زوری کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔۔۔ کیا بات ہے؟ کوئی اچھا خواب دیکھا ہے یا کسی خواب کی تعبیر اچھی دیکھی ہے؟" ماورا اپنی کہنیوں پہ زور ڈالتے ہوئے اٹھ بیٹھی تھی اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا لی تھی۔
"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں رات بھر سوئی ہی نہ ہوں۔۔۔؟"
"اچھا چھوڑو یہ بتاؤ کہ کیا پروگرام ہے تمہارا۔۔۔؟" ماورا نے ٹاپک ہی بدل دیا تھا۔
"میرا پروگرام تو یہی ہے کہ تم اپنی چھوٹی سی فیملی کے ساتھ آج کے دن کا لنچ اور ڈنر میرے گھر پہ ہی کرو۔ لیکن اس پروگرام کے حوالے سے تمہاری کیا رائے ہے' میں اس کے لیے منتظر ہوں؟"
فارہ اس کی پوری فیملی کو انوائٹ کر رہی تھی جو کہ محض تین افراد پہ مشتمل تھی اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ

افراد کے حصے کی اسے معذرت ہی موصول ہوگی۔ لیکن پھر بھی ایک موہوم سی امید کے تحت کہہ ہی دیا تھا۔

"اس پروگرام کے حوالے سے میری کیا رائے ہوگی کہ تم سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جانتا۔۔۔ اس لیے تمہیں مجھ سے پوچھنے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں آؤں تو پھر صرف مجھے ہی انوائٹ کرو۔ بلی گل اور ای والا پروگرام کسی اچھے وقت کی امید پہ رہنے دو۔" ماورا نے کہا تھا اور فارہ پہلے سے ہی جانتی تھی اس لیے چپ ہو گئی تھی۔

"اوکے۔۔۔! تو پھر تم کب آ رہی ہو؟"

"تقریباً" بارہ بجے تک۔۔۔!" ماورا نے وال کلاک دیکھا جہاں آٹھ بج رہے تھے۔

"بارہ بجے نہیں۔ دس بجے۔" فارہ نے دس بجے کا ٹائم دیا۔

"دس بجے کیوں؟! اتنی جلدی کیا ہے آخر؟" اسے تعجب ہوا تھا۔

"میں تمہیں محض کھانا کھانے کے لیے نہیں 'بلا رہی۔ بلکہ کچھ دیر اپنے پاس بیٹھنے اور باتیں کرنے کے لیے بلا رہی ہوں۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ تم گھر سے ذرا جلدی نکلو۔"

فارہ لفظ چبا کر بولی تھی اور ماورا اس کے اس اصرار پہ سر جھٹک کر رہ گئی تھی۔

"اف! شادی کے بعد بھی اس لڑکی کی بے وقوفی اور بچپنے میں کوئی چینج نہیں آیا۔" ماورا نے تاسف سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور چادر ہٹا کر بستر سے اتر آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ بلی گل اور عافیہ بیگم کے صبر اور برداشت کا امتحان لیتی ٹھیک دس بجے گھر سے نکل آئی تھی حالانکہ اسے اندازہ تھا کہ دس بجے تو مارکیٹیں بمشکل کھلتی ہیں۔ لیکن پھر بھی اسے چانس لے لینا ہی بہتر لگا تھا۔

تب ہی اپنے سیل فون پہ ہونے والی وائبریشن کی طرف دیکھا۔ جہاں ابھی ابھی فارہ کا میسج موصول ہوا تھا۔

"کہاں ہو۔۔۔؟" میسج بھی مختصر ہی تھا۔

"راستے میں۔۔۔!" اس نے بھی میسج ٹائپ کیا۔

"گڈ۔۔۔ وری گڈ۔۔۔ جیتی رہو۔" اگلا میسج موصول ہوا۔

"تھینکس۔۔۔!" ماورا لکھتے ہوئے مسکرائی۔

اور پھر مارکیٹ پہنچنے تک یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ یونہی کھیلتی رہی تھی۔

وہ دل میں یہی سوچ رہی تھی کہ شاپنگ مال میں پہلا کسٹمر وہی ہوگی۔ لیکن نہیں۔ وہاں تو خاصی گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ اس جیسے سر پھرے اور بھی تھے۔ جن کو دیکھ کر وہ قدرے پُرسکون ہو گئی تھی۔ بڑے اطمینان سے فارہ اور آفاق کے لیے گفٹس دیکھنے لگی۔ ابھی وہ اسٹینڈ پہ ہینگ کی ہوئی شرٹس میں سے ایک گرے کلر کی مردانہ قمیص نکال کر دیکھ رہی تھی کہ اچانک اپنے عقب سے ابھرنے والی آواز سن کر چونک گئی تھی۔

"ہوں۔۔۔! نائس۔۔۔ کلر اور آپ کی چوائس آؤٹ کلاس ہیں۔" تیمور حیدر کے لہجے اور انداز سے ہی لگ رہا تھا۔ اسے وہ شرٹ کتنی پسند آئی ہے۔ اور ماورا اس کی اتنی پسندیدگی دیکھ کر اک نظر دوبارہ شرٹ کی طرف دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہیں؟ دیکھیں مت۔۔۔ بس خرید لیں۔" تیمور نے بڑے دل سے اسے مشورہ دیا تھا۔ لیکن ماورا کو

اس کے مشورے پہ عمل کرنے سے پہلے سوچنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔

"میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ جس کے لیے میں یہ شرٹ لے رہی ہوں اس پہ یہ کلر اور یہ ڈیزائن سوٹ کرے گا یا نہیں؟" اس نے وجہ بتائی۔

"ہوں۔۔۔! واقعی یہ سوچنے کی بات ہے۔ اینی وے آپ اس کی پرسنالٹی کو "سامنے" رکھ کے خریدیں گی تو آسانی رہے گی۔" تیمور نے معنی خیزی سے کہا۔

"سامنے رکھ کے۔۔۔؟" ماورا نے بھی اس کے جملے کے زور کو فوراً نوٹ کیا تھا۔

"سوری۔۔۔! مد نظر رکھ کے۔۔۔" تیمور فوراً بات بدل گیا تھا اور دل ہی دل میں مسکرایا تھا جبکہ ماورا اس کے چہرے پہ نظر ڈالتے ہوئے چونکی تھی۔

وہ اسے دیکھنے میں کچھ بدلا ہوا سا لگا تھا۔

"کیا "مد نظر" اس طرح رکھتے ہیں؟" تیمور اس کے نظر بھر کے دیکھنے پہ بولا اور ماورا سر جھٹک کر رخ ہی موڑ گئی تھی۔ اسے اپنے آپ پہ خفگی ہوئی تھی۔

"پلیز۔۔۔! یہ بھی پیک کر دیں۔" اس نے وہی شرٹ سیلز مین کی طرف بڑھا دی تھی۔ اور خود ایک اور شرٹ چیک کرنے لگی۔

"کیا میری کچھ ہیلپ کر سکتی ہیں آپ؟" تیمور بھی اپنے لیے شرٹس پسند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کا سارا دھیان ماورا کی طرف تھا اس لیے وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

"سوری۔۔۔! میں لیٹ ہو رہی ہوں۔" اس نے ٹالنا چاہا۔

"گھر پہ کچھ کام ہے؟" اس نے جان بوجھ کر گھر کا پوچھا۔

"نہیں۔۔۔! فارہ کے گھر سے۔۔۔" وہ بھی اپنی بے دھیانی میں بے ساختہ ہی کہہ گئی تھی۔ اور اپنی اس بے دھیانی اور بے ساختگی کا احساس اسے فوراً ہو گیا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا بھلا۔۔۔؟

"اوہ۔۔۔! تو آج آپ اپنی دوست کے گھر جا رہی ہیں؟ ہاہ! کتنی خوش قسمتی ہے ان کی؟" اس نے بڑے حسرت بھرے انداز میں کہا تھا۔

"کوئی اتنے شوق اور اتنی محبت سے انوائٹ کرے تو جانا تو پڑتا ہے نا؟" ماورا نے کاؤنٹر پہ رکھے اپنے تمام بیگز اٹھا لیے تھے۔

"سچ کہہ رہی ہیں؟" تیمور نے دہرا کے پوچھا اور ماورا اس کے دہرا کے پوچھنے کا مفہوم سمجھ گئی تھی۔

"جی ہاں۔۔۔!" وہ ذرا سنبھل کر بولی۔

"دیٹس گریٹ۔۔۔! لایئے 'یہ بیگز میں اٹھا لیتا ہوں۔ آپ نے بے شک میری ہیلپ نہیں کی۔ مگر میں آپ کی ہیلپ ضرور کروں گا۔" تیمور نے اس کے ہاتھ سے خود ہی تمام بیگز تھام لیے تھے۔ اور ماورا اس کی بات نظر انداز کرتی وہاں سے نکل آئی تھی۔

"میں آپ کو ڈراپ کر دوں؟" پارکنگ میں آ کر تیمور کو نئی بات سوجھی۔

"آپ۔۔۔!" ماورا پہلے رکی 'ٹھٹکی۔ اور پھر بے ساختہ ہی اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"اوکے۔۔۔!" اس نے کہتے ہوئے قدم تیمور کی گاڑی کی طرف بڑھا دیے تھے۔ اور وہ بے یقین سا اس کے پیچھے آتے ہوئے گاڑی کا لاک کھولنے لگا۔

اور آج پہلی بار اس کے ساتھ اس کی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے ماورا کو کچھ عجیب سا لگا تھا۔ حالانکہ وہ پہلے بھی ایک دو بار اس کے ساتھ فیکٹری آئی اور گئی تھی لیکن اس طرح تنہا نہیں۔۔۔ تب ڈرائیور یا فاروقی صاحب

ساتھ ہوتے تھے۔ جبکہ آج تو صرف وہ دونوں ہی تھے۔

"فارہ نے کیوں انوائٹ کیا؟ کہیں اس کا برتھ ڈے وغیرہ تو نہیں ہے؟" تیمور کا اشارہ اس کے خریدے گئے گفٹس کی طرف تھا۔

"نہیں۔! وہ دراصل میں جب سے کراچی آئی ہوں نا۔ آج پہلی بار اس کے گھر جا رہی ہوں۔ اس لیے یہ سب" ماورا نے آخری جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

"اوہ۔! یعنی جب پہلی بار کسی کے گھر جاتے ہیں تو خالی ہاتھ نہیں جاتے۔ یہ سب لے کر جانا پڑتا ہے؟" اس کا اشارہ پچھلی سیٹ پہ رکھے شاپنگ بیگز کی طرف تھا۔

"نہیں۔! ایسا بھی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سب صرف دو چیزوں پہ ڈیپنڈ کرتا ہے۔ ایک آپ کے تعلقات پہ اور دوسرے آپ کے طبقے پہ۔" ماورا نے اس کی بات کی نفی کی۔

"میں سمجھا نہیں۔؟" وہ گاڑی روڈ پہ ڈالتے ہوئے بولا۔

"میرا مطلب ہے کہ یہ سب آپ اسی کے لیے لے کر جاتے ہیں، جس کے ساتھ آپ کے اچھے تعلقات ہوتے ہیں، جس کے ساتھ آپ کلوز ہوتے ہیں اور دوسرے یہ کہ یہ سب مڈل کلاس کے چونچلے ہیں۔ اپر کلاس میں یہ سب تکلفات نہیں پائے جاتے۔ اس لیے یہ سب صرف دو چیزوں تک محدود ہو کے رہ گیا ہے آپ کے تعلق اور طبقے تک۔" ماورا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہوں۔! تو یہ سب لے کر جانے کے لیے کسی کے ساتھ کلوز ہونا یا مڈل کلاس ہونا ضروری ہے؟" اس نے گردن موڑ کر ماورا کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔! کہہ سکتے ہیں۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"تو پھر یہ بتائیے کہ میں بھی کسی کے لیے یہ سب لے کر جانا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کسی کے ساتھ کلوز ہو جانا چاہیے یا کسی کے لیے مڈل کلاس ہو جانا چاہیے؟" اس نے ماورا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کسی کے ساتھ کلوز ہونا اور اپنی کلاس بدلنا دونوں ہی انسان کے اختیار میں نہیں۔"

"کیسے بھلا۔؟" تیمور نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ضروری نہیں، آپ جس سے قریب ہونا چاہیں وہ آپ کو خود سے قریب ہونے کی اجازت دے اور جس کلاس میں آپ پیدا ہوئے ہیں پرورش و تربیت ہوئی ہے۔ آپ کہیں بھی چلے جائیں۔ آپ وہی رہیں گے۔"

تیمور نے کندھے اچکاتے ہوئے سامنے ونڈ اسکرین پہ نظریں جما دیں۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" ماورا نے اسے چند منٹس متواتر خاموش دیکھ کر استفسار کیا۔

"یہی کہ مڈل کلاس میں کیسے شامل ہوا جائے؟" وہ اپنے لہجے کی شرارت دبا نہیں سکا تھا۔ اور اس کے اس شرارت بھرے لہجے پہ ماورا نے بے اختیار اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔ اور اسے اب کی بار بھی وہ کچھ بدلا ہوا سا نظر آیا تھا۔

جبکہ تیمور ونڈ اسکرین کی طرف متوجہ ہونے کے باوجود اس کی نظروں کی محویت نوٹ کر چکا تھا۔

"میری لک چینج لگ رہی ہے نا؟" اس نے ماورا کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا۔ اور ماورا اس کے سوال پر گڑبڑا گئی تھی۔

"اور کچھ نہیں کیا۔ بس کٹنگ کروا کے آیا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" تیمور اس کی نظروں کی محویت اور پھر اس کے یکدم گڑبڑا کر خجل ہونے پہ اچھا خاصا لطف اندوز ہوا تھا۔ اسی لیے اس کا موڈ شرارت پہ آمادہ ہو رہا تھا۔

"ویسے کیسا لگ رہا ہوں؟" اس نے اپنے چہرے کا رخ ماورا کی سمت موڑا۔

"آئینہ نہیں دیکھا۔؟"

"نہیں۔! جلدی میں تھا۔" وہ مزے سے بولا۔

"لیکن ہیر سیلون کی تو ہر دیوار پر نکس آئینے ہوتے ہیں۔ جلدی میں بھی دیکھ لیے جاتے ہیں۔"

"لیکن جو آئینہ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔" اس کا لہجہ ذو معنی ہوا۔

"تو اب گھر جا کر دیکھ لیجیے گا۔" ماورا نے لاپروائی دکھائی۔

"اب گھر جا کر دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ آئینہ میں نے راستے میں ہی دیکھ لیا ہے اور مجھے نظر آرہا ہے کہ میں اچھا لگ رہا ہوں۔" آخر میں وہ مسکرا اٹھا تھا۔

"اور کتنی دیر ہے فارہ کے گھر پہنچنے میں؟" وہ بات ہی بدل گئی تھی۔

"لیجیے۔ پہنچ گئے فارہ کے گھر۔" اگلے چند سیکنڈ میں تیمور نے اسپیڈ کم کرتے ہوئے گاڑی سیدھی آفاق یزدانی کے گھر کے گیٹ کے سامنے روک دی تھی۔

"تھینک یو۔!" ماورا مزید کچھ کہے بغیر گاڑی کا دروازہ کھول کر اتر گئی۔ تیمور بھی تیزی سے نیچے اتر آیا تھا اور پچھلا دروازہ کھول کر اس کے شاپنگ بیگ نکال کر اس کو تھمائے تھے۔

"تھینک یو۔!" تیمور نے بھی شکریہ ادا کیا۔

"فار واٹ۔؟" وہ ٹھہری۔

"یہ نہیں بتا سکتا۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔ اور ماورا اس کے جواب پہ چپ سی ہو گئی۔

"اوکے۔! میں چلتا ہوں۔ بائے۔ کل آفس میں ملاقات ہو گی۔" وہ کہہ کر پلٹ گیا تھا۔ دوسری سائیڈ سے جا کر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا اور ابھی گاڑی اسٹارٹ کر ہی رہا تھا کہ ماورا پھر گاڑی کے قریب آگئی تھی۔ تیمور نے تیزی سے فرنٹ سیٹ کا شیشہ نیچے کیا۔

"یہ آپ کے لیے۔!" اس نے ایک بیگ سیٹ پہ رکھ دیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" تیمور کو خیال ہی نہ رہا۔

"گفٹ۔!" اس کا جواب یک لفظی تھا۔

"مگر کس لیے۔؟" تیمور نا سمجھی سے بولا۔

"یہ نہیں بتا سکتی۔" اس نے تیمور کے الفاظ اسے لوٹا دیے تھے۔

"یعنی مجھے خود ہی سمجھ جانا چاہیے۔" وہ بے انتہا خوش ہوا تھا۔

"خدا حافظ!" وہ کہہ کر پلٹ گئی تھی۔

اور تیمور نے وہی گرے شرٹ اپنے لیے دیکھتے ہوئے بے اختیار بڑی سرشاری سے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے آگے بڑھا دی تھی آج اس کا اتوار بہت خوب صورت ثابت ہوا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قرۃ العین رائے

دوسرا رخ

صبح کے وقت ہر کوئی اپنی مصروفیت میں گم تھا جب کوئی بیرونی گیٹ کے چھوٹے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوا دودھ والا ابھی دودھ دے کر گیا تھا لہٰذا گیٹ کھلا ہوا تھا داخل ہونے والے وجود پر نظر پڑنے پر ہر کوئی اپنی جگہ تھم سا گیا تھا بالکل ایسے جیسے چلتی فلم کو ریموٹ کے ذریعے اسٹاپ کا بٹن دبا کر روک دیا جائے۔ چھوٹی انعم' ثریا بیگم اور کچن کی کھڑکی میں سے دیکھتی ردا ہر کوئی اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ابھی ڈیڑھ مہینہ قبل ہی دھوم دھام سے رخصت کی جانے والی زارا آج زرد چہرہ' گریہ زاری سے سوجی آنکھیں' الجھے بال' ملگجا حلیہ' انداز میں شکستگی لیے یہ وہ نوبیاہتا تو ہرگز نہ تھی۔

"اماں!!" لڑکھڑاتی چال کے ساتھ وہ برآمدے میں تخت پوش پر بیٹھی اماں کی جانب بڑھی اور ان کے گلے لگ کر پھپھک کر رونے لگی' یہ صورت حال گھر والوں کے لیے مزید پریشانی کا باعث بن گئی۔ معاذ اور کچن میں سے ردا اس کے پاس آن کھڑے ہوئے۔ سب کی آنکھیں سوالیہ تاثرات لیے ہوئے تھیں۔

"یا اللہ خیر! کیا ہوا سعاد ٹھیک ہے؟" ثریا بیگم نے یوں روتی ہوئی بیٹی سے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ظفر صاحب بھی اٹھ کر پاس چلے آئے تھے۔

"ارے کچھ بتا تو' میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے' ارے کوئی پانی پلائے اسے بھی اور مجھے بھی' رانو جلدی بول ورنہ میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔" انہوں نے بلکتی رانو کو خود سے الگ کرتے ہوئے کہا' ردا جلدی سے پانی کا گلاس بھر کر لائی اور ثریا بیگم کی جانب بڑھایا۔

"لے پانی پی! اور بتا سب خیر تو ہے۔" ردا سے گلاس لے کر انہوں نے بیٹی کے لبوں سے لگایا جس نے ایک گھونٹ لے کر گلاس پرے کیا اور اپنی جانب دیکھتی سوالیہ نظروں کو محسوس کرتے ہوئے وہ پھٹ پڑی تھی۔

"میں..... میں اب اس گھر میں کبھی نہیں جاؤں گی' جینا دوبھر کر دیا ہے میرا ان لوگوں نے دم گھٹتا ہے میرا' جب تک سعاد مجھے الگ گھر لے کر نہیں دیں گے میں نہیں جاؤں گی۔" اس کے ان جملوں سے گھر والوں کی پریشانی اور بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

"بات کیا ہے؟ اپنی بہن کی آنکھوں میں کسی کے بھی دیے گئے آنسو میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔" معاذ غصے سے آگے بڑھ کر بولا۔

"صرف ڈیڑھ مہینہ ہوا ہے شادی کو' لیکن ہر کوئی مجھے یوں ٹریٹ کرتا ہے جسے شادی کو دس سال ہو گئے ہوں۔ شادی کے تیسرے دن ہی کچن میں تین ٹائم کا کھانا پکانے پر لگا دیا ساس صاحبہ نے یہ کہہ کر کہ وہ گھیا کی مریضہ ہیں اور اب اس گھر کی مالکن میں ہوں' لہٰذا اب گھر میرے حوالے' سسر صاحب کو صبح ہی صبح ناشتا چاہیے کیونکہ وہ شوگر کے مریض ہیں۔ بھوک برداشت نہیں کر سکتے۔ گھر کی مالکن نہیں میں تو گھر کی نوکرانی بن گئی ہوں وہ بڑی دو نندیں ہیں تو بیاہی مگر میری بدقسمتی کہ دو گلیاں چھوڑ کر ان کا سسرال ہے جب دیکھو منہ اٹھا کر اپنے بچوں کے ساتھ آجاتی ہیں یہی نہیں اپنی سسرال میں سے کسی نہ کسی مہمان کو بھی ساتھ لے کر آتی ہیں کہ بھابھی سے ملنے کا شوق تھا ان کی خاطر مدارت بھی کرو اور مسکرا مسکرا کر ان کے مہمانوں کا بھی خود سے ملنے کا شوق پورا کرو۔ ایسے میں اگر ہمارا کہیں باہر جانے کا موڈ ہو تو کوئی نہ کوئی بھانجا بھانجی لاڈلے اکلوتے ماموں کے ساتھ دم چھلا بن کر ساتھ ہو لیتے ہیں۔ شاپنگ کروں تو نندوں کی تنقید بھابھی یہ کیا اٹھا لائیں اس کی تو قیمت دکان دار نے زیادہ وصول کی ہے مجھے شاپنگ کا سلیقہ نہیں اگلی دفعہ جب شاپنگ پر جاؤں تو سعاد کے بجائے کسی نند کے ساتھ جاؤں۔ یہ میری ساس کا فرمان ہے۔ ہر کام میں کیڑے نکالے جاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ دوغلا جملہ کہا جاتا ہے کہ آہستہ آہستہ اس گھر کے اطوار سیکھ جائے گی اور اب تو حد ہی ہو گئی ہے میں اور سعاد ہنی مون کے لیے تین دن کے لیے مری جانا چاہتے ہیں میں نے اپنی ساری سلامی اس کے لیے بچا کر رکھی ہے۔ جب یہ پتا چلا تو میری نند اور چھوٹا دیور بھی تیار ہو گئے کہ ہم بھی ساتھ جائیں گے مجال ہے جو سعاد نے منع کیا ہو الٹا وہ میری دونوں بیاہی نندوں کو بھی ساتھ لے جا رہے ہیں۔ رات اسی بات پر جھگڑا ہوا اور صبح دکھتے سر کے ساتھ میں نے چھوٹی نند صاحبہ کو کہا کہ وہ آج ناشتا بنا دے میرے سر میں درد ہے تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ جی آج تو میرا بہت اہم ٹیسٹ ہے لہٰذا مجھے کالج جلدی جانا ہے' سعاد کو بتایا تو وہ الٹا مجھ پہ خفا ہونے لگے کہ میں ان کے گھر والوں کو اپنا نہیں سمجھتی' اپنی ذمہ داریاں نہیں سمجھتی بس ہر وقت شکایتوں کا دفتر کھولے بیٹھی رہتی ہوں وغیرہ وغیرہ اور جو میں نے غصہ میں کہہ دیا کہ بس اب مجھے اس گھر نہیں رہنا تو اسی وقت گاڑی میں بٹھا کر یوں یہاں دہلیز پر اتار کر چلے گئے۔" زارا عرف رانو نے روتے بلکتے اپنا دکھڑا سنایا۔ معاذ اور ظفر صاحب کا تو غصے سے برا حال ہو گیا تھا یہ سب سن کر' اس گھر کی پہلی لاڈلی اور چہیتی بیٹی کی اتنی ناقدری۔ انہیں رانو اپنی جگہ درست لگی۔

"کوئی ضرورت نہیں تمہیں وہاں جانے کی' مجھے اپنی بیٹی بھاری نہیں ہے جب تک وہ لوگ ناک رگڑتے اس در پر آکر تمہیں منا کر نہ لے کر جائیں تم یہیں رہو گی بیٹی دی ہے ہاتھ کاٹ کر نہیں' اب یہ معاملہ ہمارے طریقے سے ہی نبٹے گا' سعاد تمہیں جب تک الگ گھر لے کر نہیں دے گا تم یہیں رہو گی۔ افورڈ کر سکتا ہے وہ دوسرا گھر ورنہ دو وقت کی روٹی بھاری نہیں مجھے اپنی بیٹی کی۔" ظفر صاحب نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے فیصلہ سنایا۔ اور زارا کے چہرے پر باپ کی طرف سے پائی جانے والی شہ پر سرخی چھلکی تھی۔

"بالکل ٹھیک ہے زارا یہیں رہے گی سعاد کو اب جو بات کرنی ہے ہم سے کرے اس کی ہمت کیسے ہوئی

زارا کو یوں ــــ چھوڑ کر جانے کی اب ہم اس سے بات کریں گے۔" معاذ نے بھی جذباتی ہوتے ہوئے ظفر صاحب کے فیصلے کی تائید کی تھی اور زارا کے شکست خوردہ وجود میں گھر والوں کا حوصلہ دوڑنے لگا تھا۔

"بس! اب ایک لفظ اور نہیں' یہ اب اس گھر کی بیٹی نہیں ہے بلکہ اس کا اصل گھر وہی ہے جسے یہ اپنی بچکانہ اور بے وقوفانہ باتوں سے چھوڑ کر آئی ہے اور حیرت تو مجھے آپ کی عقل پر ہو رہی ہے بچہ اگر نادانی اور ناسمجھی میں دہکتا کوئلہ پکڑنا چاہے تو اسے پکڑنے دیا جاتا ہے؟ ابھی شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے' دل میں بغض رکھے گی تو ان لوگوں کی ہر بات الٹی ہی نظر آئے گی۔ کب دی تھی میں نے اسے بدگمانی کی عینک جہیز میں جسے لگا کر یہ ان کے ساتھ بیر باندھ رہی ہے ٹھیک ہی تو کیا اس کی ساس نے یہ گھر کی مالکن ہے اور عورت کے گھر میں اس کی حکمرانی کچن سے ہی شروع ہوتی ہے سیاہ سفید کی مالک ہے یہ وہاں پر جو چاہے پکائے جو چاہے کھائے' حکمراں تو بنا دیا اس کی ساس نے اپنی گھر کی' جس کی ایک ایک اینٹ اس نے کتنی محنت سے لگائی ہو گی اب اگر اس گھر کے طور طریقے وہ سکھاتی ہے تو اسی کا بھلا ہے اور رہی بات نندوں کی تو شادی کے شروع کے دن ہیں نئی نئی بھابھی ہے ان کا شوق ہے چاہ ہے ان کی محبت ہے جو اپنا گھر بار چھوڑے اس کی مدد کو چلی آتی ہیں' وقت کے ساتھ ساتھ یہ سب نارمل ہو جائے گا اور سچ بتا ارانو کیا تیری نندیں کام میں تیرا ہاتھ نہیں بٹاتیں؟ اس روز جب میں تم سے ملنے گئی تھی تو تمہاری بڑی نند کپڑے دھونے والی مشین لگا کر تمہارے ہی میاں کے کپڑے دھو رہی تھی اور دونوں نندیں کچن میں تمہارے ساتھ لگی ہوئی تھیں کہ سعاد نے اس روز اپنے دوستوں کی اچانک دعوت کی تھی تمہاری ساس نے اپنی دونوں بیاہی بیٹیوں کو فون کر کے تمہاری مدد کے لیے بلوایا تھا۔ تمہاری جیسی ہوتیں تو ٹکا سا جواب دے دیتیں۔ اپنا گھر بار' اور کام کاج چھوڑ کر بھابھی کی مدد کو کیوں آتیں' اور تمہاری چھوٹی نند کا اگلے روز بھی ضروری ٹیسٹ تھا لیکن اس نے کہا تھا کہ وہ رات کو پڑھ لے گی' آج یقیناً" اس کی مجبوری ہو گی جو اس نے ناشتا بنانے سے انکار کیا اور یہ بھانجا' بھانجی کا کیا گلہ وہ تو اپنے ماموں کے ساتھ ویسے ہی آتے جاتے ہیں جیسے ان کے ماموں نے شروع سے انہیں رکھا ہے اور یہ ہنی مون کا کیا تماشا ہے' کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا' یہ موئے انگریزوں کی نقل کرنے کا یہی انجام ہے وہ تو شتر بے مہار ہوتے ہیں نہ گھر میں ماں باپ بہن بھائی بس منہ اٹھا کر ہنی مون منانے چل پڑو بلکہ اس سے زیادہ اچھا تو یہی ہے کہ پوری فیملی مل جل کر کہیں گھوم آئے اکیلے دو منہ اٹھائے جنگلوں میں گھومتے پھو کیا اپنی ردا اور معاذ گئے ہیں؟ جو تم رات بھر شوہر سے بے بنیاد بات پر لڑتی رہی ہو اگر معاذ اور ردا جا رہے ہوتے ہنی مون پر اور تم سب بھی جانا چاہتے تو کیا معاذ بھی دو ٹوک انکار کر کے اپنی بیوی کی بانہوں میں بانہیں ڈالے چل پڑتا' برداشت کرتے تم سب یہ؟ تم نے ہماری تربیت کی خوب لاج رکھی' عورت گھر بساتی ہے صبر سے' حوصلے اور برداشت سے' آج قربانی دو گی کل پھل پاؤ گی۔" ثریا بیگم نے بارعب آواز میں ظفر صاحب اور معاذ کو ٹوکتے ہوئے زارا کے لتے لیے ۔ ثریا بیگم کی باتیں سن کر ہر کوئی چپ چاپ کھڑا رہ گیا تھا' زارا تو حیران پریشان ماں کا غصے بھرا لیکچر سن رہی تھی۔

"معاذ گاڑی نکالو ابھی اسی وقت میں اسے گھر چھوڑ کر آؤں اور آئندہ اگر تم شوہر سے لڑ کر آئیں تو گھر میں گھسنے نہیں دوں گی اور خبردار جو اپنے سسرال کی برائیاں آ کر یہاں کیں۔" ظفر صاحب کا غصہ تو ثریا بیگم کی سچی کھری باتیں سن کر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا اور وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"مگر امی۔"

"معاذ سنا نہیں میں نے کیا کہا ہے۔" ثریا بیگم نے سختی سے معاذ کی بات کاٹی۔

"جلدی کرو تمہیں بھی آفس جانا اور سعاد کے آفس جانے سے پہلے اسے وہاں ہونا چاہیے۔"

ماں کا سخت انداز دیکھ کر زارا پھر سے رونے لگی تھی اسے امید نہ تھی کہ اماں اس کے ساتھ یوں پیش آئیں گی لیکن دل ہی دل میں وہ اماں کی باتوں کو سوچ کر شرمندہ بھی ہو رہی تھی' تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے اس بات کی وہ قائل تھی اور رات بھر وہ جس طرح سعاد کے ساتھ لڑتی رہی اور صبح بھی وہ کتنی بدتمیزی سے بولی تھی وہ سب اب یاد کر کے اسے شرمندگی ہو رہی تھی واقعی اسے تحمل کے ساتھ کچھ وقت دینا چاہیے' خود کو بھی اور اپنے سسرال کو بھی۔

"ارے آنٹی آپ! ہم لوگ تو بس زارا کو لینے ہی آ رہے تھے۔" جب وہ لوگ زارا کے سسرال پہنچے تو بڑی نند گیٹ پر ہی مل گئی بہت تپاک سے وہ انہیں لاؤنج میں لے کر آئی جہاں اپنے والدین کے پاس سعاد سر جھکائے بیٹھا تھا' زارا کی ساس نے ہاتھ بڑھا کر جلدی سے زارا کو اپنے قریب بٹھا کر پیار کیا۔

"کان کھینچے ہیں میں نے اس احمق کے اور اب یہ ہبین کے ساتھ تمہیں لینے آنا ہی والا تھا اگر تم کسی بات پر ناراض ہو گئی تھیں تو منانے کے بجائے تمہیں یوں میکے کے باہر چھوڑ کر چلا آیا' حد ہوتی ہے بے وقوفی کی' ہبین کو فون کر کے میں نے ہی بلایا ہے۔ تم تو جانتی ہو یہ موا گھٹیا کا مرض' ورنہ میں خود آتی اپنی پری کو لینے صبح سے پورا گھر بے رونق ہوا پڑا ہے۔" زارا کی ساس نے بے حد پیار سے بات کرتے ہوئے اپنی بڑی بیٹی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہبین سب کے لیے چائے بناؤ۔"

"آنٹی آئی ایم سوری مجھے بھی یوں آپ کو بتائے بغیر نہیں جانا چاہیے تھا۔ غلطی صرف ان کی نہیں میری بھی ہے چھوٹی سی بات بس میں نے ہی بڑھا دی میں وعدہ کرتی ہوں آئندہ آپ سب کو مجھ سے شکایت نہیں ہو گی' کوشش کروں گی کہ ایسی غلطی دوبارہ نہ ہو آپ نے انہیں ڈانٹا ہے اور مجھے امی نے بہت ڈانٹا ہے ہم دونوں کو تو صبح صبح ڈانٹ کا ناشتا مل گیا ہے اب میں سب کے لیے مزے دار ناشتا بنا کر لاتی ہوں آئی ایم سوری سعاد۔" ساس کی بات سن کر زارا کے دل سے بدگمانی کے رہے سہے بادل بھی چھٹ گئے اس نے اعتراف کرنے اور معافی مانگنے میں تامل نہ کیا اور سر جھکاتے ہوئے سعاد سے بھی سوری کی۔

"آئی ایم سوری ٹو' مجھے بھی ایک دم اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سوری آنٹی اور معاذ! ہماری وجہ سے آپ لوگوں کو پریشانی ہوئی آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔" سعاد نے بھی کھلے دل سے معذرت کی اور معاذ نے بڑھ کر ہاتھ ملاتے ہوئے اسے گلے لگا لیا۔ ہر کوئی اپنی جگہ پر پرسکون ہو چکا تھا اور خوش تھا۔ زارا جھٹ سے کچن کی جانب بڑھ گئی۔

اور ثریا بیگم سب کو پرسکون اور مسرور دیکھ کر سوچ رہی تھیں کہ آج اگر وہ بروقت درست فیصلہ نہ کرتیں تو توازن بگڑ جاتا زارا کی حالت اس کے رونے پر وقتی طور پر انہیں بھی بے حد غصہ آیا تھا مگر جیسے ہی ان کی نظر معاذ کے پیچھے خاموش کھڑی ردا پر پڑی انہیں تصویر کا دوسرا رخ بھی نظر آ گیا۔ زارا اور معاذ کی اکٹھی شادی ہوئی تھی انہوں نے بھی شادی کے تیسرے روز ہی ردا کو کچن سنبھالنے کے لیے کہہ دیا تھا کہ اب گھر کے کام ان سے نہیں ہو پاتے تھے وہ بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں اور آج صبح ہی ردا نے بھی انعم کو ناشتا بنانے کا کہا تھا کہ اس کے سر میں درد ہے مگر انعم نے کالج جلدی جانے کی وجہ سے منع کر دیا تھا جس پر وہ خاموشی سے کچن کی جانب بڑھ گئی تھی۔ ایسے ہی چھوٹے موٹے گلے شاید ردا کو بھی ان سے ہوں گے اور اگر آج وہ زارا کا ساتھ دے دیتیں اس وقت سختی سے پیش نہ آتیں تو ردا کی آنکھوں میں نمودار ہوتی شکایت وہ کبھی نہ دور کر پاتیں۔

وہ مطمئن انداز میں معاذ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی اپنے گھر کی جانب جا رہی تھیں جہاں ردا ان سب کے لیے مزے دار ناشتا بنا کر ان کی منتظر تھی' اس وقت ایک پرسکون مسکراہٹ زارا کے لبوں پر تھی اور ویسی ہی مسکراہٹ ردا کے لبوں پر تھی اور دونوں کی مسکراہٹ کا تصور ثریا بیگم کے لبوں پر بھی دھیمی سی پرسکون مسکان لے آیا تھا۔

☼

"ڈاکٹر سے شادی کیا ہوئی ہر چیز ہی اینٹی کی لپیٹ میں آگئی۔ ہر وقت ادویات' پرہیز' احتیاط..." علینہ نے سوچا۔

شادی سے پہلے گول گپوں' دہی بھلے یا پڑی چاٹ کے اردگرد زندگی گھومتی تھی۔ شادی کے بعد میاں سے پہلی فرمائش کی بھی تو یہ کہ "سنا ہے آپ کے ہاں کے گول گپے بہت مشہور ہیں۔" یہ تو علینہ ہی جانتی تھی کہ گول گپے کہتے ہوئے صرف منہ ہی گول نہیں ہوا بلکہ آنکھوں میں املی کے پانی کا تصور کرتے ہی شرارے سے پھوٹنے لگے۔ منہ سے رال ٹپکنے لگی۔

واہ... گول گپے... خوب کھٹے پانی کے ساتھ ...وہ تصور میں گول گپے دیکھ رہی تھی۔

"کیا کہا؟ گول گپے... واٹ نان سینس' جانتی ہو بازار کی گندی اور مکھیوں والی اشیا کھانے سے کتنی بیماریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

وہ خشمگیں انداز میں دیکھتے ہوئے بولے۔

"کوئی نہیں' میں نے تو ہفتے میں دو دو سو روپے کے گول گپے کھائے ہیں۔ مجھے تو کبھی کچھ نہیں ہوا' بلکہ ہاضمے کے لیے بہت اچھے ہوتے ہیں۔" اب ڈاکٹر میاں کا ٹاکرا وکیل کی بیٹی سے تھا۔

"تمہیں کبھی کچھ نہیں ہوا؟" انہوں نے بغور اسے دیکھا۔ علینہ خوامخواہ شرما گئی۔ "دیکھو تو کتنی کمزور ہو... وزن کیا ہے بھی؟"

"اف..." علینہ نے سر پیٹا (اپنا) شادی سے پہلے دو ہزار مہینے کے دے کر جم جوائن کیا ڈائٹنگ کی' ہر چکنی اور مرغن چیز سے منہ موڑا کہ باجی سارا وقت "بارہ من کی دھوبن بن جاؤ گی" کہہ کر ڈراتی جو تھیں اور ملبہ سارے کا سارا گول گپوں پر آن گرا۔

"اف گول گپے۔" اس نے آہ بھری۔ گول گپوں سے شروع ہونے والے لیکچر کا سلسلہ اتنا طویل ہوا کہ وہ تین بچوں کی ماں بن گئی مگر مجال ہے جو ڈاکٹر صاحب کی ڈاکٹری میں رتی بھر فرق آیا ہو۔ سب سے پہلے چٹورے پن کو الوداع کہا پھر کھٹی میٹھی چیزیں چھوڑیں ...پھر ہلکے پھلکے کھانوں پر آگئی اب تو وہ آدھی ڈاکٹر نہ سہی نرس تو بن ہی چکی تھی... دو سالہ بیٹے کو ہلکا سا ٹمپریچر ہوتا فٹافٹ نہلا دیتی... کیل پول کا چمچ دیتی۔ کھانسی ہوتی تو وکس سینے پر ملتی... کوئی نہ کوئی کف سیرپ بھی اٹھا کر پلا دیتی... چوٹ لگ جاتی تو آیوڈیکس کا مساج کرتی... بی پی آپریٹس کے استعمال سے انجکشن لگانے اور فرسٹ ایڈ کے سارے کام اسے "منہ زبانی" آتے تھے... اس کی نو سالہ بیٹی نائلہ کو

خوب چھینکیں آرہی تھیں علینہ کا دل چاہا کرارا تھپڑ لگائے' غصے سے اس کو بلایا۔

"بے وقوف سارا دن کھٹے مالٹے کھائے ہیں نزلہ تو ہونا ہی تھا کیسے چھینکوں پہ چھینکیں مارے جا رہی ہو۔ میں قہوہ بنا کر دیتی ہوں اور ساتھ میں اینٹی الرجک بھی... یہ لو۔" علینہ نے سفید گولی اس کے ہاتھ پر رکھی۔ بچے تو بچے ہوتے ہیں' وہ آنکھیں پٹپٹا کر بولی۔

"اماں! ہماری ٹیچر تو کہتی ہیں کہ مالٹوں میں وٹامن سی ہوتا ہے کیا وٹامن سی سے نزلہ ہو جاتا ہے؟ اور یہ

اینٹی الرجک کیا ہوتا ہے؟"
"زیادہ باتیں نہ کرو اور گرم لحاف میں لیٹ جاؤ۔" علینہ نے اسے جھڑکا۔ صبح نائلہ اٹھی تو اس کا جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔۔۔ نائلہ نے ہاتھ لگایا تو گویا آگ کی بھٹی میں جل رہی تھی۔

"اف تمہیں بخار ہو گیا ناں۔۔۔!" علینہ نے حسب عادت ڈانٹا۔

"لیکن میں نے تو رات اینٹی الرجک لی تھی اماں" نائلہ منمنائی، علینہ نے تھرمامیٹر سے بخار چیک کیا۔

"اوہ میرے خدایا ایک سو دو۔" علینہ نے فوراً چائے پاپے دیے اور ساتھ ہی بڑا سا کیپسول بھی۔

کیپسول دیکھ کر نائلہ گھبرا گئی۔

"اماں یہ کیا ہے!"

"بیٹے یہ اینٹی بایوٹک ہے۔۔۔ انفیکشن کنٹرول کرنے کے لیے۔"

دوا لے کر نائلہ لحاف میں لیٹ گئی ابھی تین چار دن پہلے ہما کھیلتے کھیلتے سیڑھیوں سے گری باہر سڑک کی طرف سیڑھیاں نکلتی تھیں۔ اس کے گھٹنے پر خوب رگڑ لگی تھی۔ اس وقت بھی اماں نے ابا سے پوچھے بغیر کوئی دوا دی تھی اور ٹیکا لگوایا تھا۔۔۔ پتا نہیں کیا نام تھا اس کا؟ اینٹی اینٹی سیپٹک، ہاں اماں نے کہا تھا اینٹی سیپٹک لے لو، ورنہ زخم خراب ہو جاتا ہے اور کمپاؤڈر کو بھیج کر ایک انجکشن بھی لگوایا تھا، عجیب سا ہی نام تھا۔ سٹیٹنس۔۔۔ نہیں نہیں ٹیٹنس کا ٹیکا پتا نہیں کب دوا نے اثر کیا اور وہ نیند کی گود میں جا پہنچی۔

آنکھ کھلی تو طبیعت عجیب سی تھی۔ ہما اور مہران کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر صحن میں آئی۔ اماں بھی غائب تھیں۔ اس نے گھبرا کر آواز دی، پسینے اور بخار اترنے سے وہ بہت نقاہت محسوس کر رہی تھی۔

"اماں۔۔۔ اماں، آپ کہاں ہیں؟"

"آپ کی اماں کی دوست تھیں ناں مہرین آنٹی ان کا انتقال ہو گیا ہے وہاں گئی ہیں۔" ابا نے کمرے سے نکل کر اسے بتایا وہ اپنے ابا کی شکل دیکھتی رہی۔

"ابا کس کا؟" اس نے دوبارہ سوال کیا۔

"آپ کی آنٹی مہرین جو کل ہمارے گھر آئی تھیں۔" ابا کی آواز میں بھی سوگ اور دکھ تھا۔

"ابا انتقال، فوت ہونے کو کہتے ہیں ناں؟" اس نے سہم کر پوچھا۔

"جی بیٹے۔" ایک لمحے کے لیے ابا نے کہا "زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تو موت ہے۔ جس کا ہم اپنی اولاد کو بتانا اس کے لیے تیار کرنا تو دور کی بات نام لینا بھی پسند نہیں کرتے۔" ابا نے خود کلامی کی۔

"ابا آنٹی مہرین تو بالکل ٹھیک تھیں۔۔۔ ابھی کل تو انہوں نے ہمارے گھر میں اتنے سارے دہی بھلے اور فروٹ چاٹ کھائی تھی۔ وہ تو بیمار نہیں تھیں وہ کیسے فوت ہو گئیں۔۔۔؟" اس کا چھوٹا سا دل بری طرح سہما ہوا تھا۔ ایک جیتا جاگتا، کھیلتا کھاتا انسان موت کے منہ میں کیسے جا سکتا ہے، یہ تو اس نو سالہ بچی نے سوچا بھی نہ تھا۔ لیکن خبر بہت بڑی تھی اس نے پھر باپ سے سوال کیا۔

"ابا ان کو کیا ہوا تھا، وہ آپ سے کون سی دوا لینے آئی تھیں!"

"بیٹے انہیں ذہنی بیماری تھی اور وہ مجھ سے اینٹی ڈپریشن لینے آئی تھیں۔"

"اینٹی ڈپریشن، وہ کیا ہوتا ہے ابا؟"

"بندہ جب بہت زیادہ سوچتا یا پریشان رہتا ہے تو جو دوا دیتے ہیں اسے اینٹی ڈپریشن کہتے ہیں۔" انہوں نے وضاحت کی۔

"ابا! ڈاکٹر ہر بیماری کی دوا اینٹی سے شروع کرتے ہیں۔۔۔ تو آپ نے ان کو ایک گولی اینٹی ڈیتھ کی بھی دے دینا تھی۔۔۔ کیا یہ دوا آپ کے پاس نہیں ہے؟"

اس کے اس سوال پر ایک آنسو ابا کی آنکھ سے نکلا۔

"نہیں بس یہی ایک بیماری ہے جس کا علاج یا دوا کسی کے پاس نہیں ہے۔"

☆

کس کارن اتنے رنگوں سے یاری، کس کارن یہ ڈھنگ
جتنے رنگ بھی چاہو زیست میں بھر لو، موت کا ایک ہی رنگ

نام و نمود سے اتنی دُوری ٹھیک ہے لیکن آخر کیوں
سارے جہاں سے قوسِ قزح کا رشتہ، اپنے آپ سے جنگ

پل میں دھجی دھجی بکھرنے والی ایسی ہے یہ زیست
اک سے زیادہ بچّوں کے ہاتھوں میں جیسے کٹی پتنگ

عمر بتا دی اپنوں اور غیروں کے نقش بنانے میں
جب اپنی تصویر بنانا چاہی، پھیکے پڑ گئے رنگ

میں اک لکھنے والا، مجھ کو بنانا، یار احمد پرویز
لوح و قلم سے آگے بھی ہے کیا، یہ دُنیا اتنی تنگ

صابر ظفر

آس

اک صحرا
جس کے ذرّے چُنتے چُنتے
میری اُنگلیاں شل ہو جائیں گی
ایک سمندر
جس کے جُرعے پیتے پیتے
میری سانس اُکھڑ جائے گی

شکیب جلالی

بے اختیار رہنا، بے اختیار رکھنا
عشق و جنوں کو یونہی سر پر سوار رکھنا

تم سے بچھڑ نہ جاؤں اس غم کے شب کدے میں
تم دل کے آئینے میں مجھ کو اُتار رکھنا

ہم ایک ہوں گے ایک دن پختہ یقین ہے مجھ کو
تم میری چاہتوں کے گیسو سنوار رکھنا

تیری نظر سے پی کر جو بے خبر پڑے ہیں
آنکھوں میں ان کی اپنا قائم خمار رکھنا

جتنے ہیں درد دل میں کاغذ پہ تم اُتارو
مظہر نہیں مناسب دل میں غبار رکھنا

شعیب مظہر

کچھ حقیقت تو ہوا کرتی تھی افسانوں میں
وہ بھی باقی نہیں اس دور کے انسانوں میں

وقت کا سیل بہالے گیا سب کچھ ورنہ
پیار کے ڈھیر لگے تھے مرے کھلیانوں میں

شاخ سے کٹنے کا غم ان کو بہت تھا لیکن
پھول مجبور تھے، ہنستے رہے گُل دانوں میں

ان کی پہچان کی قیمت تو ادا کرنی تھی
جانتا ہے کوئی اپنوں میں نہ بیگانوں میں

سر ہی ہم پھوڑنے جائیں تو کہاں جائیں گے
کھوکھلے کانچ کے بُت ہیں ترے بُت خانوں میں

سعید احمد اختر

صبا سعید

اپنے لبوں کی مسکراہٹ

شکایت

میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کی نوعیت جاننے کے لیے ان کے ایک بزرگ نے بیوی سے پوچھا۔

"آخر تمہیں اپنے خاوند سے کیا شکایت ہے؟"

"یہ بات بات پر گالیاں دیتے ہیں اور کنجوس اتنے ہیں کہ گزارا کرنا بہت مشکل ہے۔" بیوی نے شکایت کی تو خاوند تلملا کر بولا۔

"کون کم بخت اس بدذات، کمینی اور گھٹیا عورت کو گالیاں دیتا ہے۔ بکواس کرتی ہے اور سارے پیسے اس کو دیتا ہوں۔ خواہ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ ہو۔"

حمیرا نوشین۔۔۔ منڈی بہاؤالدین

اس نے کہا، میں نے کہا

اس نے کہا۔ "میں ہمیشہ اپنے دلی جذبات کا اظہار پھولوں سے کرتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "لیکن تم نے تو مجھے صرف ایک پھول بھیجا ہے۔"

اس نے کہا۔ "دراصل میں بہت کم گو واقع ہوا ہوں۔"

اس نے کہا۔ "تمہارا کہا ہوا صرف ایک لفظ مجھے کائنات کا سب سے خوش نصیب شخص بنا سکتا ہے۔۔۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔"

اس نے کہا۔ "بہت بہت شکریہ۔ یہی وہ لفظ تھا۔"

ماہم اختر۔۔۔ راولپنڈی

پروفیسر صاحب

ایک پروفیسر صاحب اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے گھر گئے اور کافی دیر اس کے ساتھ گپ شپ لگاتے رہے۔ کھانے کا وقت ہوا تو انہوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا پھر شطرنج کی بساط بچھ گئی۔ کئی گھنٹوں بعد جب پروفیسر صاحب رخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر دوست نے رسماً پوچھا۔

"گھر پر تو سب خیریت ہے نا؟"

پروفیسر صاحب چونک اٹھے۔

"خوب یاد دلایا تم نے۔ اصل میں، میں تمہیں لینے آیا تھا۔ میری بیوی کو دل کا دورہ پڑا ہے۔"

نوشابہ فضل۔۔۔ کھاریاں

قابلیت

ایک دن شریف کا پڑوسی اس کے پاس آیا اور بولا۔

"ذرا اپنا گدھا کچھ دیر کے لیے دے دیں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کو گدھا نہیں مل سکتا، کیونکہ آج صبح ہی ایک صاحب گدھا مانگ کر لے گئے ہیں۔" شریف نے معذرت کی۔

جس وقت شریف یہ بات کہہ رہا تھا عین اسی وقت، اصطبل سے گدھے کی آواز آئی۔ پڑوسی جان گیا کہ شریف اسے ٹال رہا ہے۔ اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ گدھا اندر ہے۔"

شریف نے شرمندگی ظاہر کیے بغیر بڑے وقار سے جواب دیا۔ "جو شخص انسان کے مقابلے میں گدھے کی بات کا یقین کرے، وہ اس قابل نہیں کہ اس پر اعتماد کیا جائے اور اسے کوئی چیز دی جائے۔"

حرا قریشی۔۔۔ ملتان

خاوند

نفسیات کے ایک پروفیسر انسانی رویے پر لیکچر دے

رہے تھے۔

"وہ آدمی جو غلطی پر ہو اور ہار مان لے، وہ عقل مند ہوتا ہے... اور وہ آدمی جو درست موقف رکھنے کے باوجود ہار مان لے... وہ کون ہوتا ہے۔"

"سر! وہ خاوند ہوتا ہے۔" ایک طالب علم نے فوراً جواب دیا۔

کومل عدنان... کراچی

بدقسمتی

ایک صاحب دیہی علاقے کی سیر کو گئے اور ایک مقامی دیہاتی کو بطور گائیڈ اپنے ساتھ لے لیا۔ اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے صاحب نے محسوس کیا کہ دیہاتی اپنے خراب حالات اور مالی تنگی کا مسلسل رونا رو رہا ہے۔ وہ صاحب قدرے جھنجھلا گئے۔

"تمہارے حالات اتنے خراب ہونے تو نہیں چاہئیں۔" اپنی کوفت پر قابو پا کر انہوں نے کچھ نرمی سے کہا۔ "تم بتا رہے ہو کہ تمہارے پاس تھوڑی بہت زمین بھی ہے۔"

دیہاتی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "جی جناب! ہے۔"

"تو تم اس پر کوئی فصل وغیرہ کیوں نہیں اُگاتے؟" صاحب نے کہا۔

"بس جی! کیا بتاؤں... قسمت ہی پھوٹ گئی ہے۔" دیہاتی نے اپنی پگڑی اتاری اور روتے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا۔

"اتنی پھوہڑ اور نکمی بیوی ہے میری۔ کھیتی باڑی میں ہاتھ ہی نہیں بٹاتی۔ زمین بے کار ہوئی جاتی ہے۔"

الماس تنویر... ہزارہ

سدباب

پسند کی شادی کر کے کرائے کے مکان میں رہنے والا جوڑا شادی کے ابتدائی ایام میں تفریح کی غرض سے باہر نکلا۔ کافی دور نکل جانے کے بعد دفعتاً نوبیاہتا بیوی نے کچھ پریشانی سے کہا۔

"اوہ... میں استری کا سوئچ آف کرنا بھول گئی تھی... کہیں آگ نہ لگ جائے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ آگ نہیں لگے گی۔" شوہر نے اطمینان سے کہا۔ "میں باتھ روم کا نل کھلا چھوڑ آیا ہوں۔"

رشیدہ بتول... کراچی

سیاست دان

ایک طویل آپریشن کے بعد سیاست دان کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وارڈ کے تمام دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے ہیں۔ اس نے پوچھا۔

"یہ پردے کیوں گرا دیے ہیں ڈاکٹر؟"

"بات یہ ہے جناب!" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "سڑک کے دوسری طرف بلڈنگ میں زبردست آگ لگی ہوئی ہے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ آپ ہوش میں آنے کے بعد یہ سمجھیں کہ آپریشن ناکام ہو گیا اور آپ جہنم میں پہنچ چکے ہیں۔"

حورین زیب... کھروڑپکا

نسخہ

"ڈاکٹر صاحب! میری زبان دیکھیے۔ میں پانچ منٹ سے باہر نکالے بیٹھی ہوں۔" مریضہ چلائی۔

ڈاکٹر بولا۔ "بس محترمہ! زبان اب اندر کر لیں۔ مجھے آپ کے لیے نسخہ لکھنا تھا۔ وہ میں نے سکون سے لکھ لیا ہے۔"

ماہا سرفراز... لاہور

چڑیل

"زویا آنٹی! مما نے چینی منگوائی ہے۔" ننھے عاطف نے کہا۔

زویا نے عاطف کو چینی دیتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! تمہاری ممی نے اور کیا کہا ہے؟"

"آنٹی! ممی کہہ رہی تھیں۔ اگر وہ چڑیل چینی نہ

دے تو شگفتہ آنٹی سے لے آنا۔" ننھے عاطف نے چینی سنبھالتے ہوئے مزے سے کہا۔

نسبت سنیعہ... کھروڑپکا

جھوٹی امید

نجومی نے سائل کا ہاتھ دیکھنے کے بعد گلا کھنکار کر صاف کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے صاحب! میں کسی کو جھوٹی امید دلانا پسند نہیں کرتا۔ میرا علم کہتا ہے کہ اناسی سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہو جائے گا۔ اڑتیس سال کی عمر میں آپ شادی شدہ ہوں گے اور آپ کے سولہ بچے ہوں گے۔"

"کیا بات کر رہے ہیں۔" ان صاحب نے بگڑتے ہوئے کہا۔ "اڑتیس سال کی عمر میں میری شادی ہو گی، اناسی سال کی عمر میں، میں مر جاؤں گا تو میرے سولہ بچے کیسے ہوں گے؟"

نجومی ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "آپ کی شادی جس بیوہ عورت سے ہو گی وہ پندرہ بچوں کی ماں ہو گی۔"

ثریا شاہ... کھروڑپکا

بے عزتی

"تم نے پولیس والے کی بے عزتی کی ہے؟" سارجنٹ نے غصے سے ملزم کو دیکھا اور پوچھا "کیا تم نے اسے جھوٹا کہا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"تم نے اسے چھچھورا کہا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"تم نے اسے بھینگا، لنگڑا، احمق اور ناکارہ بھی کہا تھا۔"

"جی نہیں۔" ملزم نے سادگی سے جواب دیا۔ "یہ باتیں تو اس وقت مجھے یاد ہی نہیں آئی تھیں۔"

(سمیرا سہیل... اوکاڑہ)

دوسری گولی

ایک سینما ہال میں پاکستانی پنجابی فلم چل رہی تھی۔ ایک سین میں ولن ایک مٹیار کی عزت لوٹنے کے لیے اس پر حملہ کرتا ہے۔ ولن کی ماں بندوق لے آتی ہے اور ولن کو گولی مار دیتی ہے، پھر بڑے رعب سے گردن اکڑا کر کہتی ہے۔

"سن وے بے غیرتا! تینوں دوجی گولی ایس لئی نئیں ماری کہ..." اتنا کہہ کر ولن کی ماں خاموش ہو جاتی ہے۔ ولن سینہ تھام کر نیچے گر جاتا ہے اور غیرت مند ماں سے سوال کرتا ہے۔

"چھیتی دس ماں... توں دوجی گولی مینوں کیوں نئیں ماری۔"

"سن وے بے غیرتا! دوجی گولی تینوں ایس لئی نئیں ماری کہ..." ماں پھر خاموش ہو جاتی ہے۔ ولن پھر سوال کرتا ہے۔

"توں دسدی کیوں نئیں ماں! توں مینوں دوجی گولی کیوں نئیں ماری؟"

ولن کی ماں فخر سے سینہ تان کر کہتی ہے۔ "کن کھول کے سن وے بے غیرتا... دوجی گولی تینوں ایس لئی نئیں ماری کہ... بندوق وچ اکو اک ای گولی سی۔"

شگفتہ فیاض... مشی گن امریکا

ایک کشتی کے سوار

مریض نے ڈاکٹر سے کہا۔ "جناب! میرے اعصاب بالکل جواب دے چکے ہیں۔ ذرا سی آہٹ پر چونک پڑتا ہوں۔ دروازے کی گھنٹی بجتی ہے تو دل دھڑکنے لگتا ہے۔ رات کو ٹھیک طرح سے سو نہیں پاتا۔ آخر مجھے کیا بیماری ہے؟"

"تمہاری اور میری بیماری میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم دونوں شادی شدہ ہیں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

نادرہ بخاری... کراچی

شگفتہ جاہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت سنان بن سنہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کھانے والے شکرگزار کے لیے صبر کرنے والے روزہ دار جتنا ثواب ہے۔ (مسند احمد)

فوائد و مسائل:۔

1۔ صبر اور شکر دونوں اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ مسلمان کو نعمت پر شکر، مصیبت پر صبر اور نیکی پر ثابت قدمی اختیار کرنی چاہیے۔

2۔ کھانا کھا کر شکر ادا کرنا بھی ایک نیکی ہے جب کہ کھانا حلال طریقے سے حاصل کیا گیا ہو اور وہ چیز خود بھی حلال ہو۔

3۔ جس طرح مردار اور خنزیر کا گوشت حرام ہے اسی طرح چوری، ڈاکے، دھوکے اور جھوٹ کے ذریعے سے یا تصویر سازی، شراب نوشی اور سودی کاروبار وغیرہ سے کمایا ہوا رزق بھی حرام ہے، ایسا رزق کھا کر زبان سے شکر کا لفظ کہہ لینے سے شکر ادا نہیں ہوتا۔

4۔ روزے کی افضلیت اس لیے ہے کہ وہ صبر پر مشتمل ہے۔ اللہ کے منع کیے ہوئے کاموں سے اجتناب کرنا بھی صبر ہے۔ اور نیکی کی راہ پر قائم رہنا بھی صبر ہے۔

5۔ شکر اور روزہ دونوں کے الگ الگ روحانی اور قلبی فوائد ہیں اس لیے مومن کو دونوں طرح کے اعمال کا اہتمام کرنا چاہیے۔

حضرت عمرؓ کا واقعہ،

حضرت عمرؓ نے ایک مجذوم عورت کو طواف کرتے دیکھا تو فرمایا۔

"اے اللہ کی بندی! اپنے گھر بیٹھ اور لوگوں کو تکلیف مت دے۔"

وہ طوعاً و کرہاً چلی گئی۔ چند سال کے بعد دیکھا پھر آرہی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت عمرؓ کا انتقال ہو چکا تھا مگر اس کو خبر نہ تھی۔ ایک شخص نے اس سے کہا۔

"اب دل کھول کر طواف کرلے کیونکہ عمرؓ (جنہوں نے منع کیا تھا) وفات پاچکے ہیں۔"

اس نے بہت تاسف کیا اور انا للہ پڑھا اور کہا۔

"میں اب آئندہ طواف نہ کروں گی۔ اگر عمر زندہ ہوتے تو طواف کرتی۔ میں ان کو مردہ سمجھ کر نہیں آئی تھی۔ بلکہ زندہ سمجھ کر آئی تھی۔ طواف کے شوق نے مجھے مجبور کیا اور میں نے جی میں کہا طواف کروں گی بہت سے بہت یہ سزا ہو جائے گی، عمرؓ ایسا شخص نہ تھا کہ زندگی میں تو اس کا حکم مانا جائے اور مرنے کے بعد نہ مانا جائے۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

دُنیا سے بے رغبتی،

بحیثیت خلیفہ سیدنا علی کی دُنیا سے بے رغبتی کے بے شمار واقعات تاریخ میں موجود ہیں۔ ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں شربت (فالودہ) پیش کیا گیا۔ آپ نے اس شربت کو مخاطب کرکے فرمایا۔

"تیری خوشبو اچھی ہے، رنگ حسین ہے۔ مزہ لذیذ ہے مگر میں نہیں چاہتا کہ نفس کو ایسی چیز کا عادی بناؤں جس کا وہ اب تک عادی نہیں ہے۔"

سیدنا علیؓ نے بیت المال کی امانت و حفاظت کی بھی قابلِ تقلید مثال قائم کی۔ ایک بار خطبہ دیا اور فرمایا۔

"لوگو! اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے تمہارے مال سے نہ تھوڑا لیا ہے نہ بہت، سوائے اس شیشے کے۔" اور جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر دکھائی جس میں عطر یا کوئی خوشبو تھی، سیدنا علیؓ نے کہا۔

"مجھے ایک دہقان نے یہ ہدیہ دیا ہے۔"

پھر وہ بیت المال تشریف لائے اور کہا۔ "یہ لو وہ شیشی۔" (بیت المال میں جمع کرادی)

عجیب و غریب،

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی عورت ہمارے پاس اکثر آیا کرتی تھی اور اکثر یہ شعر کہا کرتی۔

"ہار والا دن ہمارے رب کے عجائب میں سے ہے خوب سن لو کہ اس نے مجھے کافروں کے شر سے نجات دی۔

اس سے پوچھا گیا۔ "یہ جو شعر تم اتنی کثرت سے پڑھتی ہو، لگتا ہے کہ اس کے پس پشت کوئی واقعہ چھپا ہوا ہے تو وہ کیا واقعہ ہے۔ ذرا بتاؤ تو سہی؟"

اس نے کہا۔ "میں گاؤں میں ایک گھر میں کام کیا کرتی تھی تو ایک دن گھر والوں میں سے ایک لڑکی نے میرے سامنے ہار رکھ دیا۔ اتنے میں ایک شکاری چیل کا وہاں سے گزر ہوا۔ اور وہ ہماری بے خیالی میں ہار کو گوشت سمجھ کر اچک کر لے گئی۔

چنانچہ جب ان لوگوں نے ہار تلاش کیا اور ان کو نہیں ملا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "مجھے نہیں پتا۔"

انہوں نے کہا۔ "تم ہی اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔"

میں نے قسم اٹھائی اور معذرت کی لیکن انہوں نے میری قسم اور عذر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور مردوں کو بلوایا تو وہ آئے اور خوب چھان بین کی۔ مگر انہیں کچھ نہ ملا۔

تو بعض نے کہا۔ "اس نے اپنے کپڑوں میں چھپا لیا ہوگا۔"

چنانچہ انہوں نے میرے کپڑے اتارنے چاہے۔ اب ایسی عورت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے تھا جسے ایسا خوف لاحق ہو گیا تھا۔

جب مجھے اپنی بے عزتی کا یقین ہو چلا تو میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھا کر کہا۔

"یا رباہ اغثنی!"

ترجمہ:۔ "اے میرے رب! میری مدد کر۔"

اتنے میں چیل کا ہمارے اوپر سے دوبارہ گزر ہوا اور اس نے ہار کو ہمارے پاس پھینک دیا۔ پھر وہ لوگ بہت نادم ہوئے اور کہا۔

"ہم نے بے چاری پہ ظلم کیا" اور مجھ سے معذرت کرنے لگے۔

چنانچہ جب بھی میں کسی مصیبت میں مبتلا ہوتی ہوں تو اسے یاد کرتی ہوں۔ اور راحت کی امید کرتی ہوں۔ بخاری شریف میں یہ قصہ مختصر الفاظ میں مذکور ہے۔ اس کے آخر میں جب اس عورت کو اللہ تعالیٰ نے نجات دلوائی تو اس نے کہا۔

"اسی کے لیے تم لوگ مجھ پر تہمت لگا رہے تھے۔ حالانکہ میں اس سے بری تھی۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا،

"تمہیں کسی شخص کی نماز اور روزہ دھوکے میں نہ ڈال دے جو چاہے روزہ رکھے، چاہے نماز پڑھے مگر اس کا کوئی دین نہیں جو امانت دار نہیں۔"

تین صفات،

جس انسان میں تین صفات ہوں گی وہ کبھی شرمندہ نہیں ہوگا۔

1۔ صبر و تحمل۔

2۔ صلاح و مشورے کی عادت۔

3۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسا۔

دل آزاری،

کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ دل آزاری ہے۔ چاہے دل مومن کا ہو یا کافر کا۔

حلال اور حرام گوشت میں فرق،

امام جعفر صادق سے پوچھا گیا۔
"ذبح کیے ہوئے جانور اور مردار جانور کے گوشت میں فرق کیسے کیا جائے؟"
فرمایا" اگر گوشت آگ کی تپش سے سکڑتا ہے تو ذبح کا ہے۔ اگر پھیلتا ہے تو مردار کا ہے۔"

ایمان کی پہچان،

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں۔
"دل کی تین رگیں ہوتی ہیں۔ اگر اپنے ایمان کو پرکھنا ہے کہ تمہارا دل زندہ ہے یا مر گیا ہے تو
1۔ قرآن کھول کے پڑھو، دیکھو دل لگ رہا ہے یا نہیں۔
2۔ اس محفل میں بیٹھو جہاں اللہ کا ذکر ہو رہا ہو، دیکھو دل لگتا ہے یا نہیں۔
3۔ تنہائی میں بیٹھ کر دیکھو کیا تمہاری تنہائی پاک صاف ہے۔ اللہ بھی یاد آتا ہے کہ نہیں۔
اگر جواب "نہیں" میں ہے تو ڈر و اور اللہ سے دعا کرو کہ تم پر رحم فرمائے۔"

زبان پر قابو،

بہرام گور ایک درخت کے نیچے آرام کر رہا تھا کہ ایک پرندہ چہکنے لگا۔ اس نے فوراً تیر کمان اٹھایا اور پرندے کو گرا لیا۔ ادھر سے ایک فلسفی گزر رہا تھا۔ وہ بول اٹھا۔
"اگر یہ پرندہ "زبان" کو قابو میں رکھتا تو یہ انجام نہ ہوتا۔
(دانش عرب و عجم)

حرا قریشی۔ ملتان

ہمدردی اور غم خواری،

حضرت محمد بن سیرینؒ نے ایک شخص سے پوچھا کہ کیسے ہو؟
اس نے جواب دیا۔
"کیا حال ہو سکتا ہے اس شخص کا جو پانچ سو درہم کا قرض دار ہو اور عیال کثیر رکھتا ہو اور ایک پیسہ اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔"

یہ بات سن کر ابن سیرینؒ اپنے مکان پر تشریف لے گئے اور ایک ہزار درہم لا کر اس کے حوالے کیے کہ پانچ سو درہم قرضہ میں دے دو اور پانچ سو درہم اپنے اہل و عیال پر خرچ کرو۔"
آپؒ نے فرمایا۔
"دریافت حال کے بعد عملی طور پر غم خواری نہ کرنا منافقت ہے۔"
مخدوم کا اپنے خادم کے حالات سے آگاہ ہونا اور موقع و حالات کے مطابق تسلی، ہمدردی و ایثار کا اظہار کرنا ازروئے شریعت بے حد ضروری ہے۔

دو نقص،

امیر المومنین مہدی نے ایک نیا محل تعمیر کروایا۔
خلیفہ نے فرمایا۔
"کسی شخص کو اس محل کے نظارے سے منع نہ کیا جائے۔ ناظرین یا تو دوست ہوں گے یا دشمن۔ اگر دوست ہیں تو خوش و خرم ہوں گے اور ہمیں دوستوں کی خوش دلی مطلوب ہے اور اگر دشمن ہیں تو رنج اٹھائیں گے اور دل کوفتہ ہوں گے اور ہر شخص کی یہی مراد ہوتی ہے کہ دشمن کو رنج پہنچے، نیز شاید وہ کوئی عیب ڈھونڈیں اور کوئی نقص یا خرابی بتائیں تو اس نقص کو دور کر دیا جائے۔
ایک فقیر نے کہا" اس محل میں دو نقص ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اس میں ہمیشہ نہ رہیں گے، دوسرا یہ کہ یہ محل ہمیشہ نہ رہے گا۔"
خلیفہ اس کلام سے اس قدر خوش ہوا کہ وہ محل غرباء اور فقراء کے لیے وقف کر دیا۔

خالدہ جیلانی

الیشہ رفیق ___ ہارون آباد

وہ حیلہ گر ہیں جو مجبوریاں تلاش کریں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے ہوتے ہوئے

اقرا ملک ___ گوجرانوالہ

سفینے چھوڑ کے ساحل چلے تو ہیں لیکن
یہ دیکھنا ہے کہ اب کس ٹھکانے لگتے ہیں
پلک جھپکتے ہی دنیا اجاڑ دیتی ہے
وہ بستیاں جنہیں بستے زمانے لگتے ہیں

رومی انصاری ___ لاہور

اب نہ وہ منظر نہ وہ چہرے نظر آتے ہیں
مجھ کو معلوم نہ تھا، خواب بھی مر جاتے ہیں
جانے کس حال میں ہم ہیں کہ ہمیں دیکھ کے سب
ایک پل کے لیے رکتے ہیں گزر جاتے ہیں

سعدیہ ___ ڈہرکی

ہم کو تو غم کھا گئی منیر ہمیں گلہ نہیں
دیکھ تو کیا سے کیا ہوئے یار کے خدوخال بھی

عروبہ خان ___ کراچی

یہ انتقام بھی لینا تھا زندگی کو ابھی
جو لوگ دشمن جاں تھے وہ غم گسار ہوئے

عائشہ جمیل ___ لاہور

مجھ سے پہلے رخ سادہ کی حقیقت کیا تھی
منہ نہ کھلواؤ مری بات گراں گزرے گی

تحریم ___ گوجرہ

مسمار ہو سکے نہ گھروندے وفاؤں کے
آتے رہے پیار کی بستی میں زلزلے

ندا، فضہ یوسف ___ کراچی

ایثار کے دیار سے نفرت کے شہر تک
ہیں کس قدر طویل محبت کے سلسلے

ثناء اجالا ___ پھلوال

غرض کے واسطے جیتی ہے فطرتاً دنیا
بہار پھول کھلاتی نہیں خزاں کے لیے

درخشاں نور ___ فیصل آباد

جن پہ بے لوث محبت بھی بجا ناز کرے
ایسے نایاب ہی کردار نظر آتے ہیں

عالیہ جمیل ___ کراچی

مایوسیوں نے دل کا سفینہ ڈبو کے آج
افسوس ایک موج کو طوفان بنا دیا

سدرہ خان ___ کراچی

ہم عجیب طرز کے لوگ تھے کہ ہمارے اور ہی روگ تھے
میں خزاں میں اس کا تھا منتظر، اسے انتظار بہار تھا

فارحہ رضا ___ حیدرآباد

لے گیا وہ ساتھ اپنے دل کی ساری رونقیں
کس قدر یہ شہر تھا گنجان، خالی کر دیا

آسیہ جاوید ___ علی پور چٹھہ

غم زندگی! تری راہ میں، شب آرزو! تری چاہ میں
جو اجڑ گیا وہ بسا نہیں، جو بچھڑ گیا وہ ملا نہیں

حنا فرقان ___ گجرات

مرا ہمسفر جو عجیب ہے تو عجیب تر ہوں میں آپ بھی
مجھے منزلوں کی خبر نہیں، اسے راستوں کا پتا نہیں

عاصمہ لقمان ___ گوجرہ

ڈھونڈتے کیا ہو ان آنکھوں میں کہانی میری
خود میں گم رہنا تو عادت ہے پرانی میری
بھیڑ میں بھی تمہیں مل جاؤں گا آسانی سے
کھویا کھویا ہوا رہنا ہے نشانی میری

رضیہ جمیل

خط آپ کے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں
اللہ تعالیٰ سے آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں اللہ تعالیٰ ہم آپ کو، ہم سب کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین
پہلا خط بلال کالونی ملتان سے حرا قریشی کا ہے، لکھتی ہیں

"سروے" میں ہم نہیں کیا یہ "ظلم" نہیں...؟
اچھی بھلی ہنستی مسکراتی عید بدمزہ سی لگنے لگی جب سروے میں اپنا اسم خاص نہ پایا۔ ارے یہ کیا حیرت صد حیرت! سائرہ رضا کا پہلا خط۔

"ایسے لکھا جاتا ہے خط؟ ایسے لکھتے ہیں خط؟" قلب کے گم گشتہ پراسرار کونے سے صدا ابھری۔ تو رفیقہ من سائرہ جی! کبھی ہم نے اپنا خط بھی اتنے ذوق و شوق سے نہیں پڑھا بار بار، جتنا اس کو، ایک دفعہ "عائشہ فیاض" کا خط پڑھا تھا تو ان حروف باکمال کی مٹھاس اور صداقت پر فوراً "دل نے کہا تھا کہ یہ عام قاری نہیں اور بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ تو مصنفہ ہیں۔ خط وہ بھی کمال تھا اور یہ بھی بادشاہو! محفل کا میلہ تے تساں لٹ لیتا! الغرض ان کے جملوں میں عیاں کارگر بے ساختگی، لطافت اور زندگی سے بھرپور جملوں پر "واہ واہ" کیے بغیر نہ رہ سکے۔ پر پیچ باریک بیں، پراثر تحاریر کی مالکہ "سمیرا حمید" کی جانب بڑھتے ہیں۔ "یارم" ایک خوب صورت شاہکار کی طرح بہت نیچے سے بہت اوپر جاتی دکھائی دے رہی ہے۔

لگی رہیں سمیرا جی! ہماری پرخلوص تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ "زہر" قرۃ العین کی تحریر کا موضوع تو بھلے سے پرانا تھا، لیکن ایک اچھوتا انداز لیے ہوئے تھا۔ "شکریہ" عنیقہ جی ایک اچھا سبق منظر عام پر لانے کے لیے شکریہ! "ہم سے ہے زمانہ" تجل (میری اسٹوڈنٹ) نے شکایت کی کہ "بس چار ہی ورق لکھے ثمرہ بخاری نے؟ (منہ بسورتے ہوئے) ہم نہیں بولتے آپ سے!" بہرکیف ہمیں تو ازحد خوشی ہوئی کہ انہوں نے اپنے نادر و نایاب وقت سے کچھ لمحے ہمارے لیے مختص کیے (سدا بہاروں کے سنگ رہیے ہنستی مسکراتی!) "محبتوں میں انا کی بات نہیں چلتی" بھی اچھی کاوش رہی۔ دماغ میں پرمسرت سوچوں کی نشوونما کرتی آسیہ رزاقی کی تحریر نے عید سعید کی خوشیوں کو اپنی نایاب تحریر سے مزید نایاب کر دیا۔ "سنیعہ عمر" کو فرسٹ ٹائم پڑھا۔ آری اور ایمنس کی گفتگو کہانی کی بنت میں نت نئے رنگ بھرتی اس کے لطف کو دوچند کرتی گئی۔ ارے ہاں یاد آیا! "یارم" کی دوسری قسط کا اختتامیہ فقرہ زبردست تھا۔ گریٹ سکس! گویا ایک ہی وقت میں آفریدی نے بائی سکور کر کے سینچری بنالی ہو۔

حمد کا پانچواں شعر کئی دفعہ پڑھا کہ اس میں اپنی دبی دبی آرزو بدت سے مقیم ہے۔ عید سروے میں پیاری قارئین کی گفتگو حقیقت کے خیمے میں مستور حقیقت سے قریب تر لگی۔

ج : پیاری حرا! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ عید سروے میں آپ شامل نہ ہو سکیں۔ آپ کا سروے موصول ہوا تو پرچا پریس جا چکا تھا۔ اس لیے آپ کا سروے شامل نہ کر سکے۔ معذرت خواہ ہیں۔ اس ماہ بقر عید کے لیے جو سروے دیا جا رہا ہے۔ اس کے جواب جلد بھجوا دیجیے گا تاکہ شامل ہو سکیں۔
تبصرہ حسب معمول، حسب روایت بہت خوب ہے۔

آپ کی تعریف و تنقید ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

یوکے سے صائمہ اسد قریشی نے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں

میں شعاع کی چوبیس سال سے خاموش قاری ہوں اور میں نے اسے ہمیشہ بہت معیاری اور بہت ہی اچھا پایا۔ خصوصاً "مذہب کے حوالے سے اتنی اچھی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں جن کا کوئی جواب نہیں۔ بہت ہلکے پھلکے انداز سے اسلامی معلومات مل جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے ہم سب کو آپ کا ممنون ہونا چاہیے۔

آج جس چیز نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کردیا ہے وہ ہے "ایک تھی مثال" بے شک رخسانہ نگار نے بہت اچھے انداز میں لکھا ہے۔ رخسانہ نگار ہماری بہت سینئر رائٹر ہیں لیکن میں ان کو کہنا چاہتی ہوں کہ مثال اور واثق کا کردار بہت اپ سیٹنگ اور ڈپریسنگ لکھا ہے۔ بے شک یہ ہمارے معاشرے کی ہی کہانیاں ہیں ان میں بہت سچائی ہے لیکن آج کے دور میں ہر انسان پہلے ہی اتنا پریشانیوں کا سامنا کر رہا ہے اور بہت سی بیواؤں کو بالکل ایسے ہی حالات کا سامنا ہے لیکن قاری اپنے حالات میں سے وقت نکال کر ان ڈائجسٹ کو پڑھتا ہے تو وہ حق دار ہے کہ پڑھنے کے لیے

اتنی ہلکی پھلکی تحریریں ہوں جو کہ اپنی پریشانیوں سے ہٹ کر کچھ دیر کے لیے موڈ اچھا کر دے نا کہ اپنی پریشانیوں کے ساتھ ساتھ ان کرداروں کی پریشانیاں بھی اعصاب پر سوار ہو جائیں۔ میری رخسانہ صاحبہ سے گزارش ہے کہ پلیز کہانی کو آگے جا کر ہلکا پھلکا لکھنے کی کوشش کریں تاکہ پڑھنے والا اپنے حالات کے ساتھ ساتھ ان کرداروں کے لیے بھی ڈپریس نہ ہو۔

باقی سب تحریریں بے حد دلچسپ اور اچھی تھیں۔

ج : پیاری صائمہ! بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمیں اتنی دور جا کر بھی یاد رکھا ہے اور خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

زندگی اتنی آسان چیز نہیں ہے۔ یہاں ایک قدم غلط اٹھ جائے تو بعض اوقات بہت دور تک اور بہت دیر تک اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ رخسانہ نے اس ناول میں یہی بتایا ہے۔ جذبات اور غصہ میں آکر کی ہوئی ایک غلطی نے نہ صرف ایک گھر توڑا بلکہ ایک لڑکی کا بچپن چھین کر اس کی زندگی کو محرومیوں کی نذر کردیا۔ یہ کہانی آئینہ ہے ان لوگوں کے لیے جو طلاق کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس مسائل اور ٹینشن کے دور میں اس طرح کی دکھ بھری کہانیاں پڑھ دل افسردہ ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں اس کا احساس بھی ہے اسی لیے ہم زیادہ تر خوش گوار کہانیاں دیتے ہیں آپ نے خود اعتراف کیا ہے کہ باقی سب تحریریں ایسی نہیں تھیں۔ تو ایک کہانی ایسی بھی سہی۔

آپ کے اطمینان کے لیے بتادیں کہ آگے کہانی ایک خوش گوار موڑ لے رہی ہے۔

سمیعہ انعم ضلع چنیوٹ سے لکھتی ہیں

پچھلے ماہ میرا خط شائع تو ہو گیا مگر آدھا ادھورا نام بھی غلط چھپ گیا سمیرا انجم جبکہ میرا نام ہے سمیعہ انعم اور ناول کا نام تھا۔ "بیتے پل کا سایہ" آپ نے لکھ دیا پل بیتے کا سایہ۔ بازار میرے گھر سے کافی دور ہے اور پھر میرا روزہ اوپر سے اتنی سخت گرمی میں سب کچھ بھلا کر محض اس لیے رسالہ لینے چلی گئی کہ اس میں میرا خط شامل ہے مگر خط دیکھ کر بہت دکھ ہوا اور میں روہانسی ہو گئی۔ فرینڈز کے درمیان بکی ہوئی وہ الگ۔

ج : پیاری سمیعہ! معذرت خواہ ہیں' آپ کا نام غلط شائع ہو گیا۔ آپ اپنے گاؤں کے بارے میں لکھیں ہم ضرور شائع کریں گے۔

اقراء ملک نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے

پانچ سالہ خاموشی "صنم سے صمد تک" کے لیے توڑنی پڑی۔ منتظر کو حیا کی قدر نہ ہو سکی اور ماہم جیسی خود غرض اس کی بیوی بنی۔ "رقص بسمل" میری فیورٹ کہانی ہے۔ "ایک تھی مثال" رخسانہ جی آپ مثال کے ساتھ بہت برا کر رہی ہیں۔

ج : پیاری اقراء! اب خاموشی ٹوٹ گئی ہے تو یہ سلسلہ جاری رکھیے گا اور ہمیں خط لکھ کر ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

مدیحہ عارف نے لکھا ہے

میری کمی کسی کو محسوس نہ ہوئی ہوگی پر پھر بھی مجھے تو تمام مصنفین اور قارئین بے حد عزیز ہیں۔ اس بار خط

آپ کے میں موسٹ فیورٹ سائرہ رضا کا خط پڑھ کر دل جھوم اٹھا۔

سچی بات ہے میں تو سب سے پہلے سمیرا جی کے ناول "یارم" کی طرف گئی اور ایک ہی نشست میں پڑھ کر مزہ لیا۔ لیڈی مہر کا کیا کردار تخلیق کیا ہے' واہ اور عالیان اور امرحہ اوسم۔ امرحہ کی فائل گم ہونا' عالیان کا اسے واپس لانا زبردست رہا۔ اس کے بعد آسیہ رزاقی کا نایاب ہیں ہم خوب عمدہ رہا۔ اس میں ثوبیہ کا کردار دل کو بھایا اور میرے خیال میں تو آج کے دور کی یہی ضرورت ہے کہ لڑکی باہمت اور بہادر ہو' اور کچن بھی خوب سنبھالے میری طرح نہیں جو کچن کا نام سنتے ہی دوڑ لگا دیتی ہے۔

"بازگشت" نے مزہ دیا۔ خوب انجوائے کرکے پڑھا۔ پر آدی کا یوں ماہم کے لیے لاپرواہ ہونا اچھا نہیں لگا۔

اب رقص بسمل کے راز سے پردہ اٹھ جانا چاہیے۔ ایک تھی مثال پتا نہیں اور کتنے دکھ لکھنے ہیں رخسانہ نگار عدنان نے مثال کی زندگی میں۔

افسانے سب ہی اچھے تھے' پر "شکریہ" بازی لے گیا۔ مجھے بہت پسند آیا۔ اس کے بعد قرۃ العین کا زہر اچھا رہا ایک عام سی گھر گھر کی کہانی اچھے الفاظ میں بیان کی انہوں نے اور اب محبتوں میں انا۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے اس کا ذکر آخر میں کیوں تو وہ اس لیے کہ یہ مجھے بہت ہی زیادہ اچھا لگا۔ آؤ کہ ہم اپنی اپنی رنجشوں کو بھلا دیں اس نظم نے تو مجھے اپنا فین بنا لیا۔

ایک ریکویسٹ تھی پلیز دستک میں فواد خان کو لائیے نا اور تاریخ کے جھروکے میں شیر شاہ سوری کو لکھیے۔

ج : مدیحہ! آپ کی فرمائشیں نوٹ کرلی ہیں۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ کچن کا نام سنتے ہی آپ دوڑ لگا دیتی ہیں تو یہ راز بھی بتا دیں کہ آپ کے گھر والے آپ کو بخش کیسے دیتے ہیں ورنہ تو دس کام کرلیں اور ایک کام نہ کریں تو فوراً "کام چوری کا طعنہ مل جاتا ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے آپ کے ممنون ہیں۔ متعلقہ مصنفین تک تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے اور ایک ضروری بات نوٹ کرلیں کہ آپ کی کمی کوئی محسوس کرے یا نہ کرے' ہمیں بے حد محسوس ہوتی ہے۔ ہمیں ہر ماہ باقاعدگی سے خط لکھا کریں۔

رافیہ کنول ویرہ دون پناہ سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

مجھے پڑھنے اور سیکھنے کا بے حد شوق ہے۔ مگر میرے آس پاس کے کچھ لوگ اسے میرا پاگل پن سمجھتے ہیں اور جب بھی ان کو موقع ملتا ہے وہ میرے گھر والوں کو میرے خلاف اکساتے ہیں۔ میرا دل دکھتا ہے۔ ٹائٹل بہت خوب صورت تھا نبیلہ جی کا ناول رقص بسمل بہت شان دار جا رہا ہے۔ خاص کر عزت کی اس قدر بے نیازی پلیز آپی تیمور حیدر کے ساتھ کچھ غلط مت کیجئے گا۔ اس کے بعد سمیرا حمید کا ناول یارم یہ ایک ایسی کہانی ہے جس کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ آسیہ رزاقی کا "نایاب ہیں ہم" ثوبیہ اپنی حرکتوں کی وجہ سے بالکل اچھی نہیں لگی سنیعہ عمیر کی بازگشت ایک منفرد کہانی تھی۔ ماہم کی معصومیت دل کو پسند آئی پلیز نبیلہ عزیز کا انٹرویو شامل کریں میں انہیں پڑھنا چاہتی ہوں۔

ج : رافیہ! کوئی بلاوجہ برائی کرے یا تنقید کرے تو واقعی بہت دکھ ہوتا ہے لیکن اگر آپ اپنی جگہ درست ہیں اور خود کو حق بجانب سمجھتی ہیں تو بالکل توجہ نہ دیں۔ ایک بار دل میں یہ سوچ لیں گی کہ مجھے بلاوجہ کی باتوں پر دھیان نہیں دینا تو پھر آپ کو تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ پڑھنے اور کچھ سیکھنے کا شوق بہت اچھی بات ہے لیکن ایک بات کا دھیان رکھیں کہ کوئی بھی شوق جنون نہیں بنانا چاہیے۔ اعتدال سے ہٹ کر' حد سے بڑھا ہوا کوئی بھی عمل خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ اچھا نہیں رہتا۔

سمیرا حمید اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

طوبیٰ سلیم نے سمیجہ آباد ملتان سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں

ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ سب سے پہلے "رقص بسمل" پڑھی۔ اچھی لگی۔ اس کے بعد سمیرا جی کا "یارم" کیا خوب لکھا ہے۔ ثمرہ بخاری نے بہت انتظار کروایا لیکن اس بار "ہم سے ہے زمانہ" دیکھ کر سارے انتظار کی کوفت دور ہو گئی۔ میں' میری کزنز اور بھائی بہت شوق سے پڑھتے ہیں ثمرہ جی پلیز دوبارہ جلدی جلدی آئیے گا آسیہ رزاقی کا "نایاب ہیں ہم" عید کے لحاظ سے کچھ نٹ کھٹ سے رنگ

لیے اچھا لگا۔ سنیعہ عمیر کا "بازگشت" بھی بہت خوب تھا، خصوصاً "اس ناول کی شروعات خاموشی کے ذکر سے جو شروع ہوئی۔ ان الفاظ نے کئی بار روکا۔ غور سے پڑھنے پر مجبور کیا۔ مسحور کیا۔ خطوط میں سائرہ رضا کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی۔ سائرہ جی بہت بڑی فین ہوں میں آپ کی۔

ج : پیاری طوبیٰ آپ، آپ کی کزنز اور بھائی ہی نہیں ثمرہ بخاری کو ہم بھی بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ وہ جتنا اچھا مزاح لکھتی ہیں' ان کی سنجیدہ کہانیاں بھی اتنی ہی عمدہ ہوتی ہیں۔ جب سے ٹی وی کو پیاری ہوئی ہیں لکھنا کم کر دیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم اور ہمارے قارئین ان کی کمی بے حد محسوس کرتے ہیں، ثمرہ آپ ہماری بہت اچھی مصنفہ ہیں۔ پلیز لکھنا نہ چھوڑیں۔

سنیعہ عمر نئی مصنفہ ہیں لیکن انداز کی پختگی' کہانی پر گرفت اور سب سے بڑی بات کہانی کے اختتام کا سلیقہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ آگے چل کر بہت اچھا لکھیں گی۔

سمیرا حمید اور سائرہ رضا خود کو منوا چکی ہیں۔ ہماری دعا ہے وہ ہمیشہ اسی طرح لکھتی رہیں۔ آمین

رابعہ اسلم وڑائچ نے رحیم یار خان سے خط لکھا ہے

اگست کا شمارہ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ بہت دیر سے ملا۔ عید سروے خوب رہا۔ رضیہ مہدی کی تحریر بہت اچھی لگی۔

ثمرہ بخاری اپنے مخصوص اسٹائل کے ساتھ دلچسپ تحریر لے کر آئیں۔ ہلکی پھلکی سی۔ دادی کا کردار تو بڑا دلچسپ لگا۔ رمشہ خالد نے اچھے ٹاپک پر لکھا اور واقعی ہر شوق اعتدال میں اچھا لگتا ہے اور جناب عنیقہ محمد بیگ کی "شکریہ" تو بڑی دلچسپ لگی۔ بس اس کا نام حوریہ ہی رہنے دیتیں ناں....

قرۃ العین کی "زہر" سبق آموز تحریر تھی۔ اب بات ہو جائے "یارم" کی تو جناب کیا ہی بات ہے۔ میں تو سمیرا حمید کی بہت بڑی (FAN) پنکھی بن گئی ہوں۔ واہ بہت اعلیٰ۔ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

ج : پیاری رابعہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

بینا صدف نے ٹوپی سے شرکت کی ہے لکھا ہے

ٹائٹل عید کی مناسبت سے کافی اچھا تھا۔ "ایک تھی مثال" پڑھی مثال کی حالت پڑھ کے بہت دکھ ہوا۔ میرے خیال میں ان سب میں سارا قصور عدیل کا ہے۔ کیونکہ مرد کو اگر اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے کا حق دیا ہے۔ تو اس پر یہ لازم ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر یہ حق استعمال کرے۔ یارم بہت ہی زبردست جا رہا ہے۔ عالیان کا امرحہ کو سالگرہ وش کرنے کا جملہ "کہ وقت تمہیں زندہ رکھے" بہت ہی اچھا بلکہ منفرد لگا۔ "رقص بسمل" شروع کیا۔ لیکن یہ کیا۔ ساتویں صفحے پر ہی باقی آئندہ دیکھ کے کوفت کا شکار ہوئی۔ پلیز کچھ تو صفحات بڑھائیں "خط آپ کے" میں سائرہ رضا کا خط بہت ہی زبردست تھا۔

ویسے اس دفعہ عید پر ثمرہ جی نے کافی تگڑی عیدی دی ہے۔ تتلی اور جوادی کی صورت میں۔ اب آتے ہیں۔ ہمارے پیارے شہر ٹوپی کی طرف۔ جو کہ کافی شہرت رکھتا ہے۔ کے پی کے کے پہلے گورنر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کا تعلق اسی شہر سے ہے اور ان کی آخری آرام گاہ بھی یہیں پر ہے۔ غلام اسحاق خان انسٹیٹیوٹ بھی یہیں واقع ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پرائیویٹ اور گورنمنٹ اسکولوں کی بھی بہتات ہے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے علیحدہ علیحدہ ہائی اسکول بھی ہیں۔ یہاں کے لوگ اعلا تعلیم یافتہ ہیں۔ تربیلا ڈیم بھی ٹوپی کے نزدیک ہی واقع ہے۔

ج : پیاری بینا! آپ کے پیارے شہر ٹوپی کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا' ہمارا خیال تھا۔ چھوٹا سا شہر ہو گا۔ یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ بڑا شہر ہے اور وہاں تمام سہولیات بھی مہیا ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ نبیلہ عزیز سے ہمیں بھی یہی شکایت ہے کہ وہ قسط بہت مختصر لکھتی ہیں۔

حسنہ زہرا نے ہنگو خیبر پختون خواہ سے لکھا ہے

شعاع مجھے بہت بہت پسند ہے۔ شعاع کے تمام اسٹاف کو میرا سلام۔ اللہ آپ لوگوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔

ج : پیاری حسنہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ خیبر پختون خواہ سے خط موصول ہوتا ہے تو ہمیں بے حد خوشی

ہوتی ہے کیونکہ پہلے کے پی کے سے بہت کم بہنیں خط لکھتی تھیں۔ پاکستان میں ایک خوش آئند تبدیلی آ رہی ہے۔

ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ پاک آپ کو سلامتی کے ساتھ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

امتہ السلام نے شیخوپورہ سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

ٹائٹل نے خوشگوار اثر ڈالا۔ ماڈل کو پہنایا گیا زیور خاص پسند نہیں آیا۔ رخسانہ نگار عدنان کے "ایک تھی مثال" کی طرف سب سے پہلے بھاگی۔ صد شکر کہ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ رخسانہ نگار عدنان کافی عرصے بعد آئی ہیں اور اپنے سحر میں باندھ چکی ہیں۔ رخسانہ نگار وہ رائٹر ہیں جن کا ذکر میں نے پہلی مرتبہ اپنی امی سے سنا۔ میری زی زی ان کی تعریفیں کرتی پائی گئیں جب انہیں پڑھا تو قائل ہو گئی وہ اکثر انیسہ سلیم کا ذکر بھی کرتی ہیں آخر وہ کہاں ہیں؟ رقص بسمل ابھی تک مجھے کوئی خاص متاثر نہیں کر سکا نبیلہ عزیز اس سے بہت بہتر لکھ سکتی ہیں۔

سائرہ رضا نے بالکل ٹھیک کہا۔ سمیرا حمید کا نام پڑھتے ہوئے ان کی لکھی کہانی کو چونکی بلی بن کر نہ پڑھوں' ایسا ممکن نہیں۔ سمیرا حمید کا افسانہ "بوند بوند تماشا" میرے ذہن میں نقش ہوا پڑا ہے ورنہ افسانے مجھے خاص یاد نہیں رہتے۔ سمیرا حمید کا "یارم" پڑھنے کے بعد میرے احساسات ایسے تھے کہ میرا دل کر رہا تھا کہ میں بھی کچھ کروں' نایاب ہیں ہم اور' بازگشت دونوں کچھ خاص تاثر قائم نہ کر سکے۔ یہ بشریٰ جی "سفال گر" کے بعد کہاں گئیں میں تو انتظار میں اپنے فیورٹ بک + ناول کی ہیروئن بنی بیٹھی ہوں بس امید ہے کہ فاطمہ کی طرح جو (The alchemist paulo Coehilo) ناول کا کردار ہے پر امید رہوں حتیٰ کہ بشریٰ اپنے ناول کے ساتھ جلوہ گر ہوں جیسے فاطمہ کے لیے صحرا میں بھی امید آ گئی تھی۔

ج : پیاری امتہ السلام! کچھ کرنے کو دل چاہا' یہ ہی بڑی بات ہے۔ وہ کہانیاں جو بے عملی کی ترغیب دیں۔ ہمیں سخت ناپسند ہیں۔ صحیح سمت میں کوشش ہر انسان کا فرض ہے۔ کوشش کا نتیجہ انسان کی تقدیر ہے۔ بغیر کچھ کیے کچھ پانے کی توقع' انتظار میں بیٹھنے والے اکثر ناکام ہی رہتے ہیں۔ اور بقول ڈاکٹر عبدالقدیر خان انہیں ملتا بھی ہے تو اتنا جتنا کوشش کرنے والوں سے بچ جاتا ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

الیشہ رفیق ہارون آباد سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

اس بار سارا شعاع ہی لاجواب تھا جولائی میں ختم ہونے والے کنیز نبوی کے ناول "صنم سے صمد تک" میں حیا کے ساتھ ہونے والا سلوک پڑھ کر بہت روئی۔ اصل میں جولائی میں میرے تایا ابو کینیڈا سے آئے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا میرے لیے لیپ ٹاپ لانے کا وہ تو آ گئے مگر لیپ ٹاپ نہ آیا کیونکہ وہ کزن لے کر آئے گا۔ اگست میں تو کچھ حیا کا دکھ اور کچھ اپنے لیپ ٹاپ کا میں نے آپ سے ایک ریکویسٹ کرنی ہے' پلیز کوئی ایک آدھ سٹوری ایسی بھی لکھ دیں جس میں ہیرو آرمی میں ہو پلیز.... مجھے آرمی میں جانے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ آپ سب اور پڑھنے والے قارئین دعا کیجئے گا۔ مجھے کمیشن مل جائے اور خواب بھی۔

ج : الیشہ! شمالی وزیرستان میں جو کچھ ہو رہا ہے' اس کا ہمیں بھی بے حد دکھ ہے شمالی وزیرستان آپریشن سے 20 لاکھ افراد بے گھر' بے سرو ساماں دربدر ہو گئے ہیں۔ ڈرون حملوں میں بے گناہ افراد شہید ہو رہے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ حق کی فتح ہو جو بے گناہ افراد شہید ہو رہے ہیں۔ ان بے گناہ لوگوں کا لہو رائیگاں نہ جائے اور ان بے گھر' مظلوم افراد کے دکھی دلوں سے نکلتی دعائیں قبول ہوں۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کے حق میں بہتر کرے۔ آپ کا آرمی میں جانے کا شوق ضرور پورا ہو گا اگر شوق و لگن ہو تو ناممکن بھی ممکن ہو جاتے ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ مصنفین تک آپ کی فرمائش پہنچائی جا رہی ہے۔

انیلہ بتول' الوین فاطمہ' سائرہ زاہد' افنان اشفاق ملتان سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

ماڈل کا ڈریس بہت زبردست تھا لیکن ماڈل پسند نہیں آئی۔ پچھلے ماہ سب سے زیادہ جو ناول پسند آیا' وہ "صنم سے صمد تک" تھا۔ ویسے کنیز نبوی جی! آپ کے ناول کا ہر ہیرو اتنا ظالم کیوں ہوتا ہے۔ آپ اتنا زبردستی لکھتی ہیں لیکن اتنا کم کیوں لکھتی ہیں ہماری خواہش ہے کہ آپ سے ملاقات کریں۔ ایک تھی مثال اور رقص بسمل اچھے جا رہے ہیں۔

رمشہ خالد کا محبتوں میں انا کی بات بہت پسند آیا۔ عنیقہ کا افسانہ شکریہ بہت زبردست تھا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ سمیرا حمید کا یارم اچھا جا رہا ہے لیکن سمیرا کا افسانہ دمڑی مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ پلیز کرکٹر احمد شہزاد کا انٹرویو شائع کردیں۔ عفت سحر کا ناول بن مانگی دعا بہت پسند ہے۔

ہم اپنے گاؤں کے بارے میں بتانا چاہیں گے کہ ہمارے گاؤں کی سڑکیں پکی اور کشادہ ہیں۔ گاؤں میں صحت اور تعلیم کی سہولت موجود ہے۔ حال ہی میں ہمارے گاؤں کے قریب ڈگری کالج کا اجرا ہوا ہے جس کی وجہ سے اب ہر لڑکی آزادی سے تعلیم حاصل کرسکتی ہے۔ اگر گاؤں سے باہر جائیں تو سرسبز کھیت آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتے ہیں۔ ضرورت کی ہر شے یہاں پر دستیاب ہے ہمارے گھر میں شعاع اور خواتین باقاعدگی سے آتا ہے اور ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ سب سے پہلے میں پڑھوں اور قرعہ فال سب سے پہلے بھابھی سائرہ کے نام نکلتا ہے۔ پلیز فرحت اشتیاق اور عمیرہ احمد سے کچھ لکھوائیں۔

ج : ایلہ 'بتول' الوین فاطمہ 'سائرہ زاہد اور افنان آفاق! سائرہ زاہد کا تو ہمیں آپ نے بتادیا 'وہ آپ کی بھابھی ہیں جو سب سے پہلے شعاع اور خواتین پڑھتی ہیں۔ باقی آپ لوگ بہنیں ہیں یا کزنز.....؟ آپ کے گاؤں کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔ پاکستان کا دیہی علاقہ ترقی اور تعلیم کی طرف بڑھ رہا ہے 'وہاں لڑکیاں تعلیم حاصل کررہی ہیں۔ یہ امر ہمارے لیے بے حد خوشی کا باعث ہے۔

آپ سب لوگوں کا شکریہ۔ آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کیجئے گا۔

فوزیہ صادق کسووال سے شریک محفل ہیں 'لکھا ہے

کافی عرصے بعد لکھنے بیٹھی ہوں۔ کچھ عرصے سے ایسی مصروفیت نے زندگی کو گھیر لیا کہ بہت بار چاہنے کے باوجود لیٹر نہ لکھ سکی۔ شعاع اور میرا ساتھ چودہ سال پرانا ہے۔ آج میں کسی خاص تحریر پر تبصرہ نہیں کروں گی۔ آج تو آپ سے اور سب قارئین سے ملاقات کرنے آئی ہوں قارئین کے لیٹرز پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے، بہت سی تحریریں جو نہیں پڑھی جاتیں 'ان کی تعریف یا تنقید پڑھ کر پھر ضرور میں وہ تحریر پڑھتی ہوں۔ کچھ عرصے سے بہت سی نئی رائٹرز کا اضافہ ہوا جن میں امایہ خان قابل ذکر ہیں۔

پچھلے کچھ عرصے سے قسط وار ناولز بہت شائع ہونے لگے ہیں۔ آپی آپ سے گزارش ہے کہ پلیز ناول کو اتنی اقساط میں نہ لے کر جایا کریں۔ آج کے جدید دور میں قارئین کے لیے اتنا انتظار کرنا بہت مشکل ہوتا ہے 'دوسری بات یہ کہ بے شک کہانیاں معاشرے سے ہی جنم لیتی ہیں رائٹرز سے گزارش ہے کہ تکلیف دہ موضوع کے بجائے ہلکے پھلکے موضوعات کو شامل کریں۔

غم زدہ 'دکھی تحریریں پڑھ کر یقینا" ہماری سوچ بھی ویسی ہی ہوجاتی ہے۔

اور کوئی بھی ہلکی پھلکی 'مزاح کا تاثر لیے ہوئے تحریر پڑھ کر ہم خود کو بھی بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگ جاتے ہیں۔

"ایک تھی مثال" شروع سے اب تک میرا فیورٹ رہا ہے۔

"رقص بسمل" بہت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ماورا کا کردار کچھ زیادہ ہی انا پرست سا ہے۔ سمیرا حمید کا "یارم" جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہنستی مسکراتی تحریر "ہم سے ہے زمانہ" میں جوادی اور شبلی کی شرارتیں اس بار پھر مزا دے گئیں لیکن ان دونوں کی دادی اور ماموں کی کمی محسوس ہوئی۔

"خط آپ کے" میں سائرہ رضا سے ملاقات بہت اچھی لگی۔ سائرہ جی آپ کی تحریر جتنی بھی لمبی ہو 'مجھے تو ہمیشہ بہت بہت پسند آتی ہے۔

ج : پیاری فوزیہ! طویل عرصہ بعد آپ کی آمد پر ایک خوشگوار سا احساس دل کو چھو گیا جیسے کسی پرانے دوست سے اچانک ملاقات ہوجائے۔

امایہ خان بلاشبہ ایک قابل قدر اضافہ ہیں 'پچھلے ماہ سنیعہ عمیر کا مکمل ناول شائع ہوا تھا 'ہمیں ان سے بھی بہت توقعات ہیں 'میمونہ صدف 'نور عین بھی اچھا لکھ رہی ہیں اور سائرہ رضا تو واقعی کچھ بھی لکھیں 'کمال لکھتی ہیں۔

قسط وار کہانیاں ہمیں بھی بالکل پسند نہیں لیکن مصنفین اگر طویل کہانیاں لکھیں تو آپ ہی بتائیں کہ کیا کیا جائے؟

عمرانہ جمیل نے میاں چنوں سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

"ایک تھی مثال" میں رخسانہ نگار نے بہت اچھی طرح مثال کی ماں کی دکھاوے کی محبت کو واضح کیا۔ بہت گریٹ ہیں آپ۔

"یارم" سمیرا حمید آپ نے کوئی کمی نہیں چھوڑی۔

ج : عمرانہ! مثال کی ماں کی محبت دکھاوے کی محبت نہیں ہے' رخسانہ نگار نے ایک ماں کی مجبوری دکھائی ہے جو ایسے حالات کا شکار ہوگئی ہے کہ اپنی اولاد کے لیے کچھ نہیں کرسکتی۔

رخسانہ عبدالغفار نے شاہ نکدر چک نمبر 155 سے لکھا ہے

غالبا" سات آٹھ سال بعد آج ایک دفعہ پھر بزم شعاع میں حاضر ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شعاع پڑھنا چھوڑ دیا۔ بس گردش دوراں میں کچھ یوں الجھے کہ...

ٹائٹل تو اس بار بہت اچھا لگا۔ پچھلے ماہ کنیز نبوی کا ناول پڑھا۔ آغاز سے اختتام تک ناول نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر "کنیز نبوی" میرے پاس تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔

سلسلے وار ناولز "ایک تھی مثال" میری موسٹ فیورٹ رائٹر رخسانہ نگار کا ناول بھی زبردست جارہا ہے رخسانہ جی مثال پر ہاتھ ذرا ہولا رکھیں۔ "رقص بسمل" بھی اچھا مگر بہت سلو جارہا ہے۔ یارم پر تبصرہ ادھار رہا۔ باقی تمام مستقل سلسلے بھی زبردست تھے۔

ج : پیاری رخسانہ! گردش دوراں تو کسی کو بھی چین نہیں لینے دیتی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ دوستوں سے ملاقات ترک کردی جائے۔ خط آدھی ملاقات ہوتی ہے۔ سات آٹھ سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ اب اتنا طویل وقفہ نہ دیجیے گا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

یاسمین حنفی نے کراچی سے لکھا ہے

ٹائٹل پہ اورنج کلر بہت پیارا لگ رہا تھا۔ (ماڈل پہ اچھا نہیں لگ رہا تھا) "ایک تھی مثال" رخسانہ جی آپ سے ہاتھ جوڑ کر گزارش ہے کہ بس کردیں بہت ہوگیا یار.... 20 قسطوں میں مثال کی درد بھری زندگی دکھائیں گی.... اور جب مثال خوش ہوگی تو وہ لاسٹ قسط کردیں گی.... (یہ بھی کوئی گل ہوئی) "رقص بسمل" یہ تو دوسرا "در دل" اسٹارٹ ہونے جارہا ہے.... ہمیں یقین ہے کہ (در دل) کی طرح 30 قسطوں سے پہلے ماورا کا ماضی نہیں کھولنے والی رائٹر صاحبہ "نایاب ہیں ہم" ہیرو ہیروئن تو نہیں پر ہاں ہم قارئین ضرور نایاب ہیں جو ایسی تحریریں برداشت کرتے ہیں "یارم" اس ناول کی تعریف کے لیے تو میرے پاس الفاظ ہی نہیں "بازگشت" پڑھ کر بوریت مزید سوا ہوگئی.... اب ناولٹ اور افسانوں پر کیا تبصرہ کروں۔ بس یہ کہ اس بار بالکل مزہ نہیں آیا حالانکہ عید کے حساب سے شان دار ہونا چاہیے تھا' فاسٹ بالر محمد عامر کا انٹرویو شائع کریں پلیز پلیز پلیز یار....3 مہینوں سے ریکویسٹ کررہی ہوں لوجی لائیٹ چلی گئی اب اندھیرے میں کیا لکھوں۔

ج : پیاری یاسمین! مزید کچھ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں' اتنا ہی کافی ہے اب افسوس ہی کرسکتے ہیں کہ آپ کو یارم کے سوا کچھ بھی پسند نہیں آیا۔

تہمینہ روف نے بنوں سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

"یارم" سمیرا جی آپ کیوں ہماری دل کی دھڑکنوں کے ساتھ کھیلتی ہیں۔ جم کر قدم رکھنا اور اپنے حوصلوں کو بلند کیسے رکھنا ہے' یارم 'ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ آپ کی ہر تحریر سائرہ رضا کی تحریروں کی طرح دل پہ اترتے ساتھ ہی اپنے نقش چھوڑ جاتی ہے "ایک تھی مثال" رخسانہ نگار عدنان صاحبہ میں نے آج تک حقیقت کے اتنے قریب اتنی پیاری اسٹوری کبھی نہیں پڑھی "رقص بسمل" بھی خوب جارہی ہے اور ثمرہ جی "ہم سے ہے زمانہ" بس اتنی سی؟ کیا ہمارے سال بھر انتظار کا صرف اتنا سا صلہ سائرہ جی آپ ہر ماہ ڈائجسٹ کو پڑھتی ہیں مطلب اگر میرا یہ خط شائع ہوا تو آپ اس کو بھی پڑھیں گی 'میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہوگی یہ کہ میری تحریر آپ کی نظر سے گزرے گی سنیعہ عمیر کی بہت اچھی کاوش تھی اگر یہ آپ کی پہلی تحریر تھی تو "ویری ویل ڈن"

ج : پیاری تہمینہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سنیعہ عمیر کی یہ پہلی ہی کہانی سمجھ لیں۔ اس سے پہلے ان کا ایک مختصر سا افسانہ نیلا گلاب شائع ہوا تھا۔ ثمرہ بخاری سے تو ہمیں بھی شکایت ہے کہ اتنے عرصہ بعد لکھا اور اتنا مختصر۔

سائرہ رضا واقعی پرچے کا ایک ایک حرف پڑھتی ہیں اور اپنی رائے سے بھی نوازتی ہیں۔

مریم اور ماہم سنبعم نے چک نمبر 41 گ ب جگدے تحصیل سمندری سے لکھا ہے

میں اور میری کزن شعاع اور خواتین بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہم نے کبھی خریدا بھی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بڑی آپی جو کہ فیصل آباد میں رہتی ہیں پڑھنے کے بعد ہم تک پہنچا ہی دیتی ہیں۔ (دو مہینے بعد) لیٹ پڑھنے کی مجبوری یہ ہے کہ ہم گاؤں میں رہتے ہیں لیکن گاؤں میں رہتے ہوئے بھی ہم اچھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میں (مریم) ایم اے اسلامیات کر رہی ہوں پرائیویٹ اور میری کزن ماہم جو کہ حال ہی میں رائٹر بننے جا رہی ہے۔ اس نے "بدلہ" کے نام سے افسانہ لکھا ہے۔ ماہم ایف ایس سی (میڈیکل) کر رہی ہے۔ ہم دونوں کزنز ہمیشہ اسے پلس لیتی ہیں۔ سائرہ رضا، نمرہ احمد، بشریٰ سعید، فرحت اشتیاق، فائزہ افتخار کا شمار ہماری پسندیدہ ترین رائٹرز میں ہوتا ہے۔ اور مزے کی بات بتاؤں ہم نے نمرہ احمد کا ناول "جنت کے پتے" کتابی شکل میں شائع ہونے سے پہلے ہی گھر میں ہی کتابی شکل دے لی تھی۔ وہ ایسے کہ ہر دفعہ ڈائجسٹ میں سے کہانی الگ کر کے رکھ لیتے اور جب مکمل ہو گئی تو ہم نے اس کی بائنڈنگ کروالی۔ (واہ کیا بات ہے ہماری)

مریم اور ماہم! آپ کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔ آمین۔

ایک بات کی داد ضرور دیں گے کہ رسالہ آپ نے کبھی نہیں خریدا پھر بھی اتنی باقاعدگی سے آپ تک پہنچتا ہے کہ جنت کے پتے کی ایک بھی قسط آپ سے مس نہیں ہوئی اور آپ نے مفت میں مکمل کتاب حاصل کر لی۔

فرح ناز، ربیعہ، ثمینا اور گلشن گل گاؤں سکھانہ تحصیل و ضلع گجرات سے لکھتی ہیں

"ایک تھی مثال" میں اب اصل کہانی شروع ہو گی۔

اب پتا نہیں کون سا قہر ٹوٹنا باقی ہے مثال پر۔

آپی جی! میری ماما کو سمجھائیں کہ ڈائجسٹ پڑھنا گناہ نہیں ہے۔ میں حرم خان سے دوستی کرنا چاہتی ہوں اور مس آنسہ شبیر (ڈوگہ) آپ وہی ہیں نا جو سکھانہ میں نیچنگ کر چکی ہیں۔ ہمارے کلیوال والوں کو بھی شعاع پسند ہے لیکن کبھی بھی خط نہیں لکھا۔ میں ہی فرحی ارمان ہوں اور فرح ناز بھی۔

ج: فرح ناز، ربیعہ، ثمینا اور گلشن گل! خط تاخیر سے ملا، اس لیے پچھلے ماہ شامل نہ ہو سکا۔ اپنی امی کو آپ شعاع کے سلسلے پڑھ کر سنائیں، پیارے نبی کی پیاری باتیں اور باتوں سے خوشبو آئے، ہمیں یقین ہے کہ پھر وہ آپ کو شعاع پڑھنے سے منع نہیں کریں گی۔

عائشہ جمیل بلدیہ ٹاؤن کراچی سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

اس مرتبہ ٹائٹل گرل دوپٹہ کے ہالے میں بہت پیاری لگی۔ "رقص بسمل" نبیلہ عزیز کا ناول دھیرے دھیرے آگے کھسک رہا ہے۔ "یارم" سمیرا حمید کے ناول نے طبیعت ایک دم خوش کر دی۔ کافی عرصہ بعد ایسا کچھ پڑھنے کو ملا بہت مزا آیا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ — "صنم سے صمد تک" کنیز نبوی کے ناول کا اینڈ حسب توقع تھا۔ ماہم کا کردار شروع میں جتنا اچھا لگا آخر میں اتنا ہی برا محسوس ہوا۔

"ڈھل گیا ہجر کا دن" صدف آصف کا ناول معذرت کے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ "کوئی نہ جانے بات" عائشہ نصیر احمد کے ناولٹ نے دل موہ لیا۔ ویل ڈن عائشہ جی۔ افسانے سب ہی اچھے لگے لیکن "لیلۃ القدر" قانتہ رابعہ کا افسانہ بہت ہی اعلیٰ لگا۔ "ایک تیتر" رشک حبیبہ کا افسانہ بہت پسند آیا۔

ج: پیاری عائشہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔ آپ کے افسانے ابھی پڑھے نہیں ہیں اس لیے کچھ بتانے سے قاصر ہیں۔

عظمیٰ مشتاق جہلم سے لکھتی ہیں

ٹائٹل گرل بہت پیاری لگی۔ سمیرا حمید کا ناول "یارم" بہت دلچسپ ہے۔ سعیدہ عمیر کا ناول بازگشت بھی بہت خوب صورت ناول تھا۔ آپ کے ان پرچوں نے سچ میں مجھے زندگی گزارنے کا ہنر سکھایا ہے۔ میری فرینڈ حرا بھی شعاع کی دیوانی ہے۔ آپی راحت جبیں کہاں غائب ہیں

انہیں کہیں نہ کوئی ناول لکھیں۔

ج: پیاری عظمیٰ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید، راحت جبیں آج کل ٹی وی پہ مصروف ہیں، اس لیے لکھ نہیں پا رہی ہیں انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد شعاع کے لیے لکھیں گی۔ اپنی دوست حرا کا ہماری جانب سے شکریہ ادا کر دیں۔

نورینہ حنیف نے سرگودھا سے لکھا ہے

آپی کیا حال ہیں؟ ہمارا تو گرمی سے بہت برا حال ہے، سرگودھا میں تو بارش ہو ہی نہیں رہی۔ ٹائٹل بہت پیارا لگا۔ مکمل ناول سب بیسٹ تھے، افسانوں میں جوادی اور شبلی کو پڑھ کر اچھا لگا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے سائرہ آپی آپ کا خط اچھا لگا۔

ج: الحمد للہ ہمارا حال بالکل ٹھیک ہے، بارش تو کراچی میں بھی نہیں ہوئی لیکن گرمی زیادہ نہیں ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عائشہ خان ٹنڈو محمد خان سے لکھتی ہیں

خط آپ کے میں سائرہ رضا کا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سائرہ جی کی کیا بات ہے۔ اس بار ثمرہ بخاری کا نام پڑھ کر جتنی خوشی ہوئی، اتنی افسانہ پڑھ کر نہیں ہوئی۔ آسیہ رزاقی کو پڑھا خلاف توقع انہوں نے بھی مایوس کیا۔ اس بار عنیقہ بیگ کا افسانہ بہت پسند آیا۔

ج: عائشہ! شعاع پر تبصرے کے لیے شکریہ۔

نمرہ رحمان نے جہانیاں منڈی سے لکھا ہے

"ایک تھی مثال" بظاہر کہانی آگے بڑھ چکی ہے لیکن پھر بھی وہیں رکی ہوئی سی محسوس ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے کہ زندگی کی ایک تلخ حقیقت کو آشکار کرتی ہوئی تحریر ہے، لیکن پھر بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، اتنے سارے رشتوں میں اتنے سارے سالوں میں، کوئی بھی اس کا خیر خواہ نہیں..... کچھ تو مثبت پہلو دکھا دیا ہوتا۔ خواہ سہیلی کی شکل میں ہی سہی..... لیکن ناں جی! مسلسل تکلیف میں ڈوبی ہوئی مثال ہے اور بس معذرت کے ساتھ..... رقص بسمل نبیلہ عزیز بھی کچھ خاص متاثر نہیں کر پا رہیں۔

ج: پیاری نمرہ! آپ نے بہت تاخیر سے خط لکھا، اس لیے پچھلے ماہ شامل نہ کر سکے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

قارئین متوجہ ہوں!

1. شعاع ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جا سکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
2. افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔
3. ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
4. کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
5. مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابل اشاعت صورت میں تحریر کی واپسی ممکن نہیں ہو گی۔
6. تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
7. شعاع ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع۔ 37 اردو بازار کراچی۔

امتہ الصبور

درفش کاویانی

درفش کاویانی' ایرانیوں کا وہ امتیازی نشان تھا جسے اڑھائی سے تین ہزار سال قبل مسیح کے دوران بنایا گیا تھا۔ ان دنوں ایران پر ضحاک نامی ایک حامی النسل بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ حقیقتاً "یمن کا رہنے والا تھا" لیکن ایران کو اس نے اپنے مقبوضات میں شامل کرلیا تھا۔ روایت ہے کہ اس نے ایک ہزار سال حکومت کی اور یہ عرصہ 1970 قبل مسیح سے 2970 قبل مسیح کے لگ بھگ بیان کیا گیا ہے۔

تاریخ طبری کے مطابق ضحاک نہایت ظالم شخص تھا۔ اس نے کئی بادشاہوں کو قتل کیا۔ تازیانے مارنا اور لوگوں کو دار پر لٹکانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس نے ایک ہزار سالہ حکومت میں لوگوں پر بے پناہ ظلم ڈھائے۔ لوگ اس سے سخت ہراساں اور خوف زدہ رہتے تھے۔ حکومت کے آٹھ سو سال گزرنے کے بعد اس کے کندھوں کے ابھرے ہوئے گوشت پر زخم آ گئے جن کی وجہ سے وہ سخت تکلیف میں رہتا تھا۔ طرح طرح کے علاج کرائے گئے۔ لیکن زخم اچھے نہ ہوئے۔

آخر ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے کہ ان زخموں کا علاج انسانوں کے مغز سے کرو۔ دوسرے دن' ایک انسان کا مغز نکال کر زخموں پر لگایا گیا تو درد میں افاقہ ہوگیا۔ اس روز سے یہ معمول ہوگیا کہ گلی کوچوں سے دو آدمی پکڑ کر لائے جاتے اور انہیں مار کر ان کے مغز ضحاک کے زخموں پر لگائے جاتے۔ روایات کے مطابق یہ سلسلہ دو سو برس تک جاری رہا۔

ضحاک کی حکومت کے ہزارویں سال حاکم اصفہان نے ایک لوہار "کاوہ کے دو بیٹوں کو پکڑ کر ضحاک کے پاس بھیج دیا" تاکہ انہیں قتل کرکے ان کے مغز اس کے زخموں پر لگائے جاسکیں۔ کچھ ہی دنوں میں ان کے قتل کی خبر آگئی۔ بیٹوں کے قتل کا سن کر کاوہ کو بے حد صدمہ پہنچا۔ وہ شہر آیا اور عوام کو ضحاک کے ظلم و ستم کے خلاف ابھارنے لگا۔ وہ اپنی دھونکنی کو ایک لکڑی سے باندھ کر فضا میں بلند کرتا اور کہتا۔

"یہ آزادی کا علم ہے۔ جو لوگ ضحاک کے خونیں پنجوں سے رہائی چاہتے ہیں وہ اس جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔"

جھنڈے کو اس نے موتیوں سے آراستہ کیا تھا جس کی وجہ سے اس کا نام درفش کاویانی ہوا۔

کاوہ نے نہ صرف ایرانی لوگوں کو جمع کیا' بلکہ ایرانی لشکر کا سالار بن کر ضحاک کو شکست دی اور اپنی قوم کو آزادی دلائی۔ آزادی کے بعد فریدون (1670 قبل مسیح سے 1970 قبل مسیح) ایران کا بادشاہ ہوا تو اس نے کاوہ کو سپہ سالار اعلیٰ بنادیا۔ کاوہ جہاں بھی لشکر کشی کرتا' درفش کاویانی اس کے ساتھ ہوتا اور اسے فتح حاصل ہوتی۔

بیس سال کے عرصے میں کاوہ نے ایران کو دشمنوں سے پاک کردیا۔ جس کے صلے میں فریدوں نے اسے حاکم اصفہان بنادیا۔

کاوہ نے دس سال اصفہان پر حکومت کی۔ اس کے مرنے کے بعد حکومت و جاگیر تو اس کے خاندان میں ہی رہی' لیکن درفش کاویانی شاہی خزانے میں جمع کردیا گیا اور فریدون نے کاوہ اور اس کی کوششوں کے اعتراف کے طور پر ایرانی پرچم کا نام ہی درفش کاویانی رکھ دیا۔

فریدون جب بھی کسی مہم پر روانہ ہوتا' درفش کاویانی اس کے ساتھ ہوتا۔ یہ علم تمام ایرانی تاجداروں کے خزانوں کی زینت رہا۔ اس پر بیش بہا جواہرات ٹانکے گئے' یہاں تک کہ اس کا چمڑا نظر نہ آتا تھا۔ یہ جھنڈا جب کھولا جاتا تو جواہرات کی چکاچوند سے آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ ایک عرب شاعر بحتری نے اپنے ایک مشہور قصیدے میں درفش کاویانی کی تعریف کی ہے۔

"نوشیرواں' درفش کاویانی کے نیچے سپاہیوں کی صفیں لے کر چل رہا ہے اور عورتیں کھڑی دیکھ رہی ہیں۔"

بہن کی محبت

ہجرت کا بیسواں سال تھا اسلامی فوجوں نے دمشق کا محاصرہ کر رکھا ہے اور اسلامی فوج کا ایک ایک جان باز اپنی جان نثار کرنے کے لیے بے تاب تھا' اسی دوران میں یہ خبر آئی کہ دشمن کی فوجیں ہزاروں کی تعداد میں اجنادین کے مقام پر جمع ہو رہی ہیں۔

امیر لشکر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ نے سارے کمانڈروں کو اکٹھا کرکے ان سے اس نازک صورت حال کے متعلق مشورہ کیا۔

"امیر! ہم جاں نثاری کے لیے تیار ہیں' فکر کی کوئی بات نہیں' اس سے بڑی اور کیا سعادت ہوگی کہ ہماری جانیں اللہ کی راہ میں کام آجائیں۔" حضرت خالد بن ولید نے جوشیلی آواز میں کہا۔

"ہاں! مگر یہ بتاؤ کہ اس مہم کو سر کرنے کے لیے کس جواں عزم کو بھیجا جائے؟" ابو عبیدہ الجراح نے دریافت کیا۔

"امیر! میرے خیال میں اس مہم کے لیے ضرار بن الازور بہت موزوں ہیں۔ اس شیر دل کو بے کھٹک روانہ کر دیجیے۔" حضرت خالد نے ضرار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور حضرت ابو عبیدہ نے ضرار بن الازور کو پانچ ہزار شیر دل جوانوں کا کمانڈر بنا کر اجنادین کی طرف روانہ کردیا اور سب نے فتح کے لیے دعا کی۔

اسلامی فوج کے یہ جاں نثار ابھی راستے میں ہی تھے کہ شاہ حمص سے مڈبھیڑ ہوگئی' شاہ حمص بارہ ہزار تازہ دم فوج لیے اجنادین کی طرف جارہا تھا۔

ضرار نے اسلامی لشکر کو حکم دیا "بہادرو! عقاب بن کر دشمن پر ٹوٹ پڑو اور اس سے پہلے کہ یہ اجنادین پہنچیں یہیں ان کا کام تمام کردو۔"

اور گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی۔

حضرت ضرار اپنی جان سے بے نیاز بڑھ بڑھ کر حملے کررہے تھے اور اپنے جوانوں کی ہمت بڑھا رہے تھے' کہ اس دوران شاہ حمص وردان کے بیٹے ہمدان نے موقع پا کر حضرت ضرار پر نیزے سے وار کیا' نیزہ بازو میں لگا۔ حضرت ضرار زخمی ہوگئے۔ دوسرے ہی لمحے زخمی شیر دہاڑا اور پلٹ کر نیزہ ہمدان کے سینے میں اتار دیا۔ نیزہ سینے اور پشت کی ہڈیاں توڑتا ہوا پار ہوگیا۔ حضرت ضرار اپنا نیزہ نکال رہے تھے جو کسی ہڈی میں پھنس کر رہ گیا تھا کہ دشمن نے موقع پا کر حضرت ضرار کو گرفتار کرلیا۔

اسلامی فوج امیر لشکر کی گرفتاری کے باوجود بڑی بے جگری سے لڑتی رہی تھی اور دشمنوں کا صفایا کرتی رہی۔ ادھر کسی تیز رفتار سوار نے حضرت خالد کو ضرار کی گرفتاری کی اطلاع پہنچادی۔

حضرت خالد بے چین ہوگئے اسی وقت امیر کے خیمے میں پہنچے اور اجازت لے کر ایک ہزار جاں بازوں کو لے کر محاذ کی طرف علی گھوڑے دوڑا دیے۔

گھوڑے طوفان بن کر دوڑ رہے تھے کہ حضرت خالد کو اپنے گھوڑے کے آگے گرد اڑتی نظر آئی' آپ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی' گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا مگر آگے جانے والے شہسوار کا گھوڑا طوفان سے زیادہ تیز تھا۔ حضرت خالد نے غور سے دیکھا' سیاہ لباس پہنے' لمبا نیزہ ہاتھ میں لیے' کوئی جاں باز آندھی اور طوفان کو شکست دے رہا تھا۔

فوج آگے دوڑنے والے شہسوار سے کچھ قریب تو

ہوگئی لیکن اس کو پکڑ نہ سکی۔

غضب کی رفتار تھی۔ حضرت خالد نے دیکھا' شہسوار نے منہ پر ڈھاٹا باندھ رکھا ہے کہ کوئی پہچان نہ سکے۔ امیر لشکر نے پھر گھوڑے کو ایڑ لگائی گھوڑا اڑنے لگا مگر وہ شہسوار ان سے پہلے ہی میدان میں کود پڑا تھا۔ وہ بجلی کی طرح دور تک رومیوں کی فوج میں گھستا چلا جاتا' پھر اسی تیزی سے دشمنوں کو کاٹتا ہوا واپس آجاتا۔ اس کا لمبا نیزہ دشمنوں کے تازہ خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ کبھی وہ اللہ کا غضب بن کر داہنی جانب جھپٹتا' کبھی قہر الٰہی بن کر بائیں جانب جھپٹتا' کبھی سامنے کی فوج پر بجلی بن کر گرتا اور جدھر جاتا عقاب کی طرح شکار پر اس طرح ٹوٹتا کہ شکار خاک و خون میں تڑپتا نظر آتا۔

دوپہر کے بعد رومی فوج کی ہمت ٹوٹ گئی' ان کے حوصلے پست ہو گئے اور آخر کار وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے' وہ شہسوار ایک جانب خون میں نہایا ہوا کھڑا تھا۔ حضرت خالد اس بہادر جوان سے ملنے کو بے چین تھے' انہوں نے ایک سپاہی کو معلومات کے لیے بھیجا مگر وہ خاموش رہا۔ پھر حضرت خالد خود اٹھے اور شہسوار کے پاس جا کر سلام کیا اور پوچھا!

"اللہ تمہاری ہمت اور بڑھائے' تم کون ہو؟"

امیر لشکر کو دیکھ کر شہسوار نے بڑے ادب سے سلام کا جواب دیا اور نہایت دھیمی آواز میں کہا۔ "اے امیر میں ایک بہن ہوں۔"

"تم ایک خاتون ہو؟" حضرت خالد نے حیرت اور قدر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔

"جی ہاں! میں ازور کی بیٹی اور ضرار کی بہن خولہ ہوں۔"

"خولہ! تمہارے درد کو میں جانتا ہوں' خدا ضرار کی حفاظت فرمائے۔" امیر لشکر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور خاموش ہو گئے۔

"امیر! میرا سکون غارت ہو گیا ہے' جب تک میں اپنے بھائی کو دشمن سے چھڑا نہ لوں' چین سے نہیں بیٹھ سکتی۔ اگر مجھے پتا چل جائے تو باز کی طرح جھپٹ کر اسے ظالم پنجوں سے چھڑا لوں۔

میرے بھیا! کیا میں اب تجھے کبھی نہ دیکھ سکوں گی؟ کیا تو بھی اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا ہے؟ تیرے باپ ازور نے تو خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جام شہادت نوش کیا تھا۔ میرے بھیا اگر تو باپ کے پاس پہنچ گیا ہے تو میری طرف سے تجھ پر ہزاروں سلام۔"

بھائی کی یاد میں بہن کا یہ درد بھرا مرثیہ سن کر سب ہی کا دل بھر آیا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ پہاڑی کے دامن سے رومی فوج کا ایک مختصر دستہ بڑھا چلا آ رہا ہے' جوں ہی وہ دستہ قریب آیا' مسلمان فوج نے دیوانہ وار اس پر حملہ کر دیا۔

رومی دستہ لڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور امان طلب کرنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور انہیں امان دے دی گئی' پھر امیر لشکر نے ان سے پوچھا۔

"تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں جانے کا قصد ہے؟"

"ہم لوگ حمص کے باشندے ہیں اور شاہ حمص کی مدد کے لیے آئے تھے۔"

"پھر تم نے امان طلب کیوں کی؟" امیر لشکر نے پوچھا۔

"ہم لڑائی کا ارادہ ترک کر کے حمص لوٹنا چاہتے ہیں!" رومی سردار نے کہا۔

"کیوں؟ ارادہ ترک کرنے کی کیا وجہ ہے؟" امیر لشکر نے پوچھا۔

"ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ شاہ حمص آپ جیسے جاں بازوں کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتا۔ لہٰذا اس کی حمایت میں لڑنا بے سود ہے۔"

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ امیر لشکر نے خولہ کی بے تابی کو بھانپ لیا اور رومی سردار سے کہا۔

"میں تم سے ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں اور مجھے توقع ہے کہ تم صحیح صحیح بتاؤ گے۔"

"ضرور ضرور اگر میرے علم میں ہو گا تو میں آپ کو دھوکا نہیں دوں گا۔" رومی سردار نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"یہ بتاؤ' ہمارے کمانڈر ضرار کہاں ہیں؟" حضرت خالد نے پوچھا۔

"ضرار کو سو جنگی سواروں کی نگرانی میں حمص کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے اور وہاں سے ان کو شاہ ہرقل کے حضور پیش کیا جائے گا۔" رومی سردار نے سچ سچ بتا دیا۔

یہ خبر سنتے ہی سب سپاہی بے چین ہو گئے' خولہ بھی بھائی کے لیے بے تاب تھیں۔ حضرت خالد نے اسی وقت حضرت رافع کو سو جنگی سواروں کے ساتھ حمص کی جانب روانہ کر دیا اور انہیں ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

"میرے جاں باز شیرو! نشانات قدم سے دشمن کی کھوج لیتے ہوئے دشمن کو جا پکڑو اور اپنے محبوب سردار ضرار کو چھڑا کر ہی دم لینا۔" حضرت رافع سو تازہ دم سواروں کو لے کر جوش و خروش کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ حضرت خولہ بھی اس دستے کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئیں۔ حضرت خالد نے انہیں روکنا مناسب نہ سمجھا۔

اسلامی فوج بے پناہ جوش کے ساتھ گھوڑے دوڑاتی اور نشانات کا کھوج لیتی آگے بڑھ رہی تھی۔ لیکن کئی منزلیں طے کرنے کے بعد بھی رومی دستے کا کہیں پتا نہ چلا تو سردار کو فکر ہوئی۔ انہوں نے سپاہیوں کو مخاطب کر کے کہا!

"جس برق رفتاری سے تم لوگ چل رہے تھے' میرا خیال ہے کہ دشمن ضرور پیچھے رہ گیا ہے۔ لہٰذا ہمیں یہیں اس کا انتظار کرنا چاہیے۔" یہ ان کی فراست تھی۔

اسلامی لشکر اپنے امیر کا حکم سنتے ہی دشمن کی گھات میں بیٹھ گیا۔ انتظار کرتے کرتے کافی وقت گزر گیا اور دشمن فوج کا کچھ پتا نہ چلا تو سب بے چین ہو گئے۔ حضرت خولہ کا بھی برا حال تھا' وہ چاہتی تھیں کہ دم بھر میں حمص پہنچ جائیں اور اپنے بھائی کی صورت دیکھ لیں۔ اسلامی لشکر مایوسی اور بے تابی کی کیفیت سے دوچار تھا کہ دور سے گرد اڑتی ہوئی نظر آئی۔ سب کی نگاہیں وہیں جم گئیں۔ کچھ دیر بعد معلوم ہوا کچھ سوار پوری قوت سے گھوڑے دوڑاتے ان کی طرف آ رہے ہیں۔ جب معلوم ہوا کہ یہ وہی دستہ ہے جو حضرت ضرار کو حمص لے جا رہا ہے تو حضرت خولہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ چوکس ہو گئیں اور عزم کے ساتھ اپنا نیزہ سنبھال لیا۔ ادھر اسلامی لشکر کے جوش و خروش کا عجیب عالم تھا' ہر ایک کے حوصلے کا یہ حال تھا کہ وہ اکیلا ہی پورے دستے سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔

جونہی رومی دستہ مسلمانوں کے سامنے آیا' ساری مسلمان فوج اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر ان پر ٹوٹ پڑے۔

رومیوں کے ہوش اڑ گئے۔ کچھ مارے گئے' کچھ ادھر ادھر بھاگ گئے۔

حضرت خولہ کی نظر جب اپنے بھائی پر پڑی تو ان کی عجیب کیفیت ہو گئی' اپنے بھائی کو زندہ سلامت اپنے سامنے دیکھ کر فرط مسرت سے ان کے آنسو نکل آئے۔

مسلمان فوج بھی اس منظر کو دیکھ کر بے حد مسرور ہوئی۔

حضرت ضرار رہا ہو چکے تھے اور اسلامی فوج خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئی کہ انہیں کامیاب و کامران کیا' اب وہ اپنے امیر کے سامنے سرخرو لوٹیں گے۔

(تسنیم جعفری)

حب الوطنی

ہمارے عوام انڈیا سے بہت متاثر ہیں۔ ہمیں ان کی فلمیں' ڈرامے' ان کے ڈانس' ان کی بے باکی' حد تو یہ ہے کہ ہم ان کی فحاشی' بے ہودگی اور عریانیت تک سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو آج کل ہونے والے ایوارڈ شوز اور شوبز کی ہونے والی تقریبات دیکھ لیں۔ ہماری اداکارائیں جس طرح کا لباس پہنتی ہیں' اور ڈراموں میں جو ماحول ہم دکھاتے ہیں وہ پاکستانی معاشرے کی اصل تصویر تو نہیں۔

ہم نے انڈین ڈراموں سے بے ہودگی اور کم لباسی سیکھ لی ہے' لیکن ان سے حب الوطنی کا سبق نہیں لیا۔ جس طرح وہ اپنے مذہب کا پرچار کرتے ہیں۔ سوپ ہو تو ہر قسط میں روزانہ ایک سین پوجا پاٹ کا ضرور ہوتا ہے۔ ان کے ہر ڈرامے میں ماڈرن سے ماڈرن لڑکا' لڑکی اپنے مذہبی تہوار پوری شان و شوکت اور اہتمام سے مناتے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھیں تو کہانی تو برائے نام ہوتی ہے' زیادہ تر ہولی' دیوالی' نوراتی' راکھی اور گن پتی کے تہوار ہی دکھائے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر ڈرامے میں بھارت ماتا سے محبت اور ایکتا کا چرچا کرتے ہیں۔ (صرف چرچا ہی نہیں کرتے دراصل محبت کرتے بھی ہیں۔) سو ارب کی آبادی والے اس ملک میں بے شمار قومیں آباد ہیں۔ مختلف ذاتیں ہیں۔ ذات پات کے جھگڑے بھی ہیں۔ زبانیں بھی مختلف ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے ڈراموں میں ملک سے محبت کے گن گاتے نظر آتے ہیں۔ ان کے چینلز تعصب کو ہوا نہیں دیتے۔ وہ یک جہتی اور اتحاد کا سبق دیتے ہیں۔ وطن سے محبت کا پرچار کرتے ہیں۔

جبکہ ہمارے یہاں تعصب بہت کم ہے۔ لوگ آپس میں مل کر رہتے ہیں۔ رشتے کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے چینلز چند ایک متعصب قسم کے بیانات کو نمایاں کر کے دکھاتے ہیں۔ کوئی قوم مظلومیت کا رونا روئے تو اس کو اس طرح سے پیش کیا جاتا ہے کہ لگتا ہے کہ ظلم کے پہاڑ ٹوٹ گئے ہیں۔

خالصتان تحریک میں بھارتی حکومت نے سکھوں کو کچل کر رکھ دیا۔ ان کی مذہبی عبادت گاہ گولڈن ٹیمپل میں فوج گھس گئی' لیکن میڈیا نے انہیں اپنی مظلومیت کا رونا رونے کا موقع فراہم نہیں کیا۔

جبکہ ہمارے ڈراموں میں پاکستان کا نام لینا قدامت پرستی میں شمار ہوتا ہے۔ ماڈرن ازم کا مطلب ہے مذہب اور ملک کی برائیاں کرنا' جبکہ بھارت اس کے برعکس دکھاتا ہے۔ کاش! لوگ اس چیز کو سمجھ لیں تو اپنے ڈراموں کے ذریعے لوگوں کی سوچ بدل سکیں۔

باادب

بدر خلیل سینئر ترین آرٹسٹ ہیں اور ان کے کریڈٹ پر بے شمار کامیاب ڈرامے ہیں۔ آج کل وہ "قدوسی صاحب کی بیوہ" میں عقیلہ بھابھی کا کردار بخوبی ادا کر رہی ہیں۔ لیکن اب سننے میں آرہا ہے کہ وہ پاکستان چھوڑ کر اپنے بیٹے کے پاس کینیڈا جا رہی ہیں اور اب وہیں رہیں گی۔ ہم نہیں جانتے کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے' لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ آج کل زیادہ تر ڈرامے کراچی میں بن رہے ہیں' لیکن بدر خلیل جیسی منجھی ہوئی اداکارہ کو اس میں نہیں لیا جا رہا' بلکہ باہر سے آرٹسٹوں کو بلا کر کاسٹ کیا جا رہا ہے۔ جو بہرحال زیادتی ہے۔ (جی اسی لیے ایک' دو مخصوص چہرے ہی ہر چینل پر ہاں کے کردار میں نظر آرہے

ہیں۔) دوسرے "ہم ٹی وی" ایوارڈ کی تقریب میں سلطانہ صدیقی' بدر خلیل کے ساتھ بیٹھی تھیں کہ فواد خان (ہم سفر فیم) اپنی جگہ سے اٹھ آئے اور انہوں نے سلطانہ صدیقی سے براہ راست آکر کہا کہ وہ ان کے ساتھ آکر بیٹھیں' ورنہ وہ تقریب سے چلا جائے گا۔ (فواد! فرمائش کرنا غلط نہیں' لیکن اگر ادب آداب کا خیال کر لیا جائے تو بہتر ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا باادب بانصیب بے ادب؟) فواد خان کے اس رویے کو بدر خلیل نے بہت محسوس کیا۔ ان ہی رویوں کی وجہ سے وہ اب باہر جا رہی ہیں۔ (بدو جی! آپ کے پرستار آپ کی بہت قدر اور عزت کرتے ہیں۔ چند لوگوں کی وجہ سے آپ انہیں نہ چھوڑ کر جائیں۔)

نقطہ نظر

معروف ڈراما نگار عمیرہ احمد کا کہنا ہے کہ "پاکستانی میڈیا میں خواتین چھائی ہوئی نظر آتی ہیں۔ (عمیرہ! ذرا نظر دوڑائیں تو ہر جگہ ہی نظر آئیں گی۔) ہمارے بارے میں سوچا جاتا ہے کہ یہ ایک قدامت پسند ملک ہے جہاں خواتین کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ مگر ہمارے پاس خواتین فنکاروں کی کمی نہیں ہے۔

درحقیقت ٹی وی کے لیے اچھا لکھنے والوں میں اکثر خواتین رائٹرز کی ہے۔ پاکستانی ڈراموں کو ہندوستانی چینل پر نشر کیے جانے سے پاکستان کے بارے میں غلط تصورات کو ختم کرنے میں مدد ملے گی۔ ("دمگربول" اور "خدا کے لیے" جیسی فلمیں بنا کر نہیں) کہ پاکستان میں حالات ہمیشہ خراب رہتے ہیں اور ہم خوش باش زندگی نہیں گزار سکتے۔ ان ڈراموں کے ذریعے لوگ (انڈیا کے) جاننے لگیں گے کہ ہم ان سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔

عمل

اردن سے تعلق رکھنے والے گلوکار اور موسیقار "عمر العبد اللات" نے گلوکاری ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اعلان کیا ہے کہ وہ فلسطینی عوام سے اظہار یکجہتی کے لیے اپنے تمام پیشہ ورانہ معاملات سے دستبردار ہوتے ہیں۔ (اسے کہتے ہیں صرف باتیں نہیں' عمل بھی) انہوں نے میڈیا سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے فلسطینی ساتھی نسل کشی جیسی خوف ناک صورت حال سے گزر رہے ہیں۔ انہوں نے اس سے پہلے مصر میں ہونے والا اپنا کنسرٹ اور دورہ امریکا بھی ملتوی کر دیا ہے اور ایک کمپنی سے ہونے والا نیا البم کا معاہدہ بھی اب ختم کیا جا چکا ہے۔

عمر نے اپنے تمام گانے اور اپنی تمام نیک

خواہشات فلسطینی عوام کے نام کرتے ہوئے کہا کہ میں فلسطینی عوام کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرا کام اور میرے سارے گانے خاص طور پر ان کے نام ہیں۔

اعزاز

پاکستان کی پہلی خاتون کوہ پیما ثمینہ بیگ جنہوں نے 2013ء میں دنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ سر کی تھی۔ اب انہوں نے ایک اور اعزاز حاصل کرلیا ہے کہ حال ہی میں سات براعظموں کی بلند ترین چوٹیاں کامیابی سے سر کی ہیں۔ اس طرح وہ پہلی مسلمان اور پاکستانی خاتون بن گئی ہیں جنہوں نے یہ اعزاز حاصل کیا ہے۔ (بہت خوب ثمینہ! آپ نے مسلمان اور پاکستانی خواتین کا سربلند کردیا۔) ثمینہ نے یہ اعزاز سال 2014ء میں حاصل کیا۔

ترقی

معروف اداکار احمد بٹ یوں تو ٹی وی پر ڈرامے اور لائیو شوز کرتے نظر آتے ہیں، لیکن اب وہ ٹی وی اسکرین سے فلم اسکرین پر جا پہنچے ہیں اور معروف اداکار و فلم ساز ہمایوں سعید کی کامیڈی فلم میں عنقریب نظر آئیں گے۔ اس فلم کا نام فی الحال (یہ فی الحال سے کیا مطلب ہے بھئی؟) "افرا تفریح" رکھا گیا ہے۔ (کہیں فلم بھی افراتفری ہی کا شکار نہ ہوجائے۔) جو بعد میں تبدیل بھی کیا جاسکتا ہے۔ (کہیں کاسٹ ہی تبدیل نہ ہوجائے۔) اس کا اسکرپٹ واسع چوہدری نے لکھا ہے اور اس فلم کی ہیروئن کے لیے صبا قمر کا انتخاب کیا جاچکا ہے۔ ہدایت کار ندیم بیگ ہیں۔ (اور ہیرو یقیناً" ہمایوں خود ہی ہوں گے؟)

ذہانت

پاکستانی گلوکارہ زیب نے بھارتی فلم "ہائی وے" کے لیے گانا "سونا سونا" گایا تھا۔ مگر جب بھارتی میوزک کمپنی نے سوشل ویب سائٹ پر گانا اپ لوڈ کیا تو اس میں پاکستانی گلوکارہ کا نام ہٹا دیا۔ (ان کی ذہنیت کا اندازہ کریں ذرا) اس گیت میں جہاں فلم کے ڈائریکٹر امتیاز علی اور میوزک ڈائریکٹر اے آر رحمان کو کریڈٹ دیا گیا ہے۔ وہیں بطور گلوکارہ صرف عالیہ بھٹ کا نام شامل کیا گیا ہے۔ پاکستانی گلوکارہ کے ساتھ اس ناانصافی پر سوشل میڈیا پر ان کے پرستاروں نے احتجاج کیا ہے۔

(حالانکہ ہماری گلوکارہ کے ساتھ یہ ناانصافی نئی نہیں۔ ہم راحت فتح علی خان کے ساتھ ناانصافی کو بھی ابھی بھولے نہیں ہیں) اور بھارتی میوزک کمپنی سے زیب کا نام شامل کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

ادھر اُدھر سے

☆ طاہر القادری کا اس قدر زور و شور سے میدان میں نکل آنا اس بات کی دلیل ہے کہ تبدیلی کے فیصلے کو امریکہ سے گرین سگنل مل چکا ہے۔ جس طرح 2001ء میں جنرل مشرف نے ایک فون کال پر ملک کے مستقبل کا فیصلہ کردیا تھا۔ اب 2014ء میں امریکی افواج کی افغانستان سے واپسی سے قبل امریکہ کو ایک اور جنرل مشرف درکار ہے۔ سوال یہ ہے کیا پاکستان ایک اور جنرل مشرف کا متحمل ہوسکے گا؟

(سید وجیہہ حسن۔۔۔ جسارت)

☆ ہمارے ہاں نریندر مودی جیسے متعصب شخص کا وزیراعظم کیا کونسلر بننا بھی مشکل ہے، جبکہ بھارت میں نریندر مودی ایک عام بھارتی لیڈر کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ لیڈر میں لوگ اپنا پرتو دیکھتے ہیں۔ بھارتی عوام کو مودی میں اپنا آپ نظر آیا تو اس کی وجہ یہی تھی۔ بھارت کا متوسط طبقہ بھی مودی ہی کی طرح متعصب ہے۔

(یاسر پیرزادہ۔۔۔ ذرا ہٹ کے)

☆ امریکی لاڈلوں نے ہم پر "ہماری جنگ" مسلط کردی اور ٹی وی چینلز کو افیون گھول کر پلانے کے کام پر لگا دیا۔ آپ یہ چینل دیکھیے اور خاص طور پر ڈان نیوز، جس نے مرنے والے فلسطینیوں کے لیے ایک بار بھی شہید کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ جب بھی خبر دی ان الفاظ میں دی کہ اسرائیلی کارروائی میں اتنے فلسطینی ہلاک ہوگئے۔ "ہماری جنگ" کی پاس داری کا حق ادا کردیا۔ غنیمت ہے کہ اس نے مرنے والے 13 یہودیوں کے لیے "شہید" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

(عبداللہ طارق سہیل۔۔۔ نئی بات)

☆ عوامی مقبولیت رکھنے والی قیادت بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کو مشرف نے جب تک چاہا ملک میں داخل نہیں ہونے دیا۔ جب وہ واپس آئے تو سیاسی سودے بازی کے بعد واپس آئے۔ مسلم لیگ ن سادہ اکثریت اور عوامی مقبولیت کے باوجود حکومت قائم کرنے کے لیے اصل طاقت ور فیصلہ سازوں کے محتاج ہیں۔

(روزنامہ جسارت)

☆ سینئر صحافی راز درون خانہ سے باخبر ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ بھری بزم میں راز کی بات کہہ جاتے ہیں۔ صحافی کہتے ہیں میاں نواز شریف اور راحیل شریف میں اختلافات کی وجوہات یہ ہیں کہ مشرف کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ بھارت کے ساتھ دوستی نہ کی جائے۔

(لیفٹیننٹ کرنل (ر) عادل اختر)

☆ نیویارک ٹائمز لکھتا ہے کہ جنرل راحیل شریف، نواز شریف سے ناراض ہیں اور یہ ناراضی مشرف کو پاکستان سے نہ جانے دینے پر ہے۔

(مظفر اعجاز۔۔۔ قلم رو)

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

لڈو پیٹھی

اجزا :

چنے کی دال	ایک پاؤ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
اجوائن	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
بیکنگ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

چنے کی دال کو رات بھر کے لیے بھگو دیں۔ صبح اس کا پانی نکال کر سفید زیرہ، اجوائن اور نمک کے ساتھ بلینڈ کرلیں۔ آمیزہ یکجان ہوجائے تو بیکنگ پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں، پھر کھانے کے چمچے کی مدد سے پکوڑوں کی طرح گرم تیل میں تل لیں اور املی کی کھٹی میٹھی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

ہنی چکن

اجزا :

چکن	آدھا کلو
شہد	دو کھانے کے چمچے
کیچپ	چار کھانے کے چمچے
سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

چکن میں نمک، سرخ مرچ، لہسن ادرک پیسٹ، شہد اور کیچپ اچھی طرح مکس کرکے رکھ دیں۔ آدھے گھنٹے بعد تھوڑے تیل میں ہلکی آنچ پر چکن گل جانے تک پکائیں۔ روغن اوپر آجائے تو بھون کر پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھیں، پھر چپاتی کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

شملہ مرچ کا اچار

اجزا :

شملہ مرچ	ایک عدد
زیرہ، دھنیا	ایک ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
سرخ مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
املی کا پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
گڑ	ایک چوتھائی کپ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

شملہ مرچ کاٹ لیں۔ فرائنگ پان میں تیل گرم کرکے شملہ مرچ تمام مسالوں کے ساتھ دو منٹ تک فرائی کریں۔ املی کے گودے کو چھان کر گڑ میں ملائیں، پھر اس پیسٹ کو شملہ مرچ میں ملا کر اتنا پکائیں کہ گاڑھا ہوجائے۔ مزے دار اچار تیار ہے۔

چکن چلی رائس

اجزا :

بغیر ہڈی کا چکن	آدھا کلو
ابلے چاول	چار کپ
شملہ مرچ	دو عدد
ٹماٹو پیسٹ	آدھا کپ
سرخ مرچ پیسٹ	تین کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

گرم تیل میں چکن فرائی کریں۔ پھر ٹماٹو پیسٹ، سرخ مرچ پیسٹ، سیاہ پسی مرچ اور نمک ڈال کر بھونیں، اس کے بعد چکن اور شملہ شامل کرکے۔ پانچ منٹ تک پکائیں، پھر گرم ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

براؤنیز

کوکو پاؤڈر	چھ کھانے کے چمچے
میدہ	چھ کھانے کے چمچے
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
مکھن	ایک ٹکیہ
انڈے	تین عدد
چینی	چھ کھانے کے چمچے

ترکیب :

انڈوں کو اچھی طرح پھینٹ لیں پھر اس میں چینی اور مکھن ملائیں۔ مکھن نہ ہو تو تیل بھی استعمال کرسکتی ہیں اور مزید پھینٹ لیں۔ میدہ، بیکنگ پاؤڈر اور کوکو پاؤڈر ملا کر مزید مکس کریں۔ آمیزہ جتنا اچھا یکجان کریں گی۔ اتنی ہی براؤنی نرم بنے گی۔ سانچے میں آمیزہ ڈالیں۔ پھر پہلے سے خوب گرم توے پر سانچہ رکھ کر بیس منٹ تک ہلکی آنچ پر بیک کریں۔ سوئی کی مدد سے چیک کریں۔ عموماً" بیس منٹ میں براؤنیز تیار ہوجائے گی، لیکن اگر ضرورت محسوس کریں تو پانچ منٹ کے لیے مزید توے پر رہنے دیں۔

چکن میٹ اسٹک

اجزا :

چکن بون لیس	آدھا کلو
میدہ	آدھا کپ
بریڈ کرمبز	آدھا کپ
مکھن	ایک چائے کا چمچہ
لہسن ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

چکن قیمے میں (گوشت یا آلو بھی لیے جاسکتے ہیں) نمک، سرخ مرچ، میدہ، مکھن، بریڈ کرمبز، لہسن پیسٹ اور چار ہری مرچیں پیس کر مکس کریں اور آئس کریم اسٹک یا شاشلک اسٹک پر حسب پسند شیپ دے کر لگائیں۔ آدھا گھنٹہ رکھ کر ملکے تیل میں سنہرے ہونے تک تلیں اور کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

اگرچہ خوب صورتی عمر کی محتاج نہیں ہوتی اور خواتین ہر عمر میں خوب صورت نظر آسکتی ہیں۔ تاہم پچیس سال کی عمر کے بعد جلد کی تازگی، شادابی اور صحت برقرار رکھنے کے لیے مہینے میں ایک بار فیشل کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ فیشل اور خوب صورتی سے متعلق تمام مسائل کے لیے مہنگے بیوٹی پارلرز کا رخ کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ گھر میں ہی ایک عمدہ فیشل کرسکتی ہیں۔

فیشل کی چار اقسام ہیں۔ نارمل فیشل، وائٹننگ فیشل، اینٹی ایجنگ فیشل اور ایکنی فیشل۔

اگر خوش قسمتی سے آپ کی جلد ہر قسم کے مسائل سے پاک ہے تو آپ مندرجہ ذیل طریقوں سے نارمل فیشل کریں۔ منہ دھو کر سادہ دودھ سے روئی کی مدد سے چہرے کا مساج کریں ـــــ پانچ منٹ تک کلینزنگ کرنے کے بعد سادہ روئی سے چہرہ صاف کرلیں، نارمل جلد میں بھاپ لینے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر آپ چاہیں تو گرم پانی میں تولیہ بھگو کر نچوڑیں اور تین سے چار مرتبہ چہرے پر رکھ کر ہلکے ہاتھ سے دبائیں پھر کم از کم دو منٹ کے لیے چہرہ اسی گرم تولیے سے ڈھانپ لیں۔ انڈے کا ماسک لگائیں۔ دس منٹ بعد منہ دھولیں اور ٹوننگ کے طور پر عرق گلاب کا اسپرے کرلیں یا روئی کی مدد سے لگالیں۔

مرجھائی ہوئی، کملائی ہوئی جلد کی حامل خواتین وائٹننگ فیشل کریں۔ رات کو چار چمچے دودھ میں آدھا لیموں نچوڑ کر رکھ دیں۔ صبح اسی پھٹے ہوئے دودھ سے چہرے پر مساج کریں۔ بھاپ کے لیے کھولتے پانی میں چند قطرے زیتون کے تیل کے شامل کریں اور دو منٹ تک تولیہ ڈھک کر بھاپ لیں پھر برف کے ٹکڑے لے کر چہرے پر رگڑیں۔ ٹماٹر کو بالائی میں کچل کر ماسک کے طور پر لگائیں۔ چند منٹ بعد چہرہ دھو کر کھیرے یا پودینے یا چقندر کے عرق سے ٹوننگ کریں۔

بڑھتی عمر کے اثرات کو روکنے کے لیے اینٹی ایجنگ فیشل کریں۔ زیتون کے تیل میں برابر کا پانی ملا کر پھینٹ لیں پھر ہلکے ہاتھ سے مساج کریں۔ یا جو کے دلیے میں دودھ ملا کر گاڑھا سا پیسٹ بنا کر مساج کریں۔ خشک ہونے پر اتارلیں۔ بھاپ لیں۔ بھاپ والے پانی میں بھی زیتون کا تیل ملالیں۔ بھاپ لینے کے بعد کم از کم دو برف کے ٹکڑوں سے ٹکور کریں۔ انڈے کی سفیدی میں شہد ملا کر ماسک لگائیں۔ خوبانی کچل کر بھی بطور ماسک لگا سکتی ہیں۔ ٹوننگ کے لیے لیموں کا عرق لگائیں۔

کیل مہاسوں سے نجات کے لیے ایکنی فیشل کریں۔ تھوڑی سی چینی کو تھوڑے سے پانی میں اتنا گھول لیں کہ کچھ دانے باقی رہیں۔ پھر ہلکے ہاتھوں سے مساج کریں۔ (یہ مساج آپ ہر ہفتے ـــ بغیر فیشل کے بھی کرسکتی ہیں) کیل مہاسوں والی جلد بھاپ کی متحمل نہیں ہوتی۔ مسور کی دال دودھ میں بھگو کر پیس لیں۔ یہ آمیزہ بطور ماسک لگائیں۔ پپیتا کچل کر بھی لگا سکتی ہیں۔ ملتانی مٹی کا بھی ماسک لگا سکتی ہیں اور نیم کے پتوں کا پیسٹ بنا کر بھی بطور ماسک لگا سکتی ہیں۔ ٹونر کے طور پر عرق گلاب لگائیے۔

یاد رکھیے! کوئی بھی فیشل مہینے میں زیادہ سے زیادہ دو بار اور کم سے کم ایک بار کریں اور فیشل کے بعد کم از کم آدھا گھنٹہ چولہے کے نزدیک جانے سے گریز کریں۔

☼